تحقیقی مقالہ برائے ایم۔ایس۔اُردو

یورپ کے تاثرات کے متن کی تدوین

مع حواشی وتعلیقات

محقق

صفیہ کوثر

184-FLL/MSURDU/F15

نگران

ڈاکٹر سائرہ بتول

اسسٹنٹ پروفیسر، شعبۂ اُردو

شعبۂ اُردو

بین الاقوامی اسلامی یونی ورسٹی، اسلام آباد

Accession No. IH 23955

MS
914
ص ف ی

اردو ادب - سفرنامہ
- یورپ

الجامعة الإسلامية العالمية

بین الاقوامی اسلامی یونیورسٹی، اسلام آباد

شعبۂ اردو

تصدیق نامہ

تصدیق کی جاتی ہے کہ صفیہ کوثر رجسٹریشن نمبر 184-FLL/MSURDU/F15 نے ایم۔ایس۔اُردو کی ڈگری کی تکمیل کے لیے تحقیقی مقالہ بعنوان **"یورپ کے تاثرات کے متن کی تدوین مع حواشی و تعلیقات"** میری نگرانی میں رقم کیا ہے۔میں تصدیق کرتی ہوں کہ اس موضوع پر اس سے پہلے کہیں کام نہیں ہوا اور یہ کام سرقے سے پاک ہے۔

نگران: ڈاکٹر سائرہ بتول

اسسٹنٹ پروفیسر، شعبۂ اُردو

ACCEPTANCE BY THE VIVA VOCE COMMITTEE

Name of the Student: **Safia Kousar**

Title of the Thesis: یورپ کے تاثرات کے متن تدوین مع حواشی، تعلیقات

Registration No: 184-FLL/MSURDU/F15

Accepted by the Department of Urdu, Faculty of Languages & Literature, International Islamic University, Islamabad, in partial fulfillment of the requirements for the Master of Philosophy degree in Urdu.

VIVA VOCE COMMITTEE

Chairperson Viva Committee:

Dr. Humaira Ishfaq
Chairperson Department Of Urdu Female IIUI

External Examiner:

Dr. Aqlima Naz
Assistant Professor
Fatima Jinnah Women University, Rawalpindi

Internal Examiner:

Dr. Sabahat Mushtaq
Lecturer,
Department Of Urdu, IIUI,
Islamabad

Supervisor:

Dr. Saira Batool
Assistant Professor,Department Of Urdu
Female IIUI

بسم الله الرحمن الرحيم

حیدر آباد دکن سے ہجرت کرنے والوں کی یاداشت میں محفوظ

جامعہ اسلامیہ کے نام

فہرست موضوعات

نمبر شمار	عنوانات	صفحہ نمبر
01	پیش لفظ	08
02	مقدمہ	10
2.1	سفر نامہ نگاری کی روایت	13
2.2	سفر نامہ کے موضوعات	16
2.3	حیدر آناد دکن اور سیاحت	20
2.4	فن تدوین کی اہمیت	21
2.5	"یورپ کے تاثرات": ایک تعارف	24
2.6	"یورپ کے تاثرات" کا انداز تحریر اور صنف کا تعین	25
2.7	"یورپ کے تاثرات" کا مقصد	26
2.8	"یورپ کے تاثرات" کی زبان اور دور حاضر کی زبان میں فرق	28
2.9	"یورپ کے تاثرات" کے مرتب بدر شکیب کا تعارف	34
2.10	دیگر مصنفین کا تعارف	40
03	"یورپ کے تاثرات" کا متن	108

04	تعلیقات	234
4.1	شخصیات	234
4.2	مقامات	284
4.3	ادارے اور اصطلاحات	326
05	"یورپ کے تاثرات" کے متن کی فرہنگ	246
06	حواشی و حوالہ جات برائے مقدمہ	372
07	حواشی و حوالہ جات برائے مقدمہ	387
08	کتابیات	402

پیش لفظ

اس موضوع پر کام کرتے ہوئے مجھے احساس ہوا کہ ماضی کے جھروکوں میں جھانکنا اور کتاب کے ذریعے ان علاقوں کی سیر کرنا جہاں ہم نے کبھی قدم بھی نہیں رکھا تھا، کس قدر دلچسپ تجربہ ہے۔ کام کے دوران مجھے بدر شکیب کے جذبہ حب الوطنی کی شدت محسوس ہوئی اور حقائق معلوم کر کے بہت افسوس ہوا کہ ہمارے اجداد نے اپنی زندگیوں میں ہجرت کا المیہ جھیلا۔ سیاسی، معاشرتی اور معاشی لحاظ سے یہ تجربہ کتنا ہی مفید کیوں نہ ہو؛ انسان کے دل کی دنیا میں ایک کسک اور رنج ضرور موجود رہتا ہے۔

بدر شکیب نے بعد میں وطن سے محبت کے ثبوت میں حیدرآباد دکن کے گرد گھومتی ہوئی دو کتابیں مزید تحریر کیں۔ لیکن یورپ کے تاثرات میں ہمیں ان کا کردار ایک استاد کا سا محسوس ہوتا ہے جس نے نوجوانوں سے ان کے تجربات لکھوائے اور انھیں اپنے زمانے کے نئے نوجوان کے لیے کتابی صورت دی۔ ان کو کیا معلوم تھا کہ یہ بعد میں آنے والوں کے لیے ایک تاریخی دستاویز بن جائے گی۔ اس کتاب میں پچیس نوجوانوں نے مختلف مقاصد کے تحت اپنے قیام یورپ کے تجربے کو سادہ اور سلیس انداز میں بیان کیا ہے۔ اس زمانے کی عام روش میں فارسی آمیز انداز تحریر اپنایا گیا ہے۔ ایک دلچسپ بات، جس سے اس کتاب کی وقعت میں اضافہ ہوا ہے، یہ ہے کہ ان پچیس نوجوانوں میں سے بیش تر علم وادب اور سائنس حتیٰ کہ کھیل کے میدان تک کی اہم شخصیات بن گئے۔

کتاب کی تدوین کے دوران جملوں کی ساخت جوں کی توں رکھی گئی ہے تاکہ اردو زبان کے جملوں کی ساخت کا ارتقائی مطالعہ کیا جاسکے ۔

متن میں متروک الفاظ اور عربی اور فارسی کے نامانوس الفاظ کے مطالب واضح کرنے کے لیے فرہنگ بنائی گئی ہے۔

عموماً متن میں انوکھی اصطلاحات اور غیر مشہور مقامات و شخصیات کا تذکرہ نہیں۔ تمام شخصیات مشہور و معروف اور تمام مقامات معروف ہیں۔ اس کے باوجود متن میں شامل مقامات، شخصیات، اداروں اور اصطلاحات کے بارے میں معلومات اکٹھی کر کے تعلیقات کی صورت میں الف بائی ترتیب سے شامل کر دی گئی ہیں اور قارئین کی آسانی کے لیے اسے الفاظ کے ساتھ متن میں کی علامت کا اضافہ کر دیا گیا ہے۔

متن میں بہت سے الفاظ ایسے تھے جو انگریزی زبان کے ہیں لیکن ان کو فارسی رسم الخط میں لکھا گیا تھا۔ ایسے الفاظ کو حواشی میں رومن رسم الخط میں تحریر کر کے ان کا اردو مترادف تحریر کیا گیا۔ ایسے الفاظ کے ساتھ حاشیہ نمبر تحریر کیا گیا ہے۔

مقدمہ میں زیرِ تحقیق کتاب" یورپ کے تاثرات "کا تعارف، مرتب بدر شکیب کا تعارف اور مصنفین کا تعارف پیش کیا گیا ہے اس کے علاوہ متن کی صنف کے حوالے سے بھی بحث کی گئی ہے اور متن پر کہیں کہیں تبصرہ بھی مقدمہ میں ہی شامل ہے۔اس کتاب کے متن کے ساتھ اس کے مصنفین کی زندگی کی کہانی ہمیں ایک داستان کے ارتقائی مراحل کی طرح حیران کرتی ہے اور تحریر میں کسی ناول جیسی دلچسپی اور کسی اضافے جیسا ڈرامائی عنصر محسوس ہوتا ہے۔

اس کام کے دوران بہت سے لوگوں کی رہنمائی اور مدد کی وجہ سے مجھ پر ان کا شکریہ ادا کرنا واجب ہے، ان میں بہت سی لائبریریوں کا عملہ (بین الاقوامی اسلامی یونی ورسٹی، اسلام آباد، علامہ اقبال اوپن یونی ورسٹی، اسلام آباد، ادارہ فروغ قومی زبان، اسلام آباد کے کتب خانے شامل ہیں)، کراچی میں ڈاکٹر معین الدین عقیل کا حصہ اس مقالے کی ہر سطر میں شامل ہے، تین دن مسلسل میں نے ان کے ذاتی کتب خانے سے فیض اٹھایا اور ساتھ ان کی حوصلہ افزا گفتگو آج بھی میری یاداشت کا حصہ ہے، میرے اہلِ خانہ، خاص طور پر میرے شوہر، عبیدالرحمان، میرے دوست (جن کا دائرہ وسیع ہے، نام لینے میں بھول چوک کا اندیشہ ہے) میرے بہن بھائی خاص طور پر میرے بھائی فہد جنھوں نے ہنگامی فرمائشوں کو اپنے کام چھوڑ کر پورا کیا، دوسرے بھائی حامد جن کی محبت کی میں مقروض ہوں۔میری امی کا الگ سے شکریہ کہ میری یہ کاوش میری امی کی خواہش کی وجہ سے مکمل ہوئی۔

گورنمنٹ وقار انساء پوسٹ گریجویٹ کالج راولپنڈی میں میرے ساتھی اساتذہ خاص طور پر شعبہ اردو کی رکن اور میری سہیلی محترمہ شگفتہ نسرین اور محترمہ طاہرہ نوازش (اب ملازمت کا عرصہ مکمل کر چکی ہیں)، ڈاکٹر سعدیہ ہما ماجد اور محترمہ ثمینہ جاوید صاحبہ۔ان کے علاوہ گوہر زمان محسود، شاہد محمود صاحب اور ولید احمد کا بھی شکریہ جنھوں نے کمپوزنگ اور پروف ریڈنگ کے مراحل میں ساتھ دیا۔

میری ساس کی محبتوں کا بھی شکریہ جنھوں نے اپنی محبت سے میری حوصلہ افزائی کی اور ہمیشہ میرا عذر قبول کیا۔ میرے سسر (اللہ ان کو جنت مکین کرے) جنھوں نے والد کی طرح شفقت سے مسائل حل کرنے کی کوشش کی۔

سب سے زیادہ میری چھوٹی بہن سدرہ کا شکریہ جنھوں نے میری مصروفیات میں بڑی بہنوں کی طرح میرا خیال رکھا اور کام کے دوران میرے بے شمار جذباتی مسائل کو حل کیا۔

آخر میں محترمہ سائرہ بتول کا خاص طور پر شکریہ ادا کرتی ہوں جنھوں نے محبت اور توجہ سے میری رہنمائی کی اور بہت سی مشکلات سے نکالا۔یونی ورسٹی کے دیگر اساتذہ کرام میں محترمہ نجیبہ عارف اور محترمہ حمیرا اشفاق کی توجہ آمیز محبت کا بھی بہت شکریہ۔

صفیہ کوثر

۲۴ ستمبر ۲۰۲۰ء

مقدمہ

نئی نئی دنیائیں دیکھنا اور نئی نئی راہیں ڈھونڈنا انسان کی فطرت میں داخل ہے، وہ ایک ہی جگہ دیر تک نہیں رہنا چاہتا، ایسے شخص کے لیے حالات کتنے ہی ناساز کیوں نہ ہوں، اُس کی فطرت کے آگے بند نہیں باندھے جا سکتے۔ یہی بے قراری اس کو نئے شہر آباد کرنے پر اکساتی ہے اور نئے ملک فتح کرنے کی خواہش پیدا کرتی ہے۔ وہ انجانی زمین میں بسنے کا فن سیکھتا ہے، اجنبی لوگوں سے تعلق پیدا کرتا ہے، اُن کی زبان سیکھتا ہے، ان کی ثقافت کو اپناتا ہے، ان سے ہنر حاصل کرتا ہے اور کچھ اپنی باتیں بھی ان کو سکھاتا ہے۔ یہی لین دین دنیا کی ترقی کا باعث بنا، اسی سے تہذیبوں کا پھیلاؤ ہوا اور اسی سے انسان نے جینا سیکھا۔

جس وقت سفر کی سہولتیں نہ ہونے کے برابر تھیں، راستوں کے نقشے تلاش کرنا اور انھیں پڑھنا جوئے شیر لانے کے برابر تھا، ایسی تفریحی مہمات جان لیوا ثابت ہوتی تھیں، اس وقت بھی ایسے من چلے اور متوالے لوگ موجود تھے جنھوں نے اپنا قیمتی سامان بیچ کر زادِ راہ جمع کیا اور گھر بار کو چھوڑ کر انجانی راہ پکڑ لی۔ اس حوالے سے ابنِ بطوطہ کے سفر کی مشکلات اس کے اس بیان سے دیکھی جا سکتی ہیں:

> اس جگہ (صحرا) سے تکشیف بھیجے جاتے ہیں، تکشیف اس شخص کو کہتے ہیں جس کو اہلِ قافلہ اجرت پر اپنے آگے ایوالاتن کو بھیجتے ہیں۔ اس کے ہاتھ اہلِ قافلہ اپنے دوستوں کو خط بھیجتے ہیں کہ وہ ان کے واسطے مکان کا انتظام کر رکھیں اور چار منزل آگے پانی بھیج دیں۔ جس کا دوست وہاں نہیں ہوتا وہ کسی مشہور سخی سوداگر کو لکھ کر بھیج دیتا ہے تو وہ انتظام کر دیتا ہے۔ جب کبھی تکشیف رستہ میں مر جاتا ہے اور منزلِ مقصود تک نہیں پہنچتا تو اہلِ قافلہ یا ان میں سے اکثر مر جاتے ہیں۔[1]

اس سفر میں ابن بطوطہ اور ان کے ہم سفروں نے صحرا کے اس راہنما (تکشیف) کو سو مثقال سونا اجرت کے طور پر ادا کیا تھا، گویا اس زمانے میں سفر نہ صرف زندگی کے لیے خطرناک تھے بلکہ جیب کے لیے بھی خاصے بھاری ثابت ہوتے تھے، کوئی شریف اور سیدھا سادا آدمی اپنے آپ کو ایسی کٹھنائیوں میں ڈالنے کا نہیں سوچ سکتا تھا۔ سفر کی سہولتوں میں اضافہ سے جہاں سیاحت کو فروغ ہوا وہاں دنیا میں سیاسی اور معاشی بدلاؤ بھی پیدا ہوئے۔ پندرھویں صدی عیسوی کو دریافتوں کی صدی کہا جاتا ہے۔ یورپی مہم جوؤں نے بحری جہازوں پر سفر کا آغاز کیا، دنیا کے گرد چکر لگا کر اس کا آخری کنارہ تلاش کرنے کا شوق ہوا، نئے نئے بحری راستوں کی تلاش میں مسابقت پیدا ہوئی اور نئی نئی زمینوں پر اپنے جھنڈے گاڑنے کے نئے دور کی ابتدا ہوئی۔ برطانوی حکومت نے مہم جو افراد کو مدد فراہم کی تاکہ وہ سفر پر نکلیں اور ان

کے لیے کسی دور افتادہ، پوشیدہ زمین میں ان کی چھاؤنی قائم کریں' یوں ان کو کئی گنا بڑھ کر منافع ہوتا۔

اسی زمانے میں پرتگالی جہاز ران واسکوڈے گاما پہلا یورپی تھا جس نے ۱۴۹۷ء میں برصغیر کے ساحلوں پر قدم رکھا۔ اس کے بعد ۱۶۰۰ء میں برطانیہ سے کاروباری کمپنی المعروف "ایسٹ انڈیا کمپنی" نے بھی ہندوستان میں کاروبار کا آغاز کیا، اسّی سال کے عرصے میں اس کمپنی نے ہندوستان میں نہ صرف کاروبار مستحکم کیا بلکہ ۱۶۸۹ء تک علاقے بھی تسخیر کرنا شروع کر دیا۔ بالآخر ۱۸۵۷ء میں ملک برطانوی راجدھانی میں شامل ہو گیا تاہم ۱۸۷۴ء تک کچھ اختیارات کمپنی کے ہاتھ میں رہے۔ قریباً ایک سو پینتیس سال گم رہنے کے بعد ۲۰۱۰ء میں برطانوی نژاد ہندوستانی کاروباری شخص سنجیو مہتا نے ایسٹ انڈیا کمپنی خرید لی۔[2]

سفری سہولتوں اور نئے فاتح ملک کی سیر کی خواہش نے ہندوستان کے بہت سے لوگوں کو اپنا آرام، گھر بار چھوڑ کر یورپ جانے کی تحریک دی۔ ہندوستان سے یورپ جانے والے لوگوں کو کبھی اپنے حکمران کے پاس درخواست گزار ہونے، کبھی کسی قانونی چارہ جوئی اور کبھی سفارتی ضروریات کے تحت جانا پڑا، عوام کے مال دار طبقے کے افراد علاج معالجہ، تعلیم اور کاروبار کے لیے گئے، غریب لوگوں، جانوروں کے رکھوالوں، ہنرمندوں، ملازموں اور مزدوروں کو انگریز اپنی خدمت کے لیے خود ہمراہ لے جاتے اور کوئی دوسرا ان کو وہاں سے اپنے ساتھ واپس لے آتا۔ ان میں سے بہت کم سیاحوں نے اپنے تجربات تحریری صورت میں لکھے۔ بہر حال پھر بھی ہمیں اس دور کی جھلکیاں کبھی خطوں، روزنامچوں، تاثرات اور مضامین کی صورت میں مل جاتی ہیں، اور انھی تحریروں میں سفر نامہ کی صنف کے ابتدائی خدوخال بھی ملتے ہیں۔

ان کی تحریریں گویا ایک تاریخی دستاویز کی شکل اختیار کر لیتی ہیں، اس بات کا احساس خود مصنف کو بھی ہوتا تھا اس لیے اس کی تحریر صرف اپنے دور کے لوگوں کو دُور کے دیسوں کی چونکا دینے والی داستان ہی نہیں سناتی بلکہ مستقبل میں آنے والوں کے لیے اپنے چشم دید واقعات، معدوم اشیا کی تصاویر اور پرانے علاقوں کے ماضی کی لفظی منظر کشی کو بھی محفوظ کرتی ہے۔

> سفر نامہ اپنے عہد کی تہذیبی تاریخ کا نام ہے۔ اس میں زندگی اور ادب کا ایک اچھا آرٹ چھپا ہوتا ہے۔[3]

اسی بات کو پروفیسر علی احمد فاطمی نے قدرے مفصل اور مکمل انداز میں یوں بیان کیا ہے:

> سفر نامہ میں بس ریل جہاز یا مسافروں کا بیان کافی نہیں' دعوت مدارت، ملاقات وغیرہ بھی محض حوالہ ہیں۔ قاری تو اس سے آگے کی چیز جاننا چاہتا ہے اور وہ ہے کہ جس ملک کا سفر ہے اور جس مقام کی فضا پیش کی جا رہی ہے وہاں کی تاریخ و تہذیب، ثقافت و معاشرت، رہن سہن بود و رہائش، رسم رواج

غرض کہ پورا انسانی معاشرہ اور اس معاشرے کے بطن سے جنم لیتی ہوئی انسانی نفسیات اور طرز فکر۔ یعنی انسان اور انسانیت، معاشرہ اور معاشرت اس کے مرکز و محور ہیں۔ باقی ہے پیش کرنے کا انداز اور اسلوب، دلکش فضا، موسم، ماحول، اخلاق و آداب۔ ان عناصر کے تحت عام طور پر مصنف خارجی عناصر کو زیادہ پیش کرتا ہے اور یہ خودی بھی ہے لیکن ساتھ ہی مصنف کی داخلیت بھی اس میں شامل رہتی ہے جو فطری ہے لیکن وہ لاشعوری عمل میں دکھائی دے تو بہتر ہے۔ [4]

اسی حوالے سے دیکھیے کچھ اور مصنفین کی آرا:

ایک کامیاب سفر نامہ وہ ہوتا ہے جو صرف ساکت و جامد فطرت کا عکاس نہ ہو بلکہ لمحہ رواں میں آنکھ، زبان اور احساس سے ٹکرانے والی ہر شے نظر میں سماجانے والی ہو۔ تماشا نغمہ و نکہت کا ہر صوت و رنگ لفظوں کی امیجری میں جمع ہو کر بیان کو موقع بہاراں بنادے اور قاری ان مثالوں کے اندر جذب ہو کر خود کو اس مرکب آئینہ گری کا حصہ بنالے۔ [5]

سفر نامہ میں حرکت اور زندگی کا احساس بہت ضروری ہے ورنہ وہ کسی پینٹنگ جیسا لگے گا اور قاری کو سفر کی رنگ بدلتی کیفیات سے محروم رکھے گا۔

روائتی سفر نامہ ہمیں مقاماتِ سفر سے متعارف کرتا ہے اور غیر روائتی سفر کیفیتِ سفر سے مقاماتِ سفر کی تفصیل لکھنے والا زمان و مکان کا اسیر ہوتا ہے۔ جب کہ کیفیتِ سفر قلم بند کرنے والا زمان و مکان سے ہٹ کر بھی سوچتا ہے اور یہ ہی چیز اس کے سفر نامے کو معلومات کا گنجینہ بننے سے بچاتی ہے اور اس کا رشتہ ادب سے قائم کرتی ہے۔ [6]

مصنف کے دل کی باتیں، اس کے تاثرات اور وارداتِ قلبی کا ادبی اظہار سفر نامے کو ممتاز حیثیت عطا کرتا ہے۔ مزید دیکھیے کہ سفر نامہ ایک ایسی رپورتاژ ہے جو تخلیقی سطح پر حکم بند کیا جاتا ہے اور اس میں قاری صرف ان مقامات ہی کی سیر نہیں کرتا جہاں سیاح کا گزر ہوتا تھا اور نہ صرف ان لوگوں سے متعارف ہوتا ہے جن سے سیاح کو واسطہ پیش آیا تھا بلکہ وہ سیاح کے اندر، من کی بھی سیر کرتا ہے اور اس کی ذات کے ایسے گوشوں تک اس کی رسائی ہوتی ہے جہاں عام حالات میں شاید نہ پہنچ سکتا ہے۔ [7]

سفر نامہ سیاح کی ذات اور شخصیت کا غماز ہوتا ہے، سفر کی روداد ایک ایسا جادوئی آئینہ ہے جس میں ہمیں مصنف کے دیکھے ہوئے نظارے بھی دکھائی دیتے ہیں، اس کی ذہنی اور جذباتی دنیا بھی نظر آتی ہے اور واقعات پر اس کی آرا اور تبصرے بھی منظر میں گھلتے ملتے رہتے ہیں۔

سفر نامہ نگاری کی روایت:

سفر اور سیر و سیاحت پر آمد و رفت کے ذرائع کا اثر مسلم ہے۔ اس حوالے سے انیسویں صدی کی ابتدا کا زمانہ بر صغیر میں سیر و سیاحت اور یورپ کے سفر کا زمانہ تھا۔ اس دور میں بہت سے مسافروں نے اپنے تاثرات اور تجربات تحریری صورت میں چھوڑے ہیں۔ کئی سیاحوں نے فارسی زبان کو اپنے اظہار کا ذریعہ بنایا۔ جب انگریزوں نے اردو کو اظہار کے لیے پسند کیا اور چھاپہ خانے قائم کیے تو اردو میں بھی سفر نامے لکھے جانے لگے۔ سفر نامہ نگاری کے ادوار کے حوالے سے محمد اکرام چغتائی کہتے ہیں کہ اگر برِ صغیر کے حوالے سے سفر نامہ نگاری کے مختلف ارتقائی مراحل کا جائزہ لیا جائے تو اٹھارویں اور انیسویں صدی کے فارسی اور اردو سفر ناموں کو بلاشبہ دورِ اوّلین میں جگہ دی جاسکتی ہے، بیسویں صدی کے آغاز سے تشکیلِ پاکستان تک جو سفر نامے لکھے گئے انھیں وسطی دور کا حصہ قرار دیا جاسکتا ہے اور اب چند برسوں سے اردو ادب میں سفر نامہ کو جو مقبولیت حاصل ہوئی ہے اور وہ ایک نمایاں صنفِ ادب کی حیثیت اختیار کر گیا ہے، اس کے پیشِ نظر اسے اردو سفر نامہ نگاری کا دورِ جدید کہا جاسکتا ہے۔ سفر نامہ نگاری کے یہ تینوں ادوار اپنے اپنے عہد کے اجتماعی رجحانات اور شخصی میلانات کی بھرپور عکاسی کرتے ہیں اور انہی کو مدِ نظر رکھتے ہوئے ان سفر ناموں کے ادوار کے مابین حدِّ فاصل کھینچی جاسکتی ہے۔[8]

اس دور میں لکھا جانے والا یوسف خان کمبل پوش کا سفر نامہ عجائباتِ فرنگ قابلِ ذکر ہے جس کو اردو کا پہلا سفر نامہ کہا جاتا ہے۔ اس میں اِس سے پہلے لکھے جانے والے عربی، فارسی سفر ناموں کے اثرات بھی ہیں اور بعد میں لکھے جانے والے سفر ناموں کے لیے نئی راہوں کے نشان بھی ملتے ہیں۔

سفر نامے کی ابتدا انیسویں صدی کے نصف اوّل میں عجائباتِ فرنگ سے ہو چکی تھی۔[9]

بر صغیر میں سفر کرنے کی روایت مسلمانوں کی یہاں آمد کے بعد ہی پڑی۔ یہاں کے لوگ سمندر پار جانا گناہ سمجھتے تھے۔ جس زمانے میں دنیا نئی راہیں دریافت کر رہی تھی، بر صغیر اپنے تمام تر وسائل اور دولت کے باوجود کسی کولمبس کا منتظر تھا۔ ادھر سے کوئی کم مہم جو ایسا نہیں جس کا نام ابنِ بطوطہ یا مارکوپولو کے ساتھ لیا جاسکے۔ اس کی وجہ تحسین فراقی کو یہاں کے لوگوں کے مذہب میں نظر آتی ہے:

> دراصل ہندو کلچر سیاح اور سیاحت نگار پیدا ہی نہیں کر سکتا کہ ہندو دھرم ایک زمین پیوستہ کلچر ہے اور اس میں سمندر پار جانے کی ممانعت کی گئی ہے۔[10]

اس دور کے سفر ناموں میں مقامات سفر کے بارے میں مفصل بیان ملتا ہے اعداد و شمار اور سیاسی حالات بھی

تحریر کیے گئے ہیں اور دوسری دنیا کے حالات کو جگہ جگہ ہندوستان کے حالات کے ساتھ موازنے کی صورت میں بھی پیش کیا گیا معاشرتی حالات اور لوگوں کے رویے بھی بیان کیے گئے ہیں جیسا کہ عجائبات فرنگ میں مصنف لکھتے ہیں۔

> راجہ ہائے ہندوستان شامتِ اعمال اپنے سے محکوم انگریزوں کے ہوئے۔ ورنہ کیا مجال کہ ایسا ملک وسیع الفضا انگریز فوجِ قلیل سے لے سکتے۔ یقین کہ انہی حرکتوں سے ہمیشہ فرمان رواوروں کے رہیں، ظلم و جبر غیروں کے اپنے اوپر سہیں۔ [11]

سیاحت اور سفر نامہ نگاری کے حوالے سے ڈاکٹر ثروت کی تحقیق کے کچھ نتائج پیش کرتی ہوں، وہ بیان کرتی ہیں کہ ابو طالب سے بیس پچیس سال قبل بنگال کے انعام الدین نامی ایک شخص نے پہلی بار انگلستان کی سیاحت کی تھی۔ ان کا سفر نامہ ''شگرف نامہ ولایت'' کے نام سے موجود ہے جو بہت مختصر ہے اور اس سے خاطر خواہ معلومات حاصل نہیں ہوتی ہیں تاہم اس کو پہلا ہندوستانی سیاح کہا جاتا ہے جس نے انگلستان کا سفر کیا۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ ہندوستان کا پہلا سیاح ابو طالب تھا جس نے انگلستان کے تعلیمی ''سماجی، سیاسی اور صنعتی حالات پر بڑی تفصیل سے روشنی ڈالی ہے۔ اس نے انگلینڈ کے علاوہ جنوبی افریقہ، آئرلینڈ، فرانس، اٹلی، یونان، ترکی اور عراق عرب کی سیاحت بھی کی اور ہر جگہ کے حالات کا جائزہ لیا۔ اس کا سفر نامہ انیسویں صدی کے بہترین سفر ناموں میں شمار کیا جاتا ہے۔ [12]

> ابو طالب کا سفر نامہ فرنگ ایک طویل سفر کی مفصل روداد ہے۔ مصنف نے اسے فارسی زبانی میں تحریر کیا تھا۔ بعد ازاں اس کے انگریزی سمیت دیگر زبانوں میں تراجم ہوئے۔ اس میں داستان سفر کے مرحلہ وار عنوانات قائم کیے گئے ہیں اور یہ دو حصوں میں منقسم کتاب ہے جو قریباً ساڑھے تین سو کے قریب صفحات پر مشتمل ہے۔ اس کے سفر کا آغاز ۷ فروری ۱۷۹۹ء کو ہوا۔ [13]

کچھ ہندو سیاحوں نے بھی سفر نامہ لکھے، ان کی سیاحت کی جھلک ان کے الفاظ کے آئینے میں کچھ ایسی دکھائی دیتی ہے:

> میں مدت سے اس بات کا قائل ہوں کہ ہندوستان کی بہتری اور ترقی کے اسباب میں سے ایک بڑا سبب یہ بھی ہے کہ ہندوستانی سیاحت یا تجارت یا دیگر وسائل کسب معاش یا حصول تعلیم و تجربہ کے لیے ہندوستان سے باہر نکل کر دینا کے دیگر ممالک کا سفر کریں۔ خصوصاً دنیا کے ان مہذب حصوں کا کہ جہاں کی قومیں علوم و فنون میں ہم سے بہت آگے بڑھی ہوئی ہیں تاکہ وہاں سے کچھ دیکھ کر اور سیکھ کر آئیں اور اپنے ہم وطنوں کو اپنے تجربات سے مستفید کریں۔ [14]

سفر کو اسی لیے وسیلہ ظفر سمجھا جاتا ہے کہ اس سے انسان کے مشاہدات اور تجربات میں بہت اضافہ ہوتا ہے اور خیالات میں وسعت در آتی ہے۔

ڈاکٹر معین الدین عقیل اردو سفر نامہ کی روایت کے بارے میں کہتے ہیں کہ اردو میں تحریر کیے ہوئے سفر ناموں میں سے بعض بہت معیاری، دلچسپ اور معلوماتی ہیں۔ جن سفر نامہ نویسوں نے انیسویں صدی اور بیسویں صدی کے اوائل میں ایسے سفر نامے تحریر کیے، ان میں منشی برج باسی لال کا سیرِ دکن علی بخش کا سفرِ دکن، کشن پرشاد کا سیر و سفر صغرا ہمایوں مرزا کا "سیاحتِ جنوبی ہند" وغیرہ کے نام ممتاز ہیں۔ لیکن اس وقت تک اردو میں سفر نامہ نگاری کی روایت بہت مستحکم نہ ہوئی تھی اور جو سفر نامے اس وقت تک لکھے گئے تھے ان کی ایک بڑی تعداد ایسے سفر ناموں پر مشتمل ہے جو غیر ممالک کے حالات سفر اور مشاہدات پر مبنی تھے۔ ایسے سفر نامے زیادہ تر انگلستان و یورپ یا بلادِ اسلامیہ و حجاز سے تعلق رکھتے ہیں۔ [15]

معلومات کو محفوظ کرنے اور یاداشتوں کو بانٹنے کی غرض سے لکھے جانے والی سفر کی ڈائریاں اور تاثرات میں ہی سفر نامہ کے ابتدائی نقوش ملتے ہیں۔

> اردو میں سفر کے احوال کو قلم بند کرنے کی روایت لگ بھگ ایک سو ستر سال پرانی ہے۔ یوسف خان کمبل پوش کا سفر نامہ عجائبات فرنگ یا تاریخ یوسفی اس روایت کا نقطۂ آغاز ہے۔ محققین و مورخینِ ادب کی اکثریت اسے اردو کا پہلو سفر نامہ قرار دیتی ہے، کمبل پوش کے سفر نامے کی اشاعت (۱۸۴۷ء) کے ٹھیک سات سال بعد (۱۸۵۴ء) منشی امین چند کا سفر نامہ اشاعت پذیر ہوا۔ یہ سفر نامہ ہندوستان کے مختلف علاقوں کی سیاحت کے احوال پر مشتمل ہے۔ [16]

ضروری نہیں کہ سفر نامہ ملک سے باہر کے سفر پر ہی مشتمل ہو، ہندوستان ایک وسیع و عریض ملک تھا ،سیاحوں نے اپنے سفر کا احوال لکھا اور ایسی تحریریں بھی مقبول ہوئیں۔ منشی امین چند کا یہ سفر نامہ اپنے مندرجات، اسلوب و انداز اور تاریخی جغرافیائی معلومات کے اعتبار سے خاصے کی چیز ہے۔ انیسویں صدی کے ہندوستان کے ایک بڑے حصے کی تاریخی، سماجی اور علمی منظر نامے کی ایک روشن اور اجلی تصویر پیش کرتا ہے۔ [17]

اپنی تاریخ اور ماضی کے قصے کسی افسانے کی طرح دلچسپ لگتے ہیں اور دنیا کے تیزی سے بدلتے منظر نامے میں ایسی تحریروں سے تاریخ کا سچا اور کھرا نقشہ دکھائی دیتا ہے۔

سفر نامے کے موضوعات:

اس زمانے میں سفر ناموں میں ان تمام معلومات کا تفصیلی اور لفظی ذکر ضروری بھی تھا کیوں کہ ملکوں اور علاقوں کے بارے میں معلومات کا اس کے علاوہ اور کوئی ذریعہ نہیں تھا۔ سفر نامہ نگار بہت کوشش سے اس ملک کے بارے میں مختلف معلومات حاصل کیا کرتے تھے۔

عدالت اور سزاؤں کے بارے میں تفصیلی معلومات اور شرح پیدائش و اموات کے بارے میں بھی معلومات فراہم کرنے کو غیر ضروری نہیں سمجھا جاتا تھا، مثال دیکھیے:

> ۱۹۲۸ء میں برطانیہ میں کئی پیدائشیں اور اموات ہوئیں۔ رجسٹرار جنرل کی ایک رپورٹ پیپل (لندن) میں شائع ہوئی جس سے معلوم ہوتا ہے کہ اس سال میں ۲۹۷۰۲ بچے ایسے پیدا ہوئے کہ جن کو حرام کے بچے کہا جاتا ہے۔"[18]

کسی دوسرے ملک کے رہنے والوں کی زندگی کا ہر گوشہ کسی اجنبی کے لیے دلچسپ ہوتا ہے، ان کا کھانا پینا، رہنا سہنا، پسند ناپسند، پکانے کا طریقہ، کام کرنے کا انداز۔۔۔ غرض ہر بات کو قارئین جاننا چاہتے ہیں، مسافروں سے اس حوالے سے طرح طرح کے سوال پوچھے جاتے ہیں جن کے جواب سفر نامہ نگار اپنی تحریر میں پیش کرتا ہے۔ ولایت کے لوگوں کی زندگی یوں تقسیم ہوئی معلوم ہوتی ہے، ۸ گھنٹے کام، ۸ گھنٹے تفریح اور 8 گھنٹے نیند۔ ۱۲ بجے سو کر سات آٹھ بجے چند ضروریات سے فارغ ہو کر کھا پی کر ۹ بجے کام میں لگ جانا۔ یہاں کاروبار کم و بیش ۹ بجے سے شروع ہو کر ۶ بجے تک جاری رہتا ہے۔ بیچ میں کئی جگہ تو ۱۲ بجے سے ۲ بجے تک کام بالکل نہیں ہوتا۔[19]

مولانا محمد علی جوہر اپنی بیگم کے نام خط میں اپنے لندن میں قیام کے دوران اپنی صحت کے حالات یوں لکھتے ہیں:

> اس ڈاکٹر کا خیال ہے کہ کھانے کی چیزیں غلط طور پر ملائی جاتی ہیں اس لیے ہاضمہ میں خرابی ہوتی ہے۔ دوسرے قدرتی چیزیں اللہ کی بنی ہوئی کم کھائی جاتی ہیں، انسان کی بتائی ہوئی چیزیں زیادہ کھائی جاتی ہیں جن سے ہاضمہ خراب ہوتا ہے اور امراض پیدا ہوتے رہتے ہیں اور علاج بھی مشکل ہو جاتا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ شہد کھاؤ خدا نے بنایا ہے، شکر مت کھاؤ اسے انسان نے خراب کر دیا ہے۔ گنا کھاؤ تو مضائقہ نہیں۔ روٹی انسان کی بنائی ہوئی ہے اگر کھاویں تو کم اور بھوسی سمیت۔ زیادہ گوشت اچھا نہیں ترکاریاں اچھی ہیں لیکن سلاد (جو کچا کھانا ہوتا ہے) بہتر ہے، دوا کا وہ بالکل قائل نہیں۔[20]

قاضی عبدالغفار ۱۹۲۴ء میں لندن کے بارے میں کیا کیا جانتے تھے:

مجھے معلوم تھا کہ لندن کا رقبہ معہ ملحقات ۷۰۰ مربع میل ہے اور اس کی آبادی ۷۲ لاکھ کے قریب ہے۔[21]

انیسویں صدی کے آخری حصے میں سفر نامہ نگار کے لیے ہر میدان میں معلومات جمع کرنا اہمیت رکھتا تھا، اس سلسلے میں اردو کے ابتدائی دور کی تحریروں میں مصنفین نے سفر کی سرگزشت کو کسی تحقیقی مضمون جیسی وسعت اور توجہ دی تھی، گل گشتِ فرنگ کا یہ حصّہ دیکھیے:

> لندن کے بیچ کے حصے کو جو کہ تجارت اور کام کا مرکز ہے "شہر" کہتے ہیں۔ دن کے دس بجے سے رات گئے تک بڑا اژدحام رہتا ہے۔ بنک انگلستان اور اسٹاک ایکس چینج قابلِ دید مقام ہیں۔ یہاں لاکھوں روپیہ کا روز بیج (سودا، کاروبار) ہوتا ہے۔ مالی کاموں کو اس قدر ترقی ہوئی ہے کہ بطور ایک علم کے ہو گئے ہیں۔ روپیہ پیدا کرنے میں انگریزوں کو کمال ہے لندن میں بعض بعض ایسی دوکانیں ہیں جہاں رہن اور گروی کا کام ہوتا ہے۔ ہر قسم کے کام کے دفتر ہیں، اشتہارات کے دفتر میں سستی اور پرانی کباڑ کی چیزوں کی دکانیں ہیں۔ بیمہ کمپنیوں کی کچھ انتہا ہی نہیں۔ جان، اسباب، مکانات، دوکانات سب کا بیمہ ہوتا ہے اور ہر قسم کے ہرجے (نقصان) قبول کیے جاتے ہیں۔ چاہے ایک اسٹیشن تک ریل میں بیٹھنے کا جان کا بیمہ کرا لیجیے اگر کوئی حادثہ ہو جائے تو کمپنی آپ کو یا آپ کے وارثوں کو مقررہ رقم دے دے گی۔ قریب قریب ہر انگریز اپنی جان کا بیمہ کراتا ہے۔[22]

اسی زمانے میں سر سیّد احمد خان نے بھی لندن کا سفر کیا، ان کی آنکھ نے وہاں کی زندگی کو کچھ اس نظر سے دیکھا اور بولے کہ تمام خوبیاں دینی اور دنیوی جو انسان میں ہونی چاہیں وہ خدا تعالیٰ نے یورپ کو اور اس میں بالتخصیص انگلینڈ کو مرحمت فرمائی ہیں۔ دینی خوبیوں سے میرا مطلب یہ ہے کہ جس دین کو وہ لوگ سمجھتے ہیں ایسی خوب صورتی اور ایسی عمدگی سے اس کے تمام متعلقات کو پورا کرتے ہیں اور انجام دیتے ہیں کہ کسی ملک میں اور کوئی مذہب والے اس خوبی و خوش اسلوبی و سلیقے سے نہیں کرتے، یہ تمام نتیجہ پہلے زن و مرد کے عموماً تعلیم یافتہ ہونے کا اور تمام قوم کا ان امور کی طرف متوجہ ہونے کا۔[23]

ڈاکٹر ثروت علی کے الفاظ دیکھیے جن میں ہمیں یورپی اقوام کی طرف سے کسی ہندوستانی (ابو طالب، سفرنامہ فرنگ) کے لیے اچھے استقبال کی جھلک نظر آتی ہے:

> جب وہ انگلستان پہنچا تو ہاتھوں ہاتھ لیا گیا۔ بادشاہ انگلستان پر اس کا پرتپاک خیر مقدم کیا، شاہی محل میں اس کی دعوت کی انعام و اکرام سے نوازا، وزرا اور پارلیمنٹ کے ممبروں نے اس کو سر آنکھوں پہ بٹھایا۔ فرانس پہنچا تو نپولین نے اس سے ملنے کی خواہش ظاہر کی۔ ترکی میں شاہی مہمان ہوا۔ جب استنبول پہنچا

توانگلستان کے سفیر نے جہاز سے اترتے وقت اپنی طرف سے توپوں کی سلامی دی۔[24]

جبلی طور پر انسان سفر کا شوقین ہے وہ طویل عرصہ ایک ہی جگہ پر رہنے سے اکتا جاتا ہے۔ زندگی میں ترقی کی خواہش، آگے بڑھنے کا جذبہ، پہاڑوں کی تسخیر کی صلاحیت انسان کو کشاں کشاں وطن سے دور لے جاتی ہے۔ وطن کی محبت کتنی ہی ہمارے خون میں رچی بسی ہو، تسخیر اور ان دیکھے کو دیکھنے کی خواہش اس پر غالب آہی جاتی ہے۔ پھر انسان اپنے گھر کے گوشے میں کتنی ہی پر سکون اور مطمئن زندگی گزار رہا ہو۔ گھر کے افراد کے ساتھ کتنا ہی تکمیل کا احساس ہو، ایک دن اس کے اندر کا مہم جو اس کی کسی سفر پر لے ہی جاتا ہے۔ سفر انسان کے لیے نئے امکانات کا در کھولتا ہے، اس کا ذہن اور شعور نئی باتوں سے نمٹنے اور نئے حالات کو قبول کرنے پر آمادہ ہو جاتا ہے۔ سفر کے دوران وہ ایسے ایسے کام بھی کر گزرتا ہے جن کے بارے میں اس نے کبھی خواب میں بھی نہ سوچا تھا۔۔۔ اور نتیجتاً اس کو انوکھے واقعات اور انوکھی صورت حال سے گزرنے کا دل خوش کن تجربہ حاصل ہوتا ہے جس کے لیے عام آدمی ترستا رہتا ہے۔ انسان کو اصل خوشی ملتی ہے اور جب وہ وطن کی طرف واپس آتا ہے، کیوں کہ سراجیت بھی انسان کی جبلت ہے، تو یہاں وہ دوسرے سفر کا تجربہ کرتا ہے: اپنے ذہن اور یاداشتوں ساتھ دوبارہ ان علاقوں اور ان جگہوں کی سیر کرتا ہے۔ اپنے خیال میں ان لوگوں سے پھر سے ملتا ہے جن سے وہ سفر کے دوران ملا تھا۔ اس کے اندر خواہش ابھرتی ہے کہ وہ یہ تمام تجربات دنیا کے سامنے لے آئے۔ یہ خواہش اس سے ان تمام وارداتوں کا احوال لکھواتی ہے۔ وہ اپنے دل کی دنیا میں پھر سے سفر پر نکلتا ہے اور جہاں چاہتا ہے رک جاتا ہے اور ایک ایک لمحے اور ایک ایک جذبے کو دیر تک اپنے قلب پر محسوس کرتا ہے۔ پھر اس تاثر کو صفحہ پر اتارتا ہے۔ یوں کہ قاری بھی محسوس کرنے لگتا ہے کہ اس نے مصنف کے ساتھ ان دیکھی دنیاؤں کو دیکھا ہے مصنف کے دوست گویا قاری کے بھی دوست بن جاتے ہیں اور مصنف کی مشکلات قاری کے دل میں بھی ہمدردی کا جذبہ پیدا کرتی ہیں۔ مصنف کا تحیّر قاری میں بھی تحیّر پیدا کرتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ سفر نامہ جو محض تاثرات کی تحریر ہے، پڑھنے والوں میں مقبول ہوئی۔ اس حوالے سے ڈاکٹر سید عبداللہ کی بات بالکل بجا ہے کہ:

> ایک کامیاب سفر نامہ وہ ہوتا ہے جو صرف ساکت و جامد فطرت کا عکاس نہ ہو سکے لمحہ رواں میں آنکھ، زبان اور احساس سے ٹکرانے والی ہر شے نظر میں سما جانے والی ہو۔ تماشا نغمہ و نکہت کا ہر صوت و رنگ لفظوں کی امیجری میں جمع ہو کر بیان کو موقع بہاراں بنا دے اور قاری ان مثالوں کے اندر جذب ہو کر خود کو اس مرکب آئینہ گری کا حصہ بنا لے۔[25]

سفر نامہ لکھنے کے لیے مصنفین کئی طریقے اختیار کرتے ہیں۔ سیاحت کے دوران حالات سفر اپنی ڈائری میں تاریخ وار رقم کرتے ہیں، پھر کتابی صورت میں روداد سفر مرتب کرتے ہوئے بھی یہی طریقہ کار اختیار کیا جاتا ہے جسے

روزنامچہ کہتے ہیں۔اس طریق میں سیاح کا ہر دن قاری کے ساتھ گزرتا ہے اور قاری جہاں داستان سفر کے مزے لیتا ہے وہاں مصنف کو درپیش مشکلات کے حل کے لیے بھی فکر مند ہوتا ہے اور مصنف جس طرح اپنی زندگی کا برتائو دکھتا ہے، مشکلات سے نبرد آزما ہوتا ہے، مصائب سے نکلنے کے لیے ہاتھ پاؤں مارتا ہے۔۔۔یہ تمام باتیں بھی قاری سکیھتا چلا جاتا ہے حتیٰ کہ سفر نامہ پڑھنے کے بعد وہ محسوس کرنے لگتا ہے کہ وہ اکیلا مصنف کے نقش قدم پر چلتے چلتے یہ سفر کر سکتا ہے اور مشکلات سے نمٹ سکتا ہے۔ڈائری اور روزنامچے کی صورت میں کئی سفر نامے اردو ادب میں موجود ہیں۔

دوسرا طریقہ جو سفر نامہ لکھنے کے لیے اختیار کیا گیا وہ ہے خطوط کی صورت میں۔سیاحت کے دوران اپنے چند دنوں کا احوال لکھ کر بھیجا جاتا ہے۔مکتوب الیہ کبھی مصنف کے اہل خانہ یا دوست ہوتے ہیں اور کبھی وہ یہ نامے اخبارات کو روانہ کرتا ہے جو اس کی ان تحریروں کو ہفتہ وار یا پندرہ روزہ یا ماہانہ چھاپتے ہیں اور یوں سفر کی مکمل روداد خطوں کی صورت میں سامنے آجاتی ہے جس کو مصنف بعد ازاں کتابی صورت میں مرتب کر لیتا ہے۔خطوط کی صورت میں عمدہ سفر نامہ بھی منظر عام پر آسکتا ہے۔دراصل اس میں اس بات کو بھی ملحوظ رکھنا پڑتا ہے کہ مصنف وہ خطوط کس کو لکھ رہا ہے۔اسی مناسبت سے اس کی تحریر میں تکلف یا بے تکلفی، تفصیل یا اختصار اور شوق پایا جاتا ہے۔خطوط کی صورت میں بہت سی اضافی باتیں بھی شامل ہو جاتی ہیں جن کا بعض اوقات قاری کے لیے سمجھنا مشکل ہوتا ہے۔ایسی باتوں کو نکالنا پڑتا ہے یا اس کے لیے حواشی لکھنے پڑتے ہیں۔

رپورتاژ یعنی رپورٹ نگاری بھی سفر نامے کی مقبول صنف ہے۔اس کے تحت مصنف اپنے سفر کے حالات تفصیل سے بیان کرتا ہے اور تمام باتیں اسی کی مناسبت سے بتاتا ہے جہاں وہ خارجی حالات کی تصویر کشی کرتا ہے وہ اپنے داخلی تاثرات اور اپنی رائے کا بے لاگ اظہار بھی کرتا جاتا ہے۔گویا قاری کو واقعات اور حالات مصنف کے نقطۂ نظر سے دیکھنے کا موقع ملتا ہے وہ مصنف کی سیاحت کی رپورٹس پڑھتا ہے اور حالات پر مصنف کے قلبی جذبات کو بھی محسوس کرتا ہے۔اردو ادب میں بہت سے سفر نامے اسی صنف میں لکھے گئے۔سفر نامے کو رپورتاژ سے الگ کرنا ذرا دقت طلب کام ہے۔

خطوط کی صورت میں بھی سفر نامے لکھے جاتے تھے۔اس کی موجودہ شکل اخبار میں کالم یا روزنامچہ کی شکل میں قسط وار چھپنے والے سفر نامے ہیں۔

> خطوط کی بے ربطی خصوصی تاثر کو زائل کر دیتی ہے۔چناں چہ ڈائری میں تخلیقی عمل بے ساختہ اترتا ہے
> لیکن خطوط میں آرائش اور تخلیق مکرر کا وافر عنصر موجود نظر آتا ہے۔ان سب کے باوجود چوں کہ ڈائری

کی طرح خطوط دوران سفر لکھے جاتے ہیں۔اس لیے ان کے تاثر میں صداقت کا عنصر موجود ہے اور قاری انھیں دلچسپی سے بڑھتا ہے۔[26]

تکنیک کوئی بھی ہو، اچھا سفر نامہ وہ ہوتا ہے جس میں سیاح کے سامنے موجود منظر قاری کے دل پر نقش ہو جائے اور عام واقعات یادگار قصے بن جائیں۔ نقطۂ نظر کی وسعت، قلب و نظر کی گہرائی اور مشاہدے کی باریک طاقت ایک ایک سطر سے جھلکے۔ تحریر میں روانی اور شگفتگی گھلے ملے ہوئے ہوں۔ تخلیقی جوہر ایک ایک لفظ سے پھوٹے، یہ بیانیہ تحریر کسی فلم کی طرح آنکھوں کے سامنے چلتی ہوئی نظر آئے تو وہ سفر نامہ قاری کو ہمیشہ یاد رہتا ہے۔

اچھا سفر نامہ وہ ہے جس میں داستان کی سی داستان طرازی، ناول کی سی فسانہ سازی، ڈرامہ کی سی منظر کشی، کچھ آپ بیتی کا مسافر، کچھ جگ بیتی کا سالطف اور پھر سفر کرنے والا جزو تماشا ہو کر اپنے تاثرات کو اس طرح پیش کرے کہ اس کی تحریر پر لطف بھی ہو اور معلومات افزا بھی۔[27]

یہ ایک حقیقت ہے کہ اگر سفر نامہ لکھنا ہے تو اس کا مقصد ذاتی معلومات کو عام کرنا، اپنے تجربات و مشاہدات کو دوسروں تک پہنچانا ساتھ ہی ساتھ اپنے جذبہ اظہار کی تسکین بھی کرنا چاہتا ہے اور اکثر اوقات وہ جو کچھ اپنی ذات کے لیے کرنا چاہتا ہے وہ پھیل کر سفر ناموں کے ذریعہ عام انسانوں سے متعلق ہو جاتا ہے۔[28]

یورپ کے تاثرات جو پچیس مصنفین کے مختلف اوقات میں لیے گئے سفر یورپ کی یاداشتیں ہیں، بجا معنوں میں تاثرات کی سرخی کے تحت جمع کیے گئے ہیں۔ان کو سفر نامے یا رپورتاژ کے ذیل میں جمع نہیں کیا جاسکتا کیوں کہ یہ مضامین محدود اور مقصدیت کے حامل ہیں۔ان میں مرتب بدالدین شکیب کا نقطۂ نظر گھلا ہوا ملتا ہے۔ان کے ہی سوالوں کے جوابات میں یہ تاثرات سامنے آئے ہیں۔

حیدرآباد دکن اور سیاحت:

کہا جا سکتا ہے کہ ان شخصیات میں سے کوئی بھی گم نام اور کم اہم نام نہیں۔ قیام پاکستان کے فوراً بعد نئے ملک کو سنبھالنے کی جو بحرانی کیفیت ہوئی اس میں ان نوجوان میں سے اکثر نے اتنی خدمات پیش کیں اور کئی ایک کو حکومت پاکستان نے خود دعوت دی۔

اس حوالے سے مجھے نظریاتی مملکت کا درست مفہوم بھی سمجھنے میں آسانی ہوئی کہ اسلام کے ناطے سے حیدر آباد دکن کی ان ذہین اور بڑی شخصیات نے پاکستان میں آنا قبول کیا۔ مذہب کی طاقت نے حیدر آباد دکن مسئلے مسلمانوں کے دل میں پاکستان جیسی دور دراز سرزمین کے لیے بھی حب الوطنی کا جذبہ بیدار کیا۔

فنِ تدوین کی اہمیت:

دنیا کی تمام بڑی زبانوں میں ادب تخلیق کیا گیا کیوں کہ ادب انسان کی سب سے پہلی تفریح تھی۔ انسان کے دماغ میں خیال کا پیدا ہونا یا سوچنے کی صلاحیت ہی دراصل ادب ہے چاہے وہ اس کو کتنی ہی مدّت کے بعد کہنے یا لکھنے کے قابل ہوا ہو۔ شاید ہی کوئی وقت ہو جب دُنیا ادب کی تخلیق سے خالی ہو۔

انسان صرف ایک جسم نہیں، وہ تو جذبات، احساسات اور تصوّرات کا ایک مجموعہ ہے، یہ تمام واردات اور تجربات ایک روایت کا درجہ رکھتے ہیں جس کا محفوظ رکھنا نوعِ انسانی کے لیے مفید اور اہم ہے، اس نے والدین کا درجہ ملتے ہی روایت کی منتقلی کے بارے میں سوچا ہوگا، اسی مقصد کو وسیع تر انداز میں ادب نے پورا کیا کیوں کہ ایک نسل کے خیالات، تجربات اور جذبات ادب کے ذریعے ہی اگلی نسل تک پہنچتے ہیں گویا ادب تفریح کے ساتھ ساتھ روایت کو محفوظ رکھنے کا بھی اہم ذریعہ ہے لیکن یہ مقاصد اسی وقت حاصل کیے جا سکتے ہیں جب ہم ادب پاروں کو اپنے زمانے میں پھیلانے اور شائع کرنے کے ساتھ ساتھ آنے والے زمانوں میں بھی اس کی دستیابی کو ممکن بنا سکیں، اسی لیے تخلیق کے متوازی تدوین کا فن بھی اہمیت کا حامل ہے۔

دنیا کے بڑے بڑے مصنفین اور ان کے مشہور شاہ پارے فنِ تدوین کی بدولت ہی منظر عام پر آئے ہیں۔ اسی کی وجہ سے آج ہم حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی پیدائش سے بھی دو تین سو سال پہلے یونان میں سوچے جانے والے خیال سے واقف ہوئے اور ادب کو محفوظ رکھنا صرف تفریح کے لیے ہی ضروری نہیں بلکہ ادب کے ارتقاء کے لیے بھی بہت ضروری ہے آج کے دور میں پیدا ہونے والا ڈرامہ نگار محض اپنے خیالات اور معاشرتی مسائل کو ہی بیان نہیں کرتا بلکہ ڈرامے کے فن بھی گرفت رکھتا ہے۔ فن ڈرامہ نگاری پر اس کا یہ عبور اس کو شیکسپیئر کا بھی احسان مند بناتا ہے۔ انسان ہمیشہ پچھلی نسل کی بنیادوں پر اپنی عمارت تعمیر کرتا ہے۔ آج ادب کے میدان میں جو بھی کہا جائے گا وہ پوری دنیا کے پہلے سے موجود ادب کا مرہونِ منّت ہے۔

تدوین ایک تحقیقی میدان ہے اس میں مدون کئی محاذوں پر بیک وقت برسرِپیکار ہوتا ہے اس کے لیے ضروری ہے کہ اس میں فنِ تدوین کی طرف فطری رجحان ہو اور اس نے اس فن کو سیکھنے کے لیے بھی کوششیں کیں ہوں۔

> کتاب کی تدوین ایک علم ہی نہیں، باقاعدہ ایک فن ہے۔ اس فن کے کچھ عصری اور کچھ عملی تقاضے ہیں۔ نوعِ انسانی جہاں اپنی بقاء اور ترقی کی خواہاں ہے، ساری دنیا خوش حالی کی منتظر اور آسودگی کی تمنائی ہے، اور افراد کی ایک غالب اکثریت جلد سے جلد کئی طرح کی کامرانیوں سے ہم کنار ہونے کی خواہاں

ہے،انسان کو علم و آگہی کی پہلے سے کہیں زیادہ ضرورت ہے جو فنی تدوین کے مراحل کے بہ حُسن و خوبی طے کرنے ہی سے پوری ہو سکتی ہے۔[29]

پندرہویں صدی عیسوی کو دریافتوں کی صدی کہا جاتا ہے جب دنیا نے زمین میں سفر کرنے کے لیے زمینی اور بحری راستے تلاش کیے اور پھر دنیا کی نظر سے اوجھل رہنے والے خِطّوں میں قدم رکھے۔ امریکہ (۱۴۹۲ء)، نیوزی لینڈ (۱۶۴۲ء)، آسٹریلیا (۱۷۷۰ء) اور بہت سے دوسرے علاقے اسی دور میں دریافت ہوئے اور آج ہر میدان میں پوری دنیا پر ان کے اثرات سے ہم سب واقف ہیں۔

اسی طرح ادب میں بھی دریافتوں کا دَور اٹھارہویں اور انیسویں صدی میں آیا جب چھاپہ خانے لگائے گئے۔ کتابوں کی اشاعت کے دَور میں پہلے سے لکھی ہوئی مشہور کتابوں کو از سرِ نو چھاپا گیا تو شائع کرنے والے کو بہت سے مسائل کا سامنا کرنا پڑا مثلاً مخطوطے یا مسودے صحیح حالت میں نہ ہونا، پھٹے ہوئے اور ناقص مسودات، دیمک لگ جانا، بھیگ کر خراب ہو جانا یا کسی لفظ یا سطر کا پڑھنے کے قابل نہ ہونا وغیرہ۔ یہ اور اس طرح کے دیگر مسائل حل کرنے کے لیے اس بات کی ضرورت محسوس ہوئی کہ کوئی ماہر شخص مسودے میں سے یہ سب خرابیاں ایسے دُور کرے جیسا کہ وہ غیر موجود مصنف چاہتا تھا۔

دوسرا مسئلہ جو مخطوطوں کی اشاعت کے موقع پر درپیش ہوتا ہے، وہ یہ کہ اس کے مصنف کے بارے میں لوگوں کو آگاہ کیا جائے، اس کی ذات، شخصیت، خاندان، حیثیت، پیشہ ورانہ زندگی، اس کے رجحانات، اس کی تعلیم، اس کے استاد، اس کے ساتھی اور دوست، اس کے عہد کے مشاہیر اور وہ ہستیاں جن سے اُس نے کسبِ فیض کیا ہے، ان سب کی تفصیل درج کی جائے۔ روایت اور اثرات کے بارے میں معلوم کیا جائے، ساتھ ساتھ مخطوطے کی اہمیت، اس کی صنف کا تعیّن اور تعارف، متن کا معیار، اسلوب اور اندازِ نگارش، زبان کی ساخت اور ذخیرہءالفاظ۔ پھر اس متن یا دریافت شدہ تصنیف کے ادب اور معاشرہ پر ہونے والے ممکن اثرات کا بھی جائزہ لیا جائے۔ ان سب موضوعات کے لیے باقاعدہ تحقیق کا دروازہ کھولا گیا اور فنِ تدوین کی بنیاد رکھی گئی۔

ادب پاروں میں محقق کو متن سے واسطہ پڑتا ہے۔ متن کو دیکھ کر ہی اس کے بارے میں کوئی نظریہ یا تصوّر پیدا ہوتا ہے۔ زیادہ تر مدوّن کو ہی اپنی مہارت اور سوجھ بوجھ سے نہ صرف متن کے مسائل حل کرنے پڑتے ہیں بلکہ دنیائے ادب میں اس تحریر کا اور اس کے مصنف کا مقام بھی متعین کرنا پڑتا ہے۔ اس میدان میں مدون کو اکیلے ہی تمام مراحل طے کرنے پڑتے ہیں کیوں کہ نہ تو مخطوطے کا متن اپنی وکالت کر سکتا ہے اور نہ ہی اس کا مصنف مدون کی رہنمائی کے لیے غیب سے آموجود ہوتا ہے، اس مخطوطے کا واحد ماہر وہ مدون ہی ہوتا ہے جس کی آنکھوں سے دنیا اس

ادب پارے کو پڑھنے کے قابل ہوتی ہے۔اس لیے متن کی تدوین بہت حساس اور سخت ذمہ داری کا کام ہے۔مدون کو ہر کام باریک بینی، محنت اور ایمان داری سے انجام دینا پڑتا ہے،اس کی ذرا سی کوتاہی اور غفلت سے متن کے معنی بدل سکتے ہیں اور کبھی کبھی ایسی صورت میں وہ متن متنازع بھی ہو جاتا ہے۔تدوین کی روایت میں اس کی کئی مثالیں موجود ہیں۔

ترقی یافتہ قوموں نے بڑی حد تک اپنے ادب کے مخطوطوں اور نایاب کتابوں کی تدوین کا کام مکمل کر لیا ہے لیکن اُردو جو دنیا کی زبانوں میں ایک نوزائیدہ زبان ہے، میں تدوین کا کام ابھی تک جاری ہے بہت سے ایسے مخطوطے موجود ہیں جو ابھی تک کسی ماہر مدون کی راہ تک رہے ہیں۔ان کی فہرستیں کئی کتب خانوں میں موجود ہیں۔

اردو زبان نے سیاسی لحاظ سے کئی اُتار چڑھاؤ دیکھے ہیں۔ایک زبان جو اپنی جنم بھومی سے نکلی اور ایسے علاقے کے لوگوں کی بولی بنی جن کی وہ نہ مادری زبان تھی اور نہ علاقائی۔ہندوستان کی تقسیم نے اردو پر بھی اپنے اثرات مرتب کیے۔مذہبی تعصب کی وجہ سے اردو کو اپنے وطن سے نکلنا پڑا اس لیے اس کے قدیم مخطوطے پاکستانیوں کی پہنچ میں آسانی سے نہیں آئے۔پاکستان کی درس گاہوں میں، تحقیقی اداروں میں اور ان سے باہر وسیع پیمانے پر اُردو میں تحقیق کا کام جاری ہے اور نہ صرف پاکستان کے علاقوں میں تخلیق پائے گئے مخطوطوں کی تدوین کا کام ہونے لگا ہے بلکہ ہندوستان کے علاقوں سے بھی بہت سے مخطوطے پاکستان کے محققین نے مدون کر کے شائع کیے گو کہ اب ہندوستان میں بھی اردو کو اپنا کھویا ہوا مقام ملنے کی امید ہے اور بہت سی یونیورسٹیوں اور تحقیقی اداروں میں اردو پر تحقیق جاری ہے۔لیکن پھر بھی دونوں ملکوں کی اپنی اپنی ترجیحات ہیں،کچھ کتابیں محض تعصب کی وجہ سے قعرِ گم نامی میں پڑی رہ جاتی ہیں۔اس لیے ممکن ہے کہ ایک قابلِ تحقیق مسودہ ہندوستان میں موجود ہو لیکن اس پر کام کرنا وہاں کے لوگوں کے لیے دلچسپی کا باعث نہ ہو البتہ پاکستان میں اس کی بہت اہمیت ہو۔قیامِ پاکستان کے بعد مسلمانوں نے بڑے پیمانے پر پاکستان کی طرف ہجرت کی۔بہت سی ایسی شخصیات جن کی عمر کا ابتدائی دور اور کام ہندوستان میں ہوا اور انھیں عروج پاکستان میں ملا تو ضرورت محسوس ہوئی کہ ان کے ہندوستانی دَور کا کام بھی ان کے موجودہ کارناموں کے ساتھ ملا کر ان کی ذات کا مجموعی جائزہ پیش کیا جائے۔اس کے لیے کچھ ایسی کتابوں کی از سر نو اشاعت کی ضرورت پیش آئی جو قیامِ پاکستان سے پہلے ہندوستان کے کسی مقام سے شائع ہوئی تھی لیکن اتنی بڑی سیاسی تبدیلی نے اُس علاقے میں اِن کتابوں کی اہمیت ختم کر دی اور وہ کتابیں رفتہ رفتہ معدوم ہونے لگیں۔

یورپ کے تاثرات: ایک تعارف:

زیر نظر کتاب یورپ کے تاثرات جیسا کہ اپنے نام سے ظاہر ہے، یورپ کے بارے میں تاثرات پر مبنی ہے لیکن یہ کسی ایک شخص کے تاثرات نہیں بلکہ پچیس مختلف شخصیات کے الگ الگ موقعوں پر کیے گئے سفر یورپ کے تاثرات ہیں۔ ان میں ایک قدرِ مشترک یہ ہے کہ ان تمام شخصیات کا تعلق حیدر آباد دکن سے ہے۔

یورپ کے تاثرات جو پچیس مصنفین کے مختلف اوقات میں لیے گئے سفر یورپ کی یاداشتیں ہیں، بجا معنوں میں تاثرات کی سرخی کے تحت جمع کیے گئے ہیں۔ ان کو سفر نامے یا رپورتاژ کے ذیل میں جمع نہیں کیا جاسکتا کیوں کہ یہ مضامین محدود اور مقصدیت کے حامل ہیں۔ ان میں مرتب بدالدین شکیب کا نقطۂ نظر گھلا ہوا ملتا ہے۔ ان کے ہی سوالوں کے جوابات میں یہ تاثرات سامنے آئے ہیں۔

یورپ کے تاثرات میں آپ نے اپنے زمانے کے نوجوانوں سے جو یورپ کی سیر کر کے آئے تھے، کچھ خاص پہلوؤں پر مضامین لکھوائے تھے اور اس کتاب کے دیباچے میں اپنا ترجیحات اور ضروریات کا بھی تفصیل سے ذکر کیا ہے۔

انھوں نے یورپ کے بارے میں یہ تاثرات جمع کرنے کی چند وجوہات کا ذکر کیا ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ ہندوستان پر انگریزوں کے قبضہ کے بعد سے بہت اثرات مرتب ہو رہے ہیں اور وہ لوگ ہندوستانیوں کے لیے اہمیت حاصل کر گئے ہیں اس لیے ان کی معاشرت کا مطالعہ ہمارے لیے صرف دلچسپ ہی نہیں بلکہ اپنے فاتحین اور حکمرانوں کی زندگی کے بارے میں جاننا ہمارے لیے ضروری بھی ہے۔ دوسری وجہ انھوں نے یہ بیان کی ہی ہمیں دیکھنا چاہیے کہ یورپی لوگوں میں وہ کون سی خصوصیات ہیں جن کی وجہ سے وہ پوری دنیا پر چھائے ہوئے ہیں۔

پھر حیدر آباد دکن سے تعلق رکھنے والے بہت سے لوگ یورپ کی سیر کر چکے تھے اور مرتب کے مطابق پورے ہندوستان میں حیدر آباد میں ان کی تعداد سب سے زیادہ تھی اس لیے ان سے مضامین لکھوائے جا سکتے تھے۔ وہ اپنے ہم وطن سیاحوں سے یہ بھی جاننا چاہتے تھے کہ آخر یورپی لوگوں کی زندگی اور ہندوستان کے لوگوں کی زندگی میں کیا فرق ہے اور اس فرق کو کیسے دور کیا جائے کہ ہندوستان کے لوگ بھی ترقی کی دوڑ میں یورپ کے قدم بہ قدم آگے بڑھیں۔

شکیبؔ صاحب کا یہ بھی کہنا ہے کہ ایک ایسے سفر نامے کی ضرورت تھی جس میں یورپ کے رہنے والوں کی ذاتی اور معاشرتی زندگی، ان کی ثقافت اور رہن سہن کے بارے میں معلومات موجود ہوں۔ اس مقصد کے لیے شکیبؔ

نے منتخب کردہ سیاحوں کو سوال نامے بھیجے تھے تاکہ ان کی تحریروں میں ہم آہنگی اور یک رنگی ہو اور قارئین کسی خاص موضوع پر ان کی آراء کا تقابلی جائزہ بھی لے سکیں۔

یورپ کے تاثرات کا اندازِ تحریر اور صنف کا تعین:

بدر شکیب نے یورپ کے تاثرات، میں آسان سلیس اور عام فہم انداز کو اپنایا ہے۔ تمام مضامین مرتب نے ذاتی دلچسپی اور لگن سے لکھوائے ہیں۔ جو سوال بدر شکیب نے مصنفین سے پوچھے تھے ان میں سب سے پہلا سوال یورپی باشندوں کی عام خصوصیات کے حوالے سے تھا، اس میں یورپ کی ترقی کے اسباب تلاش کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ دوسرا سوال ان کی تعلیم کے بارے میں تھا۔ تعلیمی ادارے کیسے ہیں؟ تعلیمی مضامین کون سے ہیں؟ تعلیمی ادارے کیسے کام کرتے ہیں یعنی ان کا انتظامی ڈھانچہ کیسے ترتیب پاتا ہے؟ خواتین کی تعلیم پر کتنی توجہ دی جاتی ہے اور اساتذہ کا کیا معیار ہے؟ ایک سوال ان کے مذہب کے بارے میں بھی ہے تاکہ مذہبی اعتبار سے بھی ہندوستان اور یورپ کا موازنہ کیا جاسکے۔ آخری سوال میں یورپ کی عورتوں، ان کے معاشرتی مقام اور پردے وغیرہ کے حوالے سے تاثرات معلوم کیے گئے ہیں۔

ان سوالوں کے جواب میں مصنفین نے اپنے تاثرات اور مشاہدات ' اپنی ذاتی دلچسپی اور ذہنی صلاحیتوں کے مطابق تحریر کیے ہیں۔ ایک ہی سوال کے جواب میں کسی نے تفصیلی انداز اپنایا تو کسی نے مختصر، کسی نے مثالیں پیش کیں اور اشعار کے حوالے دیے اور کسی نے واقعات درج کر دیے، کسی نے مذہب پر بھرپور تفصیل لکھی اور کسی نے محض ایک سطر میں بات مکمل کی۔ عورت کے حوالے سے بھی سب کی آراء مختلف ہیں؛ کسی نے یورپ میں عورت کی آزادی کو معاشرے کے لیے مفید گردانا اور کسی نے ہندوستانی عورت کو یورپی عورت سے بہتر سمجھا۔ مصنفین میں شامل خواتین نے اپنے مشاہدات کو عورتوں کے نکتہ نظر سے بیان کیا۔ جن مصنفین کا رجحان سائنس کی طرف تھا انھوں نے ان موضوعات سے سائنسی پہلو، نکالے جن کا سیاست کی طرف تھا انھوں نے سیاسی اور جن کا مذہب کی طرف تھا انھوں نے مذہبی۔ گویا اس کتاب میں ایک ہی موضوع پر پچیس مصنفین کے الگ الگ اور منفرد تاثرات پڑھ کر قاری یورپ کے بارے میں ایک اپنی رائے تعمیر کرنے میں کامیاب ہو جاتا ہے اور یہی مرتب کا مقصد ہے جس میں وہ پورے طور پر کامیاب ہوا ہے۔

اس کتاب کے مندرجات مضامین کی صورت میں تحریر کیے گئے ہیں، کسی مصنف نے اپنے مضمون کے لیے الگ سے عنوان نہیں دیا بلکہ مرتب نے مصنف کا نام ہی عنوان کے مقام پر لکھ دیا ہے اور سب مضامین کو کتاب کے

عنوان یعنی یورپ کے تاثرات کے ذیل میں ہی جمع کر لیا ہے۔ اس لحاظ سے یہ مضامین بجا معنوں میں تاثرات ہیں کیوں کہ کسی مصنف نے اپنی طرف سے کوئی اضافی بات اپنی تحریر میں شامل نہیں کی۔ ان تحریروں میں مضمون اور مقالے جیسی وسعت صرف چند مصنفین کے ہاں نظر آتی ہے جیسے خلیفہ عبدالحکیم، محی الدین قادری زور اور ؟ ان کے علاوہ دیگر مصنفین نے تو اس قدر اختصار سے کام لیا ہے کہ اپنے سفر یورپ کے تمام تاثرات دو صفحوں میں بیان کر ڈالے ہیں۔

ان یاداشتوں کو ہم سفر نامے کی طرح پڑھ کر شائد یورپ کی چند جھلکیاں دیکھ لیں لیکن ان تحریروں کو سفر نامے کی صنف میں شامل نہیں کیا جا سکتا کیوں کہ ان تحریروں میں مصنفین نے سفر کی تیاری، یورپ کا ان کے قلب پر پہلا تاثر، وہاں اپنی رہائش کے انتظامات، سیر و سیاحت کا چشم دید اور لمحہ بہ لمحہ احوال، ذاتی جذبات و احساسات، قدم قدم پر در پیش آنے والی نئی نئی صورتِ حال کا حیرت انگیز بیان اور مختلف واردات کا مفصل اظہار نہیں کیا۔ اس میں صرف کسی ایک ہی مصنف نے اپنی تحریر میں یورپ میں پیش آنے والے چند ذاتی واقعات بیان کیے ہیں وہ بھی انتہائی اختصار سے۔

ان تحریروں کو نیم ادبی اور نیم صحافتی صنف رپورتاژ کہنا بھی درست نہ ہو گا کیوں کہ ان مضامین میں مصنفین کا یورپ کے بارے میں مجموعی تاثر ہی بیان کیا گیا ہے، ہم نے کہیں بھی وہ جزئیات، باریکیاں اور واقعات کی ہمہ پہلو داستان نہیں دیکھی جو رپورتاژ کا خاصہ ہے۔ نہ ہی مصیفین کے احساسات کی حدت میں کوئی قابلِ ذکر اتار چڑھاؤ نظر آتا ہے۔ یہ تاثرات مقصدی انداز میں لکھے گئے مضامین ہیں جن کے مصنفین کی ذہنی رو مرتب کے سوالوں کے دائرے سے باہر نہیں جا سکتی تھی۔

یورپ کے تاثرات کا مقصد:

یورپ کے تاثرات کی غرض و غایت کے بارے میں اس کے مرتب کا بیان ہے کہ:

> میں نے اس کتاب میں صرف یہ معلوم کرنے کی کوشش کی ہے کہ ہمارے مقابلہ میں یورپ اتنا ترقی یافتہ کیوں ہے، اہلِ یورپ میں آخر وہ کون سی خصوصیات ہیں جن کی وجہ سے وہ ہم پر فوقیت رکھتے ہیں اور جن کا ہم میں پیدا ہونا ضروری ہے تاکہ ہم بھی زندہ اقوام کی صف میں آسکیں۔ ہم میں کون سی کمزوریاں ہیں، انھیں کس طرح دُور کیا جا سکتا ہے ہے۔[30]

ان مقاصد کے حصول کے لیے انھوں نے مصنفین کو کیسے ایک خاص ترتیب تک محدود رکھا، بدر شکیب کے

الفاظ میں دیکھتے ہیں۔

> جن اصحاب کے بیانات میں نے قلم بند کیے ہیں، ان کا انتخاب میں نے اپنے طور پر کیا ہے۔ میں نے صرف ایسے اصحاب کے بیانات حاصل کرنے کی کوشش کی ہے جو واقعتاً اپنے دل میں قومی درد رکھتے ہیں، جنھوں نے یورپ کے حالات کا گہری نظر سے مطالعہ کیا ہے اور وہ ذہن و کردار کے لحاظ سے ملک کی قابلِ احترام ہستیاں ہیں۔۔۔ میں نے خاص طور پر یہ کوشش کی ہے کہ بیانات میں میری جانب سے کوئی اضافہ یا ترمیم نہ ہو۔[31]

> میں ان تمام اصحاب کا ممنون ہوں جن کے بیانات اس کتاب کی زینت ہیں کہ انھوں نے میری استدعا پر ملک و قوم کو اپنے خیالات اور مشاہدات سے مستفید ہونے کا موقع دیا۔[32]

یورپ کے تاثرات میں ہمیں مصنفین کے خیالات میں بعض اوقات تکرار ملتی ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ مصنفین نے ایک ہی دور میں یورپ کا سفر کیا اور اس زمانے میں ایک خاص ذہنی حالت کے ساتھ یورپ کا مشاہدہ کیا۔ زیادہ تر مصنفین نے یورپ کو مختلف زاویوں سے دیکھنے کی کوشش کی ہے مثلاً وہاں کے لوگوں کی ذاتی اور شخصی خصوصیات یعنی وقت کی پابندی اور قومی اصول کی پاس داری، وہاں کا معاشی نظام، یورپ میں سیاسی بالغ نظری، وہاں کی مذہبی زندگی، وہاں عورتوں کی زندگی اور آزادی، گھریلو زندگی، ذات پات کا نظام، تعلیمی میدان، حب الوطنی، قانون کی پابندی اور کفایت شعاری وغیرہ۔

رائے سری کشن کی تحریر میں ہمیں انفرادیت نظر آتی ہے۔ انھوں نے یورپ کی سیر کرنے کے بعد بھی اپنے ملک کو ہر طرح یورپ سے بہتر پایا۔ ان کا کہنا ہے کہ

> ہمیں کسی قسم کی تقلید کی ضرورت نہیں۔ ہمارے مذہب، ہماری تہذیب اور ہماری تمدّن میں ترقی کے سارے امکانات موجود ہیں۔[33]

انھوں نے ثقافتی اور معاشرتی زندگی کو اپنی اپنی موسمی اور معاشی صورت حال کا نتیجہ قرار دیتے ہوئے کہا کہ کسی ایک ثقافت کو دوسری ثقافت کی تقلید سے نقصان پہنچتا ہے۔

یورپ کے تاثرات کی زبان اور دور حاضر کی زبان کا فرق:

زبانیں طویل عمر گزار کر بڑی زبانیں بنتی ہیں۔ اس زبان میں لکھنے والوں کا ذوق اور ذہنی صلاحیتیں اس زبان کے ادب کا درجہ بڑھاتی ہیں۔ اس زبان کے محققین اور نقاد اس کی شکل نکھارتے ہیں اور اس زبان کے بولنے والے اس کو دنیا میں ادھر ادھر پھیلاتے ہیں اور اس کا ربط ضبط بڑھاتے ہیں۔ اس لحاظ سے اردو بہت قدیم زبان ہے اس کی ساخت اور ڈھانچہ ہندوستان میں صدیوں پہلے سے موجود تھا۔ البتہ اس کے ذخیرہ الفاظ میں وقت کے ساتھ ساتھ تبدیلیاں آتی گئیں۔ اس پر سیاسی اور مقامی اثرات ہوئے، دیگر ممالک سے آنے والے حملہ آوروں اور فاتحین کا اثر ہوا اور اس کے دامن میں سنسکرت سے لے کر عربی، فارسی، ترکی اور یورپی زبانوں کے الفاظ بھی شامل ہیں۔

شان الحق حقی کہتے ہیں۔

> اردو زبان ایک مجمع البحور ہے جس کے الفاظ و اسالیب کی فراوانی سے کم ہی زبانیں مقابلہ کر سکتی ہیں۔[34]

یہی وجہ ہے کہ وقت کے ساتھ اردو زبان کی املا اور تلفظ میں آتے ہیں۔ بیسویں صدی کی ابتدا میں لکھے ہوئے یہ تاثرات پاکستان میں لکھی جانی والی اردو سے املا اور ساخت کے لحاظ سے مختلف معلوم ہوتے ہیں۔ اکیسویں صدی ٹیکنالوجی اور مصنوعی ذہانت میں ارتقاء کی تیز رفتار ترین صدی ہے، آج ہم نے کمپیوٹر کو ڈکٹیٹ (Dictate) کروا کر لکھوانا شروع کر دیا ہے، ہمارے بولے جانے والے الفاظ کو کمپیوٹر اصلی وقت میں تحریر میں بدل دیتا ہے۔ پھر کسی بھی زبان کی تحریر کو خود کار (AutoMatic) انداز میں کسی اور زبان میں ڈھالا جا سکتا ہے اور اس میدان میں بھی حیرت انگیز ترقی دیکھنے میں آ رہی ہے۔ لفظی ترجمے کا دور اختتام پذیر ہے، اب بہت سے پروگرام ادب کے میدان میں تخلیقی نوعیت کے کام بھی کر رہے ہیں۔ نئے دور کے نئے تقاضوں کو دیکھتے ہوئے اردو زبان کے لیے کچھ اصول و ضوابط کی پابندی اور کچھ ساخت اور شکل کا تعین ضروری تھا۔ مختلف حروف کا مقام اور استعمال طے کرنا بھی ضروری تھا۔

> اردو بڑی تیزی سے بین الاقوامی زبان بنتی جا رہی ہے۔ مختلف علوم و فنون کی کتابیں بڑی سُرعت سے اردو میں منتقل کی جا رہی ہیں۔ نئے ادبی نظریات، نئے اسالیبِ فکر، انتقاد کے نئے پیمانے یا ابلاغ و اظہار کے نئے طریقے اردو ادبیات کو اس تیزی سے متاثر کر رہے ہیں کہ کل کی بات آج پرانی معلوم ہوتی ہے۔ اس کے باوصف اس حقیقت کو فراموش نہیں کرنا چاہیے کہ ادب کا ارتقا ایک حرکی عمل ہے۔ ماضی اپنے تمام کوائف کے ساتھ حال میں جذب ہو جاتا ہے اور حال اپنے تمام امکانات کے ساتھ پیہم اور متواتر مستقبل میں تبدیل ہوتا چلا جاتا ہے۔ ادبیات کے تاریخی ادوار ہم نے مبتدیوں کی سہولت کے

> لیے مقرر کر لیے ہیں ورنہ ایک دَور دوسرے دَور میں یوں ملتا ہے کہ کسی ایک مقام کو مقامِ اتصال قرار دینا ناممکن ہو جاتا ہے۔ ماضی کے عوامل ہی حال کی تخلیق کا منطقی سبب ہوتے ہیں اور یہی عوامل حال سے مل کر مستقبل کا رُخ متعین کرتے ہیں۔[35]

> اردو کا صرف ایک تشخص تھا کہ یہ مسلمانوں کی قومی زبان ہے، اس لیے ہماری قومی زبان ہے اب وہ مرکز مٹ چکے ہیں جہاں سفر قابل اعتبار تھی، وہ تہذیب ان علاقوں میں باقی نہیں رہی جس کی نشان دہی برصغیر میں اردو زبان اور ادب کرتے تھے۔ وہ ادارے اپنی صورت زائل کر رہے ہیں جن کی نشو نما اردو زبان کرتی تھی۔ اردو پڑھنے والوں کی تعداد بھارت میں روز بروز کم ہوتی جا رہی ہے اور اب وہاں اردو پاکستان کی جانب دیکھتی ہے۔ ایسا اس لیے کہنا ہے کہ پاکستان اردو کا اس زمانے میں وارث ہے۔ اردو زبان کے دیرینہ مراکز پاکستان میں منتقل ہو چکے ہیں اور اردو کے علمی، تاریخی، مذہبی اور تہذیبی ماضی کا شعور پاکستان کے رگ و ریشہ میں جی رہا ہے۔ اردو پاکستان کا تشخص ہے۔[36]

پاکستان میں اردو زبان کے بدلتے ہوئے خدوخال میں جیلانی کامران کا بھی کم و بیش یہی خیال ہے۔

اردو املا میں اصلاح کی موجود ضرورت کے مختلف عوامل ہیں۔ ان میں حسب ذیل خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔

۱۔ اردو املا کے استعمال میں یکسانیت پیدا کرنا

۲۔ موجودہ زمانے کے بعض تقاضوں کے پیش نظر ضروری اصلاحات کرنا جو جدید طباعت، ٹائپ، کمپیوٹر اور دوسری مشینی آلات و وسائل کو دیکھتے ہوئے نہایت ضروری اور فوری ہو گئے۔

۳۔ پاکستان میں اردو کی بہ حیثیت قومی زبان ترویج و اشاعت کے لیے اسکولوں کالجوں اور دوسری درس گاہوں میں طلبا کے لیے آسانیاں بہم پہنچانا تاکہ ان کو اردو سیکھنے، پڑھنے اور لکھنے میں مشکل نہ ہو۔ اسی طرح اردو اخبارات ورسائل اور دابی اور دوسری کتابوں میں اردو املا کو سہل اور یکساں بنانے کے لیے تجاویز اور ان کی عملی صورتیں۔

۴۔ پاکستان میں اردو کو سرکاری اور دفتری حیثیت دلانے کے لیے اس کی راہ میں حائل مشکلات کو رفع کرنا اور اس مقصد کے لیے معترضین کے جملہ معقول اور قابلِ حل اعتراضات کے لیے حل تلاش کرنا جو اردو املا سے متعلق ہیں۔[37]

اب ہم دیکھتے ہیں کی ۱۹۳۰ء میں لکھی گئی اس کتاب کی زبان میں آج کی زبان کے مقابلے میں کیا کیا تبدیلیاں آئی ہیں:

ا۔ ملا کر لکھنا:

ہم جانتے ہیں کہ ہمارے ہاں الفاظ ملا کر رکھنے کا روان تھا جس کی وجہ سے الفاظ کی شکل بدل جاتی ہے جیسے 'اس میں' کے بجائے 'اسمیں'، 'اس کو' کے بجائے 'اسکو' وغیرہ۔ اس طرح لکھنے سے الفاظ کی شکل بدل جاتی ہے، ان مثالوں میں 'س' کی آخری شکل 'م' اور 'ک' کے ساتھ ملنے کی وجہ سے درمیانی شکل اختیار کر جاتی ہے اور 'م' اور 'ک' ابتدائی شکل کے بجائے 'س' کے ساتھ مل کر درمیانی شکل میں بدل جاتے ہیں۔ جب ہم 'کیوں کہ' کو ملا کر 'کیونکہ' کی صورت میں لکھتے ہیں تو 'ں' بدل کر 'ن' بن جاتا ہے اور جو شخص اردو قرأت کا عادی نہ ہو وہ 'کیونکہ' کو کسی طور پر بھی صحیح تلفّظ کے ساتھ نہیں پڑھ سکتا۔ اس حوالے سے ڈاکٹر ابو سلمان شاہ جہان پوری کہتے ہیں:

"آج اردو کے رسم الخط کی جن خرابیوں اور املا کی جن بے اصولیوں کی نشان دہی کی جاتی ہے، ان کا تعلق کچھ آج کے دور سے نہیں۔ اس کی خرابیاں اس کی اوائل عمری میں چشمِ نگراں سے محرومی اور درست تربیت کے عدم وجود کا نتیجہ ہیں۔[38]

اس کتاب میں جا بجا ہمیں الفاظ ملے ہوئے نظر آتے ہیں، مثالیں ملاحظہ ہوں۔

(ملے ہوئے الفاظ والے جملے شامل کرتے ہیں۔)

میں نے کوشش کی ہے کہ ایسے الفاظ کو آج کے رائج املا کے اصولوں کے تحت لکھا جائے تاکہ عبارت کی مغائرت ختم ہو جائے۔

الفاظ کو ملا کر لکھنے کی وجوہات پر روشنی ڈالتے ہوئے ڈاکٹر طارق عزیز کہتے ہیں۔

> خطِ نستعلیق لکھتے وقت جس اہتمام کا تقاضا کرتا ہے اور ایک ایک حرف کے مختلف جوڑوں میں جو احتیاط برتنی پڑتی ہے، عام تحریر اس رفتار کی بالعموم متحمل نہیں ہو سکتی۔ اس شکل کو حل کرنے کے لیے بارہویں صدی ہجری کے اوائل میں مرتضیٰ خان شاملو نے خطِ نستعلیق ہی سے ایک اور خط اخذ کیا جسے خطِ شکستہ کا نام دیا گیا۔ الگ خط ہونے کے باوجود اس میں نستعلیق کی بعض خصوصیات باقی رہیں۔ اس خط سے دفتری خط و کتابت اور سرکاری دستاویزات میں بڑی سہولت پیدا ہو گئی۔ خطِ شکستہ میں حروف اور ان کے دائرے ادھورے ہوتے ہیں جنھیں لکھتے ہوئے وقت کی خاصی بچت ہوتی ہے لیکن ان ادھورے حرفوں کے اندر بھی ایک فنکارانہ ادا پائی جاتی ہے جس سے خطِ شکستہ میں افادی ضرورتوں کے

ساتھ جمالیاتی جاذبیت بھی پیدا ہو گئی تاہم عام تحریر میں نقطوں اور شوشوں کی حد تک جو بد نظمی اور انتشار پایا جاتا ہے، اس میں خطِ شکستہ کا بھی نمایاں کردار ہے۔ اس خط کی لمبی لمبی آڑی ترچھی کششوں کی وجہ سے مفصل حروف کو بھی ملا کر لکھا جا سکتا تھا اور ڈُور نویسی کے دوران ایسا اکثر ہو جاتا تھا۔[39]

ہم جانتے ہیں کہ اردو کے پرانے مخطوطوں میں بھی یہی دقتیں موجود ہیں تاہم وقت کے ساتھ ساتھ رسم الخط کی ان مشکلات پر قابو پایا جاتا ہے اور دورِ حاضر میں بہت سے ایسے اصول ہیں جو اس سے پہلے رائج نہ تھے۔

۲۔ ایک جیسی آوازوں کا مسئلہ:

حروف کو ملانے کے علاوہ ایک مسئلہ جو متن کی قرات اور درستی کے دوران پیش آتا ہے، وہ ہے مشترک آوازوں کا مسئلہ۔ اردو میں اصوات کے بجائے حروف تہجی کا نظام رائج ہے، جس کی وجہ سے کئی حروف کی آواز ہی آپس میں ملتی جلتی ہیں۔

مثلاً

ا، ع۔

ت، ط۔

ث، س، ص۔

ح، ہ۔

ذ، ز۔

ض، ظ

'ہ' اور 'ھ' کا فرق:

آوازوں سے قطع نظر املا میں مختلف حروف کا استعمال کسی لفظ کے ارتقا اور اس کی روایت کی نشان دہی کرتے ہیں 'ح'، 'ہ' کے ساتھ 'ھ' کی آواز بھی ملتی جلتی ہے لیکن 'ھ' کو باقاعدہ حروفِ تہجی میں شمار نہیں کیا جاتا بلکہ یہ دیگر حروف کے ساتھ مل کر بھاری آواز پیدا کرنے والی ایک صوتی علامت ہے جیسے پھول میں تین حروف ہیں ا۔ پھ، ۲۔ و اور ۳۔ ل، نہ کہ چار۔ 'پ' اور 'ھ' نے مل کر ایک حرف 'پھ' بنایا۔ ''یورپ کے تاثرات'' کے متن میں یہ فرق ملحوظ نہیں رکھا گیا۔

مثالیں شامل کرتی ہیں۔ (ہ والی)

اس کتاب کے مضامین املا اور تلفظ کے حوالے سے زیادہ بعد نہیں تھا۔ چند اصولوں میں فرق کی وجہ سے جو اختلافات تھے، صرف وہ دور کیے گئے۔ مثلاً کئی الفاظ ملا کر لکھ دیے گئے تھے جیسے اس میں اسمیں وغیرہ ان کو الگ کیا گیا۔

ھ اور ہ میں فرق ملحوظ نہ رکھا گیا تھا۔ ھ کی جگہ پر بھی ہ اور لفظ کے پڑھنے میں دقت ہوتی تھی۔ جیسے اس کی درستی کی گئی۔

بعض جگہوں پر اعراب باطروف کے استعمال سے 'ی' اور 'و' اضافی طور پر استعمال ہوئے۔ ایسے الفاظ میں سے بھی اضافی حروف کو نکالا گیا۔

اس حوالے سے لفظ کی شکل کا تعین اور ایسی کے املا کے اصول ضروری ہیں۔

> ہر زبان کے لیے ضروری ہے کہ اس کے کہ اس کے املا کے قاعدے منضبط ہوں اور ان قاعدوں کی بنیاد صحیح اصول پر ہو۔ اگر قاعدے متعین نہ ہوں تو زبان کی یک رنگی اور یکسانی کو سخت صدمہ پہنچنے کا اندیشہ ہو گا اور اردو ابھی تک اس قسم کے خطرے میں ہے۔ عربی، فارسی، انگریزی غرض ہر شائستہ زبان میں جو قاعدے مقرر ہیں، ہر لکھنے والا ان کی پوری پوری پابندی کرتا ہے۔ مگر اردو والے اپنے تیئں ہر قید سے آزاد سمجھتے ہیں۔ املا کی خرابی یا بے ضابطگی کی صورتیں جب کسی متمدّن قوم کو پیش آئیں تو اس زبان کے زبان دانوں نے فوراً اس خرابی یا بے ضابطگی کی اصلاح کی۔ ترقی کرنے والی قومیں اس زمانے میں بھی اپنی زبان کے لفظوں کی لکھاوٹ میں ضروری ترمیم اور مناسب اصلاح کرتی رہتی ہیں۔[40]

اس متن میں بھاری آواز کے لیے 'ھ' کے بجائے 'ہ' کی علامت ظاہر کی گئی ہے۔ جس کی مثالیں درج ذیل ہیں۔

(ہ والے وہ الفاظ لکھنے میں جن میں کہ لفظ بھاری آواز کے لیے لکھا گیا۔ جیسے کھیل، گھر وغیرہ)

۳۔ لفظوں کی (عربی/فارسی) روایت کا اردو املا پر اثر:

ایک مقام پر طالبات کے بجائے ''طالباۃ'' لکھا گیا ہے۔اس ضمن میں رشید حسن خان نے ماہر لسانیات ڈاکٹر عبدالستار صدیقی کے مقالے (مشمولہ رسالہ ہندوستانی، جنوری ۱۹۳۱ء) کا یہ بیان نقل کیا ہے:

> عربوں کے یہاں ایک حرف ہے جو بعضے اسموں کے آخر میں آتا ہے، شکل اس کی 'ہ' کی ہے، مگر معمولاً اسے 'ت' پڑھتے ہیں۔اس لیے اس پر دو نقطے لگا دیتے ہیں (ۃ)۔جب اس گول تے (ۃ) والا کوئی لفظ کسی جملے کے آخر میں آپڑتا ہے اور آواز ٹوٹتی ہے تو اسے ہائے ملفوظ کا سا تلفظ ملتا ہے،اس سے پہلے زبر بھی ہوتا ہے۔۔۔۔ایرانیوں نے یہ دیکھ کر کہ یہ چیز ان کی مختفی 'ہ' سے بہت ملتی جلتی ہے، اکثر صورتوں میں اسے مختفی 'ہ' کی طرح بولنا شروع کر دیا اور کہیں اسے 'ت' قرار دے کر اسے اسی طور سے بولنے کا لکھنے لگے۔ عزۃ، خدمۃ ، حجۃ وغیرہ کو عزت، خدمت، حجت بنا دیا اور درجۃ، مدرسۃ وغیرہ کو درجہ، مدرسہ۔ کہیں کہیں لفظ کو دونوں سانچوں میں ڈھال لیا۔ جیسے اجازۃ اور اجازت۔ ارادہ اور ارادت، افاقہ اور افاقت۔ان لفظوں میں جہاں جہاں 'ۃ'، 'ہ' ہوگئی وہاں 'ہ' مختفی ہی قرار پائی۔یہ مفرّس لفظ فارسی سے اردو میں آئے تو یہاں بھی ان کا تلفظ وہی رہا جو فارسی والوں نے اختیار کیا تھا۔ [41]

اس لیے 'طالباۃ' کا املا بدل کر طالبات ہو چکا ہے، اردو میں اب کسی بھی تحریر میں ''طالباۃ'' لکھنا غلط تصور ہوتا ہے۔

اب اردو میں ہائے مختفی کے بجائے الف استعمال ہوتا ہے اس لیے بہت سے الفاظ کے املا میں تبدیلی آ گئی ہے۔مثال کے طور پر کچھ الفاظ لکھتی ہوں: پرواہ کے بجائے پروا، تمغہ کو تمغا، گھرانہ کو گھرانا، غبارہ کو غبارا، سمجھوتہ کو سمجھوتا، بھروسہ کو بھروسا، کمرہ کو کمرا، انڈہ کو انڈا، دھاگہ کو دھاگا، دلاسہ کو دلاسا، پنجرہ کو پنجرا، تماشہ کو تماشا، دھماکہ کو دھماکا اور تقاضہ کو تقاضا لکھا جاتا ہے۔

بدر شکیب:

یہ کتاب اردو کے افسانہ نگار اور ادیب بدر شکیبؔ نے مرتب کی ہے جن کا اصل نام محمد بدر الدین تھا اور وہ بھارت کی ریاست تلنگانہ کے ضلع حیدر آباد میں واقع ایک شہر بولارم میں پیدا ہوئے۔ آپ کی پیدائش ٦ جون، ۱۹۰۸ء میں ہوئی۔[42] سپاہیہ خاندان سے تعلق رکھتے تھے۔ ایک ترک النسل جو وہاں کی فوج میں اعلیٰ عہدے دار تھا، اس کا نام "شکیب" تھا، جس کی اولاد میں سے محمد انور علی پیدا ہوئے جو بدر الدین کے والد تھے اور برطانوی فوج میں رسالدار میجر تھے۔[43] اسی مناسبت سے بدر الدین نے یہ نام اپنے لیے تخلص کے طور پر پسند کیا۔ جب لودھی نے ہندوستان پر حملہ کیا تو ان کے محمد انور علی اس کی فوج میں شامل تھے۔ ستر کی دہائی میں جب یحیٰ خان کا دور تھا تو پاکستان سے ایک فوجی افسر ہندوستان گئے تو ان کو معلوم ہوا کہ جس طرح پاکستان میں فوجیوں کی تربیت کاکول میں واقع اکادمی میں ہوتی ہے اسی طرح بھارتی فوجیوں کی تربیت کا ادارہ ڈیرہ ڈھونگ کے علاقہ میں ہے۔ ان کو شوق ہوا کہ ڈھونگ کی سیر کی جائے اور اس ادارے کو بھی دیکھا جائے۔ چناں چہ پہلے تو ان کو وہاں جانے کی اجازت ہی نہ ملی بعد ازاں ان کو اندھے شیشوں والی گاڑی میں وہاں لے جایا گیا۔ ان کی آنکھ وہاں کے بڑے ہال میں کھولی گئی۔ اُس ہال میں ایک دیوار پر تین تصاویر آویزاں تھیں، جن میں سے ایک کسی مسلمان فوجی افسر کی تھی۔ دریافت کرنے پر معلوم ہوا کہ وہ تصویر محمد انور علی خان کی ہے۔ انھوں نے ان کی تصویر کو سیلوٹ کیا۔ یہاں آ کر انھوں نے مظہر شکیب کے پاس ان کے پردادا محمد انور علی خان کی ایک تصویر دیکھی تو کہا کہ یہی تصویر میں نے اس دن اس ہال کی دیوار پر دیکھی تھی۔[44]

ابراہیم خان لودھی کے تعلق سے آپ کا خاندان "لودھی" بھی کہلاتا ہے۔ برطانوی ہند کے دور میں ملکہ وکٹوریہ نے محمد انور علی کی خدمات کے صلہ میں ان کو "خان" کا خطاب دیا اور حیدر آباد دکن کے مضافات میں "راچور" کے علاقہ (یہاں ریلوے اسٹیشن بھی ہے) میں جائیداد بھی دی۔ بدر شکیبؔ کے بڑے بھائی محمد حسن الدین خاں محکمہ جنگلات میں مددگار ناظم تھے،[45] بھائی اور ان کے بچے ادھر جایا کرتے تھے۔ آج بھی ان کے خاندان کے جو افراد حیدر آباد دکن میں بستے ہیں وہ اس زمین کو آباد کیے ہوئے ہیں اور ادھر کاشت کاری کرتے ہیں۔

بدر شکیب کے بارے میں شاہ بلیغ الدین کے الفاظ ملاحظہ ہوں"

> محمد بدر الدین خان شکیب طویل القامت، سانولے رنگ اور طباق چہرے کے آدمی تھے۔ جسم جثہ قد کے لحاظ سے مناسب تھا، صاف گو اور بے لاگ آدمی تھے۔ دو ٹوک بات کہتے تھے، مزاج میں منافقت نہ تھی، بلارم میں پیدا ہوئے۔[46]

آپ کی زندگی کا ابتدائی حصہ حیدر آباد میں گزرا، کالج کے زمانے سے ہی آپ نے شاعری اور نثر لکھنے کا آغاز کر دیا تھا۔ عثمانیہ یونی ورسٹی میں آپ کی ان صلاحیتوں کی وجہ سے آپ کو مجلہ عثمانیہ کے طالب علم مدیر ہونے کا اعزاز حاصل ہوا۔ اس یونی ورسٹی سے آپ نے ۱۹۲۸ء میں بی اے اور ۱۹۳۶ء میں ایل ایل بی[47] کی ڈگریاں حاصل کیں۔[48] اور وکالت کے پیشے سے منسلک ہوئے۔ حیدر آباد میں آپ ملے پلی میں قیام پزیر تھے اور دفتر وکالت معظم جاہی مارکیٹ کے قریب مجرد گاہ میں تھا۔ ۱۹۲۸ء میں بی اے کرنے کے بعد وہ نظامت کروڑ گری میں ملازم ہو گئے تھے۔ چار پانچ سال کی نوکری کے بعد ۱۹۳۶ء میں انھوں نے ایل ایل بی کیا اور قانون کے پیشے میں آ گئے۔[49] جامعہ عثمانیہ سے اپنی وابستگی کے بارے میں اپ کا کہنا ہے"

> ۱۹۲۴ء میں میں جامعہ عثمانیہ میں سال اول میں شریک ہوا جب کہ طیلسانین کی پہلی جماعت فارغ ہو کر نکلی تھی اس وقت ڈاکٹر سیادت علی خان انجمن طلبا کے نائب صدر تھے۔۔۔ مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ مجلہ کے دوسرے شمارہ میں پہلی مرتبہ میری نظم 'موجِ دریا شائع ہوئی۔۔۔ جس نے مجھے جامعہ کے شعرا کی صف اول میں پہنچا دیا تھا۔ یہ کوئی معمولی بات نہ تھی یہیں سے دراصل میری ادبی زندگی کا صحیح معنوں میں آغاز ہوتا ہے۔۔۔ پہلی مرتبہ میرے زمانے میں (مجلہ عثمانیہ کے) مدیر مہتمم کا نیا عہدہ قائم کیا گیا جس پر میرا انتخاب عمل میں آیا۔ گویا اس طرح ادارت کے ساتھ انتظامی کام بھی مدیر مہتمم کے ذمہ ہو گیا۔[50]

آپ حیدر آباد میں مسلمانوں کی سب سے بڑی تنظیم 'اتحاد المسلمین' کی مرکزی عاملہ کے رکن رہے اور آپ کو نواب بہادر یار جنگ کے ساتھ کام کرنے کے بھی کئی مواقع ملے اس کے علاوہ آپ 'انجمنِ طلبائے قدیم جامعہ عثمانیہ، حیدر آباد دکن' کے صدر، معتمد اور رکن رہے۔

۱۹۳۵ء میں اسکندر آباد کے ایک معزز خاندان میں عائشہ بیگم سے ان کی شادی ہوئی۔ کل سات بچے تولد ہوئے۔ ان میں چھے لڑکیاں اور ایک فرزند مظہر الدین خان شکیب شامل ہیں۔[51]

آپ کے افسانوں کا مجموعہ "نظر کے دھوکے" حیدر آباد سے ہی شائع ہوئی جو آپ کی پہلی طبع زاد تصنیف ہے۔[52] اس کتاب کا سرورق بھی دلچسپ ہے اور مولوی عبد القیوم صاحب (تصویری تعبیر کے مسّلم استاد) کے قلم کا نتیجہ ہے۔[53] اس کتاب کے عنوان کے ساتھ درج ذیل جملہ تحریر کیا گیا ہے:

> ایک حیدر آبادی نوجوان کی الوالعزمی، شجاعت اور رومان انگیزیاں۔[54]

اس کتاب میں آپ کے کئی افسانے شامل ہیں، جن میں سے دو افسانوں کے علاوہ سب تخیل کی کارستانی ہیں۔ آپ کی کہانیاں زیادہ تر جاسوسی نوعیت کی ہیں اور دلچسپی کا عنصر ابتدا سے انجام تک باقی رہتا ہے۔

افسانوں کے عنوانات کچھ اس طرح ہیں:

"گم شدہ لاش"، "انسانی خون"، "عارضی شوہر"، "پراسرار شخصیت "، "شہادتِ واقعاتی"، "قتل گاہ "وغیرہ

اسی زمانے میں اپ نے جامعہ عثمانیہ کے ان طالب علموں کے تاثرات جمع کیے جو کسی طرح اعلیٰ تعلیم، سیاحت یا کسی کام کے سلسلے میں یورپ گئے تھے۔ ان مختصر تاثرات کو آپ نے "یورپ کے تاثرات" کے نام سے چھپنے والے مجموعے میں (۱۹۳۹ء) شائع کیا۔[55] اس کتاب کی اہمیت اس وقت بڑھ گئی جب ان طالب علموں نے اپنی عملی زندگی میں مختلف میدانوں میں نمایاں کارنامے سرانجام دیے۔

آپ کو شعر و شاعری سے بھی شغف تھا۔ حیدرآباد میں آپ کو شعرا میں بھی شمار کیا جاتا تھا جس کا ثبوت وہاں لکھے جانے والے تذکرے ہیں۔[56] "حیدرآباد کے شاعر (جلد دوم)" میں اس کتاب کے مرتب سلیمان اریب نے آپ کے کلام کا نمونہ بھی شامل کیا ہے جو پانچ مختصر سی نظموں کی صورت میں ہے، ان میں 'کاوشِ حیات'، 'آبشار'، 'کمالِ حیات'، 'طلوعِ آفتاب' اور 'موجِ دریا' شامل ہیں۔[57] آپ کی شاعری کا مجموعہ "پیمانے" کے نام سے چھپا۔

قیامِ پاکستان کے بعد آپ نے اپنے خاندان کے ہمراہ ۱۹۴۹ء میں ہجرت کی اور کراچی میں سکونت پزیر ہوئے۔[58] یہاں بھی وکالت کو ہی اپ نے اپنا ذریعہ معاش بنایا لیکن لکھنے لکھانے کا مشغلہ بھی جاری رکھا۔ شاہ بلیغ الدین کہتے ہیں:

> بدر صاحب حیدرآباد (دکن) میں خوش حال رہے۔ کراچی میں طویل مدت تک صاحب فراش رہے۔ صحت مند ہوتے تو وکالت کرنے لگتے۔ یہیں اللہ کو پیارے ہوئے۔[59]

یہاں آکر آپ نے "اردو صحافت" کے موضوع پر تحقیقاتی مقالہ لکھا[60] جو اپنی دوسری اشاعت کے بعد کراچی یونی ورسٹی اور پنجاب کے اسکول آف جرنلزم کے پوسٹ گریجویٹ[61] کے نصاب میں زائد مطالعے کے لیے شامل ہوئی۔[62] آپ نے اس کے بعد کئی موضوعات پر قلم اٹھایا جو ان کی کتابوں کے عنوانات سے ظاہر ہو جاتا ہے، جیسے "گوریلا جنگ"، "بیمہء زندگی"[63] اور "اسلام اور جنسیات"۔

> اسلام اور جنسیات شاید اپنی نوعیت کی پہلی کتاب ہے جس میں تمام اقوام و ملل کی جنسی تعلیمات اور روایات کا تقابلی مطالعہ اسلامی اصولوں سے کیا گیا ہے۔[64]

اس کتاب کو پاک لٹریچر کمپنی کراچی نے ۱۹۵۳ء میں چھاپا تھا۔اس کے صفحات کی تعداد ۳۶۸ ہے۔[65]

اپنے کراچی کے قیام کے دوران بھی آپ اپنے ماضی کو فراموش نہ کر سکے۔ یہاں آپ نے حیدر آباد دکن اور جامعہ عثمانیہ کا قرض چکانے کی کوشش میں ان موضوعات پر دو بہت اہم کتابیں تحریر کیں،ایک ہے 'سر گزشت جامعہ عثمانیہ'۔بدر شکیبؔ کو حیدر آباد دکن اور جامعہ عثمانیہ سے بہت محبت تھی۔ان کی تمام تحریریں اسی کے گرد گھومتی ہیں بالکل اسی طرح جیسے رشید احمد صدیقی کی تحریروں سے علی گڑھ یونی ورسٹی کی محبت ٹپکتی ہے۔بدر شکیبؔ نے بھی اپنی مادرِ علمی، جامعہ عثمانیہ سے محبت کے ثبوت میں کئی تحریریں یادگار چھوڑی ہیں۔

ان کی کتاب سرگزشتِ جامعہ عثمانیہ جو کہ ۱۹۷۱ء میں کراچی سے چھپی، جامعہ عثمانیہ کے بارے میں اہم کتاب ہے۔اس میں بدر شکیبؔ نے خاصی عرق ریزی اور محنت سے اس جامعہ کی تاریخ رقم کی ہے، یہ دستاویز اس لیے بھی اہم ہے کہ اس میں جامعہ عثمانیہ کی اردو زبان کو ذریعہء تعلیم بنانے کے لیے کی گئی اوّلین کوششوں کا ذکر ہے۔[66]اس کتاب کے کئی ابواب ہیں، جن میں جامعہ کے انتظامی امور سے لے کر معاشرے کے لیے اس کی خدمات کا ذکر کیا گیا ہے۔اس کتاب کے بارے میں ۲ دسمبر ۲۰۱۸ء کو ایکسپریس نیوز میں ایک تبصرہ شائع ہوا تھا۔ جس میں تبصرہ نگار عبدالرشید عابد اور عارف عزیز نے بدر شکیبؔ کے بارے میں کچھ یوں کہا ہے۔

> بدر شکیبؔ حیدر آباد دکن کے چند معروف قلم کاروں میں سے ایک ہیں اور جامعہ ان کی مادرِ علمی رہی ہے۔اس کتاب کے مختلف ابواب پڑھ کر اندازہ کیا جاسکتا ہے کہ یہ نہایت وقیع اور بیش قیمت خزانہ ہے جس کا مواد نہایت عرق ریزی اور محنت کا متقاضی تھا اور مصنف کے عزم و استقلال نے اسے سر گزشت کی صورت ہمارے سامنے رکھ دیا ہے۔[67]

اس کتاب کی اہمیت کے بارے میں ان کے الفاظ کچھ اس طرح ہیں:

> یہ کتاب ایک اہم اور مستند دستاویز کے طور پر آنے والی نسلوں کو اپنے سنہری ماضی اور خصوصاً جامعہ عثمانیہ اور نظامِ دکن کے اردو کو ذریعۂ تعلیم بناتے ہوئے علم و تحقیق کے میدان میں شان دار کارناموں کی یاد دلاتی رہے گی۔بدر شکیب حیدر آباد دکن کے چند معروف قلم کاروں میں سے ایک ہیں اور جامعہ ان کی مادرِ علمی رہی ہے۔اس کتاب کے مختلف ابواب پڑھ کر اندازہ کیا جاسکتا ہے کہ یہ نہایت وقیع اور بیش قیمت مخزن ہے جس کا مواد نہایت عرق ریزی اور محنت کا متقاضی تھا اور مصنف کے عزم و استقلال نے اسے سر گزشت کی صورت ہمارے سامنے رکھ دیا ہے۔یہ ایڈیشن مرحوم مصنف کے صاحب زادے مظہر شکیب کی خواہش و کوشش کا نتیجہ ہے۔[68]

اس کتاب کے بارے میں نواب حسن یار جنگ بہادر نے کہا کہ یہ کتاب ایک اہم تاریخی کام ہے جس پر مصنف مبارک باد کے حق دار ہیں۔ جامعہ عثمانیہ کے نام سے قائم حالیہ یونی ورسٹی میں ماضی کی کوئی روایت باقی نہیں بلکہ یہ اب "جلی ہوئی آتش بازی کا بے جان خول ہے۔[69]

دوسری اہم کتاب ہے حیدر آباد کا عروج و زوال جو عثمانیہ اکیڈمی کراچی سے ۱۹۶۴ء میں چھپی تھی۔ اس کتاب میں آپ نے حیدر آباد کی تاریخ اور اس کے سیاسی، مذہبی اور معاشرتی عروج و زوال کی داستان رقم کی ہے۔ حیدر آباد دکن میں اسلامی حکومت اور مسلمانوں کی زندگی کو آپ نے بطور خاص موضوع بنایا۔ میر لائق علی نے جب انگریزی میں حیدر آباد کے زوال پر کتاب لکھی *Tragedy Of Haiderabad* کے نام سے، جو پاکستان کو آپریٹو بک سوسائٹی نے کراچی سے ۱۹۶۲ء میں چھاپی تھی۔[70] اس میں مصنف نے چونتیس ابواب میں برِ صغیر کی تقسیم سے لے کر قائدِ اعظم کے موت اور حیدر آباد کے زوال تک کے واقعات ترتیب سے تحریر کیے ہیں، اس میں مصنف نے نظام شاہ پر ریاست کے زوال کی ذمہ داری عائد کی ہے جس سے نہ صرف یہ کہ حضور نظام کو افسوس ہوا بلکہ اور بھی واقفِ حال لوگوں کا دل بھی دُکھا۔ اس کتاب کی اشاعت سے بدرالدین شکیبؔ صاحب کو بھی شدید تحفظات تھے کیوں کہ حیدر آبادی ہونے کے ناطے بدر بھی بہت سے واقعات کے چشم دید گواہ تھے اور اتحاد المسلمین میں شامل تھے، اس لیے اس جماعت کی عملی کارروائیوں کو قریب سے جانتے تھے۔ آپ نے حضور نظام پر سے یہ الزام دھونے اور واقعات کی صحیح تصویر سامنے لانے کے لیے حیدر آباد کا عروج و زوال تحریر کی۔ اس میں آپ نے بتایا کہ اتحاد المسلمین ایک مصلح جماعت تھی جس نے بھارت سے مقابلہ کرنے کے لیے نئے ہتھیار نہیں خریدے اور یوں ہی سپاہیوں کو انڈین فوج کے سامنے لا کھڑا کیا جس سے لاکھوں افراد شہید ہو گئے۔ بدر نے اس بربادی کو زوال کا اصل مقصد قرار دیتے ہوئے تمام تر ذمہ داری اتحاد المسلمین پر ڈالی۔ بدر شکیب خود بھی اس جماعت کا حصّہ تھے، اس فوج کے حلقہ "ج" کے صدر تھے، آپ کی نگرانی میں اسکندر آباد کا سارا علاقہ تھا۔ اس حوالے سے آپ نے کہا ہے کہ اس بربادی کی تمام تر ذمہ داری اتحاد المسلمین اور قاسم رضوی پر ہے، چوں کہ میں بھی ان کے ساتھ تھا اس لیے میں بھی خود کو اس جُرم سے مبرّا نہیں سمجھتا۔[71]

یہ کتاب جب آپ نے حضور نظام کو بھجوائی تو انھوں نے کہا:

مجھے خوشی ہوئی کہ بدرؔ نے سچائی لکھی۔[72]

مجلہ عثمانیہ کراچی میں ادارہ نے اپنی ساتویں اشاعت میں بدر شکیب کے مضمون "جامعہ عثمانیہ کی ابتدائی ادبی مجالس" کے ساتھ مصنف کے حالاتِ زندگی بھی مختصراً تحریر کیے ہیں جس کی آخری سطور میں لکھا گیا ہے:

"علاوہ ازیں دو ناول اور جنسیات پر دو اور کتب زیرِ طبع ہیں۔"[73]

آپ کئی سال 'بہادر یار جنگ کوآپریٹو ہاؤسنگ سوسائٹی، کراچی کی مجلسِ عاملہ کے رکن رہے۔ ۲۳ جنوری ۱۹۷۳ء میں آپ اس دارِ فانی سے کوچ کر گئے۔[74]

دیگر مصنفین کا تعارف:

سید عبد اللطیف:

حیدر آباد دکن کی سربرآوردہ شخصیت اور وہاں قائدِ اعظم کے میزبان سید عبد اللطیف ۱۱ ستمبر ۱۸۹۱ء میں کرنول میں پیدا ہوئے[75]۔ آپ کا سلسلہ ءنسب مردِ قلندر حضرت سید شاہ عبد اللطیف قادری لاابالی یاہو بادشاہ سے ملتا ہے جن کو جنوبی ہند کا قطب الاقطاب کہا جاتا ہے[76]۔ خاندانی روایات کے مطابق گھر میں عربی اور فارسی کی تعلیم حاصل کی پھر اس زمانے کی نئی روش کے مطابق مدرسہ میں داخلہ لے لیا تاکہ انگریزی زبان کی تعلیم حاصل کر کے دین کی خدمت میں قرآن کا انگریزی ترجمہ کر سکیں۔ اپنا یہ وعدہ آپ نے پورا کیا اور ۱۹۵۴ء میں مولانا ابوالکلام آزاد کی مشہور کتاب 'ترجمان القرآن' کو ترجمہ کے ذریعہ انگریزی میں منتقل کیا[77]۔

آپ نے ۱۹۱۰ء میں میٹرک کا امتحان پاس کیا اور بی اے کا امتحان ۱۹۱۵ء میں امتیازی حیثیت سے پاس کرتے ہی سید نواب علی چوہدری (سابق وزیر اعظم پاکستان، محمد علی بوگرا کے دادا) کے پرائیویٹ سکرٹری مقرر ہو گئے۔ جب پنچ گنی میں اسکول قائم ہوا تو آپ کو پرنسپل کا عہدہ دیا گیا، اپ نے یہ خدمت دو سال تک انجام دی۔[78] آپ نے ۱۹۲۰ء میں جامعہ عثمانیہ میں انگریزی[79] کے استاد کے طور پر ملازمت کا آغاز کیا یہیں سے ریاستی حکومت کے بلا سود قرض کی رقم سے اعلیٰ تعلیم کے یورپ روانہ ہوئے، بعد ازاں آپ کی غیر معمولی قابلیت کو دیکھتے ہوئے حکومت نے آپ کا یہ قرض معاف کر دیا۔ آپ کے ہمراہ اس سفر میں خلیفہ عبد الحکیم اور پروفیسر وحید الرحمٰن بھی شامل تھے۔ کنگز کالج کے اساتذہ نے آپ کو براہِ راست پی ایچ ڈی میں داخلے کی پیش کش کی اور آپ نے تین کے بجائے دو ہی سال میں "اردو ادب پر انگریزی ادب کے اثرات"[80] کے عنوان سے مقالہ لکھ کر ڈگری حاصل کر لی۔ ۱۹۶۳ء میں، قیامِ یورپ کے دوران آپ کو نیویارک (ریاست ہائے متحدہ امریکہ) جانے کا بھی موقع ملا[81]۔

۱۹۳۷ء میں وظیفہ ءحسنِ خدمت لے کر آپ جامعہ کی ملازمت سے الگ ہو گئے اور ایک انگریزی رسالہ "Clarion" نکالنے لگے جو اپنے مقام اور مواد کے لحاظ سے مولانا محمد علی جوہر کے "کامریڈ" جیسا تھا۔ اسی زمانے میں آپ نے "ہندوستان میں مسلمانوں کی تہذیب" اور "ہندوستان کے تہذیبی منطقے" کے عنوان سے مقالے لکھے جن کو علمی حلقوں میں سراہا گیا[82]۔ اردو ادب میں بھی آپ کی دلچسپی کا ثبوت اپ کی تصنیف "غالب" ہے[83]۔

آپ نے سیاست دانوں سے ملاقاتوں اور گفتگو کا سلسلہ بھی جاری رکھا نیز آپ کو ہندوستان کے لیے ایک وفاقی دستور کی اسکیم مرتب کرنے کا بھی موقع ملا۔ اس کے علاوہ پاکستان کے قیام کے لیے مجوزہ خاکوں میں آپ نے

"تہذیبی منطقوں کی اسکیم" کے عنوان سے اپنی تجاویز بھی دی تھیں۔[84] سیاسی افراتفری کے دور میں جب حیدرآباد دکن میں پولیس ایکشن ہوا تو اس کے بعد آپ تین ماہ کے لیے پیچ گنی چلے گئے۔ ۱۹۵۰ء میں آپ عثمانیہ کالج کرنول کے پرنسپل مقرر ہوئے۔ ۱۹۵۲ء میں آپ نے یہ ملازمت ترک کر کے مولانا آزاد کے ساتھ انسٹی ٹیوٹ آف انڈو مڈل ایسٹ کلچرل اسٹڈیز کا ادارہ قائم کیا، خلومت کی مالی امداد سے اس ادارے نے چالیس کے قریب مطبوعات شائع کیں۔ اسی سال ڈاکٹر سید عبداللطیف کی تالیف "وہ ذہن جس کی قرآن نشو نما کرتا ہے" انگریزی میں شائع ہوئی جن کو اس موضوع پر سنگِ میل کی حیثیت حاصل ہے[85]۔

آپ کے بارے میں حسن الدین احمد کے الفاظ ملاحظہ ہوں:

> عالی حوصلگی، مذہبی رواداری، دوسروں کے خیالات اور نظریات کے احترام کو ڈاکٹر صاحب کی شخصیت کا امتیازی پہلو قرار دیا جا سکتا ہے۔ وہ ایک جیّد عالم، مفکّر، مجتہد اور آزاد منش کی حیثیت سے مشہور اور ایک جامع شخصیت کے مالک تھے۔ نیکی، خلوص، محبت، ہمدردی، علمی خدمات، سادگی آپ کا وطیرہ تھیں۔[86]

۴ نومبر ۱۹۷۱ء کو آپ کا انتقال ہوا۔

سید معین الدین قریشی:

سید معین الدین قریشی ۱۹۰۰ء میں حیدرآباد دکن میں پیدا ہوئے۔ سٹی اسکول حیدرآباد دکن سے تعلیم کا آغاز کیا پھر جامعہ عثمانیہ میں داخل ہوئے۔ جامعہ عثمانیہ میں آپ کی صلاحیتیں نکھر کر سامنے آئیں۔ یہاں آپ کو کام کرنے، اپنی چھپی ہوئی خوبیوں کو دریافت کرنے کے خوب مواقع ملے اور مشہور شخصیات کی صحبت سے فیض اٹھانے کا بھی موقع ملا۔ ۱۹۲۷ء میں آپ نے یہاں سے ایم اے کی سند حاصل کی اس دوران مولانا وحید الدین سلیم، مولوی عبدالحق، ڈاکٹر ہادی رسوا، علامہ عمادی، ابوالخیر مودودی اور جوش ملیح آبادی سے استفادہ کیا۔

جامعہ میں انجمنِ اتحادِ طلبہ، انجمنِ طلبائے قدیم اور انجمنِ طلیسانینِ جامعہ میں شامل تھے۔ انجمنِ طلبائے قدیم کے صدر بھی رہے، اس زمانے میں خواجہ معین الدین، ابوالخیر صدیقی، بدر شکیب اور عبدالرحمٰن رئیس بھی اس انجمن میں شامل تھے۔

۱۹۲۷ء میں مجلہ عثمانیہ کا آغاز ہوا تو آپ اس کے اردو حصہ کے طالب علم ایڈیٹر تھے جب کے ڈاکٹر زورؔ استاد کی حیثیت سے یہ حصہ دیکھتے تھے، پہلا شمارہ چھپنے کے بعد زورؔ صاحب یورپ چلے گئے تو ادارت کی ذمہ داری قریشی

صاحب نے تنہا سنبھالی۔ آپ دو سال تک مسلسل مجلّے کے مدیر رہے یہ اعزاز بعد میں کسی طالب علم کو نہیں ملا۔ آپ کے بارے میں بلیغ الدین شاہ صاحب کے الفاظ ملاحظہ ہوں:

> اوسط سے کچھ نکلتا ہوا قد، اکھرا بدن، سرمئی رنگت، مناسب ناک نقشہ، سر پر تُرکی ٹوپی، جسم پر حیدرآبادی شیروانی، بر میں اقبال شاہی پاجامہ، پاؤں میں ڈاسن کمپنی کا بوٹ۔ زبان شُستہ، لب و لہجہ میٹھا۔ باتوں کے دھنی تھے۔[87]

اپنے انگریزی کے استاد ڈاکٹر سید عبد اللطیف سے بھی آپ نے کسبِ فیض کیا۔ دونوں اکثر مل بیٹھتے تھے۔ آپ نے ڈاکٹر لطیف کے اصرار پر ان کی کتاب اردو ادب پر انگریزی زبان کے اثرات کا انگریزی سے اردو میں ترجمہ بھی کیا تھا۔ اس حوالے سے بلیغ الدین شاہ کہتے ہیں:

> اس ترجمے کا کیا کہنا! قریشی صاحب جی جان سے ترجمے میں جتھ گئے تھے۔ شاعت اردو کا اور موضوع بھی اردو شاعری۔ ترجمے نے اصل کی جگہ لے لی۔[88]

آپ نے محکمہ تعلیم میں ملازمت کی اور اسی میں عمر گزار دی۔ وظیفہ حسنِ خدمت لے کر ریٹائر ہوئے۔ آپ نے ادارہ ادبیاتِ اردو کے انتخابِ سخن کے سلسلے "مرقع سخن" کی چوتھی جلد کو عبدالقیوم خان باقی کی مدد سے مرتب کیا تھا، یہ جلد شعرائے عثمانیہ کے بارے میں تھی جس میں ہر شاعر کے کلام کے انتخاب کے ساتھ اس کا تعارفی نوٹ بھی لکھا گیا تھا، شاہ بلیغ الدین نے اس کے اندازِ بیان کی وجہ سے پہچانا کہ یہ نوٹ قریشی صاحب کی تحریر ہے[89]۔ دکن میں اردو کی خدمت میں آپ کا نام بھلایا نہیں جا سکتا۔

آپ نے تنہا زندگی گزاری، اہل و عیال تو تھے نہیں، کام اور دوستوں یاروں کی صحبت سے دل کو شاد کیا کرتے تھے۔ حیدرآباد میں ہی ۱۹۵۰ء میں آپ انتقال کر گئے۔

علامہ عبداللہ یوسف علی:

علامہ عبداللہ یوسف علی موجودہ دور کے مسلم ممالک کے علماء میں قرآن مجید فرقان حمید کے عالمانہ انگریزی ترجمہ اور اس کی دانش مندانہ تفسیر کی وجہ سے ایک منفرد مقام رکھتے ہیں۔ عالم اسلام کے لاکھوں مسلمانوں نے ان کی انگریزی زبان پر غیر معمولی مہارت، مرقع و مسجع جملوں کی بناوٹ، سائنسی اور عقلی معیار پر پورا اترنے والے تجزیے، فکر و نظر کی وہ ہمہ جہت گہرائی جس کے ذریعہ مختلف بیانات کے درمیان تعلق کو اجاگر کرنا اور ان کی اعلیٰ درجہ کی ذہانت و فطانت کو بہت سراہا[90]۔ بہت سے غیر مسلموں نے ان کی دو ہزار سے زائد صفحات پر مشتمل قرآن مجید کے

انگریزی ترجمہ اور تفسیر کو پڑھا اور دائرہ اسلام میں داخل ہوگئے۔ دنیا بھر کے متعدد پبلشر نے ان کی تحریروں کی طباعت کے ذریعہ منفعت کمائی جس میں ان کی اعلیٰ ترین ترجمہ و تفسیر(Translation and Commentry of The Holy Quraan) سر فہرست ہے۔

عبداللہ یوسف علی، ۱۴اپریل ۱۸۷۲ء کو بمبئی میں، بوہرہ، داؤدی شیعہ گھرانے میں پیدا ہوئے تھے۔ ان کے والد پولیس انسپکٹر تھے اور "خان بہادر" کے لقب سے سرفراز ہوئے تھے۔ ابتدائی تعلیم انھوں نے بمبئی کے انجمن حمایت اسلام اسکول میں حاصل کی اور بعد میں مشنری، ولسن کالج سے بی اے کیا۔ اس دوران انھوں نے قران پاک حفظ کیا۔ ۱۸۹۱ء میں عبداللہ یوسف علی نے ۱۹سال کی عمر میں بمبئی یونیورسٹی سے انگریزی ادب میں فرسٹ ڈویژن میں سند حاصل کی جس کے بعد وہ اسی سال اسکالرشپ پر اعلی تعلیم کے لیے کیمبرج یونیورسٹی گئے۔ جہاں انھوں نے سینٹ جونز کالج سے قانون کی تعلیم حاصل کی۔ ۱۸۹۵ء میں ہندوستان واپسی پر انھوں نے انڈین سول سروس میں شمولیت اختیار کی۔ ۱۸۹۶ء میں یعنی ملازمت حاصل کرنے کے اگلے ہی سال ایم اے اور ایل ایل ایم کی تعلیم کے لیے وہ دوبارہ انگلستان لوٹے۔ [91]

حیدر آباد دکن میں ۱۹۱۰ء کے قریب صدر المہام مقرر کیا گیا اور ایک سال تک آپ اس عہدے پر کام کرتے رہے۔ بعد ازاں آپ کو صنعت و حرفت کے شعبہ میں بھیج دیا گیا۔ ۱۹۱۲ء میں آپ کی ملازمت کی مدت ختم ہوگئی تو آپ حیدر آباد دکن سے واپس لکھنؤ چلے گئے جہاں آپ نے وکالت کا کام شروع کیا[92]۔

۱۹۰۰ء میں عبداللہ یوسف علی کی ایک انگریز خاتون، ٹریسا میری شیلڈرس سے بورن متھ کے سینٹ پیٹرس چرچ میں شادی ہوئی۔ ٹریسا میری سے ان کے تین بیٹے اور ایک بیٹی ہوئی۔ انڈین سول سروس سے منسلک ہونے کی وجہ سے عبداللہ یوسف علی زیادہ تر ہندوستان میں رہتے تھے جب کہ ان کے بیوی بچے انگلستان میں مقیم تھے۔ ۱۹۱۴ء میں عبداللہ یوسف علی نے انڈین سول سروس سے استعفی دے دیا اور ہندوستان کو چھوڑ کر انگلستان میں قیام کا فیصلہ کیا۔ اس دوران وہ ووکنگ کی شاہ جہاں مسجد کے ٹرسٹی اور ایسٹ لندن کی مسجد کی تعمیر کے لیے فنڈ جمع کرنے کے نگران کی حیثیت سے خدمات انجام دیتے رہے۔ [93]

۱۹۱۴ء میں جب پہلی عالم گیر جنگ بھڑکی تو برطانیہ کے بیشتر مسلمان اس جنگ میں برطانیہ کی مدد کے مخالف تھے کیوں کہ ان کے نزدیک یہ جنگ سلطنتِ عثمانیہ کے خلاف تھی۔ لیکن عبداللہ یوسف علی نے برطانیہ کے مسلمانوں کی اس رائے کے خلاف بغاوت کی اور اس جنگ کی بھرپور حمایت کی۔ عبداللہ یوسف علی نے جنگ کے لیے

برطانیہ کی امداد کی مہم میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیا۔ انھوں نے جنگ کی حمایت میں مضامین لکھے، اور عام جلسوں میں تقریریں کیں۔ ان کی ان خدمات کے صلہ میں برطانوی حکومت نے انھیں ۱۹۱۷ء میں CBE، سر کے خطاب سے نوازا[94]۔

ہندوستان واپس آنے کے بعد وہ مختلف جگہوں پر ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ اور ڈسٹرکٹ جج کے عہدوں پر تعینات رہے۔ اور پھر حکومت ہند کے وزارت مالیات میں انڈر سیکریٹری کی خدمات انجام دیں۔ ہندوستان کی مرکزی حکومت میں انہیں جوائنٹ سیکریٹری کا عہدہ بھی دیا گیا۔ انسائیکلوپیڈیا آف اسلام ان کے بارے میں لکھتا ہے -:

> انھوں نے ۱۹۱۰ء میں ناگ پور میں ہونے والی آل انڈیا مسلم لیگ ایجوکیشنل کانفرس کی صدارت کی اور پھر کلکتہ میں ہونے والی ۱۹۱۲ء کی کانفرنس کی صدارت بھی کی۔ ۱۹۱۶ء میں آپ امپیریل انسٹی ٹیوٹ کے ہندوستانی معاملات کی کمیٹی کے ممبر تھے اور کئی خصوصی کمیٹی کے چیرمین بھی رہے۔ ۱۹۱۷ء میں آپ لندن یونی ورسٹی کے شعبہ مشرقی علوم کے اسکول کے ہندی و انڈین سوسائٹی اینڈ ریلجن میں پروفیسر مقرر ہوئے۔ ۱۹۲۱ء میں وہ ریاست حیدر آباد دکن کے وزیر خزانہ مقرر ہوئے۔ ۱۹۲۵ء میں اسلامیہ کالج لاہور کے پرنسپل مقرر ہوئے اور پنجاب یونی ورسٹی کے فیلو بھی رہے۔ اس دوران میں آپ نے علی گڑھ یونی ورسٹی کورٹ کے ممبر کے طور پر نمایاں خدمات انجام دیں۔ ۱۹۲۸ء میں ہونے والی لیگ آف نیشنز کی جنرل اسمبلی کی میٹنگ میں آپ بطور ہندوستانی مندوب کے شریک ہوئے۔ ۱۹۱۸ء سے ۱۹۳۰ء کے دوران مذہب کے ذریعہ امن کے قیام کے لیے آپ نے ڈنمارک، سویڈن، ناروے، ہالینڈ، امریکہ، کینیڈا میں منعقدہ بین الاقوامی کانفرنس میں قابل قدر خدمات انجام دیں۔[95]

آپ کے متعدد طویل تحقیقاتی مطالعات برائے اسلامی تاریخ، دعوہ و تبلیغ، تعلیماتی اصلاحات، ادب، آثار قدیمہ، مجسمہ سازی، فنون لطیفہ اور رفاہ عامہ کے اوپر آپ کے کام ہندوستان اور یورپی اخبارات و رسائل میں چھپتے رہے۔ انسائکلوپیڈیا آف اسلام کے مطابق آپ نے ان کاموں کے علاوہ بارہ (۱۲) کتابیں انگریزی زبان میں لکھیں جنھوں نے بین الاقوامی ریسرچ اسکالروں اور قارئین سے بڑی پزیرائی حاصل کی۔ مگر ان تمام کاموں کے علاوہ ان کی انگریزی زبان میں قرآن مجید کے ترجمہ اور تفسیر نے پوری دنیا کے دانش وروں کے دلوں میں اپنی جگہ بنالی۔[96]

۱۹۲۰ء میں عبداللہ یوسف علی کی ایک انگریز خاتون گرٹ روڈاین موبے سے شادی ہوئی۔ ان کا مسلم نام معصومہ رکھا گیا۔ عبداللہ یوسف علی کی پہلی بیوی کے بچوں نے اس دوسری شادی پر شدید رد عمل ظاہر کیا اور دونوں کے ساتھ سخت اذیت آمیز رویہ برتا۔ اس صورت حال سے پریشان ہو کر عبداللہ یوسف علی اور ان کی اہلیہ نے

ہندوستان جانے کا فیصلہ کیا۔ دوسری شادی سے عبداللہ یوسف علی کا ایک بیٹا ہوا جس کا انھوں نے رشید یوسف علی رکھا۔ لیکن بدقسمتی سے دوسری شادی بھی کامیاب ثابت نہ ہوئی۔[97]

ہندوستان میں قیام کے دوران علامہ اقبال نے عبداللہ یوسف علی کو اسلامیہ کالج لاہور کے پرنسپل کا عہدہ قبول کرنے پر آمادہ کیا، اس عہدہ پر وہ ۱۹۲۵ء سے ۱۹۲۷ء تک فائز رہے۔[98] ۱۹۲۸ء میں عبداللہ یوسف علی اُس متنازعہ مسلم وفد میں شامل تھے جو سر آغا خان کی قیادت میں لیگ آف نیشنز گیا تھا۔ اس وفد میں سر ملک فیروز خان نون بھی شامل تھے۔ اس وفد کا مقصد، لیگ آف نیشنز میں اسرائیل کے قیام کے لیے قرارداد کی حمایت تھا۔ برصغیر کے مسلمانوں نے اس وفد کی سخت مخالفت کی تھی۔ عبداللہ یوسف علی اس کے بعد ۱۹۳۵ء سے ۱۹۳۷ء تک اسلامیہ کالج لاہور کے پرنسپل کی خدمات انجام دیتے رہے۔ اس دوران وہ پنجاب یونیورسٹی کے فیلو بھی رہے۔ انھوں نے اس زمانے میں تصنیف وتالیف کی خدمات بھی سرانجام دیں۔ ان کی کتابوں کے نام درج ذیل ہیں۔[99]

1907	Indian Mohammedans
1916	Mestrovic and serbian sculptures
1923	Muslim Educational Ideals
1926	Islam as a World Force
1926	India and Europe
1929	Personality of Muhammad the Prophet
1932	Medivial India
1934	Translation and the Commentry of The Holy Quraan
1936	Life and Literatures
1936	Religion and Social Equality
1936	Islamic History, its Scope and Content
1940	The Message of Islam

علامہ عبداللہ یوسف علی کو ان کے ترجمہ قرآن مجید اور اس کی تشریح کی تحریر کے لیے چالیس سال محنت کرنی پڑی۔ درست ترجمہ اور شہادتوں کے حصول کے لیے انھوں نے مختلف علاقوں کے کئی سفر اختیار کیے اور وقت

کے بڑے علماء سے ملاقاتیں کیں اور پیچیدہ گتھیوں کو سلجھانے کے لیے ان سے مدد حاصل کی[100]۔اس سلسلہ میں انھوں نے اسلاف کے عہد سے لے کر دور حاضر کی تمام تفاسیر اور تشریحات کا مطالعہ کیا۔اور ان تمام تحقیقات اور مطالعہ کے نتیجہ میں حاصل ہونے والے مواد کو انھوں نے من وعن نقل کرنے کی بجائے بڑی عرق ریزی سے دیکھا اور سمجھااور پھر ان کو اختیار کیا۔[101]

اس کام کے مستند اور معتبر ہونے کی وجہ سے اس کو سعودی حکومت کے شاہ فہد کے قرآن کی طباعت کے ادارے نے ۱۴۰۵ھ میں شاہی فرمان نمبر ۱۲۴۱۲ کے تحت منتخب کیا۔اور اس ترجمہ و تفسیر کو ۱۴۱۰ھ میں سعودی حکومت کے محکمہ حج واوقاف نے طبع کیااور پوری دنیامیں مفت تقسیم کیا۔اس نسخہ کے انتخاب،طباعت واشاعت کے بارے میں اسلامی ریسرچ اورافتاء نے یہ وجوہات بتائیں:

> مرحوم استاد عبداللہ یوسف علی کے ترجمہ کو اپنے انتہائی عمدہ اور شائستہ انداز تحریر کی بدولت منتخب کیا گیا۔اس کا خوب صورت انداز ترجمہ اور ایسے الفاظ کا انتخاب جو قرآن کے مطالب کے بہت قریب ہے کے علاوہ عالمانہ نوٹ اور تشریح بھی اس کے انتخاب کی ایک بڑی وجہ ہے۔[102]

گوناگوں صلاحیتوں،اعلیٰ ذہانت اور عالمانہ انداز ترجمہ قرآن کے ساتھ انگریزی زبان اورادب کے اوپر بڑی مضبوط گرفت نے علامہ یوسف علی کو بین الاقوامی شہرت اور عزت سے ہم کنار کیا۔

۱۹۴۷ء میں برصغیر کی آزادی کے بعد عبداللہ یوسف علی ہندوستان لوٹے اور سیاست میں حصہ لینے کی کوشش کی لیکن ناکام رہے۔ ناکامی کی صورت میں انھوں نے لندن واپس جانے کا فیصلہ کیا۔ ویسے بھی وہ جسمانی اور ذہنی طور پر بہت نحیف ہو چکے تھے اور اکیلے، نیشنل لبرل کلب میں رہ رہے تھے۔بچے پہلے ہی انہیں ظلم وستم کا نشانہ بنانے کے بعد الگ ہو گئے تھے۔اس زمانہ میں گو ان کے بنک میں ۲۰۵۷۸ پونڈ جمع تھے لیکن وہ سخت مفلسی کی زندگی گذار رہے تھے اور لندن کی سڑکوں پر کسی بے گھر شخص کی طرح گھومتے پھرتے تھے۔

۹ دسمبر ۱۹۵۳ء کے دسمبر میں جب کہ کڑاکے کی سردی پڑ رہی تھی، ویسٹ منسٹر میں ایک عمارت کے دروازے کی سیڑھیوں پر آپ کس مپرسی کے عالم میں پڑے ہوئے تھے۔پولس نے آپ کو فوراً ویسٹ منسٹر ہسپتال میں داخل کر دیا۔دوسرے روز ہسپتال سے فارغ کرنے کے بعد آپ کو چیلسی میں بوڑھے لوگوں کی پناہ گاہ میں بھیج دیا گیا۔اگلے ہی دن آپ پر دل کا دورہ پڑا جو جان لیوا ثابت ہوا۔آپ کا کوئی عزیز رشتہ دار آپ کی میت لینے نہیں آیا۔اس وقت تک آپ کی شناخت بھی نہ ہوئی تھی پولس نے جب پاکستان ہائی کمیشن سے شناخت کے لیے استفسار کیا تو انکشاف ہوا کہ یہ میت تو ممتاز مسلم دانشور، مشہور تاریخ دان، ماہر تعلیم اور قران پاک کے انگریزی مترجم اور مفسر، عبداللہ

یوسف علی تھے۔[103] اس زمانے میں برطانیہ میں پاکستان کے ہائی کمشنر جناب ایم اے شریف صاحب نے وزیر اعظم پاکستان جناب محمد علی بوگرا کو خط لکھا اور ان کی وفات کے کچھ حالات بیان کیے۔ اس خط سے معلوم ہوتا ہے کہ ۸۰ سالہ عبداللہ یوسف علی کسی انتہائی شدید مالی دشواریوں میں گرفتار ہو گئے تھے۔ ٹریفلگر اسکوائر میں انہیں روٹی کے لقمے کے لیے ہاتھ پھیلائے دیکھا گیا۔ ان کے کپڑے چیتھڑوں میں تبدیل ہو چکے تھے۔ ان کے پاس ایک سوٹ کیس تھا جس میں سے ایک ڈھیلہ بھی برآمد نہیں ہوا۔

ان کا کوئی عزیز اور رشتہ دار کیوں ان کے جسد خاکی کو لینے اور دفن کرنے کے لیے نہیں آیا ایک عجیب معمہ ہے جب کہ پاکستانی ہائی کمشنر ان سے واقف تھا اور وہ پاکستانی شہری بھی تھے۔ تاہم ضروری کارروائی کے بعد علاقہ کے کچھ مسلمانوں نے انھیں وسرے بروک ووڈ کے قبرستان میں دفن کر دیا۔ یوں اکیاسی سال کی عمر میں انتہائی الجھے ہوئے حالات کے ساتھ مسلم امہ کے ایک عظیم فرزند عبداللہ یوسف علی کی زندگی کا دردناک اختتام ہوا[104]۔ یہ عظیم مصنف واسکالر، بے غرض مبلغ اسلام، گونا گوں شخصیت کے مالک اور نابغہ روزگار کو ہمیشہ ہمیشہ کے لیے یورپ کی سرزمین میں دفن کر کے چھوڑ دیا گیا۔ ان کے قریب ہی ایک اور ممتاز مسلم دانشور اور قران پاک کے انگریزی مترجم مارماڈیوک پکھتال دفن ہیں۔ ورثہ میں جو رقم انوگس نے چھوڑی تھی اس میں سے کچھ رقم سب سے چھوٹے بیٹے رشید یوسف علی کو ادائیگی کے بعد لندن یونیورسٹی میں ہندوستان کے طلباء کی تعلیم کے لیے مخصوص کر دی گئی۔

ازدواجی زندگی کے مصائب کے ستائے ہوئے، عبداللہ یوسف علی، ایک طرف اپنے بیوی بچوں کے اذیت آمیز رویہ کا شکار تھے، دوسری جانب برطانوی حکومت نے بھی اپنے اس محسن سے جو ظالمانہ بے رخی برتی، اس کی نظیر مشکل سے ملتی ہے۔ برطانوی حکومت ساری عمر انھیں اعزازات اور انعامات سے نوازتی رہی لیکن جب یہ لندن کی سڑکوں پر مفلس کی طرح بے یار و مددگار پھرتے تھے تو انھیں یوں نظرانداز کر دیا کہ اب ان کی افادیت باقی نہیں رہی۔[105]

سری کشن:

سری کشن صاحب رائے بالمکند صاحب کے فرزند ہیں جن کا تذکرہ قبل ازیں ہو چکا ہے سری کشن صاحب حیدرآباد میں تولد ہوئے یہاں تعلیم پائی وکالت میں کامیاب ہو کر وکالت کرنے لگے پھر انگلستان جا کر بیرسٹری کی ڈگری حاصل کی۔

سری کشن صاحب کو تعلیم سے بھی دلچسپی رہی اور سیاست سے بھی آپ شروع سے ان دونوں میدانوں میں حصہ لیتے رہے آپ کی زندگی ان اصحاب کے لیے ایک نمونہ اور مثال ہے جو ملک و قوم کے خدمت کا جذبہ رکھتے ہیں۔[106] سری کشن صاحب ضعیف ہونے کے بعد بھی میدان عمل سے کنارہ کش نہیں ہوئے ہیں اب تک بھی قوم اور ملک کی خدمت میں مصروف ہیں کئی کتابوں کے مصنف ہیں جن میں سے بعض یہ ہیں میری رخصت حیدر آباد سے ،میرا استعفا، میری تادیبی کارروائی وغیرہ۔آپ کی زندگی ہندو و مسلم اتحاد دکنی کلچر کا ایک مکمل نمونہ ہے، سری کشن صاحب نہ صرف خود کام کرنے والے ایک سچی محب وطن ہیں بلکہ ان کی وجہ سے کئی اصحاب نے میدان عمل میں آکر نام آوری حاصل کی ہے۔حیدرآباد کو تقسیم نہ کرنے کے متعلق آپ کی جدوجہد فراموش نہیں کی جاسکتی۔آپ کی عبارت کا نمونہ پیش ہے۔

> ملک کے معنی میں صرف ایک رقبہ جغرافیائی نہیں جو آج کل برنگ زرد طلبہ کے درس کے لیے جغرافیائی کتب میں درج ہے بلکہ اس کا خیال و تصور اس جذبہ واحساس پر مبنی ہے جس کی بنا پر ایک زمانہ میں خدا کی توفیق سے مملکت آصفیہ کا تسلط ہندوستان کے نصف حصہ پر رہا اور جو آئندہ بہ افضالِ الٰہی اپنی کھوئی ہوئی عظمت و سطوت کو حاصل اور اس میں دن دونی رات چوگنی اضافہ کرنا چاہتی ہے، ملک کے ساتھ مالک ورعایا کی ہم آہنگی ان دونوں کو بھی تصور میں لاتی ہے، تاریخی و تمدنی روایات خانوادہ آصفی کے ساتھ رعایائے ملک دکن کے جو تعلقات یک جہتی و محبت و عقیدت رہے ہیں ان کو ظاہر کرتی اور تقویت دیتی ہیں، آصف جاہوں کے درخشاں زمانے ان کی اپنی رعایا پر مشفقانہ اور مربیانہ نظر خود رعایا کی وفا شعاری، ایثار نفسی، جان نثاری، خودداری، بلند حوصلگی، ہمت و جواں مردی، ملک و مالک ورعایا کے لیے ہمیشہ باعث فخر و مباہات رہے اور اس وقت بھی شمع ہدایت کا کام دیتے ہیں کیوں کہ استحکام ملکی ان کی وجہ سے ہے۔[107]

ڈاکٹر عبداللطیف سعید:

محمد لطیف سعید ۹ فروری ۱۸۸۴ء میں حیدرآباد دکن میں پیدا ہوئے۔ابتدائی تعلیم گورنمنٹ ہائی اسکول چادر گھاٹ، حیدرآباد سے حاصل کی۔مدراس کے کرسچن کالج میں تعلیم کا سلسلہ بڑھایا،اور پھر حیدرآباد کے نظام کالج میں مزید تعلیم کے لیے داخلہ لیا،طبیہ کالج حیدرآباد میں بھی تعلیم پائی۔چوبیس سال کی عمر میں طب کی اعلیٰ تعلیم کے لیے ۱۹۰۸ء میں اڈنبرا کی یونی ورسٹی میں داخلہ لیا۔پہلے پہل اس کے اخراجات کا سارا بوجھ آپ کے والد برداشت کر رہے تھے،جو قریباً دو سو پونڈ سالانہ تھے،بعدازاں ڈاکٹر ملر کی سفارش پر حکومتِ حیدرآباد نے آپ کا تعلیمی وظیفہ منظور کیا۔

وہاں آپ کے خیالات میں وسعت پیدا ہوئی اور آپ میں سیاسی شعور بیدار ہوا، آپ نے وہاں اپنے ہم وطنوں کے حقوق کے تحفظ کے لیے آواز اٹھائی اور اس کام میں اجنبی ملک کے مقتدر لوگوں سے بھی نہ گھبرائے۔ آپ کے مزاج کی بے باکی اور حق پرستی نے آپ کی زندگی کا دھارا ترتیب دیا جس میں بہہ کر آپ بالآخر ایک عظیم انسان اور درد مند طبیب کے طور پر پہچانے گئے۔

۲۶ مئی ۱۹۱۵ء کو آپ "میڈیکل رجسٹریشن سرٹیفکیٹ" حاصل کر کے وطن واپس آئے۔ واپسی پر اپنے ساتھ دو دماغی مریضوں کو بھی لانے کی ذمہ داری تھی چناں چہ تین ہفتے کا بحری سفر کٹھن تھا پھر بھی آپ نے یہ نازک کام فرض شناسی سے انجام دیا۔

واپس آکر آپ کے لیے سرکاری ملازمت انجام دینا ضروری تھا کیوں کہ سرکار نے آپ کی تعلیم کے لیے رقم دی تھی۔ آپ کو عثمانیہ دواخانہ، افضل گنج میں سرجن کے طور پر مقرر کیا گیا۔ بعدازاں آپ کو سول سرجن کے طور پر نظام آباد، ناندیڑ اور کریم نگر بھیجا گیا۔ ہر جگہ آپ محنتی، درد مند اور فرض شناس طبیب ثابت ہوئے۔

بااثر عہدہ دار نواب معبود نواز جنگ کی بیٹی سے آپ کی شادی ہوئی۔ آپ کے ہاں چھے بچوں کی پیدائش ہوئی جن میں دو بیٹیاں اور چار بیٹے تھے۔

مختلف علاقوں میں مختلف عہدوں پر کام کرتے ہوئے آپ نے ایک شہری کے طور پر بھی اپنے کردار کو نبھایا۔ ایک بار جاسوسی کے لیے بڑی پیشکش کو آپ نے محض اپنے ضمیر کی آواز پر ٹھکرا دیا تھا۔ انگریز عہدہ دار بھی جب اپنی حدود سے تجاوز کرتے تھے تو آپ ان کے خلاف آواز اٹھانے سے کبھی نہیں گھبرائے، ہاں آپ نے اس کی بڑی قیمت بھی ادا کی۔ ایک بار ان کے سینئر ڈاکٹر جناب لنکاسٹر کی وداعی ایٹ ہوم کی تقریب میں آپ نے تقریر کے دوران کہا کہ ڈاکٹر لنکا یہاں کے ماحول اور کام میں رکاوٹوں کی وجہ سے مشکلات کا شکار رہے، اب ان کی وداعی کے موقع پر میں بجائے افسوس کے خوشی محسوس کرتا ہوں۔

لیکن آپ کے ان الفاظ کو حکومت نے نامناسب تنقید سمجھا اور آپ سے وضاحت طلب کی جس کے جواب میں ۱۹۱۹ء میں آپ نے استعفیٰ لکھ بھیجا، جو منظور کر لیا گیا۔

سرکاری ملازمت سے فراغت کے بعد آپ پرائیویٹ پریکٹس کے لیے مدراس چلے گئے لیکن وہاں کی اجنبی فضا سے گھبرا کر جلد واپس آنا پڑا۔ اب آپ کا تقرر جامعہ ملیہ میں ہوا جہاں آپ استاد کی حیثیت سے پڑھانے پر مامور

ہوئے لیکن اس کا مشاہیرہ بہت کم ہونے کی وجہ سے آپ نے یہ ملازمت قبول نہ کی۔ رابندر ناتھ ٹیگور نے شانتی نکتین کے لیے آپ کی خدمات حاصل کرنا چاہیں لیکن مشاہیرہ کا معاملہ یہاں بھی مانع ہوا۔

اس عرصہ میں آپ نے قوم کے حق میں آواز اٹھانے کا کام بھی زور و شور سے جاری رکھا کیوں کہ اب کوئی سرکاری ملازمت تو تھی نہیں آپ جو چاہتے کھل کر کہہ ڈالتے۔ اس حوالے سے ایک واقعہ مشہور ہے کہ ایک بار حکومتِ آصفیہ کے صدر الصدور، صدر یار جنگ شیروانی نے علی گڑھ کالج کے طالب علموں کو گاندھی جی کی قیدت میں چلنے والی تحریکِ ترکِ موالات میں اس وجہ سے حصہ لینے سے منع کیا کہ گاندھی مسلمان نہیں بلکہ مشرک ہیں۔ اس بیان کی خوب تشہیر ہوئی تو لطیف سعید صاحب نے اس کا جواب دینے کے لیے ۶ نومبر ۱۹۲۰ء کو "اخبارِ ہندو' مدراس" کو ایک خط میں لکھا کہ اگر صدر یار جنگ کا استدلال درست ہے تو کیوں کر بڑے علما بشمول علمائے دیوبند، گاندھی جی کی قیادت کو قبول کر چکے ہیں۔ آپ نے یہ بھی کہا کہ گاندھی جی کا کردار خدا کی نظروں میں آج کے ہندوستانی مسلمانوں میں سے اکثروں سے بہتر ہے۔ اس مکتوب کی اشاعت کے ایک ہفتہ میں ہی آپ کو کوئی وجہ بتائے بغیر شہر بدر کر دیا گیا۔ 108

آپ دوبارہ مدراس چلے گئے اور کچھ ماہ کے بعد مسولی پٹم۔ ۵ مارچ ۱۹۲۱ء کو آپ نے نظام کو ایک معروضہ پیش کیا جس کے بعد آپ کی شہر بدری کا حکم غیر مشروط طور پر منسوخ کر دیا گیا۔

جب مہاراجہ سر کشن پرشاد وزارت عظمیٰ پر فائز ہوئے تو آپ نے لطیف سعید کے ساتھ ہونے والی زیادتیوں کی تلافی کے لیے آپ کی ملازمت بحال کرنے کی منظوری دی لیکن محکمہ صحت نے اس کارروائی کو دبا دیا۔ اب لطیف سعید نے اپنے شہر میں رہ کر طبابت کا پیشہ اختیار کیا اور کامیاب رہے اور خوب نام کمایا کہ شہر کے مقتدر اور امیر لوگ بھی اپ سے علاج کرواتے تھے لیکن آپ نے کبھی ان سے ناجائز فائدہ حاصل کرنے کی کوشش نہ کی، صرف فیس کو کافی سمجھا۔ نادار مریضوں کا مفت علاج کر دیتے تھے۔ 109

۱۹۳۸ء میں نظام حکومت کے خلاف سیاسی تحریک شروع ہوئی تو آپ نے اس سے اصولی اختلاف کیا اور کہا کہ یہ فرقہ ورانہ تحریک ہے اس لیے سب کو اس شورش سے باز رہنا چاہیے۔ ڈاکٹر لطیف سعید کے فرماں روائے دکن ،نواب میر عثمان علی خان سے ذاتی تعلقات بھی ہو گئے تھے۔ سرکار سے اختلاف کے باوجود آپ میر عثمان کی سادگی اور وسعت نظری کو سراہتے تھے۔ ۲۹ جولائی ۱۹۴۴ء میں دربار سے آپ کو "سعید یار جنگ" کا خطاب بھی ملا۔ ۱۹۴۶ء میں آپ اس دارِ فانی سے کوچ کر گئے۔

سید حیدر رضا زیدی:

مولوی سید حیدر رضا صاحب زیدی۔ ایم۔اے (آکسن) بیرسٹر ایٹ لا، غالباً وہ پہلے ہندوستانی ہیں جو بالکل بے سروسامانی کے عالم میں انگلستان پہنچے اور محض اپنی قابلیّت سے نہ صرف کھایا کمایا بلکہ اعلیٰ ترین تعلیم بھی حاصل کی اور اس کے بعد انگلستان ہی میں متوّطن ہو کر بیرسٹری شروع کر دی۔ اپنے تیئیس سال کے طویل قیام میں آپ نے بہت غائر نظر سے یورپ کے حالات کا مطالعہ کیا ہے۔ انگلستان سے مراجعت کے بعد آپ نے حیدر آباد میں پریکٹس شروع کی ہے۔ آپ کا قیام یورپ و انگلستان میں ۱۹۰۹ء تا ۱۹۳۲ء رہا۔

سید محمد حسین جعفری:

سید محمد حسین جعفری کے والد سید یاور علی خان تھے جو جاگیر دار اور منصب دار تھے۔ آپ کے آباواجداد مہا راجہ چندولال کے دور وزارت میں حیدر آباد میں رہائش پذیر ہوئے تھے۔ سید محمد حسین جعفری ۱۸۸۷ء میں حیدر آباد میں ہی پیدا ہوئے۔ آپ کی تعلیم و تربیت آپ کے دادا نواب باقر نواز جنگ بہادر کے زیرِ سایہ ہوئی۔ زمانے کے رواج کے مطابق آپ کی ابتدائی تعلیم عربی اور فارسی سے ہوئی۔ یہ درس ختم کر کے آپ نے میٹرک کا امتحان پاس کیا اور اعلیٰ تعلیم کے لیے انگلستان چلے گئے جہاں کی آکسفورڈ یونی ورسٹی سے آپ نے بی اے کا امتحان پاس کیا[110]۔ آکسفورڈ میں آپ وہاں کی اسلامک سوسائٹی کے معتمد اور بعدازاں اُس کے صدر نشین رہے، آپ کا قیام، انگلستان میں ۱۹۱۲ء تا ۱۹۱۶ء رہا۔[111]

وطن واپس آکر آپ سرکارِ عالی کے محکمہ تعلیمات میں مددگار ناظم کی حیثیت سے مقرر ہوئے۔ قریباً ڈیڑھ سال تک اس عہدہ پر کام کرنے کے بعد آپ مدرسہ فوقانیہ میں صدر مدرس ہو گئے۔ اس عہدے پر سات سال تک ورنگل اور اورنگ آباد میں خدمات سرانجام دیتے رہے۔ اس کے بعد آپ ضلع عثمان آباد میں مہتمم تعلیمات (انسپیکٹر آف اسکولز) بن گئے اور اس کے کچھ ہی عرصے کے بعد آپ کو صدرِ مہتمم تعلیمات (ڈویژنل انسپیکٹر آف اسکولز) کے طور پر ترقی مل گئی، آپ نے ان دونوں حیثیتوں سے مجموعی طور پر ساڑھے چار سال صرف کیے۔ جب نائب ناظمِ تعلیمات خان فضل محمد خان واپس پنجاب چلے گئے تو ان کے عہدے پر آپ کو ترقی مل گئی۔ اس کے بعد جب نواب مسعود یار جنگ بہادر سیاحت کے لیے جاپان روانہ ہوئے تو آپ نے کچھ عرصہ تک ان کی جگہ عبوری ناظم کی خدمات سرانجام دیں۔ نواب مسعود یار جنگ بہادر کے بعد خان فضل محمد خان ناظمِ تعلیمات بن گئے اور آپ نائب ناظم تعلیمات کے طور پر کام کرتے رہے[112]۔ مولوی سید محمد حسین صاحب جعفری بی۔اے (آکسن) ناظمِ تعلیمات سرکارِ

عالی ایک وسیع تعلیمی تجربہ کے مالک ہیں۔آپ نے فنِ تعلیم پر کئی بلند پایہ کتب و مضامین تحریر فرمائے ہیں۔آپ کی کتابوں میں سب سے اہم و قابلِ ذکر ''ڈنمارک* کا طریقۂ تعلیم'' ہے۔ یہ کتاب آپ نے بہ زبان انگریزی، ڈنمارک کے حالات کا تفصیلی مطالعہ کر کے تالیف فرمائی ہے۔[113]

اپنی ملازمت کی مصروفیات کے باوجود آپ کتابیں پڑھتے رہتے تھے۔ عربی ادب کے مطالعہ سے بھی آپ کو خاصی دلچسپی رہی۔آپ نے بہت سے مضامین، خطبات اور کتابوں کی صورت میں اپنے حاصلاتِ مطالعہ ظاہر کیے۔ معلمین کے رسالے "المعلم" کی ادارت کے فرائض بھی آپ نے انجام دیے[114]۔ جنگِ بلقان کے وقت انجمنِ ہلالِ احمر کے کام میں عملی حصہ لینے کے لیے آپ ترکی تشریف لے گئے تھے[115]۔

محمد عبدالرحمٰن خان:

مولوی محمد عبدالرحمٰن خان ۱۸۸۱ء میں محلہ مختار گنج[116]، حیدرآباد دکن میں پیدا ہوئے[117]۔ مولوی سید منظر علی صاحب نے آپ کی تاریخِ پیدائش ۱۵اکتوبر ۱۸۸۳ء درج کی ہے[118]۔ آپ کے آباؤاجداد جن کا پیشہ سپہ گری تھا، مدراس کے رہنے والے تھے۔آپ نے گھر میں فارسی کی تعلیم حاصل کی اور فارسی علم وادب میں آپ کی دلچسپی ہمیشہ قائم رہی۔آپ نے مدرسہ عالیہ نظام کالج (مدراس یونی ورسٹی) سے بی اے کیا[119]۔آپ ذہین اور قابل طالب علم تھے، ہر امتحان میں امتیازی حیثیت میں کامیاب ہوئے۔ ۱۹۰۴ء میں آپ درس وتدریس کے شعبے سے منسلک ہو گئے اور نظام کالج میں طبعیات پڑھانے پر مامور ہوئے[120] ساتھ ہی تاریخِ اسلام اور یورپ کی تاریخ کا مطالعہ کرتے رہے[121]۔

چند سال ہی گزرے ہوں گے کہ آپ نظام کالج میں اسسٹنٹ لیکچرر کی ملازمت چھوڑ کر انگلستان چلے گئے[122] جہاں 'رائل کالج آف سائنس، لندن' میں سائنس اور ریاضی کی مزید تعلیم حاصل کی، دو سال میں اس کالج سے ایسوسی ایٹ آف سائنس ہو گئے اور ساتھ ہی لندن یونی ورسٹی سے طبعیات میں بی ایس سی کیا۔انگلستان میں آپ نے سائنس اور ریاضی کے مشہور اساتذہ سے فیض حاصل کیا اور تعریفی اسناد بھی حاصل کیں۔آپ نے دو بار انگلستان کا سفر کیا[123]، اپنے انگلستان کے قیام کے دوران آپ نے نہ صرف یورپ کے شہروں کو دیکھا، وہاں کے تاریخی مقامات کی سیر کی اور مشہورِ آفاق لوگوں سے ملے بلکہ ان کے تعلیمی اداروں کے نظام کا بھی گہرائی سے مشاہدہ کیا۔اس قیام میں آپ کو قسطنطنیہ (استنبول-ترکی) اور مصر کی سیر کا بھی موقع ملا۔

۱۹۲۷ء میں جب یونی ورسٹی کالج لندن کی جشنِ صد سالہ کی تقریب ہوئی تو آپ جامعہ عثمانیہ کے مندوب کی حیثیت سے اس میں شریک ہوئے۔[124]

وطن واپس آکر آپ نے ملک میں سائنسی تعلیم کے نظام کی بہتری کے لیے کوششیں کیں اور اپنے علم اور مشاہدے سے سینکڑوں طلبہ واساتذہ کو مستفید کیا۔[125]

۱۹۲۴ء میں آپ عثمانیہ کالج کے پرنسپل مقرر ہوئے، اربابِ حکومت کو راضی نہ رکھ پائے اور ۱۹۳۵ء میں ملازمت سے سبک دوش ہو گئے۔[126] اس عرصہ میں آپ نے جامعہ کے لیے بی ایس سی کی طبیعات کی کئی کتابیں تصنیف و ترجمہ کروائیں۔[127] آپ عثمانیہ یونی ورسٹی کے فیلو، سینڈی کیٹ اور سینیٹ کے رکن[128] اور صدر خانہ نظامیہ کی علمی اور فنی کمیٹی کے پریذیڈینٹ رہے۔ آپ بارہا نظام کالج کے منصرم اور پرنسپل بھی رہے۔[129]

سرکاری ملازمت سے کنارہ کرنے کے بعد تحقیق کے میدان میں مصروفِ عمل ہو گئے اور تاعمر اسی کام میں مصروف رہے۔

آپ اردو اور فارسی کے خوش فکر شاعر بھی تھے اور ضمیر تخلص کرتے تھے، 'مرقّع خیالات' کے نام سے آپ کا فارسی اور اردو کلام پر مشتمل مجموعہ موجود ہے، ادب کے میدان میں 'ضمیر' کے عنوان سے آپ نے انگریزی زبان میں ایک ڈراما بھی لکھا تھا جو کتابی صورت میں چھپا[130]، آپ کی خود نوشت سوانح عمری بھی قابلِ ذکر ہے۔[131] اس کے علاوہ آپ قرونِ وسطیٰ کے مسلمانوں کے علمی کارناموں پر اردو اور انگریزی میں فکر انگیز مقالے بھی لکھے۔ آپ نے بڑی تعداد میں "دارالترجمہ" کے لیے دس بارہ علمی اور سائنسی کتب کا ترجمہ کیا۔[132] سائنسی علوم کے لیے آپ نے ہزار ہا فنی اصطلاحیں اردو میں وضع کیں[133]۔ آپ کی دیگر تصنیفات و تالیفات میں 'خلاصہ تحفۃ النظار'، 'مقالاتِ سائنس' اور 'مسلم شاہی خاندان اوران کے سلسلے' جولین پول کی کتاب کا ترجمہ ہے، شامل ہیں۔[134] ایک کتاب آپ نے فنِ آواز پر بھی لکھی جو اپنی جامعیت اور طرزِ بیان کے لحاظ سے عمدہ ہے۔[135]

ذاتی تصنیف و تالیف کے علاوہ آپ نے جامعہ عثمانیہ میں علمی و ادبی ذوق کی بھی آبیاری کی چناں چہ اس جامعہ کے اکثر و بیشتر تعلیم یافتہ طالب علم آپ کی ہمت افزائی اور رہنمائی کے باعث بعد میں بڑے ادیب، محقق اور مؤلف بنے۔ یورپ اور امریکہ سے چھپنے والے اعلیٰ پائے کے رسائل میں فلکیات کے موضوع پر آپ کی تحقیق شائع ہوتی رہی، حیدر آباد ایجوکیشنل کانفرنس اور حیدر آباد اکیڈمی کے بھی صدر رہے۔ اپنے دور میں حیدر آباد دکن کے عظیم ترین سائنس دان اور عالم شمار ہوتے تھے۔[136]

نواب سعادت جنگ بہادر، صدر ناظم مال صوبہ اورنگ آباد کی بیٹی سے ۱۹۱۷ء میں آپ کی شادی ہوئی۔آپ کے دو بیٹے عبدالمجید خان اور عبدالوحید خان ہیں۔[137]

ڈاکٹر سید حسین:

ڈاکٹر سید حسین متمدّن دنیا میں بحیثیت جرنلسٹ، مقرّر و سیاست دان بے حد مشہور و مقبول ہیں۔آپ ہندوستان میں اخبار "انڈی پنڈنٹ" اور امریکہ میں "نیو اورینٹ میگزین" کے ایڈیٹر تھے۔ڈاکٹر سید حسین ہندوستانی وفد کے ان تین ارکان میں سے ایک ہیں جو صلح نامہ سیورس کے وقت ترکی سے متعلق ہندوستانی زاویہ نظر کو پیش کرنے یورپ روانہ کیا گیا تھا۔واشنگٹن کانفرنس میں آپ نے ہندوستانی صحافت کی نمائندگی بھی کی ہے۔

۱۹۱۵ء کے بعد سے آپ امریکہ میں متوّطن اور وہاں کی جنوبی کیلی فورنیا کی جامعہ میں اسلامی تاریخ و تمدّنِ ہند کے لکچرار رہے۔امریکہ میں آپ کی حیثیت ہندوستان کے ایک غیر سرکاری سفیر کی تھی۔مادرِ ہند جیسی کتابوں کے مبالغہ آمیز پروپگنڈے کے ازالہ میں آپ نے نمایاں حصہ لیا ہے۔ڈاکٹر سید حسین ۱۹۳۰ء کے عشرے میں ایک بار کسی تقریری سفر کے سلسلہ میں ہندوستان تشریف لائے تھے اور جامعہ عثمانیہ کے زیرِ اہتمام حیدرآباد میں بھی آپ کی توسیعی تقاریر ہوئی تھیں۔

سجاد مرزا:

سجاد مرزا ۱۸۹۶ء میں حیدرآباد میں پیدا ہوئے۔آپ کے والد کا نام مولوی عزیز مرزا تھا جو مسلم یونی ورسٹی علی گڑھ کے ان طالب علموں میں سے تھے جنھوں نے سر سیّد کی آنکھوں کے سامنے تعلیم حاصل کی اور جنھیں حیدرآباد نے خصوصیت سے بلا کر خدمت سپرد کی۔[138] آپ کے خاندان کو شمار حیدرآباد کے اعلیٰ تعلیم یافتہ، معزز اور ممتاز لوگوں میں ہوتا تھا۔آپ نے ابتدائی تعلیم ہندوستان میں ہی حاصل کی اور اعلیٰ تعلیم کے لیے انگلستان روانہ ہو گئے۔کنٹب سے آپ نے ایم اے آنرز کیا اور لندن سے سی ٹی کیا۔آپ کا قیام انگلستان میں ۱۹۱۸ء تا ۱۹۲۰ء رہا۔آپ نے ۱۹۲۵ء میں جاپان کی اور ۱۹۳۷ء میں یورپ و ترکی کی سیاحت بھی فرمائی ہے۔[139]

وطن واپس آنے کے بعد ۱۸ فروری ۱۹۲۱ء کو آپ صدرِ مدرس کے طور پر مدرسہ فوقانیہ، عثمانیہ اورنگ آباد میں تعینات ہوئے۔۱۹۲۲ء سے ۱۹۲۶ء تک آپ صدر مہتمم تعلیم کی حیثیت سے خدمات دیتے رہے۔۱۹۲۷ء میں مدرسہ فوقانیہ چادر گھاٹ کے پرنسپل بن گئے، کئی سال تک آپ نے ادارہ کا انتظام خوبی سے سنبھالے رکھا۔آپ کی

حسنِ کارکردگی اور اعلیٰ انتظامہ قابلیت کی وجہ سے آپ کے ادارہ نے تعلیمی اور تفریحی سرگرمیوں میں شان دار نتائج ظاہر کیے۔۲۸ فروری ۱۹۲۹ء میں آپ کو ٹیچرز ٹریننگ کالج بلدہ کا پرنسپل بنادیا گیا[140]۔ ترقی کی منزلیں طے کرتے ہوئے آپ ایجوکیشن ڈائریکٹر کے عہدے تک پہنچے اور پھر ایجوکیشنل سیکرٹری کے طور پر اپنی ملازمت کا عرصہ پورا کر کے سبک دوش ہوئے۔ آپ بین الاقوامی شہرت کے حامل ماہرِ تعلیم تھے اس لیے یونیسکو(UNESCO) نے اپ کو اپنا مشیرِ تعلیم بنالیا۔ یہ خدمت بھی آپ نے عمدگی سے ادا کی[141]۔

آپ ادیب اور مقرر بھی تھے۔اساتذہ کے جریدہ "المعلم" کی ادارت بھی آپ نے عمدگی سے سر انجام دی۔ آپ کے تعلیمی موضوعات پر لکھے گئے مضامین اور کتابیں بیش قیمت خزانہ ہیں۔ آپ کی اکثر تالیفات اور تصانیف نصاب میں داخل رہیں۔ آپ کا "اُردو کا قاعدہ" اُردو کا بہترین قاعدہ سمجھا جاتا ہے جس میں بچوں کی فطرت ان کے ذوق اور میلانِ طبع کو خاص طور پر ملحوظ رکھا گیا ہے[142]۔ آپ کی طبیعت سنجیدہ، متین، حلیم اور سادہ تھی[143]۔ آپ کی علمی خدمات کا یہ عالم تھا کہ آپ کے اپنی جیب سے انجمن ترقی اردو کے لیا ایک ہال تعمیر کروایا تھا۔ ہندوستان میں جب ترکِ موالات کی تحریک چلی تھی اس زمانے سے آپ دیسی کپڑا پہنا کرتے تھے۔ اپنا رسالہ بھی دیسی کاغذ پر نکالتے، تحریر اور خط و کتابت کے لیے بھی دیسی کاغذ استعمال کرتے[144]۔

آپ کے بارے میں تمکین کاظمی کے الفاظ ملاحظہ ہوں؛

> بڑی سوجھ بوجھ کے مالک ،نہایت ہی دماغ دار اور شگفتہ مزاج، دوست نواز، وضع دار اور حلیم الطبع بزرگ ہیں۔ ملنے جلنے کی بھی ایک خاص وضع رہتی ہے اور جس سے جیسے مراسم ہوتے ہیں اسی طرح آپ ملاقات بھی رکھتے ہیں۔ لوگوں سے سینکڑوں کتابیں لکھوادیں مگر آپ نے کوئی کتاب اپنے نام سے نہیں چھپوائی۔ نام و نمود سے قطعاً متفق نہیں ہیں۔[145]

قادر حسین خان:

آپ جنوبی ہند کے ایک معزز خاندان میں ۴ اپریل ۱۸۹۰ء میں پیدا ہوئے[146]۔ مولوی قادر حسین خان صاحب۔ ایم۔ اے، بیرسٹرایٹ لا، نظام کالج کے پرنسپل اور جامعہ مدراس کے سینٹ، اکاڈمک کونسل اور سنڈیکیٹ کے رکن ہیں۔ آپ سررشتہ معلوماتِ عامہ سرکارِ عالی کے ۱۹۱۳ء تا ۱۹۳۴ء ناظم رہ چکے ہیں۔ معاشیات و نظمِ عامہ آپ کے خاص مضامین ہیں جن پر آپ نے جامعہ آکسفورڈ، لندن اور پیرس میں تحقیقات بھی فرمائی ہیں۔ انگلستان میں آپ کا قیام ۱۹۲۰ء تا ۱۹۲۸ء رہا[147]۔

ابتدائی تعلیم آپ نے ہندوستان سے ہی حاصل کی لیکن اعلیٰ تعلیم کے لیے یورپ چلے گئے جہاں آپ نے معاشیات کی اعلیٰ تعلیم حاصل کرنے کے ساتھ قانون میں بھی بار ایٹ لاء کیا۔ ۱۹۳۰ء میں آپ وطن واپس تشریف لائے اور سرکارِ عالی کے محکمہ تعلیم میں معاشیات کے پروفیسر کی حیثیت سے نظام کالج میں تدریس کے فرائض انجام دینے لگے۔ آپ کی انتظامی صلاحیتوں کی بدولت جلد ہی آپ اس کالج میں نائب پرنسپل بن گئے۔ ۱۹۳۲ء میں آپ کی خدمات محکمہ تعلیم سے محکمہ معلوماتِ عامہ میں منتقل کر دی گئیں یہاں محمد مارماڈیوک پکھتال ناظم تھے، ان کی جگہ آپ کو ناظم مقرر کیا گیا۔[148]

آپ کی فطری صلاحیتوں نے اس محکمہ میں بھی آپ کو کامیاب بنا دیا۔ آپ نے محکمہ معلوماتِ عامہ کے ہر شعبہ کی اصلاح کی اور چند ہی ماہ میں کئی نئی اور بہتر ذمہ داریاں اٹھانے کے قابل بنا دیا۔ اس محکمہ کا کام حیدر آباد کی سرکاری سرگرمیوں کے بارے میں باہر کے لوگوں کو آگاہ کرنا، اخبارات میں چھپنے والی تنقید پر متعلقہ محکموں کی توجہ دلانا اور غلط اطلاعات کی مستند تردید کرنا تھا جن کو آپ نے نہایت عمدگی اور ذمہ داری سے ادا کیا[149]۔ جب مولوی مرزا علی یار خان المخاطب بہ نواب علی یاور جنگ بہادر نظامتِ معلوماتِ عامہ پر فائز ہوئے تو آپ اپنے کالج میں اپنے کام پر واپس آ گئے جہاں آپ وائس پرنسپل اور معاشیات کے پروفیسر کی حیثیت سے خدمات سرانجام دے رہے تھے۔ ۱۹۳۸ء میں آپ نے اس کالج کے پرنسپل کی ذمہ داری سنبھال لی تھی جس کو آپ عمدگی سے نبھاتے رہے۔[150]

حسن علی مرزا:

پروفیسر حسین علی مرزا، بیرسٹر ایٹ لا، جامعہ عثمانیہ کے شعبۂ قانون کے صدر ہیں۔ آپ کو اصولِ تعلیم سے بے حد دلچسپی ہے اور انگلستان کے حالات کا آپ نے غائر نظر سے مطالعہ کیا ہے۔ قانون بین الاقوام اور تاریخ دستوری آپ کے خاص مضامین ہیں۔ "وفاق اور حکومتِ ہند" پر آپ نے انگریزی زبان میں ایک کتاب بھی تحریر فرمائی ہے جو زیرِ طبع ہے۔ آپ کا قیام انگلستان میں ۱۹۲۰ء تا ۱۹۲۴ء رہا۔

ڈاکٹر جے سوریا:

ڈاکٹر جے سوریا۔ ایم۔ ڈی (برلن) مسز سروجنی نائڈو کے فرزندِ اکبر ہیں۔ پیشہ کے لحاظ سے آپ ڈاکٹر ہیں لیکن معاشیات و اقتصادیات سے بھی آپ کو غیر معمولی دلچسپی ہے اور ان علوم میں آپ کو اچھی بصیرت حاصل ہے۔

اپنے تیرہ سالہ قیام یورپ میں آپ نے جرمنی، روس، انگلستان اور دیگر یورپی ممالک کا غائر نظر سے مطالعہ کیا ہے۔ آپ کا قیام یورپ میں ۱۹۱۲ء تا ۱۹۳۴ء رہا۔

سید محمد ہادی:

سید محمد ہادی ۱۲ اگست ۱۸۹۹ء میں پیدا ہوئے۔[151] آپ کے والد ریاست حیدر آباد میں پائے گاہ لشکر میں افسر تھے۔ ایس ایم ہادی کی عمر دو سال کی تھی کہ آپ کے والد کا انتقال ہو گیا تو آپ کی تعلیم و تربیت کی ذمہ داری وزیر اعظم سر عثماں جاہ اور ان کے بیٹے نواب معین الدین دولہ نے لے لی۔ ان کے زیر سایہ آپ نے کھیلوں کے میدان میں اچھی کارکردگی دکھائی۔[152] آپ کو گھڑ سواری اور پولو کھیلنے میں بہت کم عمر میں ہی مہارت حاصل ہو گئی تھی۔ جب آپ نظام کالج میں طالب علم بنے تو فٹ بال بھی کھیلنے لگے۔ کھیل میں آپ کی اچھی کارکردگی کو دیکھتے ہوئے عثمان جاہ کے خاندان نے آپ کو انگلستان بھیج دیا۔ کیمرج سے آپ نے ایم اے کی ڈگری حاصل کی اور پنسیل وینیا کی یونی ورسٹی سے بھی ماسٹرز کیا۔[153]

کیمرج میں آپ نے ٹینس میں حصہ لیا اور شہرت حاصل کی۔ ہمایونی نے یہ خبر سنی تو ۱۹۳۱ء میں آپ کو ڈیڑھ سو پونڈ کا عطیہ دیا اور ساتھ میں ہدایت کی کہ کھیلوں سے تعلیم میں ہرج واقع نہ ہو۔ یوں آپ کے وظیفہ میں مزید ڈیڑھ سال کی مدت اور ایک سواسی پونڈ بڑھا کر آپ کو فزیکل کلچر کا چھے ماہ کا کورس کرنے کے لیے امریکہ بھیجا گیا۔ ایک سال کی مدت پر مشتمل ٹیچرز ڈپلوما کے لیے ۱۹۳۲ء میں آپ کیمرج میں داخل ہوئے تو آپ کو چار سو پونڈ کا سالانہ وظیفہ ملا۔ وطن واپس آکر آپ بوائے اسکاؤٹس کے ناظم مقرر ہوئے۔[154]

کیمبرج یونی ورسٹی کے پیٹر ہاؤس میں تعلیم حاصل کرتے ہوئے آپ نے بین الاقوامی دور کا آغاز کیا اور کیمبرج بلیو بننے کے لیے سخت محنت کی۔ آپ نے اپنی یونی ورسٹی کو آکسفورڈ یونی ورسٹی کی ٹیم اور دورے پر آئی ہوئی امریکی ٹیم کے مقابلے میں سلسلے وار متوحات دلائیں۔ آپ نے فیلڈ ہاکی، فٹ بال اور ٹیبل ٹینس میں "یونی ورسٹی کلرز" کا اعزاز بھی حاصل کیا۔ یونی ورسٹی میں جب آپ کو کیمرج کی ٹیم کا کپتان بنانے سے اس لیے منع کر دیا گیا کہ آپ ہندوستانی ہیں تو آپ نے ۱۹۲۴ء اور ۱۹۲۵ء کے ڈیوس کپ میں ہندوستان کی طرف سے حصہ لیا۔ اس کے علاوہ ومبلڈن میں پانچ سال تک اپ نے ہندوستان کی نمائندگی کی۔ آپ اولمپکس (۱۹۲۴ء سمر اولمپکس) میں ٹینس کے کھلاڑی کی حیثیت سے مقابلہ کرنے والے پہلے ہندوستانیوں میں شامل تھے۔ کئی کھیلوں میں کامیاب ہونے کی وجہ سے آپ کو "رین بو ہادی" بھی کہا جاتا ہے۔[155] انگلستان میں آپ کا ابتدائی قیام ۱۹۱۲ء تا ۱۹۲۵ء رہا۔ اس کے بعد ۱۹۲۹ء، ۱۹۳۱ء میں بھی آپ نے

یورپ اور امریکہ کا سفر کیا ہے۔ ۱۹۳۲ء میں ہندوستانی کرکٹ ٹیم کے ہمراہ اس کے خازنِ اعزازی کی حیثیت سے آپ انگلستان تشریف لے گئے تھے۔[156]

آپ نے حیدرآباد میں فرسٹ کلاس کرکٹ کے بھی کئی میچز کھیلے۔ ۱۹۳۴ء میں ہندوستان میں جب "رانجی ٹرافی" کا آغاز ہوا تو آپ سنچری بنانے والے پہلے بیٹس مین بنے۔ ۱۹۳۹ء/۱۹۴۰ء میں آپ حیدرآباد فٹ بال ایسوسی ایشن اور حیدرآباد کرکٹ ایسوسی ایشن کے بانی ممبر تھے۔ کھلاڑی کے طور پر بھرپور خدمات سرانجام دینے کے بعد بھی آپ سپورٹس کے ساتھ جڑے رہے اور نئے کھلاڑیوں کو کھیل کے گر سکھاتے رہے۔ ۱۹۵۹ء میں جب آل انڈیا کونسل آف اسپورٹس کی تشکیل ہوئی تو آپ اس کے پہلے سیکرٹری تھے۔ آپ حیدرآباد میں ڈائریکٹر آف فزیکل ایجوکیشن رہے اور بعد ازاں حکومتِ ہند میں تعلیم کے جوائنٹ سیکرٹری بن گئے۔ بوائے اسکاؤٹس کی تنظیم کے آپ فعال ممبر تھے، آپ کو "ووڈ بیج (WOOD BADGE)" بھی ملا تھا، اس کے علاوہ آپ اس تنظیم کے نیشنل کمشنر بھی تھے۔

۱۴ جولائی ۱۹۷۱ء میں حیدرآباد میں پھیپھڑوں کے کینسر سے آپ کا انتقال ہوا تو آپ کی عمر اکہتر سال تھی۔[157]

ڈاکٹر خلیفہ عبدالحکیم:

ڈاکٹر خلیفہ عبدالحکیم علم و فضل، فلسفہ اور ادب کے میدان میں منفرد حیثیت رکھتے ہیں۔ اپنے دور میں آپ کا شمار برصغیر کے معروف فلسفیوں میں ہوتا تھا، مغرب اور مشرق کے فلسفہ سے بخوبی آشنا تھے۔ آپ ۱۲ جولائی ۱۸۹۴ء کو لاہور میں ایک کشمیری گھرانے میں پیدا ہوئے۔ ان کے والد کا نام خلیفہ عبدالرحمٰن تھا اور وہ پشمینے کا کاروبار کرتے تھے۔[158]

ڈاکٹر خلیفہ عبدالحکیم کا تعلق کشمیریوں کی مشہور گوت ''ڈار'' سے تھا۔ ان کے بزرگ ہندو راجوں کی افواج میں نمایاں مقام کے حامل تھے۔ سکھوں کے عہد میں ان کے دادا کشمیر سے ہجرت کر کے لاہور (پنجاب) میں سکونت پذیر ہوئے۔ لاہور میں ان کی رہائش محلہ چہل بیبیاں، اندرونِ اکبری دروازہ میں تھی۔ کشمیر میں حکیم صاحب کے بزرگ پشمینے وغیرہ کا کام کرتے تھے اور اکثر لوگ اس ضمن میں ان سے اکتساب فن کی بنا پر انہیں ''خلیفہ'' (استاد) کے لفظ سے پکارتے۔ یوں یہ لفظ اس خاندان کے افراد کے ناموں کا پہلا جز ٹھہرا۔[159]

ابتدائی تعلیم 'انجمنِ حمایتِ اسلام اسکول' اندرون موچی گیٹ لاہور میں حاصل کی۔ میٹرک کا امتحان اسلامیہ ہائی اسکول شیرانوالہ دروازہ سے پاس کیا[160]۔ لاہور سے ۱۹۱۱ء میں میٹرک کرنے کے بعد انھوں نے ایف سی کالج میں ایف ایس سی میں داخلہ لیا لیکن سائنس سے رغبت نہ ہونے کی وجہ سے ۱۹۱۳ء میں علی گڑھ سے ایف۔اے کیا، یہاں سال اول میں ہی آپ ڈبیٹ یونین کمیٹی کے صدر بنے، اور یہ پہلی مرتبہ ہوا تھا کہ کوئی جونئیر اس کمیٹی کا صدر منتخب ہوا۔ [161] پھر دہلی آگئے اور سینٹ سٹیفن کالج میں داخلہ لیا، آپ کا مضمون فلسفہ تھا۔ ۱۹۱۵ء میں بی اے کی ڈگری حاصل کی، پنجاب یونی ورسٹی میں فلسفہ کے مضمون میں اول آکر ریکارڈ قائم کیا، اس امتیاز پر آپ کو 'مہاراجہ قاسم بازار' کا تمغہ ملا۔ اس امتحان کے بہت سے ممتحنوں نے اعتراف کیا کہ انھوں نے فلسفے کا ایسا شان دار پرچہ آج تک نہیں دیکھا۔[162] وہاں سے ۱۹۱۷ء میں ایم۔اے کیا اور "رومی' پر فلسفے کا مقالہ لکھا، اس کے بعد لاہور آئے اور اسی سال لاء کالج میں داخلہ لیا اور ایل ایل۔بی کی ڈگری حاصل کی لیکن کبھی وکالت نہیں کی۔[163]

اس دوران میں وہ شعر و شاعری بھی کرتے رہے اور مشاعروں میں شرکت بھی کرتے رہے۔ کچھ عرصہ انگریزی اخبار "آبزرور(Observer)" کی ادارت کی، جس میں انھوں نے بڑے تند لہجے میں مسلمانوں سے متعلق انگریز حکومت کی پالیسیوں پر کڑی تنقید کی، جس کے نتیجے میں اخبار کی ضمانت ضبط ہوئی اور وہ بند کر دیا گیا[164]۔

اگست ۱۹۱۹ء میں علامہ اقبال کی سفارش پر حیدر آباد دکن میں نئی قائم شدہ عثمانیہ یونیورسٹی میں فلسفے کے اسسٹنٹ پروفیسر ہوگئے۔ ۱۹۲۲ء میں جرمنی گئے اور ۱۹۲۵ء میں ہائیڈل برگ یونیورسٹی سے فلسفہ میں ڈاکٹریٹ کی ڈگری حاصل کی۔ ان کے تحقیقی مقالے کا عنوان (Metaphysics of Rumi) "رومی کی مابعد الطبیعیات" تھا۔ بعد میں انھوں نے رومی پر کتابیں بھی شائع کیں۔

پی ایچ۔ڈی کرنے کے بعد وہ حیدر آباد واپس آکر عثمانیہ یونیورسٹی میں فلسفہ کے پروفیسر اور صدرِ شعبہ مقرر ہوئے۔ ۱۹۴۳ء میں امر سنگھ کالج سری نگر کے پرنسپل ہو کر کشمیر چلے گئے جہاں بعد میں ناظمِ تعلیمات بھی مقرر ہوئے۔ ۱۹۴۷ء میں مستعفی ہو کر واپس حیدر آباد آگئے جہاں انھیں ڈین آف آرٹس فیکلٹی مقرر کیا گیا۔ حیدر آباد دکن پر ہندوستان کے قبضہ کے بعد ۱۹۴۹ء میں وہ لاہور آگئے۔ فروری ۱۹۵۰ء میں ڈاکٹر صاحب کی کوششوں سے لاہور میں "ادارہ ثقافتِ اسلامیہ" قائم ہوا تو وہ اس کے پہلے ڈائریکٹر مقرر ہوئے۔[165]

آپ کی شخصیت کے بارے میں ڈاکٹر محمد سلیم کا کہنا ہے کہ خوش رُو، خوش وضع، خوش مزاج، سرخ و سپید، تنومند، جامہ زیب۔ گھر میں پاجامہ قمیص پہنا کرتے تھے اور سردیوں میں کشمیری دُھسا بھی استعمال کرتے

تھے۔ تقریبات میں شریک ہوتے تو قراقلی ٹوپی اور شیروانی پہنا کرتے تھے۔ ویسے عام طور پر کوٹ پتلون اور گرمیوں میں زیادہ تر ململ کا کرتا اور پاجامہ پہنتے۔ میٹھی اشیا کے بہت شوقین تھے۔ کھانے کے بعد سویٹ ڈِش ضرور ہوتی۔ دہی اور لسی سے بہت رغبت تھی۔ قیلولے کی عادت اس قدر مستقل تھی کہ اس دوران میں اگر کوئی ان سے ملنے آجاتا تو انکار کر دیتے۔ کہتے تھے جو شخص دوپہر میں آرام نہیں کرتا وہ اپنی زندگی سے دشمنی کرتا ہے۔ سہ پہر کو سو کر اٹھنے کے بعد چائے پینا بھی آپ کا معمول تھا۔ شام کو اکثر و بیشتر وقت گھر ہی پر گزارتے اور محوِ مطالعہ رہتے۔ کہتے تھے: 'خیر الجلیس فی الزمان کتاب' (دنیا میں کتاب سے بہتر رفیق کوئی دوسرا نہیں)۔[166]

۱۹۲۵ء میں آپ پی ایچ ڈی کی ڈگری لے کر وطن لوٹے۔ ۱۹۲۵ء سے ان کی ملازمت کا دوسرا دور شروع ہوتا ہے اور اب وہ صدر شعبہ فلسفہ بنا دیئے گئے۔ حیدر آباد میں ان کی زیادہ تر سرگرمیاں علمی اور تدریسی حد تک ہی رہیں۔ اس عرصے میں وہ یونیورسٹی کے جریدے "مجلہ عثمانیہ" میں وقیع مقالے لکھتے رہے۔ انھوں نے فلسفے کی بعض کتب کے اردو تراجم بھی کیے۔ اپنی انہی علمی، ادبی اور تدریسی سرگرمیوں کی بنا پر یونیورسٹی کے چوٹی کے اساتذہ میں شمار ہونے لگے۔

۱۹۴۳ء سے ۱۹۴۷ء تک خلیفہ مرحوم نے کشمیر میں ملازمت کی۔ دراصل ۱۹۴۳ء میں وہاں کے امر سنگھ کالج میں پرنسپل کی اسامی خالی ہوئی اور خلیفہ مرحوم کی خدمات حکومت کشمیر نے نظام دکن سے مستعار لے لیں۔ یہاں کچھ عرصہ وہ ناظم تعلیمات بھی رہے۔

خلیفہ مرحوم کی ملازمت کا تیسرا دور ۱۹۴۷ء تا ۱۹۴۹ء کا ہے۔ ۱۹۴۷ء میں کشمیر چھوڑنے کے بعد خلیفہ مرحوم دوبارہ عثمانیہ یونیورسٹی (حیدر آباد) پہنچے، جہاں نہیں ڈین آف آرٹس بنا دیا گیا۔ دو سال بعد وہ پاکستان چلے آئے اور لاہور میں اقامت گزیں ہو گئے۔[167] ممتاز حسن لکھتے ہیں کہ ان کے وسیع و وقیع علم کے باوجود ظرافت اور بذلہ سنجی نے ان کی شخصیت میں لطافت پیدا کر دی تھی۔

ان کی تصانیف کی تفصیل کچھ اس طرح ہے:

"مختصر تاریخِ فلسفۂ یونان" (تالیف ڈاکٹر ویلیم نیسل) (جرمن زبان سے اردو میں ترجمہ)

" نفسیاتِ وارداتِ روحانی"

"داستانِ دانش"، انجمنِ ترقی اردو (ہند)، ۱۹۴۳ء

"شریمد بھگوت گیتا"

"تشبیہاتِ رومیؒ"، ادارہ ثقافتِ اسلامیہ، لاہور، ۱۹۷۷ء

"اسلام کی بنیادی حقیقتیں"

"اقبال اور مُلّا"، بزمِ اقبالؒ، لاہور

"تلخیصِ خطباتِ اقبال"

"علامہ اقبالؒ"، اتحاد پریس نُبل روڈ، لاہور

"مقالاتِ حکیم (مرتب: شاہد حسین رزاقی)، محمد اشرف ڈار، ۱۹۶۹ء

"افکارِ غالبؒ"، مکتبہ معین الادب، لاہور، ۱۹۵۴ء

"حکمتِ رومیؒ"، ادارہ ثقافتِ اسلامیہ، لاہور، ۱۹۵۵ء

"فکرِ اقبالؒ"، بزمِ اقبالؒ۔ لاہور، ۱۹۶۴ء

" Metaphysics of Rumi"

"Islam & Communism "

"The Prophet and His Message"

"Islamic Ideology"

"کلامِ حکیم" (مرتب: ڈاکٹر افتخار احمد صدیقی)

اس کے علاوہ "ڈاکٹر خلیفہ عبدالحکیم (سوانح وادبی خدمات)"، ممتاز اختر مرزا نے تحریر کی۔

۳۰ جنوری ۱۹۵۹ء کو آپ کا انتقال ہوا۔[168]

صغرا ہمایوں مرزا:

اردو دنیا میں صغرا ہمایوں مرزا ایک ادیبہ، شاعرہ، مدیرہ اور سماجی خدمت گزار کی حیثیت سے جانی اور پہچانی جاتی ہیں۔ بیگم صغرا ہمایوں کی ولادت ۱۸۸۴ء میں حیدر آباد میں ہوئی اور ۱۹۵۹ء میں حیدر آباد ہی میں انتقال ہوا۔ ان کی شادی ۱۹۰۱ء میں ہمایوں مرزا صاحب سے ہوئی۔ شادی کے بعد دونوں نے حیدر آباد ہی میں مستقل سکونت اختیار کر لی۔ شادی کے بعد آپ نے پہلا سفر منوہر آباد کا کیا۔ منوہر آباد میں کوئی سرائے نہ تھا جس کے لیے آپ نے بڑی رقم خرچ کر کے وہاں ایک سرائے تعمیر کروائی۔ ۱۹۱۲ء میں آپ نے لیڈی نواب خدیو جنگ کے ساتھ ایک انجمنِ خواتینِ اسلام قایم کی جس کی صدر لیڈی خدیو جنگ تھیں اور آپ سیکرٹری تھیں۔ اسی سال علی گڑھ مسلم یونی

ورسٹی کی مدد کے لیے جلسہ کر کے چندہ جمع کیا۔ ۱۹۱۳ء میں ہندو خواتین نے جب دکن میں یونین سوسائٹی بنائی تو آپ اس کی واحد مسلمان رکن تھیں۔ اسی سال آپ نے بشیر باغ میں جلسہ کر کے مسلم مشن ووکنگ لندن کے لیے ڈیڑھ ہزار روپے جمع کیے، جنگِ بلقان کے متاثرین کے لیے بھی چندہ جمع کیا اور مولانا محمد علی کے روسط سے ترکی بھجوایا۔[169]

حیدرآباد میں رہ کر انھوں نے بہت سے فلاحی کام انجام دیے۔ لڑکیوں کی فلاح و بہبود کے خیال سے انھوں نے ایک مدرسہ صفدریہ قائم کیا، جس کے لیے موصوفہ نے اپنی جائداد کا ایک حصہ وقف کر دیا۔ اس مدرسے میں آج بھی تعلیم کے ساتھ ساتھ مختلف پیشہ ورانہ کورسز سکھائے جاتے ہیں۔ صغرا ہمایوں مرزا نے نہ صرف فلاحی کام انجام دیے بلکہ اپنے قلم کے ذریعے سماج کی اصلاح کرنے کی کوشش بھی کی ہے۔

مصنفہ کا شمار اردو کی اولین خواتین ناول نگاروں میں ہوتا ہے۔ انھوں نے تقریباً چودہ ناول لکھے ہیں، جن میں "تحریرالنساء"، "موہنی"، "مشیر نسواں"، "زہرہ" اور "سرگزشت ہاجرہ" بہت مقبول ہوئے۔ بیگم صغرا ہمایوں مرزا کی تحریروں میں عموماً بیانیہ تکنیک کا استعمال کیا گیا ہے۔ اپنے عہد میں ان کی تخلیقات کافی مقبول ہوئیں۔ عوام اور خواص دونوں طبقوں میں مصنفہ کی تخلیقات بڑے شوق اور دلچسپی کے ساتھ پڑھی جاتی تھیں۔ ان کے فن پاروں میں اس عہد کے گہرے نقوش نظر آتے ہیں، جس کی بدولت اس عہد کی روایات کو سمجھنے میں آسانی ہوتی ہے۔[170]

> صغرا بیگم ہمایوں مرزا کا تعارف ضروری نہیں ہے کیوں کہ مختلف حیثیت سے آپ مشہور و معروف ہیں۔ بہ حیثیت شاعر آپ کو شہرت حاصل ہے، حیاؔ تخلص کرتی ہیں، بہ حیثیت نثّار اور مضمون نگار آپ دنیائے اردو میں خاص مقام رکھتی ہیں۔ اب تک تقریباً دو درجن کتابیں شائع فرما دی ہیں۔ سیاسی حیثیت سے لوگ آپ سے واقف ہیں۔ ہندو مسلم اتحاد آپ کا نصب العین رہا ہے، اسی کا پرچار کرتی رہی ہیں۔ مسلمان خواتین میں آپ وہ پہلی خاتون ہیں جنھوں نے پردے کے باہر آکر مردوں کے مجمع میں تقریر فرمائی ہے۔ عورتوں کو ان کی حقیقی آزادی اور حقوق دلانے کے لیے آپ نے جو جدوجہد کی ہے، وہ کبھی فراموش نہیں ہو سکتی۔ عورتوں میں سلیقہ شعاری پیدا کرانے، ان کو اپنی زندگی بہتر بنانے اور نمونہ بنانے کے لیے آپ نے بیسیوں مضمون قلم بند کیے اور تمثیلیں دے کر اس کو واضح کیا ہے۔ کئی سال سے مدرسہ صفدریہء نسواں قائم کیا ہے جس میں غریب طالبات کو مفت تعلیم دی جاتی اور صنعت و حرفت سکھائی جاتی ہے۔ اس کے لیے ایک بڑی جائیداد آپ نے وقف کر دی ہے، آپ کا یہ ایثار قابلِ تقلید اور بہترین نمونہ ہے۔ مدرسہ کے قریب سیّد ہمایوں مرزا صاحب مرحوم کا مقبرہ نہایت عالی شان اور بہت خوب صورت

بنوایا ہے اور اپنا مزار بھی تیار کروالیا ہے۔ بہر حال صغرا بیگم صاحبہ ایک ایسی خاتون ہیں جن کا وجود مغتنم ہے اور آپ کی زندگی جنسِ نازک کے لیے ایک نمونہ اور نظیر ہے۔ خواتین دکن ہی میں نہیں، بلکہ بھارت میں بھی آپ کی نظیر مشکل سے مل سکے گی۔[171]

صغرا ہمایوں مرزا نے نہ صرف فلاحی کام انجام دیے بلکہ اپنے قلم کے ذریعہ اصلاح کی کوشش بھی کی ہے۔ صغرا ہمایوں مرزا کی طبیعت نثر نگاری کی طرف زیادہ مسائل تھی اس لیے زیادہ تر نثر ہی میں لکھا۔ مگر وہ اچھی شاعرہ بھی تھیں۔ صباؔ تخلص کرتی تھیں، انھیں استاد جلیل سے تلمذ تھا۔ ان کی ادارت میں کئی رسالے نکلے۔ زیادہ تر صغرا ہمایوں مرزا نے خواتین کی ترقی اور اصلاح کے مسائل سے خاص دلچسپی لی۔ متعدد ناول اور افسانے لکھے اور اصلاحی کتابیں بھی لکھیں۔ طرزِ تحریر سادہ، رواں اور شگفتہ ہے تاکہ پڑھنے والا دلچسپی کے ساتھ ساتھ کچھ سبق بھی حاصل کر سکے۔ کثیر تعداد میں مضامین، قصے، افسانے اور مرثیے لکھے۔ ان کی تصانیف کی تعداد تقریباً پندرہ ہے، جو حسب ذیل ہیں:

۱۔ سر گزشتِ ہاجرہ (اصلاحی ناول)
۲۔ شیرِ نسواں (معاشرتی ناول)
۳۔ موہنی (معاشرتی ناول)
۴۔ بی بی طوری کا خواب (قصہ یا حکایت)
۵۔ مقالاتِ صغراء (تقاریر کا مجموعہ)
۶۔ تحریر النساء (عورتوں کو خط و کتابت سکھانے کی کتاب)
۷۔ سفینہ ءنجات (نوحوں اور مرثیوں کا مجموعہ)
۸۔ سفر نامہ ء عراق
۹۔ پونہ
۱۰۔ سیرِ بہار و بنگال
۱۱۔ سیاحتِ جنوبی ہند
۱۲۔ مجموعہ ء نصائح
۱۳۔ آوازِ غیب

۱۴۔ رباعیاتِ شاد عظیم آبادی (مرتّبہ)

۱۵۔ میرے موسومہ خط (۱۹۵۱ء)

اس کے علاوہ انھوں نے حضرت فاطمہؓ کی سوانح عمری بھی تحریر کی ہے۔ بیگم ہمایوں مرزا کا سفر نامہ بھوپال و آگرہ و دلی ۱۹۱۸ء میں سامنے آیا۔ ان کا اصل نام صغریٰ تھا۔ صغریٰ ہمایوں مرزا کی سرپرستی میں ہی لاہور سے مجلہ تہذیب نسواں کا اجرا ۱۸۹۸ء میں ہوا تھا۔ آزادیِ نسواں اور تعلیم نسواں کی حامی خاتون تھیں اور ان کا حلقہ اثر سارے ہندوستان کے متوسط اردو داں مسلم گھرانوں تک تھا۔ ان کا یہ سفر بھوپال، آگرہ اور دہلی کی تہذیبی، بہنوں سے رابطے کی ایک صورت تھی۔ ۱۹۲۴ء میں صغریٰ بیگم حیا کا سفر نامہ یورپ سامنے آیا اور لگ بھگ اسی زمانے میں فاطمہ بیگم کا سفر نامہ مجاز شائع ہوا۔[172]

سرگزست ہاجرہ، مشیر نسواں، بی بی طوری کا خواب نصائح حصہ اول اور موہنی کو بہت زیادہ شہرت حاصل ہوئی۔ سرگذشت ہاجرہ داستانی طرز کا ایک ناول ہے جس میں چار سہیلیاں ایک جگہ جمع ہو کر اپنی آپ بیتی سناتی ہیں جس کے مطالعہ سے لڑکیوں کو اخلاقی درس حاصل ہوتا ہے۔ سرگذشت ہاجرہ میں صغراء ہمایوں مرزا مغربی تہذیب کی اچھائیوں کو مشرقی قدروں کے ساتھ اپنانے کی ترغیب دیتی ہیں۔ سارا کی سرگذشت کا ایک اقتباس ڈاکٹر کی زبانی ملاحظہ فرمایئے:

"دنیا کا منہ کوئی بند نہیں کر سکتا، آپ جوان ہیں۔ میرے گھر میں آج کل میری بی بی نہیں ہے، وہ اپنے میسور گئی ہے۔ ایسی حالت میں آپ کا میرے گھر میں تنہا رہنا بد نمائی ہے گو کہ میں آپ کو مثل اپنی لڑکی کے سمجھتا ہوں۔ دنیا بری جگہ ہے۔ اسی لیے حضرت رسول خدا نے حضرت عائشہ سے فرمایا تھا۔ "اے عائشہ تم اپنے باپ سے بھی جب بات کرو تو تنہائی میں نہ کرو کسی کو ساتھ رکھو، شیطان ساتھ ہے، اس سے ڈرو۔"

جناب بشیر الدین احمد نے تو بیگم صغرا ہمایوں مرزا کو حیدر آباد فرخندہ بنیاد کی روح رواں کیا تھا وہ قوم وہ ملک کی اصلاح کی خاطر ایسی تصویر دکھایا کرتی تھیں جس سے قوم اور اپنے آپ کو سدھار سکے۔ بیگم صاحب کے بیان کی اثر آفرینی ملاحظہ ہو سارا کی سرگزشت میں لکھتی ہیں:

"آپ یہ خیال نہ کیجیے کہ آپ کا رہنا میرے لیے دوبھر ہے، آپ کی وجہ سے میرے اخراجات میں اضافہ ہو گیا ہے جو مجھے گراں گذر رہا ہے؛ نہیں، ہرگز نہیں۔ جو کچھ کہہ رہا ہوں یقین جانیے، آپ کی بھلائی کے لیے۔ دنیا میں آپ مجرد زندگی کب تک بسر کریں گی، عورت کے لیے شوہر ایک نعمت ہے اور مرد کے لیے نیک بی بی کا ملنا جنت ہے۔"

'مشیرِ نسواں' ایک معاشرتی ناول ہے۔ اس میں اخلاقی اصلاح اور مقصدیت کارفرما ہے۔ مقصد کو واضح شکل دے کر اخلاقی اصلاح کا اہم کام لیا گیا ہے۔ انھوں نے کہا:

''کسی قوم کے رسم ورواج کی آنکھیں بند کر کے تقلید کرنی فضول ہے۔ البتہ اس کے ہنر سیکھنے چاہیئں۔''

بیگم صغرا ہمایوں مرزا کا ''موہنی'' بھی ایک رسوم پر قصے کے پیرائے میں روشنی ڈالی گئی ہے۔ ''بی بی طوری کا خواب'' قصہ یا حکایت کہا جا سکتا یہ پندرہ صفحات پر مشتمل ہے۔ اس میں اصلاحی پہلو نمایاں طور پر عیاں ہے۔ بی بی طوری اپنے سائیں سے اپنا خواب بیان کرتی ہے۔ کسی پہاڑ پر دھواں اور کسی کے چیخنے کی آوازیں سن کر وہ وہاں جاتی ہے۔ وہاں ایک چڑیا انسانوں کی مانند گفتگو کر سکتی ہے۔ ایک شکاری کی قید سے رہائی مختلف اشخاص کے پاس لے جاتی ہے اور بی بی طوری ان سب کی مدد کرتی ہے جو کسی نہ کسی مصیبت میں مبتلا ہیں بی بی طوری کی ساس اس خواب کی تعبیر بتاتی ہیں کہ تمھارے ہاتھوں مصیبت زدہ اشخاص کا بھلا ہو گا۔

صغرا ہمایوں مرزا اس طرح سے اس قصہ کے ذریعہ مصیبت زدہ، اشخاص کی مدد کرنے کا خواتین کو درس دیتی ہیں۔ بیگم صغرا ہمایوں مرزا کی تحریروں میں ناول اور کہانی کی ملی جلی تکنیک ملتی ہے۔ جب ۱۹۱۷ء میں جامعہ عثمانیہ کا قیام عمل میں آیا اس وقت ان کی تخلیقات کافی مقبول ہو رہی تھیں۔ عوام اور خواص دونوں طبقوں میں دلچسپی سے پڑھی جا رہی تھیں ان کی تحریروں میں اس عہد کے گہرے نقوش نظر آتے ہیں جس سے اس عہد کی روایات کو سمجھنے میں آسانی ہوئی ہے۔ خواجہ حسن نظامی، بیگم صاحبہ کے فن کے بارے میں لکھتے ہیں:

> حکایات عموماً معتبر اور تاریخی ہیں۔ جس کے اندر ایک خاص مقصد یہ تھا کہ وہ طبقہ نسواں کو دنیا کی نشیب وفراز کو بتانے کی کوشش کی ہے تاکہ ملک اور قوم کی بیگم صغرا ہمایوں مرزا کا ۱۹۵۹ء میں انتقال ہوا۔ مجموعی اعتبار سے ان کی تخلیقات مذہبی اور اصلاحی ہونے کی وجہ سے پر اثر اور ناقابل فراموش ہیں۔[173]

بیرسٹر اکبر علی خان:

نواب اکبر علی خان ۲۰ نومبر ۱۸۹۹ء کو حیدر آباد دکن میں پیدا ہوئے[174]۔ آپ کھاتے پیتے گھرانے کے فرد تھے۔ آپ کے اجداد قطب شاہی دور میں حیدر آباد آئے اور یہاں اپنی خدمات کے صلے میں جاگیروں سے سرفراز ہوئے۔ آپ کے والد محبوب علی خان اور دادا، ریاست علی خان کا اپنے معاشرے میں باعزت اور ممتاز مقام تھا۔ آپ کے والد صاحب کو بھی تعلیم سے دلچسپی تھی، انھوں نے راجہ بنسی لال کے ساتھ مل کر ایک درس گاہ قائم کی جس کا نام "مفید الانام" تھا۔ یہ ادارہ بعد ازاں وہاں کی اہم درس گاہ بن گیا جس میں عثمانی دور کے کئی نام ور افراد زیر تعلیم

رہے۔[175] علی اکبر نے بھی مڈل تک اپنی تعلیم مفید الانام ہائی اسکول سے حاصل کی۔ پھر سٹی ہائی اسکول سے میٹرک کر کے علی گڑھ چلے گئے۔ ۱۹۲۰ء میں مہاتما گاندھی اور علی برادران کے مشورہ پر تعلیم ترک کر دی۔ ان دنوں ڈاکٹر ذاکر حسین قام پرست طلبہ کی رہنمائی کر رہے تھے۔ حیدر آباد کا ایک وفد سر اکبر حیدری کی قیادت میں علی گڑھ گیا جس میں سر راس مسعود، لطیف یار جنگ، مولوی حبیب الرحمٰن شیروانی بھی تھے۔ اس وفد کا مقصد یہ تھا کہ علی گڑھ میں تعلیم پانے والے حیدر آبادی طلبا کو ترکِ موالات کی تحریک میں شرکت سے باز رکھا جائے لیکن حیدر آباد کے آٹھ دس طلبا نے وفد کی اس تجویز کو ماننے سے انکار کر دیا جن میں میر اکبر علی خان بھی تھے۔ اس طرح یہ وفد ناکام رہا۔[176]

۱۹۲۳ء میں آپ نے عثمانیہ یونیورسٹی سے اپنا بی۔ اے۔ مکمل کیا۔ پھر آپ نے ایل ایل بی (آرنرز) سے کیا اور بیرسٹر ایٹ لا مڈل ٹمپل لندن سے مکمل کیا اور ۱۹۲۷ء میں واپس آ کر ایک وکیل کے طور پر پریکٹس شروع کی[177]، مولوی احمد شریف، رائے بشیش ور ناتھ، سر تیج بہادر اور سری نواس آئنگار کے جونیر کی حیثیت سے کام کرنے کے مواقع حاصل ہوئے۔[178]

لندن سے بیرسٹر ایٹ لا کر کے واپس آنے پر آپ کی شادی کرامت النساء بیگم سے ہوئی۔

آپ حیدر آباد میں قائم ہونے والے دستوری اصلاحات کمیشن میں شامل تھے اور بیرسٹر سری کشن نے جب "بلکی تحریک (Bulki movement)" شروع کی تو آپ اس کے ممتاز رکن اور روحِ رواں تھے، اس تحریک کو نواب سر نظامت جنگ کی تائید حاصل رہی، انھی کی کوششوں کے نتیجہ کے طور پر بلکی رولز نافذ ہوئے تھے۔ آپ حیدر آباد میونسپل کونسل کے وائس چیئرمین بھی بنے جب کہ مہدی یار جنگ اس وقت اس مجلسِ بلدیہ کے صدر تھے[179]، اور ۱۹۵۲ء سے عثمانیہ گریجویٹ ایسوسی ایشن کے ممبر رہے، اپنی معاشی نمائش کمیٹی کے ممبر اور چیئرمین کی حیثیت سے خدمات انجام دیتے رہے۔[180]

آپ سترہ سال تک متحدہ پروگریسو کمیٹی کے چیئرمین رہے جس میں ایم نرسنگ راؤ، بی رام کشن راؤ، علی یاور جنگ، بیرسٹر سری کشن، فضل الرحمٰن، راماچاری اور کاشی ناتھ راؤ ویدیہ شریک تھے[181]۔ آپ نے ۱۹۳۹ء میں ہندو مسلم اختلافات کو ختم کرنے کے لیے ایک اسکیم تیار کی، جسے دونوں فریقوں کے رہنماؤں کے سامنے پیش کیا گیا، اس دوران آپ نے قائدِ اعظم کی مجلس اتحاد المسلمین میں شمولیت کی دعوت قبول نہیں کی اور ریاستِ حیدر آباد کے وزیرِ اعظم بننے کی پیش کش کو بھی مسترد کر دیا۔ اس حوالے سے حسن الدین احمد کہتے ہیں کہ بہت کم لوگ یہ بات جانتے ہیں

کہ ۱۹۴۰ء میں محمد علی جناح نے آپ کو مجلسِ اتحادالمسلمین میں شرکت کا مشورہ دیا تھا لیکن آپ نے اسے قبول نہیں کیا پھر ۱۹۴۷ء میں آپ کو وزارتِ عظمیٰ کی پیش کش ہوئی اور یہ شرط رکھی گئی تھی کہ آپ مجلس میں شرکت کریں گے، چوں کہ آپ اصولی طور پر مجلس کے طریقہ عمل سے اختلاف رکھتے تھے اس لیے آپ نے اس کو قبول نہیں کیا۔[182]

طیب انصاری کے مطابق، آپ مجاہدینِ آزادی میں ممتاز مقام رکھتے ہیں، ریاستِ حیدرآباد میں آس وقت آپ نے قومی تحریکوں کو آگے بڑھایا جب اس کا تصور بھی گناہ سمجھا جاتا تھا۔آپ حیدرآبادی تہذیب کے دل دادہ ہونے کے علاوہ خود بھی اس بات کا نمونہ ہیں لیکن مطلق العنانی پر آپ نے ہمیشہ عوامی مفادات کو ترجیح دی چناں چہ قیادت اور وزارت کی پیش کشوں کو ٹھکرادیا اور قومی تحریک کو آگے بڑھانے اور جڑوں کو مضبوط کرنے میں برابر لگے رہے۔ بالآخر کانگریس کی کوششیں ۱۹۴۸ء میں کامیاب ثابت ہوئیں اور آپ انڈین نیشنل کانگریس حیدرآباد کی استقبالیہ کمیٹی کے وائس چیئرمین بنے تو رجعت پسند طبقہ کے مظالم کو دیکھ کر اقلیتی طبقہ کی جان ومال کی حفاظت کے لیے سینہ سپر ہو گئے۔[183]

آپ علی گڑھ یونی ورسٹی، جواہر لال یونی ورسٹی اور جیمز کے ممبر اور سینیٹ کے ممبر کے طور پر خدمات سر انجام دیتے رہے۔

تعلیم کے علاوہ بھی اپنی ریاست کے لیے آپ نے بہت سے میدانوں میں فلاحی کام کیے، آپ کا نام آج بھی ایک عظیم انسان کے طور پر لیا جاتا ہے۔آپ نے رامانت پور میں اپنی پندرہ ایکڑ اراضی اور اس زمانے میں پچاس ہزار روپے نقد رقم دے کر "حیدرآباد پولی ٹیکنک" کا آغاز کیا، نہرو کی موت کے بعد اس ادارے کا نام بدل کر "جواہر لال نہرو پولی ٹیکنک" رکھا گیا۔[184]

آپ حیدرآباد دکن میں ہونے والی صنعتی نمائش کے بانی ممبروں میں سے ایک تھے۔۱۹۷۵ء میں آپ نے "نام پلے(Nampally)" ہسپتال میں چالیس بستروں پر مشتمل "یوسف باباوارڈ"[185] کے قیام کے لیے نقد رقم اور عطیات جمع کیے۔آپ نے علی گڑھ مسلم یونی ورسٹی میں "اولڈ بوائز ایسوسی ایشن" کی بنیاد بھی رکھی۔ بیوہ خواتین کے لیے آپ پانچ سال تک مدد اور ریلیف کا انتظام کرتے رہے۔ ۱۹۶۵ء میں آپ کو "پدما بھوشن (Padma Bhushan)ایوارڈ" سے نوازا گیا تھا۔

۱۹۷۲ء سے ۱۹۷۴ء تک آپ اُترپردیش میں گورنر کے طور پر خدمات سرانجام دے رہے تھے تو اس عرصہ میں آپ نے سرسید احمد خان کی یاد میں ڈاک ٹکٹ جاری کیا۔آپ کے اس دور کے بارے میں طیب انصاری کہتے ہیں

کہ جب انھیں ہندوستان کی سب سے بڑی ریاست اتر پردیش کا گورنر بنایا گیا تو اس وقت گفتار کے اس غازی کو اپنے کردار کا عملی ثبوت دینے کا موقع ملا۔[186]

جاننے والے جانتے ہیں کہ حکومتِ ہند گورنری کا جلیل القدر عہدہ یوں ہی نہیں دے دیتی۔ اس عہدہ تک پہنچنے کے لیے میر اکبر علی خان کو خدمت وخلوص کا مجسمہ بننا پڑا جو ہمیشہ آپ کی طبیعتِ ثانیہ رہی، اصولوں اور اقدار کی پابندی کرنی پڑی جو ہمیشہ آپ کا شعار رہا اور وضع داری اختیار کرنی پڑی جو آپ کی فطرت رہی، صلح کن پالیسی پر عمل پیرا ہونا پڑا جو ہمیشہ آپ کا طریقہ کار رہا، عوامی اداروں کو چلانے میں آپ کا کردار ایسا مثالی رہا کہ آپ قابلِ تقلید نمونہ بن گئے۔[187]

بحیثیت سیاست دان وہ کس حد تک کامیاب رہے ہیں مجھے اس سے بحث نہیں ہے لیکن جہاں تک اردو زبان و ادب کے مسائل کا تعلق ہے، اپنی گورنری کے زمانہ میں انھوں نے اردو زبان سے اپنی محبت کا عملی ثبوت دیا اور پچھلے برسوں کا حساب اس طرح چکایا کہ ہزاروں اردو مدرسین کا تقرر عمل میں آیا۔ اردو اکیڈمی کا قیام اور اس کی اعلیٰ کارکردگی سامنے آئی۔ اردو کی ترقی کے حوالے سے مولوی حبیب الرحمٰن صاحب سے برابر مشاورت کرتے رہے۔ ادب کا گہرا مطالعہ کر رکھا تھا۔[188]

اس کے علاوہ جائز مطالبات کی یک سوئی کے ذریعے اندرا گاندھی کی لسانی پالیسی کو کامیابی سے ہم کنار کرنے کامیاب کوشش کی۔[189] علاوہ ازیں ریاستی مسائل سے آگاہی اور ان کے حل کے لیے بھی بحیثیت گورنر اپنی فراست اور تدبّر کا ثبوت دیا۔ اتر پردیش کے بعد اڑیسہ کے گورنر (۲۵ اکتوبر ۱۹۷۴ء سے ۱۷ اپریل ۱۹۷۶ء تک[190]) رہے۔[191]

آپ نے تلنگانہ کے سیاسی مطالبات کی حمایت کی لیکن ان کے علیحدگی کے مطالبے کی مخالفت کی، اس حوالے سے حسن الدین احمد کہتے ہیں کہ ریاستوں کی تنظیمِ جدید کے کمیشن نے یہ مشورہ دیا کہ ابتدائی پانچ سال تک تلنگانہ کی علیحدہ ریاست قائم کی جائے چناں چہ ونکٹ رنگا ریڈی صاحب نے علیحدہ ریاست کا مطالبہ کیا اور ایک تحریک چلائی۔ آپ اس تحریک سے وابستہ رہے۔ اس سلسلے میں پنڈت نہرو، مولانا آزاد اور گوبند ولبھ پنت سے تلنگانہ قائدین رنگا ریڈی، جے وی نرسنگ راؤ اور ڈاکٹر چنا ریڈی سے ملاقاتیں ہوئیں۔ ان میں تلنگانہ کے مطالبات کی ترجمانی کے فرائض آپ ہی نے انجام دیے لیکن جب ۱۹۶۹ء میں علیحدہ تنگانہ تحریک چلائی گئی تو آپ نے اس سے اصولی اختلاف کیا، آپ

نے یہ محسوس کیا کہ تلنگانہ کے عوام کے ساتھ کافی ناانصافیاں ہوئی ہیں مگر اس مرحلے پر علیحدہ ریاست کے قیام کو تلنگانہ کے لیے مضر قرار دیا اور اپنے نقطہ نظر کو نہایت بے باکی کے ساتھ پیش کیا۔[192]

آپ نے اقوام متحدہ میں کرشنا مینن کی رہنمائی میں ہندوستان کی نمائندگی کی۔ چین کو جو خیر سگالی مشن انت سایم آئنگار کی صدارت میں گیا تھا آپ اس بھی شریک تھے۔ اس کے علاوہ آپ ڈیپوٹیشن پر ماسکو، فن لینڈ اور ایشیاء، افریقہ اور یورپ کے کئی ممالک میں خدمات سرانجام دیتے رہے۔[193]

آپ اٹھارہ سال تک راجیہ سبھا (ایوان بالا کی پارلیمنٹ) کے ممبر رہے اور قریباً بارہ سال تک اس کے وائس چیئر مین رہے۔ اس کے ساتھ ساتھ آپ کانگریس کے پارلیمانی بورڈ کے نائب رہنما بھی تھے۔[194]

نواب میر اکبر علی خان، ۱۹۹۴ء میں انتقال کر گئے۔ آپ کے چار بچے تھے جن میں سے تین کے نام یہ ہیں: میر ریاضت علی خان، فیض النساء بیگم اور نعیم بیگم۔

پروفیسر محمد صلاح الدین:

محمد وحید الدین صاحب جب ضلع پر بھنی میں دوم تعلق دار (ڈپٹی کلکٹر) تھے تو ان کے ہاں ۱۸۹۹ء میں محمد صلاح الدین کی پیدائش ہوئی۔ اس زمانے کے رواج کے مطابق ابتدائی تعلیم گھر پر حاصل کی، آپ کے چار بھائی اور دو بہنیں تھیں۔ والد کا تبادلہ حیدر آباد دکن میں ہوا تو سٹی اسکول میں زیرِ تعلیم رہے۔ جامعہ عثمانیہ کا قیام عمل میں آیا تو صلاح الدین نے یہاں ۱۹۲۲ء-۱۹۲۳ء میں انٹر میڈیٹ کے پہلے امتحان میں ایف اے کے پرچے دیے اور اول درجے میں کامیاب ہوئے، یہیں سے بی اے کیا اور اس امتحان میں بھی اول درجے میں تیسری پوزیشن حاصل کی۔ اپنے زمانہ طالب علمی میں آپ اچھے مقرر کے طور پر مشہور تھے۔ جامعہ میں انجمنِ اتحادِ طلبہ کے پہلے سربراہ تھے۔ اس زمانے میں طلبہ نائب صدر اور اس کی کابینہ کا انتخاب کرتے تھے۔

ایم اے کی تعلیم کے لیے آپ ڈھاکہ چلے گئے، یہاں بھی آپ کی فی البدیہہ تقریروں کا شہرہ تھا، ایک مباحثہ میں آپ نے طلائی تمغہ حاصل کیا، یہ فی البدیہہ مباحثہ ایسا تھا جس میں اساتذہ اور طلبہ، دونوں شریک تھے۔ ادھر سے نہ صرف آپ نے اوّل درجہ میں کامیابی حاصل کی بلکہ ہر پرچے میں سب امیدواروں سے زیادہ نمبر لے کر اول آئے باقی سب امیدواروں نے درجہ دوم میں ایم اے پاس کیا (مجلہ عثمانیہ—شمارہ ۱۹۲۷ء)۔ وہاں سے آپ کے بارے میں یہ رائے سامنے آئی کہ آپ غیر معمولی ذہین طالب علم ہیں، آپ کو اعلیٰ تعلیم کے لیے انگلستان بھیجا جائے۔[195]

چناچہ ۱۹۲۵ء میں آپ سرکاری خرچ پر انگلستان چلے گئے، یہاں آپ بائیں بازو کی تحریکوں سے زیادہ متاثر تھے، سجاد ظہیر اور رادھا کرشن سے میل جول بڑھ گیا۔ آپ تحلیلِ نفسی پر پی ایچ ڈی کرنا چاہتے تھے لیکن کچھ نامساعد حالات کی وجہ سے ۱۹۳۱ء میں آپ ڈگری لیے بغیر واپس آ گئے اور جامعہ عثمانیہ میں شعبہ انگریزی میں استاد مقرر ہوئے۔

آپ کے بارے میں شاہ بلیغ الدین کے الفاظ ملاحظہ ہوں:

> میں نے جب پہلے پہل انھیں جامعہ میں دیکھا تو وہ پچاس کے پیٹھے میں ہوں گے۔۔۔اکہرا جسم، دبتا ہو قد، سرمئی رنگت، پتلون نما پاجامہ، چست شیروانی، کرسٹی ٹوپی، پیروں میں پمپ شوز، ہاتھ میں چھتری، طبق دار چہرہ، صاف ستھرا ناک نقشہ! میں نے انھیں کبھی ننگے سر یا سوٹ میں ملبوس نہیں دیکھا۔ وہ اکثر مجھے شعبہ انگریزی کی لائبریری میں ملے۔[196]

صلاح الدین صاحب اردو، فارسی، عربی، فرانسیسی، جرمن، لاطینی اور انگریزی زبان سے واقف تھے، انگریزی پر مادری زبان جیسا عبور تھا، جامعہ عثمانیہ میں انگریزی سے اردو ترجمہ کے لیے خصوصی شہرت رکھتے تھے۔ جب آپ انگلستان سے واپس آئے تو آپ کی شادی اپنے ماموں شہاب الدین صاحب کی صاحب زادی حمید النسا سے ہوئی۔ آپ کے چھے بچے ہوئے: ۱- نجمہ باسط، ۲- اسد الدین، ۳- سیف الدین، ۴- آصف الدین، ۵- واصف الدین اور ۶- نسیم بیگم۔

ملکی سیاست میں آپ نے کبھی کوئی حصہ نہیں لیا۔ جامعہ میں بھی خاموش زندگی بسر کی۔ سواری کے لیے ایک پرانی سی کار ورثے میں ملی تھی جب وہ خراب ہو گئی تو جامعہ کی بس میں آتے جاتے تھے۔ انگلستان سے آپ اپنے ساتھ بہت سی کتابیں لائے تھے، یہی آپ کا کل سرمایہ تھیں، زیادہ وقت مطالعہ میں صرف کرتے تھے اس کے علاوہ نہ کھانے پینے کا شوق تھا نہ پہننے اوڑھنے کا۔ اپنا یہ کتب خانہ بعد میں آپ نے 'اقبال اکیڈمی' کو عطیہ کر دیا۔ نرم گفتار اور منکسر المزاج تھے۔ ڈاکٹر سیّد عبد اللطیف کے اصرار پر ان کی اکیڈمی کے لیے علامہ سلیمان ندوی کی کتاب 'عرب و ہند کے تعلقات' کا انگریزی میں ترجمہ کیا جو خاصے کی چیز ہے۔ ان کے دو کتابچے بھی منظرِ عام پر آ چکے ہیں، ایک ہے "قرآن و سیرت" جس میں آپ کے دو مضامین ہیں، ۱- "قرآن، تعلیم کا عالم گیر پہلو"، ۲- "اسوہِ رسول اکرم اور عصرِ جدید"۔ جب کے دوسرا کتابچہ اقبال اکیڈمی سے "افکارِ تازہ" کے نام سے چھپا جس میں آپ کے تقریباً چودہ مضامین ہیں۔[197]

۱۹۸۰ء میں آپ امریکہ روانہ ہوگئے، وہاں سے واپسی پر کراچی میں اپنی بیٹی نجمہ باسط کے پاس گئے تو بہادر یار جنگ اکیڈمی کراچی نے آپ کے اعزاز میں عصرانہ دیا اور آپ سے گفتگو کی نشست کا اہتمام کیا۔ ۱۹۸۱ء میں آپ کراچی سے حیدرآباد دکن چلے گئے، عارضہ قلب میں بھی مبتلا تھے، ۱۵ مارچ ۱۹۸۱ء میں انتقال کر گئے اور اپنے آبائی قبرستان آصف نگر میں دفن ہوئے۔[198]

ڈاکٹر مقبول علی:

ڈاکٹر محمد مقبول علی، بی۔ اے۔، ایل۔ آر۔ سی۔ پی۔، ایم۔ آر۔ سی۔ ایس (لندن)۔ جامعہ عثمانیہ کے پہلے طیلسانی ہیں جنھوں نے انگلستان سے طب کی ڈگری حاصل کی۔ آپ سررشتۂ طبابت، سرکارِ عالی میں سوّل سرجن ہیں۔

۱۹۲۰ء میں آپ علی گڑھ میں زیرِ تعلیم تھے جب رئیس الاحرار، مولانا محمد علی* نے جامعہ ملّیہ* کی بِنا ڈالی تو آپ اس میں شریک ہوگئے، اس طرح آپ کو مولانا کے بہت قریب رہنے کا موقع ملا ہے۔ تحریکِ خلافت کے زمانہ میں صوبہ سرحدی و صوبہ متوسّط میں پروپگنڈے کا کام آپ کے تفویض تھا۔ انگلستان میں آپ کا قیام ۱۹۲۶ء تا ۱۹۳۳ء رہا۔

جامعہ عثمانیہ کے سب سے پہلے ڈاکٹر اور سرجن مقبول علی سرونگر کے قریب اجالے شاہ صاحب کی درگاہ کے احاطے والے مکانات میں پیدا ہوئے۔ آپ کے والد نقش بندی سلسلے میں مرید تھے، اپنے بیٹے کی تربیت بھی انھوں نے انھی خطوط پر کی۔ آپ کی شخصیت کے بارے میں شاہ بلیغ الدین کے الفاظ دیکھیے۔ مقبول علی صاحب دراز قد، ابھرے بدن کے آدمی تھے۔ کھلتا ہوا گیہوانی رنگ تھا، کتابی چہرہ، بڑی آنکھیں، کشادہ پیشانی، بڑا دہانہ، سر پر گھنے بال، کلین شیو، نک سک سے ہمیشہ درست رہتے۔ خاصے جامہ زیب آدمی تھے۔

مقبول علی کسی میڈیکل کالج میں داخلہ لینا چاہتے تھے۔ اس زمانے میں جامعہ عثمانیہ کی ڈگری تسلیم نہیں کی جاتی تھی۔ ایک دو سال میں یہ معاملہ حل ہوگیا۔ اس وقت پروفیسر عبدالرحمٰن خان کے مشورہ سے آپ نے ۱۹۲۲ء بمبئی یونی ورسٹی میں انٹر میڈیٹ کے لیے داخلہ لیا۔ انٹر کے بعد وہاں کے میڈیکل کالج میں داخلہ لے لیا۔ حیدرآباد میں ایک ہی طبّی ہائی اسکول تھا جس کے پرنسپل کرنل فرحت علی تھے۔ میٹرک کے بعد تین سال کا طب کا کورس کروایا جاتا تھا۔ اس کورس کے بعد سب اسسٹنٹ سرجن کی ملازمت حاصل ہوتی تھی۔

جب حیدرآباد لوٹ کر آئے تو اس کوشش میں تھے کہ کسی طرح یورپ جا کر طب کی تعلیم حاصل کرنے کا موقع ملے۔ جامعہ کے تیسرے بیچ میں آپ نے شعبہ سائنس میں بی اے کیا، جامعہ عثمانیہ کے ابتدائی دَور بی ایس سی کے بجائے بی اے کی ڈگری دی جاتی تھی۔ مقبول علی کی بیرونِ ملک جانے کی کوشش بارور ہوئی اور پروفیسر عبدالرحمٰن

خان کی سفارش پر آپ کو اعلیٰ تعلیم کے لیے انگلستان کا وظیفہ مل گیا۔ اس کا اعلان ۱۹۲۵ء میں ہوا، اس سال فرزندانِ جامعہ عثمانیہ کا پہلا گروپ اعلیٰ تعلیم کے لیے بیرون ملک روانہ ہوا۔ اس میں سید حسین احمد، ولی الدین اور سیادت علی خان بھی شامل تھے۔

انگلستان میں آپ نے لندن کے مڈل سیکس اسپتال اور کالج میں داخلہ لیا جو کوئن اسکوائر میں واقع تھا۔ مقبول علی محنتی اور ذہین طالب علم تھے، آپ نے وہاں سے ایل آر سی پی (LRCP) اور ایم آر سی ایس (MRCS) کے ڈپلومہ حاصل کیے۔ دسمبر ۱۹۳۲ء میں آپ وطن واپس آئے تو اپنے پروفیسر عبدالرحمٰن خان کے مکان پر قیام کیا۔ ابھی آپ کو واپس لوٹے ہوئے ایک ہفتہ بھی نہ گزرا ہوگا کہ آپ عثمانیہ اسپتال میں سول سرجن مقرر ہوئے اور ساتھ درس و تدریس میں بھی مصروف ہو گئے۔ انگلستان میں جب آپ تعلیم کے لیے قیام پذیر تھے تو ایک لیڈی ڈاکٹر Uharton Edith سے آپ نے شادی کر لی۔ آپ کی بیگم ٹری نی داد کی شہری تھیں۔ شادی کے بعد ان کا نام عائشہ رکھا گیا۔ اسلامی عبادات کی پابند تھیں۔ حیدر آباد میں آ کر انھوں نے بچوں کے لیے ایک ہاسٹل کھولا۔ ان سے مقبول علی کے ہاں دو بیٹے منصور اور حامد پیدا ہوئے جو بعد ازاں کینڈا میں منتقل ہو گئے تھے۔ آخر میں پولیس سرجن کے عہدے سے وظیفہ حسنِ خدمت لے کر سبک دوش ہوئے۔ ریٹائرمنٹ کے بعد اپنی بیگم کے ساتھ ان کے ملک ٹری نی داد گئے تو بیمار پڑ گئے، ۱۰ جولائی ۱۹۰۸ء کو وہیں انتقال ہو گیا اور تدفین بھی وہیں ہوئی۔

میر سیادت علی:

ڈاکٹر سیادت علی ۱۹۰۰ء میں پیدا ہوئے۔ ہونہار طالب علم اور حیدر آباد کا مایہ ناز سرمایہ تھے۔ عربی، فارسی، انگریزی اور اردو پر یکساں عبور حاصل تھا۔[199] خوش رُو، خوش وضع، جامہ زیب، گورے چٹے، اونچے پورے دیدار و آدمی تھے۔ نسبی شرافت ان کے عادات و اطوار سے جھلکتی تھی۔[200]

> مذہب، ادب اور قانون کے مضامین پر یکساں نظر رکھتے تھے، مرنجانِ مرنج، یار باش، نیک دِل اور وضع دار آدمی تھے، بڑوں کا ادب اور چھوٹوں کا وقار ہمیشہ پیشِ نظر رہتا ہے۔[201]

میر سیادت علی کے آباؤ اجداد آصف جاہ اوّل کی دعوت پر حیدر آباد تشریف لائے تھے۔ آپ کے والد علامہ وطب الدین فاضل پائے گاہ (مملکتِ آصفیہ میں سب سے بڑے امرا کی جاگیر کا نام ہے) میں وزیر کے مساوی درجہ رکھتے تھے۔[202]

ابتدائی تعلیم گھر میں حاصل کی، مفید الانام ہائی اسکول سے میٹرک کر کے اعلیٰ تعلیم کے لیے جامعہ عثمانیہ میں

داخلہ لیا۔ جامعہ عثمانیہ کے ابتدائی طالب علموں میں سے تھے، تاریخِ اسلام کے مضمون میں سب سے پہلے آپ نے ایم اے، ایل ایل بی کی ڈگری حاصل کی[203]۔ ایل ایل بی پروفیسر بیرسٹر محبوب علی کے زیرِ نگرانی اوّل آنے پر قانون کے میدان میں مزید اعلیٰ تعلیم کے لیے آپ کو یورپ جانے کا وظیفہ ملا۔ ۱۹۲۰ء میں انٹر میڈیٹ اور ۱۹۲۲ء میں بی اے کیا، انجمنِ طیلسانین کے صدر بھی رہے۔ دارالترجمہ کے لیے کام کیا، آپ کا ایم اے کا مقالہ حجاج بن یوسف ثقفی پر تھا، آپ کی یہ تصنیف دو جلدوں میں ہے اور بہت سی جامعات کے نصاب میں "اصولِ قانونِ شہادت" کے مضمون کے تحت شامل رہی ہے۔ آپ نے مجلہ عثمانیہ میں دو مضامین بھی لکھے:

۱۔ "ماہیتِ علم واصولِ قانون"

۲۔ "علمِ اصولِ قانون کا طریقہ کار"

جب آپ اعلیٰ تعلیم کے لیے یورپ چلے گئے تو وہاں آپ نے شان دار کارکردگی کا مظاہرہ کیا، اس حوالے سے شاہ بلیغ الدین کا کہنا ہے:

> اعلیٰ تعلیم کے لیے وہ آکسفورڈ گئے۔ وہاں سے بی سی ایل (Bachelor of Civil Law) کی ڈگری لی، ایم فل کیا، بار ایٹ لا ہوئے اور ایل ایل ڈی (-Legum Doctor/Doctorate Level acadamicdegree in Law) کے اعزاز کے ساتھ وطن واپس ہوئے۔ آکسفورڈ نے راست بی سی ایل میں داخلہ نہیں دیا۔ پروفیسر مار گولیتھ کی نگرانی میں علومِ عربی میں ڈاکٹریٹ کے لیے شریک ہوئے۔ معاملات کے اسلامی قوانین پر ڈیڑھ سال کی مدت میں تحقیقی مقالہ مکمل کیا۔ احکامِ سود پر اس مقالے میں خصوصی بحث کی گئی ہے۔ اس کے بعد بی سی ایل میں داخلہ ملا۔ تین سال میں اپنا تمام تعلیمی کیریئر مکمل کر لیا۔[204]

۱۹۳۱ء میں وطن واپس آکر آپ شعبہ قانون میں ریڈر کی حیثیت سے پڑھانے لگے اور جلد ہی پروفیسر بن گئے۔ جامعہ عثمانیہ میں پانچ سال تک آپ قانون کی تعلیم دینے کے بعد ۱۹۳۶ء میں ناظم فوج داری کی حیثیت سے وزارتِ قانون میں چلے گئے جہاں سے محکمہ عدالت کے ڈپٹی سیکرٹری بنے، پھر رکنِ عدالت (جج) بن کر سقوطِ حیدر آباد کے بعد ملازمت سے الگ ہو گئے۔ البتہ جامعہ سے آپ کا رشتہ آخر تک قائم رہا، قانون شہادت، قانون روما اور شرع شریف یعنی مسلم لا کے مضامین پڑھاتے رہے۔[205]

> تدریس کا شوق تھا، وزارت قانون کی ذمہ داریوں کے ساتھ ساتھ جامعہ عثمانیہ، قانونی تعلیم کے ایک اور پرانے ادارے اور سوّل سروس اکیڈمی میں پڑھایا کرتے تھے۔ قانون کے طالب علموں میں آپ بہت مشہور تھے۔[206]

رحمت یار جنگ کوتوال بلدہ کی بڑی صاحب زادی نادر النساء بیگم سے آپ کی شادی ہوئی۔۱۹۷۵ء میں حیدر آباد دکن میں آپ کا انتقال ہوا۔[207]

ڈاکٹر یوسف حسین خان:

آباواجداد کا تعلق قائم گنج، فرخ آباد سے تھا۔ان کے چھے بھائیوں میں ڈاکٹر ذاکر حسین خاں مسلم علی گڑھ یونیورسٹی کے وائس چانسلر، صوبہ بہار کے گورنر اور بعد ازاں بھارت کے صدرِ جمہوریہ (۱۹۶۷ء—۱۹۶۹ء) رہے۔ ایک بھائی ڈاکٹر محمود حسین خاں، جو تحریکِ پاکستان میں شامل ہو گئے تھے اور بعد ازاں پاکستان منتقل ہو گئے، کراچی اور ڈھاکا کی یونی ورسٹیوں میں بطور وائس چانسلر خدمات سرانجام دیتے رہے۔اس کے علاوہ حکومتِ پاکستان میں وزارتِ دفاع اور وزارتِ تعلیم کے قلم دان بھی ان کے سپرد رہے۔[208]

آپ ۱۸ ستمبر ۱۹۰۲ء میں حیدر آباد دکن میں پیدا ہوئے۔آپ نے ابتدائی تعلیم علی گڑھ کے سرکاری اسکول میں حاصل کی۔آپ کا شمار ذہین طلبا میں ہوتا تھا۔جولائی ۱۹۲۱ء میں آپ نے جامعہ اسلامیہ میں داخلہ لے کر اپنی تعلیم کا سلسلہ آگے بڑھایا جہاں اپ پانچ سال تک زیرِ تعلیم رہے۔مئی ۱۹۲۶ء میں آپ اعلیٰ تعلیم کے لیے فرانس چلے گئے اور ۱۹۲۹ء میں پی ایچ ڈی مکمل کر لی۔اپنے فرانس میں قیام کے دوران آپ نے فرانسیسی زبان سیکھنے میں بھی بہت محنت کی۔[209] جنوری ۱۹۳۰ء میں آپ فرانس سے واپس وطن تشریف لائے اور حیدر آباد دکن میں عثمانیہ یونی ورسٹی کے شعبہ تاریخ سے وابستہ ہو گئے جو ۱۹۵۷ء تک جاری رہا۔[210] واپس آکر مولوی عبدالحق کی فرمائش پر آپ نے گارساں دتاسی کے پندرہ خطبات کا اردو میں ترجمہ بھی کیا تھا جو ۱۹۳۵ء میں کتابی صورت میں شائع ہوئے، بعد ازاں آپ نے فرانسیسی ادب پر بھی ایک کتاب لکھی۔بطور ماہرِ لسانیات اُن کو عربی، انگریزی، فرانسیسی، فارسی اور اُردو زبانوں پر کامل عبور تھا۔آپ نے نظام الملک جاہ پر بھی انگریزی میں ایک کتاب لکھی تھی جو ۱۹۳۶ء میں چھپی۔[211]

آپ نے دفتر دیوانی ملکی ومال میں بھی خدمت انجام دی تھی۔[212] اٹھائیس سال آپ جامعہ عثمانیہ سے منسلک رہے اس دوران دو سال کے عرصہ کے لیے آپ کو شہزادہ مکرّم جاہ کا اتالیق مقرر کیا گیا۔۱۹۴۸ء میں بھارت کے خلاف اقوامِ متحدہ میں جب ریاستِ حیدر آباد کا مقدمہ پیش کیا گیا تو اس وقت آپ ترجمان کی حیثیت سے نواب معین نواز جنگ اور قائدِ پست اقوام شیام سندر کے ساتھ کراچی سے پیرس روانہ ہوئے۔سلامتی کونسل میں حیدر آباد کا مقدمہ پیش ہو چکا تھا کہ ۱۳ ستمبر کو بھارت نے حیدر آباد پر حملہ کر دیا۔۱۷ ستمبر ۱۹۴۸ء کو آصف جاہی حکومت کا خاتمہ ہو چکا تھا۔[213] اپنی آپ بیتی "یادوں کی دنیا" میں آپ نے لکھا ہے:

> مجھے حیدر آباد دکن کی تباہی اور آصف جاہی خاندان کی حکمرانی ختم ہونے کا سخت افسوس تھا۔ نہ صرف یہ کی میں حیدر آباد میں پیدا ہوا تھا بلکہ جذباتی طور پر بھی میں نے اپنے آپ کو حیدر آباد سے وابستہ کر لیا تھا۔ ہمارے خاندان کا تین پشتوں سے دکن سے تعلق رہا تھا، دادا، چچا، والد اور میں خود وہاں رہے۔ مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ جب میر محبوب علی خان کے انتقال کی خبر ہم لوگوں کو قائم گنج میں معلوم ہوئی تو ہماری والدہ کے آنسو نکل آئے تھے۔ ان کی زبانی ہم نے میر محبوب علی خان کی سخاوت اور فیاضی کے قصے سنے تھے۔ حیدر آباد دکن کا فیضِ عام تھا، ملک کے تعلیمی ادارے چاہے وہ ہندوؤں کے ہوں یا مسلمانوں کے، حیدر آباد کی طرف امید کی نظر اٹھاتے تھے اور یہ نظر کبھی وہاں سے واپس نہیں آتی تھی۔ سارے ملک میں نظام کی داد و دہش کا چرچا تھا اور عثمانیہ یونی ورسٹی نے اردو زبان کی جو خدمت انجام دی اس کی وجہ سے اس زبان کے بولنے والے حیدر آباد کا احسان کبھی فراموش نہیں کر سکتے۔ [214]

سر مرزا اسماعیل جب کچھ عرصے کے لیے حیدر آباد کے صدر اعظم ہوئے تو انھوں نے بھی حیدر آباد میں ہندو مسلم اتحاد کی کئی مثالیں دیکھیں۔ ڈاکٹر یوسف حسین خان عثمانیہ یونی ورسٹی سے سبک دوش ہونے کے بعد سات سال تک مسلم یونی ورسٹی علی گڑھ کے وائس چانسلر رہے۔ ۱۹۶۵ء میں آپ دہلی چلے گئے۔ [215]

یوسف حسین خاں کی ''یادوں کی دُنیا'' کا شمار اُردو آپ بیتی اور خود نوشت نگاری کے میدان میں ایک جامع اور وقیع تحریر کے طور پر کیا جاتا ہے اور اسے بجا طور پر دس منتخب جدید خود نوشتوں کی فہرست میں جگہ دی جاتی ہے۔ ایک مؤرّخ ہونے کے ناطے انہوں نے اپنے واقعات کا اور شخصیات کا ایک جامع مگر کڑا انتخاب کیا ہے اور بہر حال گفتنی اور ناگفتنی کا اپنے نقطۂ نظر سے بخوبی لحاظ رکھا ہے۔ یوسف حسین خاں نے ایک ایسے عہد میں جنم لیا جو برصغیر کے مسلمانوں میں سیاسی، تہذیبی اور تعلیمی لحاظ سے کھوئی ہوئی عظمت دوبارہ حاصل کرنے کی کوششوں اور آزادی کی تحریک کا زمانہ تھا۔ ڈاکٹر یوسف حسین خاں نے یادوں کی دنیا میں زبان و بیان کی آسانی اور شگفتگی کا دامن نہیں چھوڑا اور کئی واقعات کو کہانیوں اور افسانوں کے انداز میں بیان کیا ہے مگر محتاط اور شائستہ پیرائے میں۔ اس طرح انھوں نے ''یادوں کی دنیا'' کو جوش ملیح آبادی کی ''یادوں کی برات'' بنانے سے حتی الوسع شعوری احتراز کیا ہے، جو حضرت جوش جیسے جرأتِ رندانہ و بے باکانہ کے حامل شاعر کے سامنے ایک ماہرِ تعلیم اور موّرخ کے انداز کی غمازی کرتا ہے۔ مصنف داخلی جذبات کو اتنا کھل کر بیان نہیں کر سکے اور ''کچھ بھی نہ کہا اور کہہ بھی گئے'' کی درمیانی کیفیت کو برقرار رکھا ہے اور اسے قاری کے تخیل پر چھوڑ دیا ہے۔ اس اعتبار سے ''یادوں کی دنیا'' ایک تاریخ بھی ہے، سوانح عمری بھی

اور زندگی کی داستان بھی۔ یہ خودنوشت بلاشبہ اُردو ادب کی منتخب خودنوشتوں میں شمار کیے جانے کے قابل ہے۔اس حوالے سے جموں یونی ورسٹی کی طالبہ شاہدہ نواز کے الفاظ ملاحظہ ہوں:

> ڈاکٹر یوسف حسین خان کی خودنوشت یادوں کی دنیا ۱۹۶۵ء میں منظر عام پر آئی۔ مصنف اردو ادب میں مورخ وادیب کی حیثیت سے جانے جاتے ہیں۔ یہ خودنوشت مصنف کی شخصیت اور نفسیات سے پردہ اٹھاتی ہے۔ کتاب آٹھ ابواب اور ۲۷۴ صفحات پر مشتمل ہے۔ تاریخ نگار ڈاکٹر ذاکر حسین کے چھوٹے بھائی ہیں۔ آپ بیتی میں ڈاکٹر ذاکر حسین کو فخر خاندان کے نام سے یاد کیا ہے۔ پہلے دو ابواب میں خاندانی تاریخ اور دوسرے اہم واقعات پر روشنی ڈالی گئی ہے بچپن کی یادوں کا ذکر مختصر ہے۔ ہندوستان میں پٹھانوں کی آمد کا سلسلہ بھی پیش کیا گیا ہے۔ تیسرے باب میں بھائیوں کے متعلق جانکاری دی گئی ہے۔ چوتھے باب میں فخر خاندان کے عنوان سے ڈاکٹر ذاکر حسین کے بارے میں جانکاری ملتی ہے۔ان کی شخصیت کے ہر پہلو پر تفصیلاً بحث کی گئی ہے۔ یہ تفصیل ۷۰ صفحات پر مشتمل ہے۔ پانچویں باب میں طالب علمی کے زمانے کی یادوں کو تازہ کیا گیا ہے۔ چھٹے باب میں فرانس کے سیاسی، سماجی،ادبی اور معاشرتی پہلوؤں پر روشنی ڈالی گئی ہے۔[216]

صنف غزل کی تنقید میں یوسف حسین خاں کی کتاب اردو غزل کو بڑی اہمیت حاصل ہے۔روح اقبال اقبال کی فکر اور فن کا احاطہ کرتی ہے۔انھوں نے مومن پر بھی علمی اور تحقیقی کام کیا۔حسرت کی شاعری کے مختلف پہلوؤں پر تحقیقی مضامین لکھے جو حسرت کی شاعری کے نام سے کتابی شکل میں شائع ہو چکے ہیں۔ گورنمنٹ آف انڈیا ایکٹ پر ایک مبسوط کتاب تاریخِ دستورِ حکومتِ ہند کے نام سے ترتیب دی۔آخری عمر میں غالب کے کلام کا انگریزی زبان میں ترجمہ کیا۔یوسف حسین خاں نے انگلش اردو لغت کے کام میں مولوی عبدالحق کی بھی بہت مدد کی تھی۔[217] دارالترجمہ عثمانیہ کے لیے انھوں نے تاریخِ ہند مرتب کی جو ایسٹ انڈیا کمپنی کے عہد سے ۱۹۳۹ء تک کے زمانے کی ہندوستان کی تاریخ ہے۔دکن کی تاریخ پر تاریخِ دکن بھی مرتب کی۔مبادی عمرانیات نامی کتاب فرانسیسی زبان سے براہ راست ترجمہ ہے۔غالب اور آہنگِ غالب بھی ان کی ایک اہم تصنیف ہے۔عہد وسطیٰ کی تاریخ اور ادب سے متعلق انگریزی میں بھی کئی کتابیں ہیں۔اس کے علاوہ کاروانِ فکر، سماجی علوم اور خوابِ زلیخا آپ نے یادگار چھوڑی ہیں۔

آپ کی شخصیت کے بارے میں تمکین کاظمی کے الفاظ ملاحظہ ہوں:

> نہایت زندہ دل، مرنجان ومرنج، قابل اور محنتی شخص ہیں۔دفتر دیوانی کے کیئر ٹیکر کی حیثیت سے بھی مدتوں کام کیا۔تاریخ اور ادب پر پورا عبور ہے۔ایک درجن کے قریب کتابیں چھپوا دی ہیں

،سیاسیات،ادب اور تاریخ پر تمام کتابیں ہیں۔علامہ اقبال پر بھی ایک عمدہ کتاب لکھی ہے جو بہت پسند کی جاتی رہی۔[218]

اقبال پر لکھی جانے والی کتاب روحِ اقبال کے نام سے ۱۹۴۱ء میں شائع ہوئی جس سے ان کی ادب پر گہری نگاہ اور بالغ نظری کا اظہار ہوتا ہے۔

آپ نے اردو زبان کے فروغ اور ترقی میں اپنا کافی حصہ ڈالا۔ایک بار جب اردو کے لیے فارسی کے بجائے دیونا گری رسم الخط کی تحریک چلی تو آپ نے اس تحریک سے اختلاف کرتے ہوئے فارسی رسم الخط کی حمایت کی۔[219]

ملازمت کے دوران یوسف حسین خاں کی تمام تر علمی توجہ کا مرکز زبان وادب، شاعری اور تاریخ رہی۔ حیدر آباد کے قیام کے زمانے میں وہ وہاں کے علمی اور ثقافتی اداروں سے وابستہ رہے۔۱۹۷۸ء میں ان کی کتاب حافظ اور اقبال پر انھیں ساہتیہ اکیڈمی اعزاز دیا گیا جو ان کی علمی خدمات کا اعتراف تھا۔حکومتِ ہند نے انھیں پدم بھوشن کے خطاب سے سرفراز کیا۔آپ کا انتقال اپریل ۱۹۷۹ء میں ہوا۔[220]

محمد رضی الدین صدیقی:

ڈاکٹر رضی الدین صدیقی پاکستانی نظریاتی طبعیات دان اور ریاضی دان تھے جنھوں نے پاکستانی نظامِ تعلیم میں اہم کردار ادا کیا اس کے علاوہ انھوں نے پاکستان کے ایٹمی ہتھیاروں کے انضمام اور اس کی ترقی میں بھی اپنا حصہ ڈالا۔ آپ نے ایک تعلیمی ماہر اور سائنس دان کی حیثیت سے اپنے ملک میں تعلیمی تحقیقاتی ادارے اور یونی ورسٹیاں قائم کیں۔

رضی الدین صدیقی ۸ جنوری ۱۹۰۸ء[221] (فصلی تقویم میں آپ کی تاریخ ولادت ۱۴ خورداد، ۱۳۱۴ف لکھی گئی ہے[222]) کو حیدر آباد دکن (بھارت) میں پیدا ہوئے۔آپ کے والد کا نام مظفر الدین تھا۔رضی الدین کے ایک بڑے بھائی محمد ذکی الدین تھے اور دو بہنیں عابدہ اور ساجدہ۔رضی الدین سب سے چھوٹے تھے[223]۔ڈاکٹر رضی الدین صدیقی مرحوم کے بزرگوں کا تعلق اورنگ آباد سے تھا۔یہ لوگ نظام حیدر آباد کے دور میں مختلف اضلاع میں خطیب اور قاضی کے فرائض انجام دیتے رہے۔ان کے والد مولوی مظفر الدین چھٹے نظام، محبوب علی خان اور ساتویں نظام میر عثمان علی خان کے دفتر کے سپریٹنڈنٹ رہے۔[224]

آپ کا خاندان پرانے شہر میں رہتا تھا، یہاں کے علمی مرکز دار العلوم (پنجاب یونی ورسٹی) سے اپ نے عربی اور فارسی میں مولوی اور منشی کی سندیں حاصل کیں[225] اور میٹرک کا پہلا امتحان ۱۹۲۲ء میں پاس

کیا۔۱۹۱۸ء میں "رشیدیا امتحان" پاس کرنے کے بعد ۱۹۲۱ء میں آپ نے عثمانیہ یونیورسٹی میں داخلہ لیا اور ۱۹۲۵ء میں ریاضی میں بی اے کی ڈگری حاصل کی[226]۔آپ ۱۹۲۵ء میں عثمانیہ یونیورسٹی کے پہلے بیچ کے گریجویٹز میں سے ایک ہیں۔[227] آپ تینوں مراحل میں اوّل آئے اس کے علاوہ ہر مضمون میں آپ کے نمبر سب سے زیادہ رہے۔[228] آپ کی شخصیت کے بارے میں شاہ بلیغ الدین کے الفاظ دیکھیے:

> رضی الدین صاحب کا رنگ صاف تھا، قد اونچا پورا، گردن لمبی تھی، چہرہ بھی کچھ لمبوترا تھا، پیشانی کشادہ، انکھیں نہ بڑی نہ چھوٹی، ناک ستواں، منہ کا دہانہ بڑا، مدتوں چہرہ داڑھی مونچھ سے صاف رہا۔ آخر عمر میں عربوں کی سی داڑھی چھوڑ لی تھی۔ طالب علمی کے زمانے میں شیروانی پہنتے رہے، یورپ گئے تو سوٹ بوٹ کے ہو گئے۔ پڑھانے لگے تو اکثر سوٹ اور فیلٹ ہیٹ میں نظر آتے، کبھی کبھی شیروانی بھی پہن لیتے تھے۔ پاکستان آئے بھی تو یہی حال رہا، یہاں البتہ سر پر جناح کیپ پہننے لگے تھے۔۔۔ڈاکٹر رضی الدین سادہ مزاج اور ملنسار آدمی تھے، آپ بہت زیادہ یار باش آدمی نہیں تھے، نہ کلب اور مجلسی زندگی کے دلدادہ تھے۔ ان کے پڑھنے لکھنے کا کینوس بہت وسیع تھا۔ ریاضی اور فزکس کے تحقیقاتی کاموں کے علاوہ انھیں اردو شعر وادب کا بھی بڑا پاکیزہ ذوق تھا۔ بنیادی طور پر وہ مذہبی رجحانات کے آدمی تھے اور کچھ پاروں کے حافظ بھی تھے۔[229]

آپ کو دکن کی سرکار نے برطانیہ میں اعلیٰ تعلیم حاصل کرنے کے لیے اسکالرشپ سے نوازا تاہم یورپ جانے سے قبل آپ کی شادی کاظم یار جنگ کی بیٹی خورشید جہاں سے ہوئی۔ کاظم یار جنگ' میر عثمان علی خان کے چیف سیکریٹری تھے۔[230]

برطانیہ میں آپ نے ۱۹۲۸ء میں کیمبرج یونی ورسٹی میں داخلہ لینے کے لیے امتحانی مقابلے میں اول پوزیشن حاصل کی تو اربابِ اختیار کو آپ کو داخلہ دینا پڑا ورنہ وہ آپ کو داخلہ دینے سے انکار کر چکے تھے۔ کیمبرج سے جناب پال ڈیراک کے زیرِ نگرانی ریاضی میں ماسٹرز کی ڈگری مکمل کی۔ اس کے بعد آپ نے جرمنی میں لیپزگ (Leipzig) یونیورسٹی (جمہوریہ ویمار) میں اپنے پی ایچ ڈی کے لیے مزید کام کیا۔[231]

لیپزگ میں آپ نے برلن (berlin) اور ہیسن برگ (Heisenberg) میں البرٹ آئن سٹائن کے تحت ریاضی اور کوانٹم میکانیکس کا مطالعہ کیا اور نظریاتی طبیعیات میں جوہری توانائی پر مختصر مقالہ لکھ کر اپنا پی ایچ ڈی مکمل کیا، آپ البرٹ آئن سٹاین کے سب سے زیادہ قابلِ ذکر طالب علموں میں شمار کیے جاتے ہیں۔ شاہ بلیغ الدین کے خیال میں آپ نوبل پرائز کے اہل تھے لیکن کچھ تعصبات کی وجہ سے آپ کو محروم رکھا گیا[232]۔ دوسری عالمی جنگ کے

اختتام تک آپ جرمنی میں ہی تھے اس کے بعد پوسٹ ڈاکٹوریل کے لیے آپ فرانس کی پیرس یونی ورسٹی چلے گئے۔

یورپ میں پیرس یونی ورسٹی میں اپنے تحقیقی کام کے دوران آپ کو "پیرس گروپ" کے ارکان کے ساتھ ملاقات کا موقع ملا تو آپ نے فزکس اور ریاضی کے غیر حل شدہ مسائل کے بارے میں ہونے والے مباحث میں شرکت کی۔ برطانیہ میں اپنے قیام کے دوران آپ نے کوانٹم میکانیکس کا مطالعہ کیا اور (Cavendish Laboratory) کاوینڈش لیبارٹری میں اس حوالے سے اپنے کام کے بعد آپ نے کئی تحقیقی مضامین شائع کیے۔ ۱۹۴۱ء میں، برطانیہ نے آپ کو اپنے جوہری سائنسدانوں کی اپنی ٹیم میں شامل کر لیا تھا، اسی ٹیم نے بعد میں آپ کو کچھ دیگر محققین کے ہمراہ امریکہ کے جوہری پروگرام (Mainhattan Project) کے لیے نامزد کیا۔

آپ ان طالب علموں میں شمار لیے جاتے ہیں جنھوں نے عثمانیہ یونیورسٹی کے قیام میں حصہ لیا۔ ۱۹۳۱ء میں آپ وطن (برطانوی ہند) واپس آئے اور عثمانیہ یونیورسٹی حیدرآباد دکن میں ریاضی کے ایسوسی ایٹ پروفیسر بن گئے اور تحقیق کا کام بھی جاری رکھا، انڈین سائنس جنرل میں آپ کے مقالے مسلسل چھپا کرتے تھے جس کی وجہ سے انڈین سائنس کانگریس نے آپ کو دو مرتبہ 'ہندوستان کے مانے ہوئے سائنس دان' کا اعزاز دیا تھا۔[233] ۱۹۴۸ء-۱۹۴۹ء کے دوران وہاں کے گورنر کے ایما پر آپ نے عثمانیہ یونی ورسٹی کا وائس چانسلر کے طور پر خدمات سرانجام دیں اور کچھ عرصہ کے لیے تحقیقاتی کونسل کے ڈائریکٹر جنرل بھی رہے[234]۔ آپ کے وطن واپس آنے کے بعد سے پاکستان میں منتقل ہونے تک کا جو عرصہ ریاست حیدرآباد میں گزرا، اس کے بارے میں آپ کے بھتیجے صفی الدین صدیقی کے الفاظ ملاحظہ ہوں:

> ۱۹۳۱ء میں صدیقی (یورپ سے واپس) حیدرآباد واپس لوٹ گئے اور عثمانیہ یونیورسٹی میں ریاضی کے پروفیسر کی حیثیت سے خدمات سرانجام دینے لگے۔ انھیں ۱۹۴۸ء میں اس یونی ورسٹی کا وائس چانسلر مقرر کیا گیا تھا۔ 235 ۱۹۳۱ء سے ۱۹۴۸ء تک آپ اس یونی ورسٹی کے سائنسی تحقیق کے ادارے کے ڈائریکٹر بھی رہے۔ آپ ۱۹۴۹ء اس یونی ورسٹی سے وابستہ رہے جب تک کہ بھارتی اتحاد (انڈین یونین) نے ۱۹۴۸ء میں اس ریاست میں اپنا سیاسی نظام نہ نافذ کر لیا۔ ۱۹۳۱ء سے ۱۹۴۹ء تک آپ نے کئی بین الاقوامی جریدوں میں اپنے سائنسی تحقیق پر مبنی مضامین شائع کیے ساتھ ہی کئی قومی اور بین الاقوامی کانفرنسوں میں بھی شامل ہوئے۔ ۱۹۳۸ء میں آپ نے کوانٹم میکانیات (Quantum Mechanics) پر جو کتاب لکھی وہ غالباً اس اہم موضوع پر برطانوی ہند میں چھپنے والی پہلی کتاب تھی۔ ۱۹۴۲ء میں عثمانیہ یونی ورسٹی نے آپ کو سائنس میں اعزازی ڈگری سے بھی نوازا۔ آپ بھارتی سائنسی اکادمی (Indian Academy of Science) کے بانی رکن تھے اس کے علاوہ

آپ انڈین ریاضیاتی سوسائٹی (Indian Mathematical Society) کے صدر(۱۹۴۷ء سے ۱۹۴۹ء) رہنے کے ساتھ ساتھ انڈین نیشنل سائنس اکیڈمی کے رکن بھی تھے۔[236]

ہندوستان میں اپنے قیام کے دوران جب آپ کو معلوم ہوا کہ علامہ اقبال نظریہ اضافیت پر ایک کتاب لکھوانا چاہتے ہیں تو آپ نے کتاب لکھی اور اس میں علامہ اقبال کے زمان و مکان کے نظریے کے بارے میں بھی ایک مضمون شامل کیا مگر جب یہ کتاب مکمل ہوئی تو علامہ کا انتقال ہو گیا۔ مولوی عبدالحق نے یہ کتاب انجمن دہلی سے شائع کی۔[237]

۱۹۴۷ء میں قیامِ پاکستان کے بعد حکومتِ پاکستان کی درخواست پر ڈاکٹر صدیقی ۱۹۵۰ء میں پاکستان کے شہر کراچی میں منتقل ہو گئے۔ یہاں آپ نے کراچی یونی ورسٹی میں درس و تدریس کا مشغلہ اختیار کیا اور یہاں ریاضی کے پروفیسر مقرر ہو گئے۔ ۱۹۵۳ء میں آپ ایک ساتھ ہی سندھ یونی ورسٹی اور پشاور یونیورسٹی کے وائس چانسلر کے عہدے پر کام کر رہے تھے۔ ۱۹۵۲ء میں ڈاکٹر صدیقی نے "آل پاکستان ریاضی ایسوسی ایشن" (اسے اب پاکستان ریاضی سوسائٹی کے نام سے جانا جاتا ہے) کے نام سے پاکستان میں پہلی ریاضیاتی سوسائٹی قائم کی، اور پھر ۱۹۷۲ء تک اس کے صدر رہے۔ ۱۹۵۶ء میں ڈاکٹر صدیقی نے پاکستان جوہری توانائی کمیشن (Pakistan Atomic Energy Commission)(PAEC) کے نئے ادارے میں شمولیت اختیار کر لی اور پھر ریاضیاتی طبیعیات پر پہلا سائنسی ڈائریکٹریٹ قائم کرنے کے بعد ملک میں جوہری طاقت اور اس کی توسیع میں اپنی خدمات دیں۔

۱۹۶۴ء میں ڈاکٹر صاحب پاکستان جوہری توانائی کمیشن (Pakistan Atomic Energy Commission) میں کام کرنے کے لیے اسلام آباد میں منتقل ہو گئے۔ یہاں آپ نے نظریاتی طبیعیات میں اپنی تعلیمی تحقیق کا بھی آغاز کیا۔ ۱۹۶۰ء میں آپ نے قائدِ اعظم یونی ورسٹی کو ایک تحقیقی ادارہ بنانے کے لیے صدر فیلڈ مارشل ایوب خان کو قائل کرنے میں بھی اہم کردار ادا کیا، آپ کی کوششوں سے یہاں "فزکس انسٹی ٹیوٹ" قائم کیا گیا اور پروفیسر رضی الدین کو اس نئے ادارے کا پہلا ڈائریکٹر اور فیکلٹی کا ڈین مقرر کیا گیا۔ ۱۹۶۵ء میں قائدِ اعظم یونی ورسٹی کے قیام کے ساتھ اس وقت کے وزیرِ خارجہ ذوالفقار علی بھٹو نے آپ کو یہاں کا پہلا وائس چانسلر مقرر کیا تو آپ نے پی اے ای سی کے ادارے کو خیر باد کہہ دیا۔ آپ قائدِ اعظم یونی ورسٹی میں طبیعیات کے اولین اساتذہ میں سے ایک تھے، آپ نے طبیعیات کے شعبہ کے چیئرمین کی حیثیت سے ۱۹۷۲ء تک اپنی خدمات جاری رکھیں۔ اس یونی ورسٹی میں خدمات سرانجام دینے کے بعد اس وقت کے وزیرِ اعظم ذوالفقار علی بھٹو کی درخواست پر ۱۹۷۱ء کی پاک۔ بھارت جنگ

کے بعد پی اے ای سی میں دوبارہ شمولیت اختیار کرلی۔ آپ ہی اس کے اوّلین کل وقتی تکنیکی رکن تھے اور اس کے چارٹر کی تیاری کے ذمہ دار تھے۔

پروفیسر رضی الدین نے اپنے مربّی ڈاکٹر عبدالسلام کی مدد سے، پی اے ای سی کے اس وقت کے چیئرمین ڈاکٹر عشرت حسین عثمانی کو قائل کر کے پاکستان جوہری توانائی کمیشن میں کام کرنے والے تمام نظریاتی طبیعیات دانوں پر مشتمل "نظریاتی طبیعیات گروپ (TPG)" تشکیل دیا جس نے بعد میں ملک کے لیے ایٹمی ہتھیار ڈیزائن کیے۔

ٹی جی پی کے قیام کے ساتھ ہی ڈاکٹر صدیقی نے ڈاکٹر عبدالسلام کے ساتھ کام کرنے کا آغاز کیا اور ان ہی کے مشورہ پر PAEC میں نظریاتی طبیعیات میں تحقیق شروع کی۔ آپ نے ۱۹۷۰ء میں PAEC میں "ریاضیاتی فزکس گروپ (MPG)" قائم کیا اور یوں ریاضی میں اعلیٰ درجے کی تعلیمی تحقیق کی نگرانی کی پھر آپ نے پی اے ای سی کے ماہر ریاضی دانوں کو اپنے شعبے میں مزید مہارت اور تخصص حاصل کرنے کے لیے ریاضیاتی فزکس گروپ (MPG) کے ساتھ کام کرنے کا موقع بھی فراہم کیا۔

۱۹۷۰ء کی دہائیوں کے دوران ڈاکٹر صدیقی نے پاکستان کے جوہری پروگرام میں درپیش نظریاتی فزکس کے حل طلب مسائل پر کام کرنے کے لیے پاکستان کے نظریاتی طبیعیات کے ماہرین کے ساتھ مل کر کام کیا۔ اس سے قبل آپ یورپ میں برطانوی ایٹمی پروگرام (Tube Alloys) اور فرانسیسی ایٹمی پروگرام کے تحت جوہری تحقیق کے کام کا تجربہ حاصل کر چکے تھے۔ PAEC میں رہ کر آپ ملک کے کئی تعلیمی سائنس دانوں کے مربی اور سرپرست بن گئے تھے۔ PAEC میں آپ ریاضیاتی فزکس گروپ کے ڈائریکٹر تھے اور یہاں آپ کو فشن (Fission) کا مطالعہ کرنے کے لیے بڑے بڑے ریاضیاتی حساب (Supercomputing) کرنے پڑے جس کے لیے آپ نے PAEC میں کوانٹم کمپیوٹر لیبارٹریوں کے قیام کا بندوبست کیا۔

نظری طبیعیات کا کردار جوہری طبیعیات کے پیمانوں کو سمجھنے میں بھی اہم سمجھا جاتا ہے اور ڈاکٹر صدیقی نے اپنی اس مہارت کی وجہ سے آپ نے نظریہ اضافیت کے پیچیدہ پہلو یعنی ریلیٹوٹی آف سیمول ٹینی ٹی (Relativity of simultaneity) پر اپنی تحقیق کا کام شروع کیا۔ اس دوران آپ کو پاکستان کے جوہری پروگرام کے حوالے سے کیے جانے والے کاموں میں بھی حصہ لینا پڑتا تھا۔

PAEC میں اپنا کام مکمل کر کے آپ دوبارہ قائدِ اعظم یونی ورسٹی کے شعبہ طبعیات میں شامل ہو گئے۔ یہاں آپ نے طبیعیات کے پروفیسر کے طور پر اپنی تحقیق جاری رکھی، اس ادارے میں اعلیٰ تعلیم کو فروغ دینے میں مدد

دی اور اس حوالے سے اہم اور مرکزی نوعیت کی پالیسیاں ترتیب دیں۔ ۱۹۹۰ء میں آپ کو یہاں طبعیات اور ریاضی کا پروفیسر امیر طس(Professor Emeritus)بنادیا گیا۔[238] قائدِ اعظم یونیورسٹی میں رضی الدین صدیقی کی یاد اور ان کی عمدہ کاوشوں کو خراجِ تحسین پیش کرنے کے لیے "رضی الدین صدیقی میموریل لائبریری" قائم کی گئی ہے۔

آپ نے ۲ جنوری ۱۹۹۸ء کو ترانوے (۹۳) سال کی عمر میں انتقال کیا۔[239] صدیقی کی سوانح ان کے ہم کار ساتھی سائنس دانوں نے لکھیں۔

اپنی تعلیمی اور پیشہ ورانہ زندگی کے دوران آپ کو بہت سے ایوارڈ ملے۔ حیدر آباد دکن (بھارت) کی عثمانیہ یونی ورسٹی (Osmania University) کی جانب سے آپ کو ۱۹۳۸ء میں ڈاکٹر آف سائنس کی اعزازی سند (Doctorate of Science Honoris Causa) عطا ہوئی۔ پاکستان اکیڈمی آف سائنسز کی طرف سے ۱۹۵۰ء میں آپ کو گولڈ میڈل ملا۔ پاکستان فزیکل سوسائٹی نے ۱۹۵۳ء میں گولڈ میڈل دے کر آپ کی خدمات کا اعتراف کیا۔ ۱۹۶۰ء میں تعلیمی شعبے میں ترقی کے لیے قابلِ ذکر کوششیں کرنے کے اعتراف میں پاکستان کے تیسرے صدر فیلڈ مارشل ایوب خان نے سب سے بڑا شہری اعزاز "ستارہ امتیاز" عطا کیا۔ پاکستان ریاضی سوسائٹی نے ۱۹۸۰ء میں آپ کو طلائی تمغے سے نوازا۔ ۱۹۸۱ء میں پاکستان میں سائنس کی مقبولیت میں اضافہ کرنے اور پاکستان کے جوہری پروگرام میں آپ کی خدمات کے صلے میں صدر جنرل ضیاالحق نے آپ کو دوسرا بڑا شہری اعزاز "ہلالِ امتیاز" دیا۔ مئی ۱۹۹۸ء میں پاکستان نے کامیاب ایٹمی تجربہ کیا تو اس وقت کے وزیرِ اعظم نواز شریف کی طرف آپ کو سب سے بڑا شہری اعزاز "نشانِ امتیاز" سے نوازا گیا۔ آپ دنیا بھی کی جامعات کے ممتحن رہے۔ کئی علمی اور سائنسی اداروں کے مشیر بنے۔ کئی زبانوں سے واقف تھے۔[240]

ان کی چار اولادیں ہوئیں، ایک بیٹا توفیق اور تین بیٹیاں فریدہ، شیریں اور سعیدہ۔ ان کے بیٹے توفیق نے پشاور یونی ورسٹی سے بی ایس سی کیا، کیمبرج سے فزکس میں آنرز کیا اور فرینک فرٹ یونی ورسٹی (جرمنی) سے پی ایچ ڈی کیا، ۱۹۷۶ء سے امریکہ میں ہیں، پھر ایسٹ ویسٹ سینٹر، ہونولولو، ہوائی میں انوائرمنٹ اینڈ پالیسی انسٹی ٹیوٹ کے انچارج رہے۔ فریدہ ۱۹۶۲ء سے نیشنل بنک آف پاکستان میں آفیسر رہیں۔ آپ کی سب سے بڑی بیٹی، ڈاکٹر شیرین طاہر خیلی امریکی ماہرِ سیاسیات ہیں۔ انھوں نے امریکہ کے اسٹیٹ ڈیپارٹمنٹ میں بھی خدمات سرانجام دیں۔ ۲۰۰۶ء میں ان کو خواتین کو بااختیار بنانے کا پہلا سفیر (First Ambassador for Women's

empowerment)اور اقوامِ متحدہ کی اصلاح سازی پر امریکہ کے اسٹیٹ سیکرٹری کی سینئر مشیر (Senior Advisor to the Secretary of state on United Nations Reform)بنایا گیا۔امریکہ کے صدر کی معاشی اور معاشرتی امور کی مشیر بھی بنیں،ان کے سپرد مشرقِ وسطیٰ کا خطہ تھا۔ سعیدہ کی میجر (ریٹائرڈ) اویس ادریس سے شادی ہوئی اور پاکستان میں رہائش پزیر رہیں۔[241]

آپ کے بارے میں نئی نسل بہت کم جانتی ہے، محسنِ پاکستان ڈاکٹر عبدالقدیر خان کبھی ملک کو جوہری طاقت بنانے کا کارنامہ سرانجام نہ دے پاتے اگر پس منظر میں ڈاکٹر رضی کی کاوشیں نہ ہوتیں۔ اس حوالے سے ضرار صلاح الدین نے اپنے ایک مضمون میں The Forgotten legacy of Dr Raziuddin (Siddiqui)لکھاہے:

> ہم ڈاکٹر رضی الدین کی خدمات فراموش کر چکے ہیں۔ آپ کا نام صرف انٹرنیٹ پر کچھ جذباتی بیانات میں ملتاہے۔ آپ کا نام بھی ملک کے دوسرے بڑے سائنس دانوں کی طرح یاد رکھنے کے قابل ہے۔ آپ کو آئن اسٹائن کے ساتھ کام کرنے کا موقع ملا۔ آپ قائدِ اعظم یونی ورسٹی کے پہلے وائس چانسلر تھے، سوائے اس کے کہ اس یونی ورسٹی میں آپ کی یاد میں لائبریری کا نام رکھا گیا ہے، ہم نے ان کا ذکر کبھی اپنی درسی کتابوں اور اپنی تاریخ کے صفحات میں نہیں پڑھا۔ گو کہ ان کو "ستارہ امتیاز" اور "ہلالِ امتیاز" سے سجایا گیا لیکن اپنے ملک میں اگر ان کی یاد باقی نہیں تو ان اعزازوں سے بھی کیا فرق پڑتا ہے۔[242]

ڈاکٹر محی الدین قادری زور:

پروفیسر سیدہ جعفر ہندوستانی ادب کے معمار-ڈاکٹر زور (حیدر آباد دکن: ساہتیہ اکیڈمی، س ن) ص۹ سے ۱۸ حالات زندگی، ۱۹ سے ۳۵ شخصیت، ادارہ ادبیات اردو، ۳۶ سے ۴۶، تحقیق وتدوین ۴۷ سے ۹۵، تنقید ۹۶ سے ۱۱۶، صوتیات ولسانیات ۱۱۷ سے ۱۲۸، افسانہ نگاری ۱۲۹ سے ۱۵۶، شاعری ۱۵۶ سے ۱۵۹، متفرقات ۱۶۰ سے ۱۷۶۔

پروفیسر ڈاکٹر محمد علی اثرؔ اشـــراق ادبیـات دکـن، (تلنگانہ، حیدر آباد دکن: ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، ۲۰۱۵ء)۔۔ڈاکٹر زور کے تـدوینی کـارنـامـے ص ۴۳ سے ۸۵۔۔ڈاکٹر زور کی ســـوانـح نـگــاری ص ۱۶۷ سے ۱۷۶۔۔ماہر القادری یـاد رفـتـگـان- جلد دوم، (لاہور: البدر پبلی کیشنز، ۱۹۸۴ء)۔۔ڈاکٹر زور۔ ص ۲۴۸ سے ۲۵۱۔۔ نقوش۔رفیعہ سلطانہ۔ ۳۰۵ سے ۳۱۱۔

دکن میں اردو زبان وادب کی خدمت میں دکنی ادیبوں وشاعروں نے بہت محنت کی اور زبان وادب کو فروغ دینے میں کوئی کسر نہیں چھوڑی، ان ادیبوں میں ڈاکٹر محی الدین قادری زورؔ کی خدمات بے پایاں ہیں۔ ان کی حیثیت زبان وادب میں جامع کمالات وہمہ جہت تھی۔ انھوں نے زبان وادب میں نئے موضوعات ومضامین کو پہلی مرتبہ متعارف کرایا۔ لسانیات کا علم یورپ میں تو مقبول تھا لیکن اردو ادب میں ابھی متعارف نہیں ہوا تھا۔ اردو تنقید ابھی رینگ رہی تھی۔ ڈاکٹر زورؔ نے اصول تنقید متعارف کرایا اس لیے وہ لسانیات اور تنقید کے اولین علم برداروں میں شمار کیے جاتے ہیں۔[243]

ڈاکٹر محی الدین قادری زورؔ نامور محقق بھی ہیں۔ انھوں نے کئی مثنویوں کی تدوین کی۔ اردو میں تحقیق کو اپنی کاوشوں کی بنیاد بنایا اور اردو کے لیے تحقیقی مرکز "ادارہ ادبیاتِ اردو" اور "ایوانِ اردو" قائم کیا۔ خود دکنی ادب کے محقق کہلائے اور کئی ایک کتابیں مرتب ومدون کی ہیں۔ ماہرِ دکنیات بھی ہیں۔ دکنی ادب کے دل دادہ اور عاشق تھے اس لیے ان کی تصانیف میں گولکنڈہ، حیدرآباد کی تہذیب وتمدن کے نقوش ملتے ہیں۔ انھوں نے گولکنڈہ حیدرآباد کی ثقافت کے تمام نقوش کو جزئیات کے ساتھ پیش کیا۔ اس لیے ان کے کارنامے تاریخ ادبِ اردو کا اٹوٹ حصہ بن گئے۔[244]

ڈاکٹر زور کا ایک اور کارنامہ جو طبعی مظاہرہ کا نمونہ ہے یعنی ادارہ ادبیات اردو (ایوان اردو) کا قیام اس کے کئی شعبے ہیں۔ اس میں بارہ شعبے کام کرتے ہیں مثلاً تصنیفی، تالیفی، تحقیقی، نشرواشاعت، امتحانات، خطاطی وغیرہ۔ یہ ادارہ دکنی محققین واسکالرز کی مدد وامداد کرتا ہے یعنی دکن سے تعلق رکھنے والے باشندے اس سے استفادہ کرتے ہیں۔ اس میں ایک میوزیم بھی ہے جس میں نوادرات رکھے ہوئے ہیں۔ بہرحال محققین کے لیے یہ ادارہ کسی نعمت سے کم نہیں۔ ایک کتب خانہ منسلک ہے اس میں رسائل، ادبی کتب ہیں۔ اس کا ترجمان رسالہ "سب رس" تو ہر لحاظ سے ترقی کر گیا۔ اچھے اور خوبصورت کے طرز پر چلائیں انداز سے پروفیسر بیگ احساس کی ادارت میں شائع ہو رہا ہے۔ ایسے محقق ونقاد یعنی ڈاکٹر زورؔ کی یاد منانے کے لیے عثمانیہ یونیورسٹی یا تلنگانہ یونیورسٹی میں ڈاکٹر زورؔ چیئر یا تحقیقی مرکز کا آغاز کریں تاکہ ان کے کارناموں کا اعتراف کیا جاسکے۔[245]

سید محی الدین قادری زور کی تاریخ پیدائش ۶ دسمبر ۱۹۰۴ء ہے۔ حیدرآباد، بھارت میں ان کی ولادت ہوئی۔ ابتدائی تعلیم مدرسہ دارالعلوم سٹی اسکول میں ہوئی۔ پھر ۱۹۲۷ء میں عثمانیہ کالج سے "لسانی سائنس" میں ایم۔ اے کی سند حاصل کی۔ ان کی ادبی اور علمی ذہانت کو دیکھتے ہوئے حیدرآباد کے فرماں روا نے انھیں وظیفہ دے کر

۱۹۲۹ء میں لندن یونی ورسٹی میں پی ایچ ڈی کرنے کے لیے روانہ کیا۔ جہاں انھوں نے "آریائی زبانوں" پر ڈاکٹریٹ کا مقالہ لکھا۔ ۱۹۳۰ء میں انھوں نے فرانس میں لسانی تحقیق پر خصوصی تعلیم حاصل کی۔ پھر وہ ہندوستان واپس آگئے۔ ہندوستان واپس آکر زورؔ صاحب چندر گھاٹ کالج کے پرنسپل مقرر ہوئے۔ اس کے بعد جامعہ عثمانیہ کے شعبہ اردو کے صدر مقرر ہوئے۔ بعدازاں وہ اپنی وفات تک کشمیر کی سری نگر یونی ورسٹی میں اردو اور فارسی مطالعات کے شعبے میں درس وتدریس کے فرائض انجام دیتے رہے۔ زورصاحب نے نواب رفعت یار جنگ کی صاحب زادی تحینت النساء سے شادی کی۔ جو اردو کی باقاعدہ پہلی صاحب دیوان شاعرہ تھیں۔ ان کے تین دیوانوں میں "صبر شکر" سب سے زیادہ مشہور ہوا۔ ان کی چار صاحب زادیاں اور پانچ صاحب زادگان تھے۔ زورصاحب کی ایک بیٹی زہرہ کا انتقال ستمبر ۱۹۶۲ء میں ہوا اور وہ خاینار شریف میں رزق خاک ہوئی۔ محی الدین زورصاحب ۱۹۳۱ء تک ادارہ ادبیات اردو میں اپنے آبائی مکان "تھنات منزل"، حیدرآباد میں مقیم رہے۔ ان کی ایک بیٹی تہذیب زہرہ عربی کی عالمہ ہیں۔ ۱۹۶۰ء میں وہ عثمانیہ یونیورسٹی میں پڑھاتی رہی۔ ان کی شادی ۷ مئی ۱۹۶۱ء کو ڈاکٹر یحیی علی احمد فاروقی سے ہوئی جو زورصاحب کے دوست پروفیسر لطیف احمد فاروقی ے صاحبزادے تھے۔ پھر وہ ۱۹۶۴ء میں پاکستان چلے گئے تھے۔ ان کی دوسری بیٹی توقیر زہرہ نے پاکستان میں ایک فوجی میجر عبدالقیوم سے شادی کی۔ ان کی تیسری بیٹی آرکی ٹیکٹ ہیں وہ اب برطانوی شہری ہیں۔ زرو صاحب کے تمام صاحبزداگان حیدرآباد، ہندوستان میں مقیم رہے۔ سید محی الدین قادری زور صاحب کا انتقال سری نگر، کشمیر میں ۲۵ ستمبر، ۱۹۶۲ء کو ہوا۔

انھوں نے اکسٹھ (۶۱) کتابیں تصنیف کیں اور ہندوستان کے تعلیمی اداروں میں اردو رائج کرنے میں بڑی خدمات سرانجام دیں۔ وہ اردو میں ماہر لسانیات کے طور پر معروف ہیں۔ انھوں نے لسانی تحقیق، معاشرتی روداد نگاری، عالمانہ تنقید کے علاوہ افسانے لکھے اور شاعری بھی کی۔ ان کی شاعری "حب ترنگ" اور "گلزارِ ابرہیم" کے نام سے چھپ چکی ہے۔ زروصاحب نے اردو کی ترویج کے لیے ادبیات اردو (المعرف ایوانِ اردو) کی بھی بنیاد رکھی۔ جس کا مقصد قدیم اردو کے اور علمی ورثے اور پرانے متنوں کو نیا افق فراہم کرنا تھا۔ انھوں نے ابوالکلام آزاد تحقیقی انسٹی ٹیوٹ بھی قائم کیا اور ادبی اور علمی جریدہ "سب رس" جاری کیا۔ یہ رسالہ اب بھی جاری ہوتا ہے۔ کراچی سے بھی شاہد حمید مرحوم بھی ایک عرصے تک شمالی ناظم آباد سے "سب رس" نکالتے رہے۔

محی الدیں قادری زور کے علمی اور ادبی کارناموں پر خلیق انجم نے کتاب بھی لکھی ہے۔ ان کی سب سے معروف کتاب ہندوستانی لسانیات ہے۔ اس کے علاوہ انھوں نے ہندوستانی لسانیات کے نام سے

انگریزی میں بھی ایک کتاب لکھی تھی۔ان کی مشہور تصانیف میں،" طلسمات خیال"، شاعر گولکنڈہ " "گولکنڈہ، کے ہیرے"، دکنی ادب کی تحریک"، "کلیات قطب شاہ"، " حیات میر محمدمومن"، داستان ادب حیدر آبا د"، " تذکرہ مخطوطات اردو"(دوجلدیں)،"طالب موہنی"، معنی شکن"(اس کتاب میں مغرب میں ۱۹۷۰ءاٹھنے والی فکری نظریہ "ردتشکیل"کوزورصاحب نے ساٹھ (۶۰) سال پہلے پیش کردیا تھا)انھوں نے کلیات محمد قلی قطب شاہ کے تدوین بھی کی۔

ڈاکٹر زور صاحب کے متعلق بہت سی ایسی باتیں سچائی کے ساتھ کہی جاسکتی ہیں جو ہر بڑے آدمی کے متعلق تھوڑے سے ردوبدل کے ساتھ اب تک کہی جاچکی ہیں۔ مثلاً یہ کہ انھوں نے اپنی ان تھک محنت سے بڑے کارہائے نمایاں انجام دیئے۔ وہ اپنی ذات سے ایک انجمن اور ایک ادارہ تھے۔ان کی سیرت آنے والوں کے لیے ایک نمونہ بنی رہے گی وغیرہ۔ مجھے اس قسم کی کوئی بات عرض نہیں کرنی ہے کیوں کہ زور صاحب کی عوامی زندگی اور علمی، ادبی خدمتوں سے بے شمار لوگ واقف ہیں اور بہت عمدگی سے اس زندگی اوران خدمات کاتذکرہ کرسکتے ہیں۔ میں توصرف وہ واقعات اور تاثرات لکھنا چاہتا ہوں جن سے مجھے زور صاحب کے بڑے قریب آنے کے بعد سابقہ پڑااور جن کی وجہ سے وہ مجھے بڑے آدمیوں میں بھی بڑے نظر آنے لگے۔ حضرت خواجہ حسن نظامی مرحوم، ڈاکٹر زور صاحب کے بڑے قدرداں تھے۔ان کے "ادارہ ادبیات اردو" کو "ایوان اردو" کا خطاب ۱۹۳۶ء میں خواجہ صاحب ہی نے دیا تھا۔ اور ڈاکٹر زور صاحب بھی خواجہ صاحب سے بڑا خلوص رکھتے تھے۔خواجہ حسن نظامی کے الفاظ ملاحظہ ہوں:

> ڈاکٹر زور صاحب کی شخصیت میں بے شمار خوبیاں تھیں۔خامیاں بھی یقیناً ہوں گی لیکن ان کی شخصیت کا ایک پہلو مجھے نظر آیا جو غالباً سب پہلوؤں سے نمایاں تھااور جس کی وجہ سے ان کی ہر خوبی میں چار چاند لگ جایا کرتے تھے اور ہر کمزوری نظر کے سامنے سے ہٹ جاتی تھی۔ڈاکٹر صاحب جب خلوص برتتے تھے تو اس میں بناوٹ اور دکھاوے کا شائبہ تک نہیں ہوتا تھا۔کہنے کو یہ بات معمولی سی ہے لیکن اس کا علم کچھ ڈاکٹر صاحب کے خلوص سے آشنا ہونے کے بعد ہی ہوتا تھا کہ روزمرہ ہم کو جس قسم کے خلوص سے سابقہ رہتا ہے اس میں کتنے فی صد تکلف کی ملاوٹ ہے۔کتنے فی صد مروت کا لحاظ ہے۔کتناد کھاوا ہے۔کس قدر منافقت ہے اور اس کے بعد اصل خلوص کی مقدار کتنی رہ گئی! ڈاکٹر زور صاحب کے خلوص میں منافقت اور بناوٹ تو کیا مروت اور تکلف کو بھی دخل نہیں ہوتا تھا۔کم از کم میں نے ایسا ہی محسوس کیا۔[246]

"وہ بڑے عملی آدمی تھے۔ تھوڑے وقت میں سارا کام کرڈالتے تھے۔اور اس کا راز ان کی محبت کے علاوہ غالباً یہی تھا کہ وہ ادھر ادھر کی بے کار، فضول اور لاگ لپیٹ کی باتوں میں وقت ضائع نہیں کرتے تھے۔ان کی ہر بات

اور ان کا ہر کام ٹو دی پوائنٹ ہوتا تھا۔ ان کے خلوص میں اس قدر شدت تھی کہ بعض اوقات باغ و بہار طبیعت کے باوجود اجنبی آدمی کو وہ کچھ اکل کھرے سے معلوم ہونے لگتے تھے۔ ہر آدمی کے دل میں نمایاں کام کرنے کا جذبہ ہوتا ہے تاکہ وہ سب کے سامنے اس کے اور اس کو خوش حالی میسر آئے۔ یہ جذبہ کچھ برا جذبہ نہیں ہے لیکن اس جذبے کو ہماری تہذیب کے تکلفات اور بناوٹوں نے ایسا گھیر رکھا ہے کہ کچھ لوگ تو بے غرض کام کے نام پر اغراض پوری کر کے اپنے کو ساری عمر دھوکہ دیتے رہتے ہیں اور کچھ یا تو خاکساری کے مارے کچھ کام نہیں کر پاتے یا چوروں کی طرح میدان میں آتے ہیں۔ اور دوسری طرف بہت سے لوگ اس جذبے کی شدت میں ایسے میدان میں کہ شہرت طلبی کی تہمت ان کے سر دھری جاتی ہے اور ان کے اچھے کام کو بھی نہایت بے انصافی کے ساتھ نظر انداز کر دیا جاتا ہے۔ 247

"ڈاکٹر سید محی الدین قادری زور (۱۹۰۴ء۔ ۱۹۶۲ء) سرزمین حیدر آباد دکن کے ایک مایہ ناز سپوت اور اردو زبان و ادب کی تاریخ میں ایک انتہائی قد آور شخصیت کے حامل معتبر نام ہے۔ وہ ایک نامور ماہر لسانیات، محقق نقاد، ادیب، شاعر، افسانہ نگار، مرتب و مدون، سوانح نگار، مورخ، ادارۂ ادبیاتِ اردو کے بانی، ہمہ پہلو شخص تھے۔ وہ بلاشبہ اپنی ذات میں انجمن تھے۔ دکنی ادب کے فروغ میں ان کی خدمات اظہر من الشمس ہیں۔ کلیاتِ محمد قلی قطب شاہ کی تدوین، اردو شہ پارے اور دیگر کتابوں کی تدوین سے انھوں نے اردو زبان و ادب کی تاریخ میں گراں قدر اضافے کیے۔

لسانیات میں اردو زبان کے آغاز کے بارے میں ان کا نظریہ، ہندوستانی صوتیات پر ان کی تحریر کردہ کتابیں اپنے موضوع سے متعلق انتہائی اہمیت کی حامل ہیں۔ ان کی تصنیف روح تنقید اردو تنقید کی اولین کتابوں میں شمار ہوتی ہے۔ 248

> ڈاکٹر زور ایک مقناطیسی و حرکیاتی شخص تھے وہ بے لگان کام کرتے تھے اور دوسروں کو کام کی ترغیب دیتے تھے۔ ادارۂ ادبیاتِ اردو کی شکل میں انھوں نے دکنی تہذیب و ثقافت کے تحفظ کے لیے جو ادارہ تشکیل دیا تھا وہ آج ایک تناور درخت کی شکل اختیار کر گیا ہے۔ اس ادارہ کا ترجمان سب رس اور اس کے دیگر شعبہ جات ڈاکٹر زور کی کاوشوں کے رہن منت ہیں۔ 249

ڈاکٹر زور کو دکنی تہذیب اور اردو زبان و ادب سے پیار تھا۔ ڈاکٹر زور کی علمی و ادبی خدمات کا دائرہ کافی وسیع ہے ذیل میں موضوع کے اعتبار سے ان کی علمی و ادبی خدمات کا اجمالی جائزہ پیش کیا جا رہا ہے۔

ڈاکٹر زورؔ نامور ماہرِ لسانیات تھے۔ لسانیات پر ڈاکٹر زورؔ کی دو کتابیں ہیں اور کچھ مضامین

۱۔ ہندوستانی لسانیات :لسانیات کی نمائندگی کرنے والی ان کی اہم کتاب ہندوستانی لسانیات ہے، جسے اردو لسانیات پر پہلی کتاب ہونے کا اعزاز بھی حاصل ہے۔ جو کسی ہندوستانی نے لکھی ہے جس میں لسانیات کے

جدید ترین اصولوں کی روشنی میں اردو زبان کا جائزہ لیا گیا ہے۔ اس کتاب کے سلسلے میں زورؔ صاحب تین سال تک لندن اور پیرس کی درس گاہوں میں مصروف تحقیق رہے۔ یہ ان کی خوش نصیبی تھی کہ انھیں بین الاقوامی شہرت رکھنے والے ماہر لسانیات کی سرپرستی نصیب ہوئی۔ اسکول آف اورینٹل اسٹڈیز لندن کے پروفیسر آر۔ ایل۔ ٹرنر اور ہندوستانی زبان کے ماہر گراہم بیلی نے زورؔ صاحب کی مدد کی اور بڑے قیمتی مشورے دیے۔

۲۔ ہندوستانی فونیٹکس (بزبان انگریزی): یہ کتاب عملی لسانیات میں اہم مقام رکھتی ہے۔ ہندوستانی لسانیات سے متعلق انگریزی میں اپنی نوعیت کی یہ اوّلین کتاب ہے اس میں زبان کا صوتیاتی تجزیہ کیا گیا ہے۔ ڈاکٹر گیان چند جین نے اسی بنا پر ''زورؔ صاحب کو صرف اردو ہی نہیں بلکہ ہندوستان کی جملہ زبانوں میں علم زبان کے قافلے کے سالاروں میں شمار کیا۔[250]

اس کے علاوہ ان کا ایک پر مغز مقالہ ہندوستان کی گجراتی شاخ پر ہے جس کو انھوں نے ڈاکٹر جے۔ بلوک کی نگرانی میں قلم بند کیا تھا۔ لسانیات میں اپنی خدمات کی بنا پر ڈاکٹر زورؔ کو اردو کا سب سے پہلا باقاعدہ ماہر لسانیات تسلیم کیا جاتا ہے۔ چناں چہ ڈاکٹر خلیق انجم لکھتے ہیں:

''دکن کو بجا طور پر فخر حاصل ہے کہ اردو نظم و نثر دونوں کی باقاعدہ ابتدا اس سرزمین سے ہوئی۔ یہ بھی عجیب اتفاق ہے کہ اردو کا سب سے پہلا ماہر لسانیات بھی خاکِ دکن سے اٹھا۔[251]

اس سے بہ حیثیت ماہر لسانیات ڈاکٹر زورؔ کی عظمت کا پتہ چلتا ہے۔ اس کے علاوہ ان کے دو مضامین اس سلسلے میں اہمیت کے حامل ہیں:

۱۔ اردو اور پنجابی (مطبوعہ نقوش لاہور ۱۹۵۳ء)

۲۔ اردو کی ابتدا (مطبوعہ اردوئے معلی لسانیات نمبر جلد سوم ۱۹۶۴ء)

اردو تنقید کے ابتدائی دور میں ایک معتبر نام ہمیں ڈاکٹر زورؔ کا ملتا ہے۔ جن کی تنقید نگاری پر اعتبار کیا جا سکتا ہے۔ ڈاکٹر زورؔ بنیادی طور پر سائنٹفک دبستان تنقید سے وابستہ تھے۔ ڈاکٹر عبادت بریلوی ان کے تنقیدی دبستان کے مسلک کا ذکر کرتے ہوئے تحریر فرماتے ہیں:

''ڈاکٹر زورؔ نے تنقید کے لیے جن اصولوں کو ضروری قرار دیا ہے وہ بڑی حد تک سائنٹفک ہیں۔ اگر ان کو سامنے رکھ کر تنقید کی جائے تو زیر نظر تصنیف کے تمام پہلو پڑھنے والے کے سامنے آ سکتے ہیں۔ ان کی عملی تنقید میں یہ خصوصیت سب سے زیادہ نمایاں ہے۔[252]

۱۔روح تنقید :

اصول تنقید پر ڈاکٹر زورؔ کی کتاب روح تنقید ایک معرکتہ الآرا تصنیف ہے۔اس میں انھوں نے مغربی تصورات تنقید سے براہ راست استفادہ کیا اس کے مضامین عملی تنقید کی بہترین ترجمانی کرتے ہیں۔اس کتاب کی اہمیت اس لیے بھی بڑھ جاتی ہے کہ اس کتاب سے پہلے بہت ہی کم نقادوں نے اصول تنقید کی تدوین کی طرف توجہ دی تھی۔ ڈاکٹر جمیل جالبی نے ارسطو سے ایلیٹ تک کتاب تصنیف کرکے اردو والوں کو ان کے تنقیدی نظریات سے روشناس کروایا۔ان سے پچاس سال قبل ڈاکٹر زورؔ نے ارسطو سے میتھو آرنلڈ تک نقادوں سے اردو دنیا کو واقف کروایا تھا۔اس اعتبار سے ڈاکٹر زورؔ جمیل جالبی کے پیش رو اور اپنی مثال آپ قرار دیے جاسکتے ہیں۔

روح تنقید کو بنیادی طور پر دو حصوں میں تقسیم کیا گیا ہے۔پہلے حصہ میں فن تنقید کے ارتقا،ادب اور تنقید کے باہمی تعلق اور فن تنقید کے اصول و مبادیات سے بحث کی گئی ہے اور دوسرے حصہ میں دنیا کے مختلف ممالک مثلاً یونان،روما،فرانس اور انگلستان میں تنقید کے ارتقا پر روشنی ڈالی گئی ہے۔

ڈاکٹر زورؔ نے تنقید کی تعریف،ادب میں اس کی اہمیت و ضرورت اور دوسرے اہم مسائل پر قلم اٹھایا ہے۔ ان کے تنقیدی خیالات کا اندازہ ذیلی اقتباس سے کیا جاسکتا ہے:

> تنقید میں نہ صرف تقریظی پہلو ہوتا ہے بلکہ تخلیقی بھی اس کا کام نہ صرف برائی کی خدمت کرنا ہے بلکہ اچھائیوں کی بھی صحیح طور پر ترجمانی کرکے ان میں ترقی دینا۔[253]

۲۔تنقیدی مقالات :

روح تنقید کے حصہ دوم یعنی تنقیدی مقالات میں ڈاکٹر زورؔ نے عملی تنقید کے نمونے پیش کیے ہیں۔اس کتاب کے بعض مضامین موقر جرائد میں شائع ہو کر اہل ادب سے داد و تحسین حاصل کر چکے تھے۔"میر انیس کی شاعری"، "ہورس اسمتھ کی شاعری" اور "میر تقی میر کی مثنویاں" کو بہ قول مصنف تمام تنقیدوں کو ایک جگہ محفوظ کرنے کے خیال سے اس مجموعے میں جگہ دی گئی ہے۔ڈاکٹر زورؔ نے تنقید کی تین قسمیں قرار دی ہیں۔

الف۔ تخریبی تنقید

ب۔ تعمیری تنقید

ج۔ تخلیقی تنقید

ڈاکٹر زورؔ اپنی اس اولین تصنیف کو بہت عزیز رکھتے تھے چناں چہ انھوں نے لکھا کہ :

''روح تنقید'' مجھے بہت عزیز ہے۔ یہ میری پہلی علمی و ادبی کوشش ہے اور اگرچہ اس کے بعد میری ایک درجن سے زیادہ کتابیں شائع ہوئیں۔ لیکن کوئی کتاب اردو دنیا میں اتنی مفید و مقبول ثابت نہیں ہوئی حالاں کہ میں سمجھتا ہوں کہ بعض دوسری کتابیں میری محنت و کاوش اور افادیت کی وجہ سے مقبولیت میں اس سے بڑھ جائیں گی۔ خدا کا شکر ہے کہ ''روح تنقید'' کی مانگ روز افزوں ہے جس سے اندازہ ہوتا ہے کہ یہ ان وقتی کتابوں میں نہیں ہے جو امتداد زمانہ کی وجہ سے اوراق پارینہ بن جاتی ہیں اس میں زندگی کی قوت موجود ہے اور یہ اردو ادب میں زندہ رہے گی۔[254]

۳۔ تین شاعر:

اس کتاب میں ڈاکٹر زورؔ نے میر تقی میر، میر انیس اور ہوریس اسمتھ کی ادبی خدمات کا تنقیدی جائزہ لیا ہے۔

۴۔جواہر ِسخن:

مولوی مبین عباسی چریا کوٹی نے اردو شاعری کا انتخاب جواہر سخن کے عنوان سے چار جلدوں میں مرتب کیا تھا۔ ڈاکٹر زورؔ نے اس پر ایک طویل تبصرہ لکھا اور اس جواہر سخن کے نام سے ہی کتابی شکل دے دی گئی۔ ڈاکٹر زورؔ نے جواہر سخن پر تنقیدی نظر ڈالی ہے اور اس کے فرو گزاشتوں کی نشان دہی کی ہے۔

۵۔ادبی تحریریں:

یہ ڈاکٹر زورؔ کے مختلف تنقیدی مضامین کا مجموعہ ہے جس کو ڈاکٹر گوپی چند نارنگ نے مرتب کیا ہے۔

۶۔ادبی تاثرات:

اس کتاب میں ڈاکٹر زورؔ کے دوسرے مصنفین کی کتابوں پر لکھے گئے تبصروں اور مقدموں کو یکجا کیا گیا ہے۔ اس کتاب کو مرزا قدرت اللہ بیگ نے مرتب کیا۔ ان تبصروں اور مقدموں کی تعداد جملہ ۴۳ ہے۔

ڈاکٹر زورؔ ایک مایہ ناز محقق، تجربہ کار مدون تھے۔ ان کی تحقیقی اور تدوینی کام کی وجہ سے کئی شاعر گوشۂ گم نامی سے نکل کر شہرت کے بام عروج پر پہنچے۔ تحقیق ایک صبر آزما اور مشکل کام ہے اس میں جذبے کی لطافت، ذہنی یکسوئی خیال کی ہم آہنگی کا ہونا نہایت لازمی ہے، تحقیق اپنے موضوع کے ساتھ انصاف چاہتی ہے۔ وہ مواد کو سلیقے سے اکٹھا کرنا، اس کی صحیح جانچ پڑتال، چھان بین، تقابل، ردو قدح جیسے مراحل میں باریک بینی و حساسیت چاہتی ہے۔ یہ تمام اوصاف ڈاکٹر زورؔ میں بہ درجہ اتم پائی جاتی تھیں۔ اسی لیے ڈاکٹر موہن سنگھ دیوانہ اپنے مضمون ''محقق اعظم'' میں رقم طراز ہیں:

> اگر میں کسی ادبی ادارے سے منسلک ہوتا تو ڈاکٹر موصوف کو محقق اعظم کا خطاب پیش کرتا اس لیے کہ ان میں وہ تمام خوبیاں جمع ہیں جو تحقیق، تدلیل، تنقید کے کار اہم کے لیے ناگزیر ہیں۔ جیسے کھوج پڑتال

> ،مواد کی ڈھونڈ بھال کی فطرتی اہلیت، وسیع و عمیق مطالعہ اور اساتذہ کی صحبت، موضوع سے ہمدردی اور موافقت، فکرِ غائر کی عادت، شک اور ایمان سے سمجھوتا، تنوع اور تعمق کی لگن، تحلیل و تسنیق کا گر، بے تعصبی و بے غلوّی، حوصلہ، صبر، خود اعتمادی، انکساری، ٹھیک جچی تلی مختصر بات کہنے کی کاوش اور تاکید و تکرار سے حذر، حقیقت عشق اور دار گیری کا جنوں۔[255]

ڈاکٹر موہن سنگھ دیوانہ نے اپنے مضمون میں ڈاکٹر زورؔ کی ان تمام خوبیوں کا ذکر کیا ہے جو ایک اچھے محقق کے لیے ضروری ہیں۔ ان اوصاف کو دیکھ کر موہن سنگھ دیوانہ انھیں "محقق اعظم" قرار دینے پر مجبور ہیں۔ ان کا "محقق اعظم" کے عنوان سے مضمون کا لکھنا ہی ڈاکٹر زورؔ کے تحقیقی کارناموں اور اس کی قدر و منزلت کا ثبوت دینا ہے۔

ڈاکٹر زورؔ مخطوطہ شناسی کے سارے گر سے واقف تھے اور ان کو "مخطوطہ شناسی" کا فطری ذوق تھا ۱۹۳۱ء میں ادارۂ ادبیاتِ اردو کے قیام نے ڈاکٹر زورؔ کی مخطوطات کے جمع کرنے اور ان کی بازیافت کی دھن اور ان کی ترتیب اور وضاحت پر محنت کی وجہ سے ڈاکٹر زورؔ کی مخطوطہ شناسی میں کافی بالیدگی آچکی تھی اور ان کی اسی دلچسپی نے مخطوطات کے سرمائے میں کافی اضافہ کر دیا۔ سید حرمت الاکرام لکھتے ہیں:

> یہ مبالغہ نہیں حقیقت ہے کہ ان کی دوسری تصنیفات و تالیفات سے قطع نظر اگر حیدر آباد اور باقی ماندہ پورے ہندوستان کے مخطوطات ایک دوسرے کے مقابلے میں رکھ دیے جائیں تو اس میں حیدر آباد سبقت لے جائے گا۔ جس کا سہرا ڈاکٹر زورؔ کی ذات واحد کے سر ہے۔[256]

ڈاکٹر زورؔ کا سب سے گراں بہا کام دکنی ادب کی تحقیق و تدوین ہے انھوں نے ایسے لافانی کارنامے انجام دیے کہ اردو دنیا اس کو کبھی فراموش نہیں کر سکتی۔ انھوں نے تحقیق و تدوین کے کام کو منظم طور پر اپنی زندگی کا مشن بنالیا تھا۔ کلیات محمد قلی قطب شاہ، حیات میر محمد مومن، نذر محمد قلی قطب شاہ، متاع سخن، کیف سخن، بادہ سخن، فیض سخن، معانی سخن، رمز سخن، محمود غزنوی کا بزم ادب، اردو کے اسالیب بیان، اردو شاعری کا انتخاب، فن انشاپردازی، حب ترنگ، طالب و موہنی، روح غالب، مکاتیب شاد عظیم آبادی، شاد اقبال، باغ و بہار، قطب شاہی سلاطین اور آندھرا، جامعہ عثمانیہ کے فرزندوں کی اردو خدمات، تذکرہ گلزار ابراہیم، تذکرہ اردو مخطوطات جلد اول تا پنجم، تذکرہ نوادر ایوان اردو، مرقع سخن (جلد اول)، مرقع سخن (جلد دوم)، یادگار محمد قلی قطب شاہ، ارمغان یوم محمد قلی وغیرہ ان کے بیش بہا کارنامے ہیں۔

ڈاکٹر زورؔ ایک شاعر، افسانہ نگار، نقاد ہی نہیں بلکہ ادبی مورخ بھی تھے۔ بہ حیثیت ادبی مورخ ان کے

کارنامے قابل قدر اور گراں بہا ہیں اور یہ کارنامے اردو کی ادبی تاریخ کا ایک بیش بہا سرمایہ ہے۔ان کے ان کارناموں کو اردو دنیا کبھی فراموش نہیں کر سکتی۔

۱۔تاریخ ِادب ِاردو:

اس کتاب کو ڈاکٹر زورؔ نے اپنی تصنیف قرار دینے کے بجائے مرتبہ ادارۂ ادبیاتِ اردو لکھا ہے۔اس میں اختصار و جامعیت کے پہلو پر خاص دھیان دیا گیا ہے۔یہ کتاب اپنے اختصار و ایجاز کے باوجود بہت ساری معلومات کا احاطہ کرتی ہے۔دراصل ڈاکٹر زورؔ نے سمندر کو کوزہ میں بند کیا ہے۔

۲۔دکنی ادب کی تاریخ:

دکنی ادب کی تاریخ زورؔ صاحب کی تصانیف میں ایک سنگ میل کی حیثیت رکھتی ہے جو قدیم دکنی تخلیق کار سے لے کر اورنگ آباد تک احاطہ کیے ہوئے ہے۔

۳۔داستان ادب حیدر آباد:

ڈاکٹر زورؔ کی مرتبہ ادبی تواریخ کے سلسلے کی ایک کڑی ہے اس میں شہر حیدر آباد کی علمی و ادبی تحریکات ارباب علم اور اصحاب کمال کی حالات زندگی اور ان کے تصانیف کا مطالعہ پیش کیا گیا ہے۔

۴۔اردو شہ پارے:

اردو شہ پارے ڈاکٹر زورؔ کی پہلی تصنیف ہے یہ تحقیق پر مبنی ہے۔اس کتاب کی اہمیت کو اجاگر کرتے ہوئے پروفیسر محمد انور الدین رقم طراز ہیں:

> اردو شہ پارے ۱۹۲۹ء میں شائع ہوئی۔یہ دکنی ادب کی تحقیق میں شاہ کار کا درجہ رکھتی ہے۔اس قدر گراں مایہ کتاب اس سے قبل اور اس کے بعد نہیں چھپی۔یہ وہ کتاب ہے جس نے دکنیات کے میدان میں مطالعے کی بنیاد فراہم کی اور محققین کے لیے نئی راہ ہموار کی۔[257]

ڈاکٹر زورؔ ایک کامیاب افسانہ نگار تھے لیکن انھوں نے افسانہ نگاری کو اپنی ادبی زندگی کا مقصد نہیں بنایا۔ دراصل وہ ایسا چاہتے بھی نہیں تھے۔جب کبھی انھیں تحقیقی و تنقیدی کاموں سے فرصت ملتی تھی وہ افسانے لکھتے تھے یا شعر موزوں کرتے تھے۔

ڈاکٹر زورؔ کی ادبی زندگی کا آغاز افسانہ نگاری ہی سے ہوتا ہے ۱۹۱۸ء اور ۱۹۲۰ء کے درمیان ان کے افسانے شائع ہونے لگے۔انھوں نے جتنے بھی افسانے لکھے وہ تاریخی یا پھر نیم تاریخی ہیں۔سچ تو یہ ہے کہ رومانوی افسانے لکھنا اتنا مشکل نہیں جتنا تاریخی افسانے،تاریخی افسانوں کے لیے وسعت نظر، مطالعہ، مشاہدہ، دوربینی اور تحقیق و تاریخ سے

واقفیت کی ضرورت ہوتی ہے جو ہر شخص کو میسر نہیں آتی۔ ان کا سب سے پہلا طویل نیم تاریخی افسانہ، ''طلسم تقدیر'' ہے جو بے حد مقبول ہوا۔

ان کے مختصر افسانوں کے مجموعے یہ ہیں:

۱۔ سیر گولکنڈہ (۱۹۳۶ء)

۲۔ گولکنڈہ کے ہیرے (۱۹۳۷ء)

سیر گولکنڈہ میں سولہ افسانے اور گولکنڈہ کے ہیرے میں چھ افسانے ہیں جن میں طلسم تقدیر بھی شامل ہے۔ ان افسانوں کے مجموعوں کے علاوہ ۱۹۵۲ء میں شہر حیدر آباد پر ایک اور کتاب حیدر آباد فرخندہ بنیاد کے نام سے شائع ہوئی۔ اس کتاب کے دوسرے حصے ''روایات'' میں انھوں نے اپنے انیس (۱۹) افسانوں کو شامل کیا جو ''سیر گولکنڈہ'' اور ''گولکنڈہ کے ہیرے'' سے ماخوذ ہیں۔ ڈاکٹر زورؔ کے جملہ تئیس (۲۳) افسانے ہمارے سامنے موجود ہیں۔

سیر گولکنڈہ پر تبصرہ کرتے ہوئے بابائے اردو مولوی عبدالحق لکھتے ہیں:

> یہ بہت دلچسپ کتاب ہے اور دلچسپ طرز میں لکھی گئی ہے۔ اس میں تاریخ اور افسانے اور واقعات اور تخیل کو بڑی خوبی سے سمویا ہے کہ قطب شاہی دور کی تصویر نظروں کے سامنے پھر جاتی ہے۔ بڑی بڑی تاریخوں کو پڑھنے سے وہ معلومات حاصل نہیں ہوتیں جو اس چھوٹی سی کتاب میں ہیں اور وہ نہ لطف و کیفیت ہے جو اس میں ہے۔ اس وقت کی معاشرت کا رنگ بھی اس میں نظر آتا ہے۔[258]

ڈاکٹر زورؔ کے تاریخی افسانے اس لیے بھی غیر معمولی طور پر کامیاب ہیں کہ یہ افسانہ نگاری کے فنی تقاضوں پر بھی پورے اترتے ہیں۔ مختصر افسانے کی پہلی اور اہم خصوصیت یہ ہوتی ہے کہ اس میں زندگی کا ایک واقعہ یا ایک جھلک دکھائی جاتی ہے۔ لیکن یہ واقعہ یا جھلک اتنی جامع ہوتی ہے کہ اس کے ذریعہ افسانے کے مرکزی کردار کی پوری زندگی پر روشنی پڑتی ہے۔

ڈاکٹر زورؔ کی ہمہ جہت ادبی شخصیت کا ایک روشن پہلو سوانح نگار کی شکل میں آتا ہے انھوں نے بعض ادبی اور تاریخی شخصیتوں کی سیرت و سوانح شخصیت و کردار، واقعات حیات اور ان کے گوناں گوں کارناموں کو سپرد قلم کر کے انھیں زندۂ جاوید بنا دیا ہے۔

ڈاکٹر زورؔ کی سوانحی تصانیف میں گارساں دتاسی، سرگزشت حاتم، سرگزشت غالب، سلطان محمد قلی قطب شاہ اور میر حسن کے نام قابل ذکر ہیں۔

۱۔گارساں دتاسی:

گارساں دتاسی اردو کا پروفیسر اور فرانس کا مشہور مستشرق تھا۔ڈاکٹر زورؔ نے پیرس میں اپنے قیام کے دوران گارساں دتاسی کے نام سے اردو کے بے لوث خدمت گزار کے واقعات، حیات اور اس کے علمی وادبی کارناموں پر مشتمل ایک سیر حاصل تذکرہ مرتب کیا جو رسالہ ہندوستانی (الہ آباد) کے اپریل ۱۹۳۱ء کے شمارے میں پہلی بار چھپا اور بعد میں اس ادارے کی جانب سے کتابی صورت میں بھی شائع ہوا۔ ڈاکٹر زورؔ نے اس کتاب کو دو حصوں میں تقسیم کیا ہے۔پہلے حصے میں دتاسی کی ابتدائی زندگی اور اردو سے دلچسپی، تصانیف، کتب خانہ، درس وتدریس اور طریقہ تلامذہ اس زمانے کے اردو کے دیگر اساتذہ اور اس کے ہم عصر مستشرقین کو متعارف کروایا ہے۔

۲۔سرگزشتِ حاتم:

یہ کتاب شاہ ظہورالدین حاتم کے "دیوان زادہ" پر ڈاکٹر زورؔ کا تحریر کیا ہوا مقدمہ ہے۔جو علاحدہ کتاب کی صورت میں شائع کیا گیا ہے۔اس کتاب میں مولف نے شاہ حاتم کا نام، پیدائش، ان کے والد کا نام اور پیشہ، شعر گوئی کا آغاز، ولی کے اثرات، وضع قطع عرفان پسندی، معاصرانہ چشمک کی روشنی میں تبصرہ کیا ہے اور ساتھ ہی سوانحی حالات وکوائف کا خاکہ بڑی تحقیق وتدقیق اور عرق ریزی کے ساتھ مرتب کیا۔

۳۔سرگزشتِ غالب:

سرگزشت غالب میں ڈاکٹر زورؔ نے مرزا غالب کے حالات زندگی ان کے ادبی کارنامے اور عزیز و اقارب کا اجمالاً ذکر کیا ہے۔یہ کتاب دراصل "روح غالب" کے مقدمہ کے طور پر لکھی گئی تھی۔لیکن یہ مقدمہ اس قدر طویل ہو گیا کہ اسے مختصر سی کتابی شکل دے دی گئی۔

۴۔سلطان محمد قلی قطب شاہ:

ڈاکٹر زورؔ کی سوانحی کتابوں میں سلطان محمد قلی قطب شاہ سب سے ضخیم اور بھرپور سوانح حیات ہے۔اس میں اردو کے پہلے صاحب دیوان شاعر، شہر حیدر آباد کے بانی اور قطب شاہی خاندان کے پانچویں حکمرانوں سلطان محمد قلی قطب شاہ (۱۵۶۵ء۔۱۶۱۱ء) کے حالات زندگی اور اس ضمن میں حیدر آباد کی تاریخ اور یہاں کی سیاسی و سماجی زندگی پر بھی تفصیلی روشنی ڈالی گئی ہے۔

ڈاکٹر زورؔ نے بچپن ہی سے شاعری شروع کر دی تھی۔شاعری ان کو ورثہ میں ملی تھی۔ان کے والد غلام محمد

قادری زعمؔ اچھے شاعر تھے۔اعلیٰ تعلیم کا حصول پھر درس وتدریس کی مصروفیات، تحقیق کی راہوں کے انہماک نے شاعری کے ذوق میں اضمحلال پیدا کر دیا۔ان کے استاد وحید الدین سلیم ہمیشہ ان کو اردو کے جدید تقاضوں کی طرف متوجہ کیا کرتے تھے۔اس لیے بھی وہ عام راستے سے ہٹ کر اور نئے نئے کام کرنے اور مادر جامعہ کا نام روشن کرنے کے لیے شاعری کی جگہ نثر اور اس میں بھی تاریخ اور تحقیق و تنقید کی طرف زیادہ متوجہ ہوئے۔ کالج کے زمانے کی کہی ہوئی نظموں میں روایتی طرز اسلوب کی کارفرمائی نظر آتی ہے ان کے اشعار میں ''تغافل یار'' اور ''حسن ہوش ربا'' کا تذکرہ بار بار ملتا ہے۔

ڈاکٹر زورؔ کی ابتدائی شاعری کے بارے میں پروفیسر سیدہ جعفر رقم طراز ہیں:

> ان کے اشعار میں نوجوانی کی امنگ بھی ہے اور محبت کرنے کا حوصلہ بھی۔ان میں انفرادی اور داخلی جذبات کی ترجمانی کی گئی ہے۔زبان میں روانی اور سلاست ہے لیکن گہرائی رفعت تخیل اور ندرت فکر کے عناصر نظر نہیں آتے۔ڈاکٹر زورؔ کی ابتدائی نظمیں ہلکی پھلکی اور عشقیہ ہیں یہ نظمیں عنفوان شباب کے لطیف اور معصوم جذبات کی آئینہ دار ہیں۔[259]

ڈاکٹر محی الدین قادری زورؔ کے شاعرانہ اوصاف اور افکار اپنے عصر کی ترجمانی کے ساتھ ساتھ خود زورؔ صاحب کے ذوق ادب اور ان کے غیر معمولی کارناموں پر بھی روشنی ڈالتے ہیں۔ان کی شاعری میں لطافت رکھ رکھاؤ، حسن اور رعنائی کا پرتو جھلکتا ہے۔شاعری میں وہ کوئی آواز یا نئی تحریک سے وابستہ نہ رہے اور نہ اپنے درون کی آواز پر اپنے احساسات کا بیان کیا ہے۔ان کے چند اشعار بہ طور نمونہ پیش کیے جاتے ہیں:

جناب زورؔ بھی شاعر ہیں سنتے آئے ہیں
کسی قطار میں شامل نہ کچھ شمار میں ہیں

یاد تڑپائے گی زورؔ اس کی ہمیشہ ہم کو
نہ ملا ہے نہ ملے گا کوئی ایسا ہم کو

پونچھ ڈالو اب چشم نم ساتھیو
کیوں کریں آج بھی کل کا غم ساتھیو
اپنی تقدیر بنتی ہے تدبیر سے
اب نہ دشمن کا ڈھونڈو کرم ساتھیو
زندگی سانس لیتی رہے گی یوں ہی

زندہ دل ہنستے ہنستے گزر جائیں گے
موت سے بھی مریں گے نہیں زورؔ ہم
زندگی میں جو کچھ کام کر جائیں گے
ہم غریبوں پہ امیروں کی خدائی چلتی
باعث برہمی بزم بتاں ہیں کچھ لوگ

ڈاکٹر زورؔ کو شاعری کی بناپر جب شہرت ملی اور لوگ ان کی شاعری پسند کرنے لگے تو گویا وہ شہرت کی معراج پر پہنچ گئے تھے۔ ایسے میں انھوں نے ایک دم سے خاموشی اختیار کی جیسے وہ فن شاعری سے واقف ہی نہیں۔ ایک عرصہ تک خاموش رہنے کے بعد وادی کشمیر میں وہ اپنی شاعری کی آگ کو پھونک مار مار کر پھر سے تابناک بنانے کی کوشش کرتے ہیں۔ جیسے تحقیق، تنقید، درس وتدریس کی راکھ اپنے آغوش میں چھپالی تھی۔

پروفیسر سیدہ جعفر زورؔ صاحب کی شاعری کے دوسرے دور کے تعلق سے لکھتی ہیں:

> ڈاکٹر زورؔ کی شاعری کا دوسرا دور وادی کشمیر سے وابستہ ہے مسلسل کئی سال کی خاموشی کے بعد وہ شعر گوئی کی طرف مائل ہوئے۔۔۔ سرزمین کشمیر کے دل فریب نظاروں، یہاں کی پرُ فضا اور فرحت بخش ماحول اور اس جنت نشان کی دل فریبیوں سے مسحور ہو کر ڈاکٹر زورؔ نے شعر کہے تھے لیکن حقیقت یہ ہے کہ ڈاکٹر زورؔ کو بڑھاپے میں وطن چھوڑنا پڑا تھا۔۔۔ پردیس میں دکن کے دیوانے کو وطن کی یاد ستاتی رہی اور ان میں سویا ہوا شاعر جاگ اٹھا۔[260]

ڈاکٹر محمد ابرار الباقی (اسسٹنٹ پروفیسر شعبہء اردو ساتاواہانا یونیورسٹی کریم نگر) لکھتے ہیں:

> چوں کہ ڈاکٹر زورؔ کو کشمیر میں رہنے کا بہت کم موقع ملا اور جب کہ وہ شاعری کی طرف مائل ہوئے ہی تھے کہ ان کے قلب پر حملہ ہوا جس کے بعد وہ سنبھل نہ سکے اور اپنی شاعری کے سلسلے کو ادھورا چھوڑتے ہوئے اس دارِ فانی سے کوچ کر گئے۔[261]

حبیب الرحمن:

پروفیسر حبیب الرحمٰن ۱۳دسمبر ۱۸۹۸ء (۲۷ بہمن ۱۳۰۸ف[262]) کو حیدرآباد دکن کے قدیم محلہ سلطان پورہ میں پیدا ہوئے[263]، ابتدائی اور دینی تعلیم اپنے والد مولوی محی الدین احمد سے گھر میں حاصل کی۔ پانچ سال کے تھے تو "دار العلوم" جانا شروع کیا[264] جہاں ان کے منجھلے بھائی محی الدین محمود مدرس تھے، یہ مدرسہ حیدرآباد کے

قدیم مدرسوں میں سے ایک ہے بعد میں اسے ڈگری کالج کا درجہ حاصل ہوا[265]۔ ۱۹۱۴ء میں پنجاب یونی ورسٹی سے میٹرک پاس کیا، اس کے بعد منشی، مولوی اور منشی فاضل کی اسناد بھی حاصل کیں۔[266]

علی گڑھ میں چار سال تعلیم حاصل کی اور بی۔اے کیا۔ الہ آباد یونی ورسٹی سے اقتصادی علوم میں ایم۔اے اور ایل۔ایل۔بی کیا، یہ پہلی جنگِ عظیم کا دور تھا[267]۔ جامعہ عثمانیہ کا قیام ۱۹۱۹ء میں عمل میں آیا اور آپ ۱۹۲۲ء (۲ آزر ۱۳۳۲ف) کو آپ معاشیات کے اسسٹنٹ پروفیسر کی حیثیت سے جامعہ عثمانیہ میں ملازمت سے منسلک ہوئے۔ ۱۹۲۳ء (۹ آبان ۱۳۳۳ف) میں اسی ملازمت میں مستقل عہدہ پر فائز ہوئے۔ چھے سال تک اسی عہدے پر کام کرتے رہے پھر ۱۹۲۹ء/ ۱۹۳۰ء میں تین سال کی چھٹی لے کر اعلیٰ تعلیم حاصل کرنے کی غرض سے انگلستان کے شہر لندن تشریف لے گئے۔ پروفیسر لاسکی کے زیر نگرانی[268] بی۔ایس۔سی آنرز کی سند دو سال میں حاصل کرنے کے بعد ایگری کلچرل اکنامکس ری سرچ انسٹی ٹیوٹ، آکسفورڈ یونی ورسٹی میں ایک سال تک زرعی تحقیق کے جدید طریقوں کا مطالعہ کرنے کے بعد حیدر آباد دکن واپس آئے[269]۔ واپس آکر آپ جامعہ عثمانیہ میں معاشیات کے پروفیسر اور اس شعبہ کے صدر بن گئے۔[270]

مولوی سید مبارک سے آپ نے خدمتِ جلیلہ، نظامتِ سر رشتہ معلوماتِ عامہ کی مہارت سیکھی جس کے نتیجے میں ۱۹۳۶ء میں سر رشتہ معلومات عامہ کے ناظم کی خدمات آپ کے سپرد ہوئیں[271] اور آپ حیدر آباد کی سرکاری سرگرمیوں سے باہر کے لوگوں کو آگاہ کرنے، اخبارات میں کسی محکمہ پر تنقید چھپے تو متعلقہ محکموں کو اس کی طرف توجہ دلانے اور غلط اطلاعات کی تردید کرنے کے فرائض انجام دیتے رہے۔[272]

۱۹۴۲ء میں آپ محکمہ صنعت و حرفت کے ڈائریکٹر مقرر ہوئے، چند سال کے ۱۹۴۶ء میں آپ سیکرٹری کے عہدے پر فائز ہوئے پھر ۱۹۴۹ء میں اسی عہدے سے وظیفہ حسن خدمت لے کر تین سال پہلے ہی ریٹائر ہو گئے[273]۔ یہ زمانہ حیدر آباد کے لیے بہت کڑا امتحان تھا، نام نہاد پولیس ایکشن سے مسلمانوں پر قیامت ٹوٹ رہی تھی۔[274]

آپ کی تصنیف "چند یاداشتیں"، جس میں آپ نے حیدر آباد دکن میں اردو کے عروج و زوال کی داستان رقم کی ہے، کے فلیپ پر بہادر یار جنگ اکادمی کے ناشر نے کہا ہے:

> سقوطِ حیدر آباد کے بعد پروفیسر حبیب الرحمن کو یہ فکر شدّت سے دامن گیر ہوئی کہ کس طرح اردو زبان کو جو نہ صرف حیدر آباد بلکہ پورے غیر منقسم ہندوستان کی قومی اور ثقافتی زبان بن گئی

ہے، تعصب کی زد سے بچایا جائے۔اردو زبان کے دفاع کے لیے پروفیسر صاحب کمربستہ ہو گئے۔ بڑے تدبر اور حکمت عملی سے کامیاب محاذ بندی کی۔[275]

حیدرآباد دکن میں سیاسی ابتری میں آپ نے اپنے سارا سرمایہ کھو دیا تھا۔ان کی بیگم نے ان کا بھرپور ساتھ دیا جن کے ساتھ آپ نے ساٹھ سے زائد سالوں کی ازدواجی زندگی گزاری تھی۔آپ کے دو بچے ہوئے، ایک بیٹی حبیبہ جو شادی کے بعد پاکستان میں بس گئیں اور ایک بیٹا ڈاکٹر انیس الرحمان جو امریکہ میں سائنس دان کے طور پر خدمات سر انجام دیتے رہے[276]۔ان کے روحانی اور منہ بولی اولادوں میں بہت سے لوگ نام ور ہوئے خاص طور پر سری نواس لاہوٹی، ڈاکٹر حسینی شاہد اور ان کی بیگم ڈاکٹر زینت ساجدہ۔

ڈاکٹر زینت ساجدہ نے پروفیسر حبیب الرحمٰن کی تصنیف "چند یاداشتیں" میں "بابا" کے نام سے ایک مضمون لکھا ہے جس میں وہ آپ کے بارے میں ان الفاظ سے اپنے مضمون کا آغاز کرتی ہیں:

> سر پر رومی ٹوپی، جسم پر حیدرآبادی شیروانی، سفید پاجامہ کم عرض کے پائنچوں والا، گریبان کے بٹن گلے تک لگے ہوئے۔ چہرے پر نقاہت کے باوجود رونق، نظر نیچی، سر تا پا شائستگی۔ جو صاحب اردو ہال میں منعقد ہونے والے جلسوں میں اگلی صفوں میں بیٹھے ہوئے نظر آئیں اور کسی مقرر نے اپنے موضوع سے انحراف کیا، بحر طویل میں بات ہونے لگے تو بار بار پہلو بدلتے، جیبی گھڑی نکال کر وقت دیکھتے، بے چین و بے زار نظر آئیں، وہی ہیں سب کے لیے پروفیسر حبیب الرحمٰن۔[277]

آپ کے مزاج اور طبیعت کے بارے میں طیب انصاری کے الفاظ دیکھیے:

> غرور چھو کر بھی نہیں گیا۔طبیعت میں انکساری، احباب کے لیے، چھوٹوں کے لیے لیکن برابر کے لوگوں کے لیے حریفانہ اندازِ گفتگو۔ مسائل اردو زبان کے ہوں یا اردو تہذیب کے، قطعیت ہر ہر لفظ سے ٹپکتی ہے۔ حکومت کے یہاں مؤثر انداز میں نمائندگی ہوتی ہے اسی وجہ سے کامیابی ہمیشہ قدم چومتی ہے اور جھوم اٹھتی ہے۔۔۔ شرافت اور اخلاق ایسے کہ بڑے ہوں یا چھوٹے سبھوں سے نرمی برتتے ہیں، اس لیے ان سے بات کرتے ہوئے خوف محسوس نہیں ہوتا ورنہ کتنے ہی لوگ ایسے ہیں جو اتنی عمر اور ایسے مقام پر پہنچ کر کسی کو خاطر میں نہیں لاتے اور جب بھی بات کرتے ہیں تو خواہ مخواہ گرجتے بگڑتے رہتے ہیں۔ حبیب الرحمٰن صاحب مجسم اخلاق ہیں۔اس لیے وہ ایک تہذیب کی علامت بھی ہیں۔یکتا و بے نظیر۔[278]

معاشیات میں اردو زبان کی پہلی اصولِ معاشیات آپ نے لکھی تھی جسے جامعہ کے انٹرمیڈیٹ کے نصاب میں شامل کیا گیا تھا اور آج بھی اس موضوع پر یہ ایک مستند کتاب سمجھی جاتی ہے۔آپ کی دیگر تصانیف میں

کساد بازاری کے اسباب، ٹیکسیشن کے اصول اور طریقے،زرِ مبادلہ،اورہندوستان کی اقتصادی تاریخ شامل ہیں۔[279]

مسز جمال الدین:

مسز جمال الدین۔ بی۔ اے۔ ملک کی ایک روشن خیال خاتون ہیں۔آپ نے ۱۹۱۱ء میں میٹرک کامیاب کیا لیکن بلدہ میں کوئی زنانہ کالج ہونے کی وجہ سے آپ سلسلۂ تعلیم جاری نہ رکھ سکیں۔ تیرہ سال بعد جب کلیّہ اناث، جامعہ عثمانیہ کاافتتاح ہواتو باوجود اس کے کہ بیوی اور ماں کی حیثیت سے آپ کی ذمہ داریوں میں اضافہ ہو گیا تھا،آپ نے تعلیم کی طرف توجہ کی اور ۱۹۲۸ء میں بی۔ اے کامیاب کیا۔ ۱۹۲۹ء میں سرکاری وظیفہ پر یورپ گئیں۔ لندن میں فروبل اور اٹلی میں مانٹسوری طریقۂ تعلیم کی ٹریننگ حاصل کی۔آپ ماڈل پرائمری اسکول کی صدر معلمہ ہیں۔آپ کا قیام یورپ میں ۱۹۲۹ء تا ۱۹۳۲ء رہا۔

ڈاکٹر محمد حمید اللہ:

معروف محدّث، فقیہ، محقق، قانون دان اور اسلامی دانش ور،ڈاکٹر حمید اللہ ۱۹ فروری[280] ۱۹۰۸ء بمطابق ۱۶ محرم ۱۳۲۶ھ[281] کو مملکت آصفیہ کے شہر حیدر آباد دکن کے کوچہ حبیب علی شاہ میں پیدا ہوئے۔آپ نے اپنے ایک مکتوب بنام مظہر ممتاز قریشی میں اپنی تاریخ پیدائش ۱۶ محرم،۱۳۲۶ ہجری بیان کی ہے جو عیسوی تقویم کے مطابق بروز بدھ ۱۹ فروری ۱۹۰۸ء قرار پاتی ہے۔آپ اپنے آٹھ بہن بھائیوں (چار بہنیں،چار بھائی) میں سب سے چھوٹے تھے،آپ کی بہنوں میں امتہ العزیز بیگم،امتہ الوہاب بیگم،امتہ رقیہ بیگم اور امتہ الصمد بیگم ہیں جب کہ بھائیوں میں محمد صبغت اللہ (نائب ناظم بند وبست)، محمد حبیب اللہ (مددگار ناظم بندوبست)، محمد غلام احمد اور ایک بھائی کا بچپن میں انتقال ہو گیا تھا۔آپ کے والد کا نام ابو محمد خلیل اللہ (مددگار معتمد مال گزاری،حیدر آباد) تھا جو خود بھی ایک ادیب اور عالم شخصیت تھے۔[282] ڈاکٹر حمید اللہ کے دادا محمد صبغت اللہ قاضی بدرالدولہ (۱۷۹۲ء— ۱۸۶۳ء) نے انیتس (۲۹) کتابیں عربی میں،چوبیس (۲۴) فارسی میں اور چودہ (۱۴) اردو میں لکھیں۔اسی وجہ سے اُن کے دادا کا نام بھی عظیم علما میں شامل ہے۔[283]

ڈاکٹر حمید اللہ نے ابتدائی تعلیم اپنے والد ماجد سے حاصل کی،پھر مدرسہ دارالعلوم جامعہ نظامیہ میں انگریزی کا امتحان دے کر ۱۹۲۴ء میں آپ نے جامعہ عثمانیہ میں داخلہ لیا اور ۱۹۳۰ء میں وہاں سے اسلام،علمِ قانون میں ایم اے اور ایل ایل بی کی سند حاصل کی۔ جامعہ عثمانیہ کی جانب سے اسلامی قوانینِ بین الاقوامی میں ڈاکٹریٹ کے لیے آپ کو

فیلوشپ سے نوازا گیا۔[284] ۱۹۳۲ء میں آپ نے بون(Boon)یونیورسٹی، جرمنی سے "اسلام کے بین الاقوامی قانون" پر تحقیقی مقالہ لکھ کر ڈی فل کی ڈگری حاصل کی اور پھر اسی جامعہ میں عربی و اردو کے استاد کی حیثیت سے متعین ہوئے۔ جرمنی میں کچھ عرصہ گزارنے کے بعد سوربون(Sorbonne)یونیورسٹی(پیرس) سے 'عہدِ نبویؐ اور خلافتِ راشدہؓ میں اسلامی سفارت کاری' پر مقالہ لکھ کر ڈاکٹر آف لیٹرز کی ڈگری پائی۔ [285]

ڈاکٹر صاحب کا گھرانا روحانیت اور تصوف کی طرف مائل تھا۔ جدید تعلیم کو اچھا نہیں سمجھا جاتا تھا۔ خاندانی روایات کے مطابق آپ نے گھر میں ابتدائی تعلیم حاصل کرنے کے بعد جامعہ نظامیہ میں داخلہ لیا اور ۱۹۲۴ء میں مولوی کامل کا درجہ مکمل کیا۔ بعد ازاں، گھر والوں کو بتائے بغیر، انگریزی زبان کی اہمیت کے پیش نظر میٹرک کے امتحان کی تیاری کے بعد میٹرک کا امتحان بھی دیا اور امتیازی حیثیت سے کامیاب ہوئے۔ اُن کے والد کو مقامی اخبارات کے ذریعہ ڈاکٹر صاحب کی کامیابی کی اطلاع ملی۔ اس کامیابی کے بعد انھوں نے بیٹے کی مزید حوصلہ افزائی کی۔

۱۹۳۵ء میں اپنے آبائی شہر آنے کے بعد انھوں نے جامعہ عثمانیہ میں بطور لیکچرر اور اسسٹنٹ پروفیسر ۱۹۴۸ء تک خدمات سر انجام دیں۔[286] اس کے علاوہ برسوں تک دنیا کی مختلف جامعات میں درس و تدریس کے فرائض سر انجام دیتے رہے۔[287]

آپ اردو، عربی، فرانسیسی، جرمن، قدیم و جدید ترکی، اطالوی، فارسی، انگریزی اور روسی زبانوں پر عبور رکھتے تھے[288]۔ آپ نے سات زبانوں میں تحریر و تحقیق کا کام کیا جن میں انگریزی اور اردو کے علاوہ فرانسیسی، جرمن، عربی، فارسی اور ترکی زبان وغیرہ شامل ہیں۔[289]

آپ نے تحقیقی مقاصد کے لیے متعدد اسلامی اور یورپی ممالک کا دورہ بھی کیا۔ جن میں "عہد نبویؐ کے میدان جنگ" کے سلسلے میں نجد و حجاز کے ان میدانوں کا سفر بھی کیا اور تاریخی مواد اکٹھا کیا۔[290] انگریزی میں جب یہ کتاب شائع ہوئی تو اس میں نقشے وغیرہ بھی شامل تھے لیکن اردو کے ناشرین سے اس امر کا خیال نہ رکھا اور اسے درسی کتب کے حجم میں شائع کر کے نقشے وغیرہ حذف کر دیے۔

حضرت ابوہریرہ کے شاگرد حضرت ہمام ابن منبہ کے صحیفے کی تدوین کا کام ڈاکٹر حمید اللہ کا بہت بڑا کارنامہ تسلیم کیا جاتا ہے[291] جب کہ فرانسیسی زبان میں ان کے "ترجمہ قرآن" کی اہمیت بھی مسلم ہے۔ آپ نے فرانسیسی زبان میں سیرتِ نبویؐ بھی تحریر کی جو دو جلدوں پر مشتمل ہے۔ آپ نے امام محمد شیبانی کی کتاب السیر اور شاہ ولی اللہ کی حجۃ اللہ البالغہ کا فرانسیسی ترجمہ بھی کیا۔[292]

۱۹۴۶ء میں اقوامِ متحدہ میں ریاستِ حیدر آباد کے نمائندہ (سفیر) مقرر ہوئے۔۱۹۴۸ء میں حیدر آباد پر بھارتی پولیس/فوجی ایکشن کے بعد پیرس میں ہی رہ کر جلاوطنی کی زندگی اختیار کی۔ وہ سقوطِ حیدر آباد کو بہت بڑا قومی سانحہ قرار دیتے تھے چناں چہ انھوں نے ریاستِ حیدر آباد کے تحفظ اور عالمی برادری میں اس کی نمائندگی کی غرض سے ''حیدر آباد لبریشن سوسائٹی'' کی بنیاد رکھی۔[293]

حیدر آباد دکن سے اقوامِ متحدہ کی جنرل اسمبلی کے اجلاس میں شرکت کے لیے ایک وفد بھیجا گیا تھا، نواب معین نواز جنگ اس کے قائد تھے اور ڈاکٹر حمید اللہ مشیر۔ ڈاکٹر یوسف حسن خان اور شام سندر بھی اس وفد میں شریک تھے۔ پولیس ایکشن ستمبر ۱۹۴۸ء کے بعد جب نظام حکومت ساقط ہوگئی تو وفد کو واپس آنے کی ہدایت کی گئی، ڈاکٹر حمید اللہ کے سوا سب ارا کین واپس آ گئے۔ ڈاکٹر صاحب نے پیرس میں پناہ طلب کر لی اور وہیں رہنے لگے۔[294]

> ڈاکٹر صاحب کی متنوع اور پیچیدہ تحقیقی سرگرمیوں پر نظر رکھنے والا شخص حیرت و ممنونیت کی کیفیت میں مبتلا ہو جاتا ہے کہ ان کی ساری زندگی تحقیق و جستجو، اشاعت اور تبلیغ اسلام ہی سے عبارت ہے۔ اس سلسلے میں آپ ابن تیمیہؒ کے متّبع نظر آتے ہیں۔ ہر قسم کے تکلّفات اور جھمیلوں سے آزاد بس اپنے مشن میں مگن اور آپ نے اس مشن کو بڑی کامیابی سے پورا کیا۔[295]

ڈاکٹر صاحب نے ایک سو سے زائد کتب تصنیف کیں۔ مختلف بین الاقوامی جرائد میں آپ کے نو سو اکیس مقالہ جات شائع ہوئے۔ فرانسیسی زبان میں قرآن پاک کا ترجمہ اور تفسیر بھی آپ کا نمایاں کام ہے۔ اسی طرح سیرت النبیؐ؛ محمد رسول اللہؐ، عہدِ نبویؐ کا نظامِ حکمرانی، عہدِ نبویؐ کے میدانِ جنگ، رسول اللہؐ کی سیاسی زندگی الوثائق السیاسیۃ (عربی) مطبوعہ قاہرہ اور دیگر بہت سی اہم کتب اہلِ علم و تحقیق کے لیے یادگار حیثیت رکھتی ہیں۔[296]

پاکستان کے لیے بھی آپ کی خدمات ناقابلِ فراموش ہیں۔ ۱۹۵۰ء میں پاکستان کا پہلا مسودہ قانون یا قرارداد مقاصد کی تیاری کے لیے پاکستان نے جہاں دنیا بھر کے اہم علما سے رابطہ کیا انھی میں ڈاکٹر حمید اللہ بھی شامل تھے اور آپ نے قیام پاکستان کے بعد کچھ عرصہ اس سلسلے میں کراچی میں قیام کیا۔[297] ۱۹۸۰ء میں آٹھ مارچ سے بیس مارچ تک بہاولپور کی اسلامیہ یونیورسٹی میں ڈاکٹر محمد حمید اللہ نے ان بارہ دنوں تک مختلف موضوعات پر لیکچرز دیے۔ ان لیکچرز میں اسلام کے کچھ بنیادی پہلوؤں اور اس کی ابتدائی تاریخ کا احاطہ کیا گیا ہے۔ فی البدیہہ دیے جانے والے یہ لیکچرز برسوں کی تحقیق اور دوسرے علم کا فی الواقع آسان زبان میں نچوڑ تھے، یہ سرسید احمد خان کے خطباتِ احمدیہ کے بعد اردو زبان میں تاریخی و تحقیقی مواد کے لحاظ سے بہت اہمیت کی حامل کتاب ہے[298] خصوصاً ان کا پانچواں خطبہ "قانونِ بین الممالک" ایسا موضوع ہے جو عام طور پر دینی درس گاہوں کے طالب

علموں کی دسترس سے باہر ہے۔ان کا انگریزی ترجمہ ڈاکٹر افضل اقبال نے کیا اور یہ 'The Emergence of Islam' کے نام سے شائع ہوا۔[299]

اردو میں سن کر لکھے جانے والے اور خطبات بہاولپور کے نام سے چھپنے والے یہ لیکچرز دوسری کئی چیزوں کے علاوہ اس بات پر مشتمل تھے کہ قرآن وحدیث کو کیسے جمع کیا گیا اور ان کی تدوین کی گئی۔ان لیکچرز یا خطبات کی تفصیل کچھ اس طرح ہے۔

۱۹۸۰ء میں پہلا خطبہ: تاریخ قرآن

دوسرا خطبہ: تاریخ حدیث

تیسرا خطبہ: تاریخ فقہ

چوتھا خطبہ: تاریخ اصول فقہ واجتہاد

پانچواں خطبہ: اسلامی قانون بین الممالک

چھٹا خطبہ: دین (عقائد، عبادت، تصوف)

ساتواں خطبہ: عہدِ نبوی میں مملکت اور نظم ونسق

آٹھواں خطبہ: عہدِ نبوی میں نظامِ دفاع اور غزوات

نواں خطبہ: عہدِ نبوی میں نظامِ تعلیم

دسواں خطبہ: عہدِ نبوی میں نظامِ تشریع وعدلیہ

گیارہواں خطبہ: عہدِ نبوی میں نظامِ مالیہ وتقویم

بارہواں خطبہ: عہدِ نبوی میں تبلیغ اسلام اور غیر مسلموں سے برتاؤ

اسی طرح آئینِ پاکستان کے بنیادی نکات کی تیاری کے سلسلے میں انھوں نے مولانا سید سلیمان ندوی، ظفر احمد انصاری وغیرہ کے ساتھ مل کر کام کیا۔"علما کے بائیس نکات" اور نظامِ تعلیم کے خاکے کی تیاری میں بھی آپ شامل رہے۔ڈاکٹر صاحب کے تحقیقی شہ پاروں میں سب سے اہم 'صحیفہ ہمام ابن منبہ' کی تلاش اور اس کی اشاعت ہے۔ڈاکٹر صاحب کو یہ مسودہ جرمنی کی ایک لائبریری سے ملا جسے انھوں نے ایڈٹ کر کے اور یہ ثابت کر کے شائع کیا کہ اس مجموعے میں پائی جانے والی احادیث اور بعد کے مجموعوں میں لکھی ہوئی احادیث میں کوئی فرق نہیں۔انھوں نے بڑے

منطقی اور تاریخی اعتبار سے ثابت کیا کہ تدوین حدیث اور کتابتِ حدیث کا کام دورِ رسالت اور دورِ خلافت ہی میں شروع ہو گیا تھا۔[300]

آپ کی خدمات کے اعتراف میں پاکستان نے ۱۹۸۵ء میں آپ کو اعلیٰ ترین شہری اعزاز ہلال امتیاز سے نوازا۔ آپ نے اعزاز کے ساتھ ملنے والی تمام رقم (ایک کروڑ روپیہ (بین الاقوامی اسلامی یونیورسٹی اسلام آباد کے ادارۂ تحقیقات اسلامی کو عطیہ کر دی۔ اِس جامعہ کی لائبریری)ڈاکٹر حمید اللہ کے نام سے موسوم ہے۔ اس حوالے سے یونی ورسٹی کی اپنی ویب سائٹ پر اس کتب خانے کا تعارف کچھ اس طرح درج ہے:

"اسلامی ریسرچ انسٹی ٹیوٹ کی یہ لائبریری ۱۹۵۹ء میں قائم ہوئی، جس میں اسلام اور مسلمانوں پر دنیا بھر کی بڑی زبانوں پر کئی کتابیں جمع کی گئی ہیں۔ اس لائبریری کا آغاز کراچی سے ہوا تھا جب برصغیر کے مشہور ماہر زبانِ عربی مولانا عبدالعزیز میمانی نے پچیس سو(۲۵۰۰) کتابیں عطیہ کیں۔ اس کے بعد سے انسٹی ٹیوٹ اسلامیات کے میدان میں تحقیق کے لیے زیادہ سے زیادہ کتابیں شامل کرنے کی کوشش کر رہا ہے۔ یہ لائبریری مشہور عالم ڈاکٹر محمد حمید اللہ کے نام سے ۱۹۸۶ء میں منسوب ہوئی۔ اس کی انفرادیت کئی لحاظ سے ظاہر ہوتی ہے مثلاً یہاں عربی، فارسی اور اردو میں اصل مواد کے علاوہ انگریزی، فرانسیسی، جرمن، اطالوی، یونانی، ہسپانوی، روسی اور دیگر اہم زبانوں میں بھی مسلم اور غیر مسلم دانشوروں کی کتابیں دستیاب ہیں۔ کتابوں کے انتخاب اور ذخیرے کی وسعت کے لحاظ سے یہ پاکستان میں اسلامیات پر بہترین لائبریری ہے۔[301]

آپ نے ۱۹۵۲ء سے ۱۹۷۸ء تک ترکی کی مختلف جامعات میں بطور مہمان استاد خدمات انجام دیں جن میں انقرہ، استنبول اور ارضِ روم کی جامعات بھی شامل ہیں۔ آپ ۲۰ سال سے زائد عرصے تک فرانس کے قومی مرکز برائے سائنسی تحقیق سے وابستہ رہے۔

احادیث کی سب سے اولین کتابوں میں شامل جو "صحیفہ ہمام بن منبہ" کے طور پر جانی جاتی ہے جسے حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ نے (۵۸ ہجری بمطابق ۶۷۷ عیسوی) میں اپنے شاگردوں کو پڑھانے کے لیے تیار کیا تھا، اس عظیم دستاویز کو ڈاکٹر محمد حمید اللہ نے اس کی تصنیف کے ۱۳۰۰ سال بعد جرمنی میں برلن لائبریری سے دریافت کیا اور شائع کرایا۔ اس دریافت سے بعض لوگوں کا یہ اعتراض بھی ختم ہو گیا کہ احادیث کی تدوین و تالیف نبی کریم ﷺ کی وفات کے دو سو سال بعد ہوئی۔

ڈاکٹر صاحب نے پہلی بار قرآن کریم کا مکمل فرانسیسی زبان میں ترجمہ کیا اور تفسیر لکھی۔ اس ترجمہ اور تفسیر

کے قریباً بیس ایڈیشنز شائع ہو چکے ہیں۔ یہ کسی بھی یورپی زبان میں سب سے زیادہ چھپنے والے تراجم میں سے ہے، جو کئی ملین کی تعداد میں شائع ہو چکا ہے۔ اس فرانسیسی ترجمے اور تفسیر سے بہت فرانسیسی اسلام کی طرف راغب ہوئے۔ اُن کی کوششوں اور تحقیق کی وجہ سے مسلمان ہونے والوں کی تعداد تیس ہزار (۳۰،۰۰۰) بتائی جاتی ہے اگرچہ یہ مبالغہ لگے مگر حقیقت میں ہزاروں لوگ ڈاکٹر صاحب کی وجہ سے اسلام کی طرف راغب ہوئے۔ "تعارفِ اسلام " (Introduction of Islam) ڈاکٹر صاحب کی تصنیف کردہ کتب میں اور اسلام کے بارے میں شائع ہونے والی کتب میں سب سے زیادہ مشہور ہے۔ اس کتاب کا دنیا کی ۲۲ زبانوں میں ترجمہ کیا جا چکا ہے۔

ڈاکٹر حمید اللہ کے اپنے بقول ان کے مقالوں کی تعداد ایک ہزار سے زائد ہے جب کہ ان کی تصانیف، تالیفات، ترجموں، نظر ثانی شدہ کتابوں، کتابچوں اور رسائل کی تعداد ایک سو چونسٹھ (۱۶۴) کے قریب بنتی ہے۔[302]

ڈاکٹر صاحب کی کتابوں کی فہرست کچھ اس طرح ہے۔

داعیٔ اسلام ان کی سب سے زیادہ عالمی شہرت یافتہ کتاب ہے۔

سلطنتوں کے باہمی برتاؤ کا دستور العمل۔ قانون بین الممالک کے اصول اور نظیریں۔ جلد طبع اول ۱۹۳۶ء، حیدر آباد دکن سے چھپی۔ طبع ثانی ۱۹۴۵ء، حیدر آباد دکن۔

عہد نبویؐ کا نظام تعلیم۔ طبع دہم ۱۹۷۶ء، حیدر آباد دکن (اب یہ مختصر کتاب "عہد نبویؐ میں نظام حکمرانی" کا حصہ ہے)۔

عہد نبویؐ میں نظام حکمرانی۔ ۱۹۸۱ء، کراچی سے شائع ہوئی۔

امام ابو حنیفہؒ کی تدوین قانون اسلامی۔ ۱۹۸۳ء، کراچی سے شائع ہوئی۔

عربی حبشی تعلقات اور نو دریافت شدہ مکتوبات نبویؐ بنام نجاشی۔ ۱۹۴۲ء، حیدر آباد سے شائع ہوئی۔

قانون شہادت۔ ۱۹۴۴ء، حیدر آباد سے شائع ہوئی۔

عہد نبویؐ کے میدان جنگ ،لاہور سے شائع ہوئی۔

رسول اکرمؐ کی سیاسی زندگی۔ ۱۹۸۰ء، کراچی سے شائع ہوئی۔

صحیفہ ہمام ابن منبہ، کراچی۔ ملک سنز، فیصل آباد سے شائع ہوئی، سالِ اشاعت ہے ۱۹۸۳ء، اضافی دیباچہ غلام احمد حریری۔

سیاسی وثیقہ جات (ترجمہ الوثائق السیاسیۃ از ابو یحییٰ امام خان نوشہروی)، لاہور سے ۱۹۶۰ء میں شائع ہوئی۔

روزہ کیوں؟(ترجمہ Why Fast? از محمد حبیب اللہ)، حیدر آباد سے ۱۹۶۶ء میں شائع ہوئی۔

خطبات بہاولپور، اشاعت اول ۱۹۸۱ء، بہاولپور۔ مکمل نظر ثانی شدہ اشاعت، اسلام آباد ۔

سیرت ابن اسحاق (ترجمہ از نورالٰہی ایڈوکیٹ)، نقوش رسولؐ نمبر۔

سیرت طیبہ پر ڈاکٹر محمد حمید اللہ کے عثمانیہ یونیورسٹی کے لیکچر، ۱۹۸۷ء، حیدر آباد۔

سیرت طیبہ کا پیغام عصر حاضر کے نام، ۱۹۹۲ء، لاہور۔

اخبار الطوال

کتاب المجر

مقالات گارساں دتاسی

خطباتِ گاساں دتاسی

نقشہ ہائے تاریخ اسلام

مقالہ در "نذر عرشی" (عنوان مقالہ "شمس الائمہ سرخسی")

مقالہ در "نذر مختار" (عنوان مقالہ "فرانسیسی زبان کی پیدائش میں عربی کا حصہ")

اسلامی قانون کا ارتقا (توسیعی لیکچر)

رویت ہلال / نیا چاند

عیدین اور ان کے منانے کے اسلامی و جاہلی طریقے

مدرسۂ محمدی

داعئ اسلام

آپ کے اردو مقالات کی تعداد تین سو پچاس (۳۵۰) سے زائد ہے ۔ آپ نے عربی میں پندرہ (۱۵) کتابیں تحریر کیں جب کہ آپ کے عربی مقالات کی تعداد پینتیس (۳۵) ہے۔ آپ نے فارسی میں بھی چھ (۶) مقالات تحریر کیے۔ اس کے علاوہ آپ نے اردو دائرۃ المعارف اسلامیہ کے لیے بھی بتیس (۳۲) مضامین تحریر کیے جن میں اُحد، بدر، حدیبیہ، حلف الفضول، حنین، خندق، خیبر، زینب بنت جحش، طائف، علی بن ابن طالب، عمر ابن الخطاب، عمرو بن امیہ، حضرت محمدؐ، عہد نبوی میں نظم و نسقِ مملکت، رسول اللہ اکرمؐ بطور مقنن، معراج اور یہود جیسے اہم مضامین بھی شامل ہیں۔

آپ نے انگریزی میں بھی کئی تصانیف یادگار چھوڑی ہیں، جن کی تفصیل کچھ یوں ہے:

1. *The Battlefields of the Prophet Muhammad*, 3rd Ed. Hyderabad: Habib, 1983

2. *The Emergence of Islam: lectures on the development of Islamic world-view, intellectual Tradition and Polity.* Islamabad: Islamic research institute in collaboration with Da'wah Academy. International Islamic University, 1993
3. *The First Written Constitution in the World.* 3rd ed. Sh. Muhammad Ashraf, 1975"
4. *Sahifah Hammam ibn Munabbih.* 10th ed. Luton: Apex, 1979
5. *Introduction to Islam*, 5th ed. Luton: Apex 1980
6. *Islam and Communism: A study in comparative thought*, Lahore: Kazi publications, 1975
7. *Islam, A general picture.* Chicago: Kazi Publications.1980
8. *Muhammad Rasulullah.* Hyderabad: Stockists, Habib, 1974
9. *The Muslim Woman*, Islamabad: International Islamic University, 1989
10. *The Muslim code of state.* 7th ed. Lahore: Sh. Muhammad Ashraf, 1987
11. *Why fast? 11 A study of fast in Islam from both spiritual and temporal points of view*, Geneva: Islamic center, 1961.
12. *The 1400 anniversary of the completion of Islam.* Oxford: Oxford Center for Islamic Studies, 1989

ڈاکٹر صاحب نے اسی تحقیقی و علمی ذوق کی بناپر دیارِ مغرب کو اپنا مسکن بنایااور اپنی ساری زندگی اسی ذوق کی نذر کر دی لیکن دلچسپ بات یہ ہے کہ اتنا طویل عرصہ مغرب میں رہنے کے باوجود ان کی طرزِ زندگی یاان کی فکر پر مغربیت کاادنٰی ساشائبہ تک نہیں۔اسی طرح عجز وانکساری بھی ان کی شخصیت کا نمایاں پہلو رہے ہیں۔[303] انھوں نے ہمیشہ سادگی اور قناعت کو اپنایا۔انھیں کئی دفعہ مختلف لوگوں کی طرف سے ہر طرح کے تعاون کی پیش کش ہوئی لیکن انھوں نے کبھی اس طرف دھیان نہ دیا۔وہ کسی بھی قسم کی آسائش کو جنھیں آج کے دور میں 'ضروریات' تصور کیا جاتا ہے، غیر ضروری اور وقت کا ضیاع خیال کرتے تھے۔انھیں حکومتِ پاکستان کی طرف سے کئی ایک پیش کشیں ہوئیں لیکن انھوں نے یہ کہہ کر انکار کر دیا کہ وہ جس کام میں مصروف ہیں،وہ زیادہ توجہ کا مستحق ہے۔[304]

ڈاکٹر محمد حمید اللہ کی وفات کے بعد ان کے تحقیقاتی کاموں کو دوبارہ شائع کیا گیا۔انڈیا اور پاکستان کے سکالروں نے اپنی کتابوں میں ڈاکٹر صاحب کی شخصیت کو شان دار خراج تحسین بھی پیش کیا۔کچھ رسالوں نے ان پر خصوصی نمبر نکالے۔جن رسائل نے خصوصی نمبر شائع کیے اُن کے نام یہ ہیں۔

"معارف اسلامی"، "دعوہ، فکر و نظر"، "اور ینٹل کالج میگزین" اور "شاداب"۔

ڈاکٹر محمد حمید اللہ زندگی اور علمی کاموں پر تین کتابیں بھی لکھی اور شائع کی گئی ہیں جن کے نام یہ ہیں۔

ڈاکٹر محمد حمید اللہ از راشد شیخ، طبع ۲۰۰۳ء از المیزان پبلشرز، فیصل آباد

آثارِ ڈاکٹر حمید اللہ از صفدر حسین

مجددِ علومِ سیرت از غتریف شہباز

ڈاکٹر محمد حمید اللہ حیات، خدمات اور مکتوبات مرتبہ راشد شیخ

آپ ۱۷ دسمبر ۲۰۰۲ء کو چورانوے سال کی عمر میں امریکی ریاست فلوریڈا کے شہر جیکسن ول میں انتقال کر گئے۔[305] ان کی زندگی 'کام، کام اور صرف کام' کی عملی تفسیر ہے جس میں آرام نام کی کوئی شے نظر نہیں آتی۔ اور بلاشبہ ڈاکٹر صاحب نے علمی و تحقیقی، تبلیغی اور تدریسی میدان میں جو کارہائے نمایاں انجام دیے ہیں، اس کے لیے کئی دماغ اور کئی زندگیاں درکار ہیں۔[306] انھوں نے اپنے آپ کو حصول مقصد کے لیے کھپا کر احمد بن حنبلؒ اور ابن تیمیہؒ کی روایت کو زندہ کیا ہے اور آئندہ نسلوں کے لیے تحقیق و تفویق، محنت و قربانیوں کی ایسی راہ متعین کی ہے جو ان کے لیے مشعل راہ بنے گی۔

مولوی محمد صدیق:

مولوی محمد صدیق صاحب ایک جرنلسٹ کی حیثیت سے ہندوستان میں کافی مشہور ہیں۔ آپ "بمبئی کرانیکل" اور "نیشنل ہیرلڈ" کے چیف سب ایڈیٹر تھے۔ اوّل الذکر اخبار کی ہفتہ وار اشاعت اور فری پریس نیوز سروس کی شاخ دہلی کے آپ ایڈیٹر بھی رہ چکے ہیں۔ کچھ دنوں سے آپ ایک طرح صحافت سے کنارہ کش ہو گئے ہیں لیکن حیدرآباد کے سیاسی معاملات میں آپ کی پُر خلوص دلچسپیاں ناقابلِ فراموش ہیں۔ ۱۹۳۷ء میں شاہ جارج ششم کی تاج پوشی کے وقت آپ انگلستان دو ماہ کے لیے تشریف لے گئے تھے۔

"یورپ کے تاثرات"

(اصل کتاب کا متن)

مرتب: بدرالدین شکیبؔ

"یہ کتاب صرف حالات و واقعات اور مشاہدات و تجربات کا مجموعہ نہیں ہے بلکہ اس میں زندگی کے کچھ نئے راستے معلوم ہوتے ہیں۔ ہمیں اس کتاب میں ایسی قوم کے حالات کا پتہ چلتا ہے جو ہم سے کسی طرح بالا و برتر نہیں لیکن اس میں کچھ ایسی قومی خصوصیات اور منضبط اور مربوط زندگی کے کچھ ایسے پہلو ہیں جن سے ہم اس زمانہ میں بے خبر نہیں رہ سکتے اور نہ بے خبر رہنا چاہیے۔

اس میں شک نہیں کہ یہ بڑی دلچسپ کتاب ہے لیکن اس میں دلچسپی سے زیادہ بصیرت و عبرت کا سامان ہے۔ مجھے یقین ہے کہ قومی تعمیر و تشکیل کے خاکہ میں یورپ کی زندگی کی یہ چند تصویریں مفید ثابت ہوں گی۔

سر سید عبد الطیف

یورپ کے تاثرات

(یعنی پچیس فرزندانِ وطن کے مشاہدات و تجربات کا مرقع)

تالیف

محمد بدر الدین خان شکیب بی۔اے۔، ایل۔ایل۔بی۔، وکیل ہائی کورٹ

مطبوعہ

اعظم اسٹیم پریس، حیدر آباد دکن

جملہ حقوق بحق مؤلف محفوظ ہیں

بار اوّل	۱۳۴۹ف بمطابق ۱۹۳۹ء	قیمت
۱۲۵۰		8

ملک کے نوجوانوں کے نام

فہرستِ مضامین

پیش لفظ ڈاکٹر سید عبداللطیف، پی۔ایچ۔ڈی۔(لندن)

تعارف سید معین الدین قریشی، ایم۔اے۔

دیباچہ بدرشکیبؔ

بیان علامہ عبداللہ یوسف علی، ایم۔اے۔، ایل۔ایل۔ایم۔، آئی۔سی۔

" رائے سری کشن، بیرسٹر

" ڈاکٹر لطیف سعید، ایم۔بی۔سی۔ایچ۔(ایڈیٹر)

" سید حیدر رضا زیدی، ایم۔اے۔(آکسن)، بیرسٹر ایٹ لا

" سید محمد حسین جعفری، بی۔اے۔(آکسن)، ناظمِ تعلیمات سرکارِ عالی

" عبدالرحمن خان، بی۔اے۔، ایف۔آر۔اے۔ایس۔(لندن)، سابق صدر، کلیہ جامعہ عثمانیہ

" ڈاکٹر سید حسین، پروفیسر جامعہ جنوبی کیلی فورنیا (امریکہ)

" سجاد مرزا، ایم۔اے۔(کنٹب)، پرنسپل عثمانیہ ٹریننگ کالج

" قادر حسین خان، ایم۔اے۔، بیرسٹر ایٹ لا، پرنسپل نظام کالج

" حسن علی مرزا، بیرسٹر ایٹ لا، صدر شعبہ قانون، جامعہ عثمانیہ

" ڈاکٹر جے سوریا، ایم۔ڈی۔(برلن)

" ایس۔یم۔ہادی، بی۔اے۔(کنٹب)، ناظم سررشتہ بوائے اسکاؤٹس، سرکارعالی

" ڈاکٹر خلیفہ عبدالحکیم، ایم۔اے۔، پی۔ایچ۔ڈی۔(ہائیڈل برگ)، صدر شعبہ فلسفہ، جامعہ عثمانیہ

" صغرا ہمایوں مرزا

" میر اکبر خان، بی۔اے۔، ایل۔ایل۔بی۔(آنرز)(لندن)، بیرسٹر ایٹ لا

" محمد صلاح الدین، ایم۔اے۔، پروفیسر جامعہ عثمانیہ

" ڈاکٹر مقبول علی، بی۔اے۔، ایل۔آر۔سی۔پی۔، ایم۔آر۔سی۔ایس۔(لندن)، سول سرجن

" ڈاکٹر میر سیادت علی خان، ایم۔اے۔، پی۔ایچ۔ڈی۔، بی۔سی۔ایل۔(آکسن) بیرسٹر ایٹ لا

" ڈاکٹر یوسف حسین خان، بی۔ لٹ۔ (پیرس)، پروفیسر جامعہ عثمانیہ

" ڈاکٹر محمد رضی الدین صدیقی، ایم۔اے۔، پی۔ایچ۔ڈی۔(کنٹب)

" ڈاکٹر سید محی الدین قادری زورؔ، ایم۔اے۔، پی۔ایچ۔ڈی۔(لندن)، پروفیسر جامعہ عثمانیہ

" حبیب الرحمن، ایم۔اے۔، بی۔ایس۔سی۔(لندن) ناظمِ معلوماتِ عامہ، سرکارِ عالی

" مسز جمال الدین، بی۔اے۔

" ڈاکٹر حمید اللہ، ایم۔اے۔، پی۔ایچ۔ڈی۔(بان) بی، لٹ۔، پروفیسر جامعہ عثمانیہ

" محمد صدیق

پیش لفظ

یورپ باوجود رنگ و نسل کے امتیازات کے کئی حیثیتوں سے ایک ایسی اقلیم ہے جو ایک ناظر کے دل پر دیرپا ارتسامات اور نقوش بٹھاتی ہے۔ وہاں کے حیرت انگیز سائنس کے اکتشافات اور مادی ترقیوں نے اہلِ یورپ کی معاشی، اخلاقی اور سیاسی زندگی اور اس کے نصب العینوں میں اتناز بردست انقلاب برپا کر دیا ہے کہ یورپ کی حیاتِ اجتماعی مختلف، پیچیدہ اور عالم گیر اہمیت رکھنے والے مسائل کا مظہر بن گئی ہے۔ ہندوستان کا، جو بخت و اتفاق سے یورپ کی ایک طاقت ور سلطنت کے زیرِ اقتدار ہے[307]،ان جدید خیالات اور رجحانات سے متصادم ہونا ناگزیر تھا۔

یہ کتاب اُن ارتسامات کا مجموعہ ہے جو ایسے فرزندانِ وطن کے دلوں پر منقوش ہوئے ہیں، جنھیں یورپ میں کسی نہ کسی حیثیت سے رہنے سہنے اور اپنے اپنے زاویۂ نظر سے اُس کو سمجھنے کا موقع ملا ہے۔ مسٹر بدر شکیبؔ نے اس بات کا اہتمام کیا ہے کہ اس میں ہر نقطۂ نظر کے لوگ شامل رہیں۔ یہی وجہ ہے کہ اس میں ماہرینِ تعلیم بھی ہیں، سیّاس بھی ہیں[308]، ادیب ہیں، سائنس دان ہیں، بیرسٹر ہیں، ڈاکٹر ہیں۔ غرض ہر قسم کے لوگ ہیں جس سے کتاب کی افادیت میں اضافہ ہو گیا ہے۔ بظاہر ان ارتسامات کا ہر شخص کے طبعی رجحان، جبلّی صلاحیت اور ذہانت کی بنا پر آپس میں مختلف ہونا ضروری ہے۔ لیکن یہ مسرت کا مقام ہے کہ مرتّب نے اپنے ذوقِ نظر سے ایسے اصحاب کا انتخاب کیا جو بحیثیتِ مجموعی یورپ کی زندگی اور حالات کا ایک مربوط اور متناسب نقشہ پیش کر سکتے تھے۔ اس لحاظ سے یہ مجموعہ صحیح معنوں میں ایک مفید اور دل کش مرّقع ہے۔

مسٹر بدر شکیبؔ جامعہ عثمانیہ کے اُن قابل فرزندوں میں سے ہیں جنھوں نے اپنے ذوق اور صلاحیت کی تربیت سے ملک کے اُن مسائل پر جو اہلِ فکر کی توجہ کا مرکز بنے ہوئے ہیں، جچی تلی نظر پیدا کر لی ہے۔ انھوں نے رائے کے اظہار میں ہر صاحبِ بیان کو اپنے حال پر نہیں چھوڑا بلکہ بڑی دانائی اور احتیاط کے ساتھ فکر اور رائے کے دائرہ کو چند سائنٹیفک حدود میں متعین کر دیا جو ان ارتسامات کی افادی قدر و قیمت کی ضامن ہیں۔ جو سوالات انھوں نے ہر صاحبِ بیان کے سامنے پیش کیے اور جن موضوعات پر تبادلۂ خیال اور بحث و تمحیص کی، ان سے بجائے خود زندگی کا ایک زاویۂ نظر ظاہر ہوتا ہے اور یہ معلوم ہوتا ہے کہ یورپ کی منزل مقصود کیا ہے اور ہندوستان کیا چاہتا ہے۔ دراصل ایک مقصد کی تلاش ہے جس کے نشانات ناظرین اس کتاب کے ہر صفحہ پر پائیں گے۔

یہ کتاب صرف حالات و واقعات اور مشاہدات و تجربات کا مجموعہ نہیں ہے بلکہ اس میں زندگی کے کچھ نئے راستے معلوم ہوتے ہیں، ہمیں اس کتاب میں ایسی قوم کے حالات کا پتہ چلتا ہے جو ہم سے کسی طرح بالا و برتر نہیں لیکن اس میں کچھ ایسی قومی خصوصیات اور منضبط اور مربوط زندگی کے کچھ ایسے پہلو ہیں جن سے ہم اس زمانہ میں بے خبر رہ سکتے اور نہ بے خبر رہنا چاہیے۔

اس میں شک نہیں کہ یہ بڑی دلچسپ کتاب ہے لیکن اس میں دلچسپی سے زیادہ بصیرت و عبرت کا سامان ہے۔ مجھے یقین ہے کہ قومی تعمیر و تشکیل کے خاکہ میں یورپ کی زندگی کی یہ چند تصویریں مفید ثابت ہوں گی۔

حیدرآباد، دکن

(ڈاکٹر) سید عبد اللطیف، پی۔ ایچ۔ ڈی۔ (لندن)

تعارف

میں نے یورپ کی کبھی سیر نہیں کی۔ اس کے جلوے دور ہی سے دیکھے ہیں۔ اس لحاظ سے مجھے نقوشِ یورپ کے اس دل نشین مجموعہ پر قلم اٹھانے کا بہت کم حق حاصل ہے لیکن میں اپنے دوست بدر شکیب کی فرمائش اور ایک نامعلوم سی ترغیب کو کسی طرح ٹال نہیں سکتا۔

ہمارے ملک میں یورپ کے تعلیم یافتہ افراد کی کمی نہیں جن کی ایک بڑی تعداد نظم و نسق کے سانچوں میں ڈھلی جا رہی ہے۔ اس کارخانے سے یقیناً کبھی کبھی اچھی صنعتیں بھی نکلتی رہتی ہیں لیکن عام طور پر آشنایانِ فرنگ کی خوش نما ٹولیوں میں ایسے لوگ خال خال ہی نظر آئیں گے جنھوں نے اپنے آپ کو پبلک زندگی اور اس کے قریبی مسائل سے وابستہ کیا ہو یا ملک کے وسائلِ حیات میں اضافہ کرنے کے لیے کوئی نئے ہمت آزما میدان اپنے لیے پیدا کیے ہوں۔ اس کی وجہ بہ ظاہر یہی معلوم ہوتی ہے کہ بہت سی مستعار امانتیں، ترقی کے ان گنت امکانات اور نئی تہذیب کی بے پناہ قوتیں دیر تک شانِ مجاز میں ان کے جلو میں رہتی ہیں، کبھی وہ سوسائٹی سے اس قدر اونچے ہو جاتے ہیں کہ ان کی نظر عام نظروں سے مل نہیں سکتی اور کبھی وہ اپنے اندر ایک نئی نوع کے وجود کا احساس اس قدر قوی پاتے ہیں کہ جب وہ بولتے ہیں تو ان کی بولی کسی کی سمجھ میں نہیں آتی پھر حجابات کچھ اٹھنے لگتے ہیں لیکن اس وقت جب کہ زمانہ عمل سے زیادہ ردِ عمل اور خیال سے زیادہ ردِ خیال کا ہوتا ہے۔ اس دور میں خود ہی کچھ سوجھ جائے تو سوجھ جائے لیکن اوروں کو کوئی کیا سجھا سکے۔

یورپ کی تماشگاہ سے بہت سے تماشائی کچھ اسی آن سے لوٹے اور اسی ڈھب کی زندگی بسر کی، انھی میں بعض ایسے اربابِ نظر بھی ہیں جنھوں نے کچھ دیکھا اور جو کچھ وہاں دیکھا ہمیں بھی دکھانے کی کوشش کی۔

اس مجموعہ میں کچھ ایسے ہی 'دیدہ وروں' کی جھلکیاں نظر آتی ہیں، ان میں بعض ایسے بھی ہیں جو نیم باز آنکھوں سے دیکھ رہے ہیں۔

یورپ ایک عجیب سرزمین ہے جہاں تہذیب کے نت نئے نظام بنتے اور بگڑتے ہیں اور معاشرت کے گوناگوں تجربات آئے دن آزمائے جاتے ہیں۔ زندگی کی سطحی اور گہری چیزیں، کثیف و لطیف رجحانات بہ یک وقت آپس میں دست و گریبان نظر آتے ہیں۔ ایک پر لطف مشغلہ چپکے چپکے ایک سنجیدہ مسئلہ بن جاتا ہے پھر یہی عالمانہ سنجیدگی کسی کے ہاتھوں ایک دلچسپ مشغلہ میں تحلیل ہو کر رہ جاتی ہے۔ زندگی ایک منظم کھیل ہے جس کو سو طرح سے کھیلا جاتا ہے لیکن اس سے کون انکار کر سکتا ہے کہ ہر ایسے یا اسی قسم کے عمل میں ایک 'طریقہ' کار فرما رہتا ہے جس

کا مقصد کوئی نہ کوئی مادی نتیجہ خیزی ہے۔ یہاں فکر و دانش ہے، حکمت و تدبیر ہے، علم و فن ہے، عمل و تنظیم ہے، سلیقہ ہے، حسن ہے اور اس کی آرائش ہے لیکن دیکھنا یہ ہے کہ ان مظاہرِ حیات میں سب کو ہم آہنگ کرنے والی روح کس طرح کام کر رہی ہے۔ یورپ نے قدرت کی بہت سی ان بوجھ قوتوں کو اپنا رفیق بنالیا لیکن کیا وہ زندگی کے کسی دُور رَس مستقبل کو پہچان سکا، اس کی بے شمار ترقیوں میں ہماری مجبوریوں کا بھی کچھ حال کھل سکتا ہے؟

یہ ایک سوال ہے جو مختلف انداز سے یورپ کے تربیت یافتہ صاحبوں سے کیا جا سکتا ہے۔ اسی سوال کو بدر شکیب نے اپنے متجسس دماغ کی روشنی میں حل کرنے کی کوشش کی ہے۔ شکیب کی زندگی سوچ بچار، اخلاص اور گہرے احساس سے لپٹی ہوئی ایک عمل کی زندگی ہے۔ وہ ہمیشہ کچھ کرنا اور کام کا راستہ نکالنا چاہتے ہیں۔ یہ کتاب دراصل ان کی اسی کوشش کا ایک نتیجہ ہے۔

میں چاہتا ہوں کہ لوگ اس کتاب کو ذرا غور سے پڑھیں!

سید معین الدین قریشی
حیدر آباد دکن
۲۲ آبان ۱۳۴۸ء ف

دیباچہ

ہندوستان پر یورپ کے تمدنی اور تہذیبی اثرات یوں تو ایسٹ انڈیا کمپنی[309] کے زمانہ ہی سے شروع ہو گئے تھے لیکن ان میں شدت ہندوستان پر انگریزی تسلط کے بعد پیدا ہوئی اور غدر کے بعد سے اسّی سال کے قلیل عرصہ میں مغربی تہذیب ہماری زندگی کے ہر شعبہ میں سرایت کر گئی۔ ہماری معاشرت، ہمارے سیاسی اور سماجی تصورات، ہمارے قانونی اور معاشی آئین، ہماری زبان، ہمارا ادب غرض ہماری ہر چیز آج مغربی اثرات کی رہینِ منت ہے اور مغرب نے ان پر وہ گہرے نقوش چھوڑے ہیں کہ ان کے محو ہونے کے لیے بڑا عرصہ لگے گا۔ اس کی وجہ یہ نہیں ہے کہ ہماری تہذیب و تمدن کسی طرح مغربی تہذیب و تمدّن سے کم تر ہے بلکہ بظاہر اس کے یہ اسباب معلوم ہوتے ہیں کہ جب دو قومیں یا تمدن آپس میں متصادم ہوتے ہیں تو غالب قوم کا تمدن' مغلوب قوم کے تمدن پر چھا جاتا ہے اور اگر بد قسمتی سے احساسِ پستی بھی رونما ہو جائے تو یہ اثرات زیادہ گہرے اور نمایاں ہو جاتے ہیں، ہر زمانہ میں اس قسم کی مثالیں ملتی ہیں۔

لیکن تعجب اس امر کا ہے کہ مغرب کے اُن سارے اثرات کو قبول کرنے کے باوجود ہم میں ابھی دو خصوصیات پیدا نہیں ہوئیں جو مغربی اقوام کے لیے سرمایۂ ناز ہیں اور جو اُن کی ترقی کا اصلی سبب ہیں۔ اس کی وجہ غالباً یہ ہے کہ ہم نے اُن اثرات کا تجزیہ کرنے کی کبھی کوشش ہی نہیں کیا اور اگر کی بھی ہے تو بہت کم۔

اس وقت حیدر آباد (دکن) میں یورپ سے واپس شدہ حضرات کی اتنی کثیر تعداد موجود ہے کہ شاید ہی ہندوستان کے کسی شہر میں ہو اور ہر سال اس تعداد میں اضافہ ہی ہوتا جارہا ہے لیکن اس کے باوجود ہم دیکھ رہے ہیں کہ ملک کو ان لوگوں سے کوئی خاطر خواہ فائدہ نہیں پہنچ رہا ہے۔ ایک طرف یورپ جانا آج کل بڑی حد تک محض اپنے ذاتی فائدہ کی غرض سے ہوتا ہے تو دوسری طرف ملک کا ماحول اور فضا ایسی ہے کہ کام کرنے والوں کو اپنے جوہر دکھانے کا موقع ہی نہیں ملتا اُن کی قابلیتیں گھٹ کر رہ جاتی ہیں، اُن پر جو قومی دولت صرف ہوتی ہے وہ رائیگاں جاتی ہے۔ اس کے کیا اسباب ہیں؟ اس کے کون ذمہ دار ہیں اور اس کی کیسے اصلاح ہو سکتی ہے؟ یہ ایسے سوالات ہیں جن کا یہاں جواب دینا میرے موضوع سے خارج ہے۔ میں نے اس کتاب میں صرف یہ معلوم کرنے کی کوشش کی ہے کہ ہمارے مقابلہ میں یورپ اتنا ترقی یافتہ کیوں ہے، اہلِ یورپ میں آخر وہ کون سی خصوصیات ہیں جن کی وجہ سے وہ ہم پر فوقیت رکھتے ہیں اور جن کا ہم میں پیدا ہونا ضروری ہے تا کہ ہم بھی زندہ اقوام کی صف میں آسکیں، ہم میں کون سی کمزوریاں ہیں اور

اُنھیں کس طرح دُور کیا جاسکتا ہے؟ حقیقت یہ ہے کہ یہی وہ سوالات ہیں جن کے جوابات میں ہماری قومی اور ملی پستی کا راز پوشیدہ ہے۔

قوموں کا عروج وزوال قانونِ قدرت کا تابع ہے۔ ابتدائے آفرینش سے اب تک دنیا میں مختلف قوموں اور تمدنوں کو عروج حاصل رہا، اُن کے نشیب وفراز کے اسباب وعلل پر نظر ڈالنے سے معلوم ہوتا ہے کہ زندہ اقوام اور زندہ تمدنوں میں بعض ایسی خصوصیات ہوتی ہیں جن کی وجہ سے وہ زندہ رہتی ہیں اور جب اُن میں انحطاط پیدا ہوتا ہے تو قومی زندگی میں بھی انحطاط کی کیفیت رونما ہو جاتی ہے۔ آج ہمارا بھی یہی حال ہے، ہمارا ماضی تو شان دار ہے لیکن مستقبل تاریک کیوں ہے۔ اس کی وجہ بجز اس کے کچھ نہیں کہ ہمارے اسلاف بعض ایسی خوبیوں کے حامل تھے جو زندہ اقوام کے لیے ضروری ہیں، ہم میں وہ اوصاف نہیں رہے اور ہم مردہ ہیں۔ اگر ہم کو زندہ رہنا ہے اور دنیا میں پھر سربلند ہونا ہے تو ہم میں اُن خوبیوں کا پیدا ہونا ضروری ہے جن سے قومیں زندہ رہتی ہیں اور جن کے بغیر فنا ہو جاتی ہیں۔ اہلِ یورپ کی ترقی اور اُن کی خصوصیات ہمارے لیے کوئی نئی چیز نہیں لیکن اُن کے حالات کی تفصیل اس لیے بتلانی ضروری ہے کہ آج کل اُن ہی کی مثال ہمارے پیشِ نظر ہے اور یہی ہمارے لیے نمونہ بنے ہوئے ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ ایک بھولا ہوا سبق یاد دلایا جارہا ہے ممکن ہے اس سے ہم میں از سرِ نو زندگی کی کوئی لہر پیدا ہو جائے۔

یورپ کے متعلق اُردو میں جو کتابیں لکھی گئی ہیں اُن کی تعداد انگلیوں پر گنی جاسکتی ہے۔ یہ ہماری بدقسمتی نہیں تو کیا کہ وہ لوگ جو برسوں یورپ میں رہے ہیں اور جنھیں صحیح معنوں میں یورپ کو دیکھنے اور سمجھنے کا موقع ملا ہے انھوں نے اب تک اپنے خیالات ومشاہدات کو منظرِ عام پر لانے کی کوشش ہی نہیں کی۔ اُردو میں یورپ سے متعلق جو تھوڑا بہت ادب ہے وہ بیش تر سیر وسیاحت کی تفصیل ہے۔ ان سفر ناموں میں بہت کم مصنفین نے یورپ اور اہلِ یورپ کی خصوصیات کا تجزیہ کرنے کی کوشش کی ہے۔ اس میں شک نہیں کہ اُن میں اہلِ یورپ کی معاشرت اور تمدن کی کچھ جھلکیاں نظر آتی ہیں لیکن یہ چیزیں وسیع مشاہدہ اور غور وفکر کا نتیجہ نہیں ہیں۔ ایسی کتابیں محض اپنے لکھنے والوں کے خیالات، احساسات اور دلچسپیوں کی آئینہ دار ہیں۔ زیرِ نظر کتاب میں مختلف زاویہ ہائے نظر کے لوگوں کے خیالات کو یک جا جمع کر دیا گیا ہے تا کہ پڑھنے والے خود اپنے طور پر نتائج اخذ کر لیں۔

ابتدا میں جب میں نے اس کتاب کے لکھنے کا خیال بعض احباب پر ظاہر کیا تو کسی نے تائید کی اور کسی نے مخالفت۔ حیدرآباد کے ایک بڑے امیر نے اس خیال کا مذاق اُڑایا اور اپنا بیان دینے سے انکار کر دیا۔ لیکن میں ہراساں نہیں ہوا۔ جب میں نے دو ایک بیانات قلم بند کر لیے تو خود مجھے دلچسپی ہونے لگی اور اعتراضات کا خیال نہ کر کے میں

اس کام میں محو ہو گیا۔ میں سمجھتا تھا کہ چھ ماہ میں یہ کام ختم کر لوں گا لیکن اس میں دو سال لگ گئے اور اس کے بعد میں نے محسوس کیا کہ ہمارے ملک میں اس قسم کی ادبی کوشش کس قدر کٹھن اور صبر آزما ہے۔ میری مشکلات کا اندازہ میرے بعض احباب کو ہے یا ان لوگوں کو جن کے بیانات اس کتاب کی زینت ہیں۔ جن اصحاب کے بیانات میں نے قلم بند کیے ہیں ان کا انتخاب میں نے اپنے طور پر کیا ہے۔ میں نے صرف ایسے اصحاب کے بیانات حاصل کرنے کی کوشش کی ہے جو واقعتاً اپنے دل میں قومی درد رکھتے ہیں، جنھوں نے یورپ کے حالات کا گہری نظر سے مطالعہ کیا ہے اور جو ذہن و کردار کے لحاظ سے ملک کی قابلِ احترام ہستیاں ہیں۔ یہ حیدر آباد (دکن) کے بہترین دماغ ہیں اور یہ کسی بھی ملک یا صوبہ میں رہتے تو اس کے لیے مایۂ ناز ثابت ہوتے۔ اس میں شک نہیں کہ ان میں سے بعض گم نامی میں ہیں لیکن اس کی وجہ بجز اس کے کچھ نہیں کہ انھوں نے گم نامی میں رہنا پسند کیا ورنہ اس زمانہ میں شہرت، پروپگنڈے کا دوسرا نام ہے۔

اس کتاب میں جملہ پچیس اصحاب کے بیانات ہیں جن میں سے دو بیرونِ حیدر آباد (دکن) کے ہیں، علامہ عبداللہ یوسف علی اور سید حسین۔ میں نے کوشش کی تھی کہ باہر کے مشہور لوگوں اور رہنمایانِ قوم کے کچھ اور بیانات حاصل کروں اور اس سلسلہ میں میں نے ہندوستان کے تقریباً تمام رہنمایانِ قوم کے نام خطوط روانہ کیے تھے لیکن گاندھی جی *، ڈاکٹر ٹیگور * اور سر شاہ سلیمان * کے سوا' جنھوں نے اپنی مصروفیتوں کی بنا پر معذرت چاہی، کسی نے خط کا جواب دینے کی بھی ضرورت محسوس نہیں کی۔ علامہ عبداللہ یوسف علی، جشنِ جوبلی[310] کی تقریب میں اور ڈاکٹر سید حسین، تقریری سفر کے سلسلہ میں بلدہ تشریف لائے تھے۔ علامہ موصوف نے اپنے وعدہ کے بہ موجب لاہور سے اپنا بیان روانہ فرمایا اور ڈاکٹر صاحب نے اس امر کی اجازت دی کہ ان کی تقاریر سے میں ان کا بیان مرتب کر لوں۔ مجھے اس کا بھی افسوس ہے کہ خود حیدر آباد (دکن) کے بعض لوگ رہ گئے ہیں۔ اس کی وجہ کچھ تو میری اپنی مصروفتیں ہیں اور کچھ ''پیروی'' سے گھبرا جانا۔ اگر حالات اجازت دیں اور وقت ملے تو میں آئندہ اس کی تلافی کرنے کی کوشش کروں گا۔ جو بیانات اس کتاب میں شائع ہو رہے ہیں ان میں سے اکثر محض گفتگو (Interviews) کی تفصیل ہیں، بعض بیانات تحریری تھے جنھیں میں انے اپنے طور پر لکھ دیا، بعض انگریزی کے ترجمے ہیں' مثلاً علامہ عبداللہ یوسف علی، ڈاکٹر لطیف سعید، ڈاکٹر جے سوریا اور ڈاکٹر رضی الدین کے بیانات۔ جو بیانات زبانی حاصل کیے گئے تھے ان میں سے تقریباً تمام میں نے صاحبِ بیان کو دکھلا دیے ہیں، مبادا افراط و تفریط کی ذمہ داری مجھ پر عائد ہو۔ میں نے خاص طور پر کوشش کی ہے کہ بیانات میں میری جانب سے کوئی اضافہ یا ترمیم نہ ہو۔ لٰہذا بیانات میں جو بھی خیالات ظاہر کیے گئے ہیں وہ صاحبِ بیان کے اپنے خیالات ہیں جن سے مجھے کوئی تعلق نہیں، میری حیثیت محض ایک راوی کی ہے۔

بیانات کی ترتیب میں نے سنہ واری رکھی ہے یعنی جو صاحب یورپ پہلے گئے ہیں، اُن کو پہلے جگہ دی گئی ہے۔ یہ طریقہ مجھے اس لیے پسند آیا کہ اس میں یورپ کے حالات کا ارتقائی اور تدریجی طور پر اندازہ کرنے میں آسانی ہوتی ہے۔

آخر میں میں ان تمام اصحاب کا ممنون ہوں جن کے بیانات اس کتاب کی زینت ہیں کہ اُنھوں نے میری استدعا پر ملک و قوم کو اپنے خیالات اور مشاہدات سے مستفید ہونے کا موقع دیا۔ اپنے احباب میں میں خاص طور پر مولوی سید محمد صاحب ایم۔ اے۔ اور مولوی سید محمد اکبر صاحب وفا قانی بی۔ اے۔، ایل۔ ایل۔ بی کا شکر گزار ہوں کہ ان کے مفید مشوروں اور رہنمائی سے مجھے بڑی مدد ملی۔

یکم آبان ۱۳۴۸ف بمطابق ۲۳ اکتوبر ۱۹۶۹ء

بدر شکیب

بیت الامیر

ملے پلی جدید حیدرآباد دکن

علامہ عبداللہ یوسف علی:

علامہ عبداللہ یوسف علی* ایم۔اے۔،ایل۔ایل۔ایم(کنٹب)،آئی۔سی۔ایس۔سی۔بی۔ای۔کسی تعارف کے محتاج نہیں۔آپ کی شہرت بین الاقوامی ہے۔انڈین سول سروس سے آپ کا تعلق ۱۸۹۵ء سے ۱۹۱۴ء تک رہا۔ یہاں سے وظیفہ لینے کے بعد آپ ۱۹۱۷ء تا ۱۹۱۹ء، سکول آف اورینٹل اسٹڈیز[311]،لندن میں ہندوستانی زبانوں، مذاہب و تہذیب کے لکچرار مقرر ہوئے۔۱۹۲۱ء میں حکومتِ سرکارِ عالی نے آپ کی خدمات بحیثیت صدر المہام مال[312] حاصل کیں۔اس کے بعد صدر المہامی صنعت و حرفت پر آپ فائز ہوئے۔لیکن ۱۹۳۲ء میں اپنی خدمت سے مستعفی ہو گئے۔ آج کل آپ اسلامیہ کالج،لاہور[313] کے پرنسپل ہیں۔آل انڈیا مسلم ایجوکیشن کانفرنس[314] کی ۱۹۱۰ء میں اور خلافت کانفرنس[315] کی ۱۹۲۵ء میں آپ نے صدارت بھی فرمائی ہے۔

آپ انگریزی کے ایک مسلّمہ ادیب اور کئی بلند پایہ کتب کے مصنف ہیں۔آپ کا قرآن مجید کا انگریزی ترجمہ جس کے کچھ حصے چھپ کر شائع ہو چکے ہیں کلام پاک کا ایک بہترین و مستند ترجمہ ہے۔[316]

اختلافات:

یورپ کی زندگی کے متعلق اپنے تاثرات کو ایک مختصر مضمون میں بیان کرنا آسان نہیں ہے۔یورپ ایک بڑا رقبہ[317] ہے اور اُس میں متعدد ممالک شامل ہیں[318] جن میں سے ہر ایک کی زبان جداگانہ ہے اور قومی زندگی مختلف۔ ایک ملک کے حالات سے دوسرے ملک کے حالات میں اتنا زبردست اختلاف پایا جاتا ہے کہ کل یورپ کی ایک ہی تصویر کھینچنے سے کوئی مفید نتیجہ برآمد نہیں ہو سکتا۔اس لیے میرے لیے شاید یہی بہتر ہو گا کہ میں برطانیہَ عظمیٰ* کے متعلق اپنے تاثرات قلم بند کر دوں۔یہاں بھی اختلافات ہیں لیکن اتنے زیادہ نہیں ہیں جتنے کہ اُن مجموعہ خیالات میں پائے جاتے ہیں جنھیں سوویت[319] کے نام سے موسوم کیا جاتا ہے اور اُن مجموعہَ خیالات میں جو جرمنی* میں نازی حکومت* کے زیرِ سایہ پرورش پا رہے ہیں۔

ہندوستانی و برطانوی زندگی کا مقابلہ:

ہندوستانی زندگی کے مقابلہ میں برطانوی زندگی کی پہلی چیز جو نمایاں طور پر نظر آتی ہے وہ بحیثیتِ مجموعی ایک منضبط قومی زندگی کا وجود ہے۔انگلستان*، اسکاچستان*، ویلز* اور شمالی آئرستان* ایک دوسرے سے مختلف رہتے ہیں۔ویلز کے اندرونی علاقوں میں جو زبان بولی جاتی ہے وہ ویلش* ہے نہ کہ انگریزی* اور یہ معیاری انگریزی[320] زبان سے جس سے کہ ہم واقف ہیں بہت ہی مختلف ہے۔اسی طرح اسکاچستان کے پہاڑی علاقوں میں جو زبان بولی جاتی

ہے وہ گیالک * ہے اور یہ بھی انگریزی سے مختلف ہے۔ اسکاچستان[321] کے نشیبی علاقوں میں جو بولی بولی جاتی ہے وہ تلفظ اور بعض الفاظ و محاورات کی حد تک انگریزی سے مختلف ہے۔ اس کے باوجود ہم کہہ سکتے ہیں کہ اہلِ برطانیہ میں قومیت کی جو روح ساری ہے وہ ان تمام علاقوں میں بشمول شمالی آئرستان[322] ایک ہی ہے۔

قومی زندگی اور سیرت کا یہ میل ہندوستانی زندگی کے مقابلہ میں (جو متعدد، متبائن اور بعض صورتوں میں متنازع فیہ طریقۂ خیال، طرز و روِش اور کردار میں منقسم ہے) بہت نمایاں ہے۔ ہندوستان میں بہت سی قومیں اور ذاتیں ہیں[323] اور یہ عموماً ایک ہی صوبہ یا ضلع ہیں یا ایک ہی قصبہ یا موضع میں ایک ہی جگہ آباد ہیں۔ ان میں سے ایک کی زبان دوسرے کی زبان سے مختلف ہے۔ ان کی روایات اور زاویہ ہائے نگاہ مختلف ہیں۔ انگلستان میں حالاں کہ مختلف فرقوں یا کلیساؤں کی نسبت سے مختلف مذاہب کا وجود ہے لیکن اس کے باوجود کردار و رَوِش کا عام طور پر ایک ہی معیار ہے جس سے لوگ کافی حد تک قومی زندگی میں وحدت کا رنگ پیدا کر لیتے ہیں۔ یہ اتحاد گو ظاہری سہی لیکن پھر بھی اس ظاہری وحدت سے لوگوں کو ایک رشتہ میں منسلک کرنے اور دوسرے لوگوں یا اقوام سے ممیّز ہونے میں مدد ملتی ہے۔

سرمایہ اور محنت:

یہ کہا جا سکتا ہے کہ سرمایہ اور محنت میں معاشی خلیج دن بہ دن وسیع ہوتی جا رہی ہے جو دولت منداشخاص اور عامۃالناس میں حقیقی فرق کے مترادف ہے۔ یہ بات صحیح ہے لیکن اس فرق کے اثرات کو مبالغہ کے ساتھ نہیں بیان کرنا چاہیے۔ کیوں کہ وہاں سرمایہ منظم ہے اور محنت بھی منظم ہے اور حکومت کے توسط سے ان دونوں میں ربط و اتصال اور آپس کے تصفیوں کے لیے راستے مقرر ہیں۔ علاوہ ازیں ملک کی معاشی زندگی میں دونوں جماعتوں کو ایک دوسرے سے اتصال قائم کرنے کے متعدد مواقع حاصل ہیں لیکن اس کے باوجود لوگوں کی معاملہ فہمی کی وجہ سے ان دونوں میں کوئی ایسا تفرقہ نہ پڑ سکا جس سے قومی زندگی میں انتشار پیدا ہو جاتا۔ ساتھ ہی قوم کے ایک طبقہ کے معاشی مطالبات کو دوسرے سے تسلیم کرانے میں تجارتی انجمنوں[324]، قومی کونسلوں[325] اور اس قسم کے دیگر ادارات سے بڑی مدد ملتی ہے۔ یہ صورتِ حال اس خلیج سے بہت مختلف ہے جو ہندوستان میں مثال کے طور پر وہابی جماعت * کے مسلمانوں کو دوسرے فرقوں کے مسلمانوں سے یا ہندوؤں * یا جینوں * سے علیحدہ کرتی ہے یا جو خلیج ہمارے دولت مند لوگوں اور کاشت کاروں کے درمیان حائل ہے۔

ذات پات:

یہ کہا گیا ہے کہ ہندوستان میں ذات پات کا جو طریقہ رائج ہے وہ ہندوستان کے لیے مخصوص نہیں ہے اور یہ کہ انگلستان میں اونچے طبقات اور کام کرنے والے طبقات میں حقیقی معنوں میں ذات پات کے خیالات پائے جاتے ہیں۔ میں نہیں سمجھتا ہوں کہ یہ بیان اتنا واضح ہے جتنا کہ اس قسم کے ایک عام اور وسیع بیان کو ہونا چاہیے۔ یہ سچ ہے کہ ایک زمانے میں جاگیر داروں اور عام لوگوں میں ایک دوسرے سے الگ تھلگ رہنے کا خیال ضرور موجود تھا لیکن اس خیال کا کبھی صریح طور پر اظہار نہیں ہوا اور ان دونوں میں ہمیشہ میل جول ہوتا رہا۔ اکثر غریب لوگ مال دار بن گئے اور انھوں نے جائیدادیں خرید لیں گو ابتدا میں جاگیر داروں کے خاندانوں کے نزدیک اُن کی خاندانی وجاہت مشتبہ ہی رہی لیکن ایک دو پشت گذرنے کے بعد حالات بدل گئے اور دونوں میں کوئی خاص فرق باقی نہیں رہا۔ اس طرح انگلستان کے موروثی امرا بھی اکثر بیش تر معمولی خاندانوں سے منتخب کیے گئے ہیں اور یہ کہا جا سکتا ہے کہ فی زمانہ دارالامرا[326] کے اکثر اراکین کا تعلق ایسے خاندانوں سے ہے جنھوں نے حال حال میں یا گزشتہ دو تین صدیوں میں ترقی کی ہے۔

جامعاتی طبقہ:

برطانیۂ عظمیٰ میں جامعاتی تعلیم والوں کا کوئی گروہ یا طبقہ نہیں ہے۔ لیکن اُنیسویں صدی کے وسط یا شاید اُس سے کچھ بعد تک پبلک اسکول[327] کے تعلیم یافتہ لوگوں کا ایک سماجی طبقہ تھا جس کو ملک میں تھوڑی بہت اہمیت حاصل تھی۔ برطانوی تعلیم میں اس طبقہ کا قبضہ جاری رہا۔ لیکن حال حال میں قدیم ترین پبلک اسکولوں کو بھی جدید تعلیم کی اسکیم میں شریک کیا گیا ہے اور طبقہ داری امتیازات بتدریج زائل ہوتے جا رہے ہیں۔ اکثر جدید پبلک اسکول حالیہ پیداوار ہیں اور اُن کی حیثیت، ایٹن[328]، ہیارو[329] یا ونچسٹر[330] جیسے اسکولوں سے بالکل مختلف ہے۔ اس طرح اکسفورڈ[331] اور کیمبرج[332] کی دونوں قدیم جامعات جو اونچے طبقات کے لیے مخصوص سمجھی جاتی ہیں اب برطانوی تعلیم کی عام اسکیم کے تحت ہیں۔ ان جامعات میں اب عوام کے اکثر لڑکے تعلیمی وظائف اور امداد کے ذریعہ شریک کیے جاتے ہیں۔ ان میں سے بعض تو دیہات کے معمولی بورڈ اسکولوں سے بھی آتے ہیں۔ اکسفورڈ میں تو ایک ایسا کالج ہے، رسکن کالج[333] جو خاص طور پر مزدور پیشہ طبقات کی تعلیم کے لیے مخصوص ہے۔ اس قسم کی بہت سی جدید جامعات ہیں جو جدید خیالات کی حامی ہیں اور جہاں ادنیٰ، متوسط اور مزدور پیشہ طبقات کے مرد اور عورتوں کی بڑی تعداد شریک ہے۔

سیاسی جماعتیں:

یہ کہا جا سکتا ہے کہ سیاسی جماعتیں خاص گروہوں میں منقسم ہیں جو سماجی زندگی میں رخنے ڈالتے ہیں۔ ایسا شاید ایک صدی قبل ممکن تھا لیکن آج کل نہیں ہے۔ قدیم ٹوری[334] اور وِگ[335] جماعتیں ناپید ہو گئی ہیں البتہ کبھی کبھار ان کے نام سنے جاتے ہیں۔ جدید جماعتیں خود کشمکش کی حالت میں ہیں۔ ہر عام انتخاب کے وقت ہمیشہ ایک دو جماعتوں میں اُلٹ پھیر ہوتی ہے اور نئی جماعتیں معرضِ وجود میں آتی رہتی ہیں۔ ایسی کوئی جماعت نہیں جسے قائم کہا جا سکے یا ایسی جو ایک ہی تعداد یا طبقۂ اشخاص کے لیے مخصوص ہو۔ ایواناتِ قانونی میں کتنی بھی جماعتیں ہوں لیکن یہ امر خوش آئند ہے کہ خارجی پالیسی یا ایسے معاملات جن میں ملکی مفاد بحیثیتِ مجموعی کسی دوسرے ملک کے مفاد کے مغائر ہو تو عام طور پر آپس میں سمجھوتہ کر لیا جاتا ہے جس کے بعد تمام جماعتیں حکومت کی تائید کرتی ہیں جو فی الوقت قوم کی نمائندہ سمجھی جاتی ہے۔ اس طرح پارلیمنٹ[336] میں بھی خاص روایات ہیں جو حکومتِ وقت اور حزب الاختلاف کے تعلقات کو معین کرتے ہیں۔ ہر حزب الاختلاف اس امر سے واقف ہے کہ کسی دن اسے بھی حکومتی ذمہ داریوں اور عہدوں سے دوچار ہونا پڑے گا لہٰذا داخلی سیاسیات کے اختلافی امور میں کتنی بھی سخت مخالفت کر لیں لیکن وہاں آپس میں مل کر کام کرنے کا جذبہ ضرور پایا جاتا ہے۔

پبلک زندگی:

بحیثیتِ مجموعی انگلستان کی پبلک زندگی کی پاکیزگی سے میں بہت متاثر ہوں کبھی کبھار رشوت ستانی کے قصے بھی سنے جاتے ہیں جو عموماً قصبہ کی کونسلوں یا معمولی انتظامی ادارات میں پیدا ہوتے ہیں۔ لیکن انگلستان کی ستائش میں میں یہ کہہ سکتا ہوں کہ وہاں پبلک زندگی کا عام رجحان اکثر ممالک کے بہ نسبت جن سے میں واقف ہوں، پاکیزگی کی طرف بہت زیادہ مائل ہے۔ ہر شخص جانتا ہے کہ مسٹر بالڈون* ایک بے داغ کردار کے مالک مشہور ہیں جو نہ صرف ذاتی و خانگی اغراض و مفاد سے بالاتر ہیں بلکہ جماعتی اغراض و مفادات بھی یا اُن شاطرانہ اغراض و مفاد سے جو ادنیٰ ذہنیت کے سیاست دانوں میں پائے جاتے ہیں۔ لیکن اُن کے جیسے وہاں بیسیوں آدمی ہیں۔ اس سلسلہ میں یہ واقعہ قابلِ ذکر ہے کہ ایک مستقل و اعلیٰ ترین عہدہ دار نے ایک کمپنی سے کچھ ایسی مفاہمت کر لی تھی کہ ملازمت سے سبک دوش ہونے کے بعد کمپنی میں اُسے بڑی خدمت مل جائے۔ لیکن جب مسٹر بالڈون کو اس کا علم ہوا تو بڑی حکمت اور تدبیر سے اُنھوں نے اس ملازم سرکار کے کردار کی مذمّت کی اور اس عہدیدار کو اپنی ملازمت سے دست بردار ہونا پڑا۔ اس معاملہ میں رائے عامہ نے مسٹر بالڈون کی کامل تائید کی۔ اس طرح جنگِ عظیم کے وقت مسٹر آسٹن چمبرلین* آنجہانی نے

اپنی وزارتِ ہند کے زمانہ میں جنگ کی بعض بدانتظامیوں کی ذمہ داری اپنے سر لے لی حالاں کہ ذاتی طور پر وہ کس طرح ذمہ دار نہیں قرار دیے جا سکتے تھے۔ انھوں نے محسوس کیا کہ اگر کوئی خرابی ہوئی ہے تو بحیثیتِ افسرِ اعلیٰ اُس کی ذمہ داری اور نتائج انھیں قبول کرنے ہوں گے لہٰذا وہ مستعفی ہو گئے۔ چوں کہ اس معاملہ میں وہ بالکل بے قصور تھے لہٰذا اس استعفیٰ سے اُن کی آئندہ زندگی پر کوئی اثر نہیں پڑا بلکہ اُس سے پبلک زندگی کے اس اُصول کی تائید ہوئی کہ ہر افسرِ اعلیٰ اُن نتائج کا ذمہ دار رہے گا جو اُس کے دورِ انتظام میں کسی خرابی کی وجہ سے پیدا ہوں۔ اس سے ظاہر ہے کہ انگلستان میں ملازمینِ سرکار کا معیارِ کردار کتنا بلند ہے۔ مسٹر گلاڈ سٹن* کے زمانہ کا بھی ایک واقعہ ہے کہ کسی جماعت کے ایک لیڈر سے جو مسٹر گلاڈ سٹن کی لبرل جماعت سے اشتراکِ عمل کیے ہوئی تھی، کوئی اخلاقی جرم سرزد ہونے پر مسٹر گلاڈ سٹن نے اس لیڈر کے مستعفی ہونے پر اصرار کیا تھا۔ شاہ ایڈ ورڈ* کی دست برداری کے حالیہ واقعہ کے وقت ایک ایسے معاملہ میں جس میں برطانوی اخلاقی معیارات کا امتحان تھا مسٹر بالڈون نے جس تدبّر، بردباری اور ثابت قدمی کا ثبوت دیا اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ برطانوی قوم اپنی اعلیٰ ترین روایات کو برقرار رکھنے میں کس طرح بلا فرقِ مراتب متحد ہو سکتی ہے۔

رائے عامہ:

یہ سب اس لیے ممکن ہے کہ وہاں ایک مضبوط اور بیدار رائے عامہ موجود ہے۔ اس کا یقیناً امکان ہے کہ ایسی چیزوں میں رائے عامہ سے غلطی ہو جائے جن میں کسی شخص کا ذاتی کردار عامۃ الناس کے خیالات کے مغائر ہو لیکن میرے خیال میں برطانوی رائے نامہ کی اصابت نے اکثر نازک موقعوں پر برطانیہ عظمیٰ کی دست گیری کی اور اسے خطرات سے بچایا ہے۔

رائے عامہ کی اس طاقت کی وجہ سے برطانوی اخبارات بھی سیدھے رہتے ہیں۔ میں یہ نہیں کہتا کہ وہ کبھی ذوقِ سلیم کو دھکا نہیں پہنچاتے لیکن میں یہ ضرور کہوں گا کہ تمام اچھے اخبارات تنقیدِ عامہ کے اعلیٰ ترین معیارات کو پیشِ نظر رکھتے ہیں اور اپنے آپ کو کبھی اتنا نہیں گرا لیتے کہ ذاتیات کے رکیک حربوں کے اختیار کرنے یا ایسے طریقوں پر عمل پیرا ہونے کا الزام اُن پر عائد کیا جا سکے جو مفادِ عامہ کے لیے مضرت رساں ہوں۔

گھریلو زندگی:

مشرق میں عام طور پر یہ سمجھا جاتا ہے کہ ہندوستانی گھریلو زندگی کے مقابلہ میں برطانوی زندگی کچھ اچھی نہیں۔ اگر اُس کے یہ معنی ہیں کہ ہندوستان کی طرح خاندان آپس میں ایک دوسرے سے مل کر نہیں رہتے ہیں تو یہ صحیح

ہے۔ لیکن میں سمجھتا ہوں کہ خاندان کی برطانوی تعریف جو شوہر، بیوی اور کمسن بچوں پر مشتمل ہے، اچھی تعریف ہے اس سے ہر فرد کو اپنی انفرادیت کے نشو و نما دینے کا موقع ملتا ہے۔ جوان لڑکے اور لڑکیاں شادی کے بعد اپنا جینا الگ کر لیتے ہیں۔ اس کے یہ معنی نہیں کہ وہ اپنے والدین یا قریبی رشتہ داروں سے بالکل بے تعلق ہو جاتے ہیں بلکہ اُس کے یہ معنی ہیں کہ اُنہیں اپنے انفرادی ذوق و دلچسپی کو اپنے طور پر ترقی دینے کا بہت اچھا موقع ملتا ہے۔ اکثر خاندانوں کے جوان سال لڑکے اور لڑکیاں آسٹریلیا*، جنوبی افریقہ*، کینڈا* اور برطانوی شہنشاہیت کے دیگر علاقوں* میں بس گئے ہیں۔ کچھ دنوں کے لیے ممکن ہے یہ لوگ بے تعلق سے ہو جائیں لیکن بعد میں خود اُن کی آزاد زندگی انھیں اپنے خاندان اور عزیزوں کی محبت بھری یاد تازہ رکھنے اور نسلاً بعد نسل اس تعلق کو برقرار رکھنے میں معاون ثابت ہوتی ہے۔ ظاہر ہے کہ یہ بات کبھی پیدا نہ ہوتی اگر تمام لوگ ایک ہی جگہ گتھے رہتے اور ہر بزرگ خاندان کی تبدیلی کے وقت خاندانی معاملات میں جھگڑے اور فساد کی صورتیں رونما ہوتی رہتیں۔ انگلستان اور ہندوستان کے صنفی معیار بھی ایک دوسرے سے مختلف ہیں۔ لیکن میں تجربہ کی بنا پر یہ کہہ سکتا ہوں کہ میں نے انگلستان کے معیارِ اخلاق کو ہندوستان کے مقابلہ میں کسی طرح گرا ہوا نہیں پایا بلکہ میں سمجھتا ہوں حقیقتِ حال اس کے برعکس ہے۔

رائے سری کشن:

رائے سری کشن بیرسٹر حیدرآباد کے ایک مسلّمہ سیاسی لیڈر، ملک و مالک کے سچے بہی خواہ اور ہمدرد، اپنی بے لوث زندگی اور خلوص کی وجہ سے ملک میں بے حد مشہور و ہر دل عزیز ہیں۔ ہریجنوں[337] کی فلاح و بہبود اور اُن کی ترقی کے لیے آپ ایک زمانہ سے کوشاں ہیں اور اس خصوص میں آپ کی خدمات ملک میں انتہائی قدر کی نگاہوں سے دیکھی جاتی ہیں۔ آپ کا شمار حیدرآباد کے چوٹی کے بیرسٹروں[338] میں ہے۔

آپ کا قیام انگلستان میں ۱۹۰۸ء تا ۱۹۱۰ء رہا۔ ۱۹۲۰ء میں بھی سیاحت کی غرض سے آپ یورپ تشریف لے گئے تھے۔

یورپ کی مادی ترقی:

میرے اس سوال پر کہ اہلِ یورپ کی زندگی میں کون سی چیزیں جاذبِ نظر اور اُن کی ترقی کا باعث ہیں، رائے سری کشن بیرسٹر نے فرمایا کہ یورپ کی سب سے نمایاں خصوصیت اُس کی مادی ترقی ہے جس کا انحصار اہلِ یورپ کی محنت اور حوصلہ مندی پر ہے۔ محنت میں وہ تمام خصوصیات داخل ہیں جن پر لفظ کاہلی کا اطلاق نہیں ہوتا۔ عمل دراصل،

ان کی زندگی کا اصلِ اصول ہے۔ حوصلہ مندی سے مراد کسی کام کو جوش اور یقین کے ساتھ کرنا ہے خواہ اس میں دوسرے کتنی ہی نکتہ چینی کریں۔ حقیقت یہ ہے کہ دنیا میں قوموں کی ترقی ان ہی دو چیزوں کی بدولت ہے اور ان کے نہ ہونے سے قومیں ترقی سے محروم بھی ہو جاتی ہیں۔

قابلِ تقلید خصوصیات:

جب میں نے یہ دریافت کیا کہ ہمارے لیے یورپ کی کون سی چیزیں قابلِ تقلید ہیں آپ نے فرمایا کہ ہمیں کسی قسم کی تقلید کی ضرورت نہیں۔ ہمارے مذہب، ہماری تہذیب اور ہمارے تمدّن میں ترقی کے سب امکانات موجود ہیں۔ مشرقی اقوام کی ترقی دیگر اقوام کے لیے ہمیشہ سرمایۂ بصیرت رہی ہے۔ کسی قوم یا تمدّن کی تقلید کرنے میں بڑی قباحتیں ہیں۔ ایک معمولی مثال سے اس کی یوں توضیح ہو سکتی ہے: ہندو گھرانوں میں چوکھوں[339] میں کھانے کا رواج ہے۔ روزانہ کھانے کے مقام کی صفائی ہوتی ہے، ہر شخص صبح اشنان کرتا ہے اور ایک خاص طریقہ پر کھانا کھایا جاتا ہے۔ لیکن اگر اس کو چھوڑ کر میز کرسی پر کانٹے سے کھانے کا طریقہ اختیار کیا جائے تو پرانے رسوم اور دستور کی اہمیت اور عظمت دلوں میں باقی نہیں رہ سکتی اور اُن کو چھوڑنا ضروری ہے۔ اس کھانے ہی کی مثال کو اور واضح کیا جائے تو معلوم ہو گا کہ قدیم طریقہ کتنا سہل، سستا اور آرام دہ تھا۔ مغربی طرز کے کھانوں کا اہتمام ہی جداگانہ ہوتا ہے۔ میز کرسی ہے، کانٹا چھری ہے، سامانِ خورد نوش ہے، پکوان ہے، بٹلر[340] ہے، کمرہ ہے، کھانے کا طرز ہے، غرض بیسیوں نئی چیزیں ہیں۔

تیس، چالیس سال قبل حیدرآباد میں صرف دو چار ہی لوگ مغربی تہذیب کے دل دادہ تھے۔ اُس زمانہ کا ایک مغربی طرز کا ڈنر خصوصیت سے قابلِ ذکر ہے جس میں حیدرآباد کے تقریباً تمام سربرآوردہ لوگ شریک تھے جن میں سے اکثر کانٹے چھری کے استعمال ہی سے ناواقف تھے۔ میز پر ہر شخص اپنے برابر والے کی نقالی کر رہا تھا۔ اتفاق سے ایک صاحب گھبراہٹ میں کسی چیز کو کانٹے سے کھانے کی بجائے چھری سے کھا گئے اور اُن کے ہونٹوں پر چھری کا چرکا لگ گیا اور خون نکلنے لگا، ایک ہنسی ہو گئی۔ غرض دوسروں کی تقلید کرنے میں نہ صرف اپنی بہت سی چیزوں کو چھوڑنا پڑتا ہے بلکہ تقلید بھی ادھوری رہ جاتی ہے۔ ہر قوم کے رسوم اس قوم کے تمدّن، معیارِ زندگی اور روایات کی مناسبت سے ہوا کرتے ہیں جن کو چھوڑنے کے یہ معنی ہیں کہ قومی وقار اور روایات کو صدمہ پہنچایا جائے۔

تقلید کی توضیح ایک اور مثال سے ہو سکتی ہے۔ آج کل ہمارے پاس یورپ کے اتباع میں اہم تقاریب میں کالے کپڑے پہننے کا رواج ہے۔ درباری لباس، عدالتی لباس، ڈنر یا دعورتوں کا لباس، مدارس اور کالجوں میں طلبا و طالبات کا

لباس کالا ہے۔اس سیاہ پوشی کی غایت معلوم کرنے کے قبل ہمیں یہ دیکھنا چاہیے کہ انگلستان میں آخر اس کا رواج کیوں ہوا؟ یہ ایک مسلّمہ بات ہے کہ ہر قوم کے لباس پر اس ملک کے تمدّن، رسم ورواج اور آب وہوا کا اثر پڑتا ہے۔ انگلستان ایک سرد ملک ہے، وہاں فضا، ہمیشہ کہر آلود اور گرنیوں[341] کے دھویں سے ہوا مکدّر رہتی ہے۔ ظاہر ہے کہ ایسے ملک میں سفید کپڑے جلد میلے ہو جاتے ہیں، اس طرح وہاں سیاہ کپڑوں کا پہننا فیشن نہیں ضرورت ہے۔ پھر ہندوستان میں اس کی کیا ضرورت ہو سکتی ہے، اس کا جواب آسان ہے۔ یہ حاکم قوم کی ایسی تقلید ہے جس میں خود حاکم قوم کا فائدہ ہے۔ کیوں کہ انگلستان کے کارخانوں کی رونق اسی میں ہے۔اب ہم اس تقلید کے دوسرے پہلو پر نظر ڈال کر دیکھیں گے کہ اس میں ہمارا کیا نقصان ہے۔ سب سے پہلے یہ کہ ہمارا قدیم درباری، عدالتی یا تقاریب کا لباس ختم ہو گیا۔ جس کے یہ معنی ہیں کہ اس کے ساتھ اور بہت سی چیزوں کا خاتمہ ہو گیا۔ جس طرح ہندوستان کی وجہ سے آج یورپ کی گرنیوں کی رونق ہے اسی طرح کسی زمانہ میں ہمارے جلاہوں کے گھر میں اُجالا تھا، اُن کا روزگار جاتا رہا۔ وہ یورپ کے جیسا کپڑا بنا نہیں سکتے اور ہم باہر سے خریدنے پر مجبور ہیں۔ اگر ملک میں یہ کپڑا تیار بھی ہونے لگے تو ہم باہر کے کپڑے سے مسابقت نہیں کر سکتے۔ وہاں کے کارخانے صدیوں سے قائم ہیں، اُن کا میعارِ کار کردگی بڑھا ہوا ہے اُور ان کا تجربہ وسیع ہے۔ غرض اُن کا مقابلہ ہر لحاظ سے ہمارے لیے مشکل ہے اور معاشی و معاشرتی ہر مصیبت سے ہم خسارہ میں رہے۔

آزادیٔ نسواں:

آزادیٔ نسواں* کے متعلق رائے سری کشن بیرسٹر کے خاص خیالات ہیں۔آپ ہندوستان میں آزادیٔ نسواں کی تحریک کے، جو یورپ کی اتّباع میں ہو، حامی نہیں ہیں۔ کیوں کہ ہمارا ماحول، حالات اور روایات مختلف ہیں اور یورپ کے تمدنی، سماجی اور معاشی تصورات ہم سے بالکل جداگانہ ہیں۔ یورپ کی عورتوں کی موجودہ سیاسی، سماجی اور معاشی حیثیت نتیجہ ہے صدیوں کے ارتقا کا۔ وہاں پر یہ تحریک دراصل معاشی کشمکش کی پیداوار ہے۔ انگلستان میں بلحاظ آبادی مردوں اور عورتوں کا تناسب ۴:۱ ہے۔ اور قانوناً صرف ایک عورت سے شادی کی جا سکتی ہے۔ گویا تین عورتیں بے سہارا رہ گئیں جن کے لے بجز کسبِ معیشت کے کوئی چارہ نہیں اور سوسائٹی میں اپنی عزت اور وقار قائم رکھنے کے لیے انھیں اپنے پیروں پر کھڑا ہونا ضروری ہے۔ اس طرح جب مرد اور عورت میں معاشی یکسانیت پیدا ہو جائے تو حقوق کا سوال پیدا ہونا ایک فطری امر ہے عورتوں کو حق رائے دہی حاصل ہونے کی بڑی وجہ یہی ہے اور یہ اس مشہور سیاسی ضرب المثل کے مطابق بھی ہے کہ بغیر نمائندگی، محصول عائد نہیں کیا جا سکتا۔ لیکن ہندوستان میں نہ عورتیں معاشی حیثیت سے مرد کے برابر ہیں اُور نہ ان کو رائے کی ضرورت ہے۔ محض اس لیے کہ انگلستان کی عورتوں کو حقِ رائے

حاصل ہے، ان کو بھی ہونا چاہیے، ایک خام خیالی ہے۔ اس میں شک نہیں کہ ہماری عورتوں کو ترقی کی بڑی ضرورت ہے لیکن یہ ترقی ہمارے اپنے ماحول، ہمارے اپنے حالات، روایات اور خصوصیات قومی کے تابع ہوگی۔ ہماری عورتوں کو یورپ کی عورتوں کے نقشِ قدم پر چلنے کی کوئی ضرورت نہیں۔ ایک مثال سے اس کی یوں توضیح ہوسکتی ہے۔

انسانی زندگی کے دو پہلو ہیں جو ساتھ ساتھ چلتے ہیں اور یہ ایک دوسرے کے لیے لازم وملزوم ہیں۔ تکلیف اور راحت، نشیب وفراز، تاریکی اور روشنی اور انسان کے پیشِ نظر ہمیشہ تاریک پہلو رہتا ہے کیوں کہ اس میں اس کی آزمائش ہے۔ ہماری سوسائٹی میں عملی تربیت کے سلسلہ میں جس چیز پر سب سے زیادہ زور دیا جاتا ہے، وہ یہ ہے کہ انسان تکلیف میں ثابت قدم رہے۔ والدین اولاد کو، استاد شاگرد کو اور پیشوایانِ قوم اپنی قوم کو اسی کی تلقین کرتے ہیں اور یہ چیز ہماری تربیت کا ایک اصلِ اصول بن گئی ہے۔ اس معاملہ میں ہماری عورتیں مردوں سے زیادہ صبر واستقلال، تحمّل، بردباری اور تکلیف سہنے میں بڑھی ہوئی ہیں۔ عورت کے متعلق ہمارا یہ تصور ہے کہ وہ تکلیف کے لیے بنائی گئی ہے اور جب بچپن ہی سے یہ چیز اُس کے ذہن نشین کرائی جائے تو اُس میں لازماً سادگی، کفایت شعاری اور سگھڑپن کی عادتیں پیدا ہونی چاہیں۔ اب عورت کی اس زندگی کو پیشِ نظر رکھ کر ہم دیکھیں گے کہ موجودہ زمانہ میں یہ خصوصیات کہاں تک برقرار رہتی ہیں۔ ہمارے مدارس کی طالبات دن بہ دن اسراف کی طرف مائل ہوتی جارہی ہیں۔ پڑھائی سے زیادہ انھیں فیشن، آرائش، کپڑوں، ٹائلٹ اور جیب خرچ کا خیال ہے۔ آئے دن مدارس میں کچھ نہ کچھ تقاریب ہوتی رہتی ہیں اور لڑکیوں سے چندے وصول کیے جاتے ہیں۔ غریب سے غریب گھرانے کی لڑکی کو اپنا وقار قائم رکھنے کے لیے ان کھیل تماشوں میں شریک ہونا پڑتا ہے۔ اگر آئندہ زندگی میں اُنھیں ایک عیش پسند زندگی میّسر نہ آئے، جس کے وہ آئے دن خواب دیکھا کرتی ہیں تو پھر ان کی گزر بسر کیسے ہو۔ کیا وہ چوری کریں یا فاحشہ پن۔ کیا وہ غیر محسوس طور پر تباہی کے تاریک گڑھوں کی طرف نہیں دھکیلی جارہی ہیں۔ اگر ہماری لڑکیاں تکلیف کے لیے تیار کی جائیں اور عملی زندگی میں انہیں راحت سے سابقہ پڑے تو کیا یہ سونے پر سہاگہ نہیں ہے۔ دولت کی خیرگی سے وہ اندھی نہیں ہوسکتیں اور اپنی مصیبت زدہ بہنوں کا خیال اُن کے دل سے دُور نہیں ہوسکتا۔

اگر یورپ کی عورتوں کے نقشِ قدم پر چل کر آزادی حاصل کی جائے تو یہ آزادی کہاں رہی۔ آزادی تو ہر قسم کی قید وبند سے آزادی کا نام ہے۔ ایک اور خرابی ہماری سوسائٹی میں پیدا ہو رہی ہے۔ وہ یہ کہ مغربی تعلیم اور تمدنی اثرات کی وجہ سے ہمارے مردوں کی ذہنیتوں میں تبدیلی پیدا ہوگئی ہے۔ قدیم طرز کی مشرقی عورتیں اب اُن کے معیار پر پوری نہیں اُترتی ہیں اور مرد ان کو کسی طرح اپنے معیار پر لانا چاہتے ہیں۔ یہ آئے دن کا مظاہرہ ہے کہ کسی طرح

ہماری عورتیں باوجود مغربی تعلیم اور تمدنی اثرات سے براہِ راست کوئی تعلق نہ رکھنے کے، غیر محسوس طور پر مغربی اثرات کو قبول کرتی جارہی ہیں جس کی ذمہ داری بڑی حد تک مردوں پر عائد ہوتی ہے۔

ہماری سوسائٹی میں بہت سی ایسی مثالیں ملیں گی کہ شادی کے بعد عورتوں نے مردوں کے اصرار پر پردے کو خیر باد کہہ دیا اور باہر نکلنے کے بعد وہ فیشن کی دل دادہ بن گئیں کیوں کہ اس کے بغیر وہ سوسائٹی میں گھل مل نہیں سکتیں۔اُن کے اخراجات بڑھ گئے،اُن میں اسراف پیدا ہو گیا۔اگر اس کے بعد مرد اپنی بیوی پر کچھ قیود اور پابندیاں عائد کرنا چاہے یا اس کے اسراف کو روکنے کی کوشش کرے تو یہ ناممکن ہے۔اس کی ایسی ہی مثال ہے جیسے ببول[342] کا بیج بو کر آم کی توقع رکھنا۔ہر عمل نیت کے ساتھ ہے۔الاعمال بالنیۃ[343]۔جو شخص جس نیت سے کام کرے گا اس کو ویسا ہی پھل ملے گا۔

تعددِ ازدواج:*

اُوپر بتلایا گیا ہے کہ یورپ میں قانوناً صرف ایک عورت سے شادی کی جاسکتی ہے اور بلحاظ آبادی، مرد اور عورت کا تناسب ایک اور چار ہے۔جب چار میں سے تین عورتوں کا بیاہ نہ ہو سکے تو لازماً سوسائٹی میں جنسی بے راہ روی کا پیدا ہو جانا ایک فطری امر ہے اور اُس کا سدِ باب اُس وقت تک مشکل ہے جب تک کہ وحدتِ ازواج[344] کے قانون میں ترمیم نہ کی جائے۔اسلام میں چار بیویوں کی جو اجازت دی گئی ہے اُس کی یہی وجہ معلوم ہوتی ہے کہ اس قسم کی شدید صورت حال کا مقابلہ کیا جائے۔ہر قوم اور ملک کے تصورات اس ملک کے حالات کے مطابق ہوا کرتے ہیں اور مصلحانِ قوم یا حکومت اُن ہی حالات کو پیش نظر رکھ کر آئین و اصول مدوّن کرتی ہے۔ایّامِ جاہلیّت میں عرَب میں عورت کی کوئی قانونی حیثیت نہیں تھی اور وہ خرید و فروخت کی چیز تھی۔حضرت محمد صلعم نے اُنھیں ایک حیثیت عطا کی، مردوں کو جن کی بیویوں کی تعداد غیر معیّن ہوا کرتی تھی' ایک بیوی سے شادی کرنے کے لیے کہا گیا اور خاص حالات میں چار بیویوں تک کی اجازت دی گئی کیوں کہ عربوں کے حالات کا لحاظ کرتے ہوئے وہاں اس امر کی ضرورت تھی کہ اُنھیں ایک بیوی سے پابند کر دیا جاتا۔لیکن جس ملک کے حالات ایسے نہ ہوں وہاں اس قسم کے قانون کے نفاذ کی ضرورت بھی نہیں ہے۔انگلستان میں ایسے قانون کی ضرورت ہے مگر وہاں تعددِ ازدواج کی ممانعت ہے اور عملاً سوسائٹی میں یہ چیز موجود ہے۔

مشرقی عورت:

ہندوستان میں عورت اور مرد میں کسی قسم کی معاشی کشمکش کا سوال پیدا نہیں ہوتا۔ دھرم شاستر[345] کی رُو سے شوہر وزوجہ ایک روحانی وابدی رشتہ میں منسلک ہوتے ہیں، شادی ایک مذہبی سنس کار[346] ہے، ایسی صورت میں ظاہر ہے کہ شوہر کو اپنی زوجہ کی تمام ضرورتوں اور آسائشوں کا خیال رکھنا پڑتا ہے۔ بحیثیت استری[347] وہ گھر کی مالکہ ہے، گھر کا سارا کاروبار اور سارا انتظام اس کو تفویض ہے، اُس کا سوامی[348] اُس کی جملہ[349] ضرورتوں کو پورا کرتا ہے، اُس کے حقوق وفرائض متعین ہیں۔ اسلام میں بھی ایسا ہی ہے، عورتوں کو وراثت میں حق حاصل ہے، وہ جائیداد کی مالک بن سکتی ہے اور اپنے کاروبار کو بلاشرکت غیرے انجام دے سکتی ہے، یہ اور بات ہے کہ ان تمام چیزوں کے ہوتے ہوئے' ہماری عورتوں کے بہت سے حقوق مرد کے ہاتھوں پامال ہوتے ہیں، ان کی حق تلفیاں ہوتی ہیں لیکن وہ خاموش رہتی ہیں۔ یورپ کی حالت اس کے بالکل برعکس ہے، وہاں عورتوں کو اس قسم کے حقوق حاصل نہیں تھے، ان کے ساتھ سخت ظلم اور ناانصافیاں روا رکھی گئی تھیں، جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ تعلیم کی وسعت کے ساتھ ساتھ عورتیں حقوق کا مطالبہ کرنے لگیں، اُن کی ناگفتہ بہ حالت دیکھ کر اکثر مردوں کو بھی اُن سے ہمدردی پیدا ہو گئی، جوں ہی ملک میں موافق ماحول پیدا ہوا' عورتیں آزاد ہو گئیں۔ فرق صرف اتنا ہے کہ ہماری عورتوں کو پہلے ہی سے حقوق حاصل تھے اور وہاں ایسے حقوق حاصل نہیں تھے لہٰذا اُن کے حصول کی کوشش کی گئی۔

تعلیمی معاملات:

تعلیمی معاملات میں رائے سری کشن بیرسٹر کا خیال ہے کہ دنیا کے ہر ملک میں تعلیم کے بنیادی اُصول تقریباً ایک ہی ہیں جنھیں ہر قوم اپنے حالات، ماحول اور قومی ضروریات کے تحت اضافہ و ترمیم کر لیتی ہے۔ بدقسمتی سے ہمارے ملک میں جو تعلیمی طریقہ رائج ہے وہ ٹھیٹ انگریزی کی اتّباع میں ہے جس سے ہماری قومی ضروریات پوری نہیں ہوتیں۔ انگریزی تعلیم یا مغربی ادب سے استفادہ کرنے والے مارکسزم*، کمیونزم*، بالشویزم* اور اس قسم کے دیگر "ازم"[350] کی طرف مائل ہوتے ہیں۔ اگر ہندوستانی دماغ اس قسم کی تحریکات کی آماجگاہ بنیں جو یورپ میں بعض خاص حالات اور واقعات کے تحت پیدا ہوئی ہیں، تو ہندوستان کو اُن سے کس قسم کا فائدہ پہنچتا ہے؟ کیا ہندوستان میں ان تحریکات کو بھی کامیاب ثابت ہونا چاہیے؟ اور کیا ہمارے مختلف فیہ مسائل کا یہ صحیح حل ہو سکتی ہیں؟ اگر نہیں ہو سکتی ہیں تو پھر اُن کے پیچھے وقت ضائع کرنے کے کیا معنی ہیں؟ اس طرح شکسپیر*، ملٹن*، شیلے* اور بائرن *کی شاعری سے ہندوستانی طالب علم کو کیوں دلچسپی ہونے لگی۔ جب خود ہندوستان نے ایسے بلند پایہ شاعر اور فلسفی پیدا کیے جن پر

ہم رہتی دنیاتک فخر کر سکتے ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ مغربی تعلیم اور مغرب کی ہر چیز کی بنیاد اس خیال پر رکھی گئی ہے کہ مشرق کی ہر چیز بے کارِ محض ہے۔ مثال کے طور پر آپ مغربی طب ہی کو لیجیے جس کے سامنے ساری دُنیا کی طب فرسودہ ہو گئی ہ ہر ڈاکٹر اپنا یہ خوش گوار فرض سمجھتا ہے کہ وہ مشرقی طب کا جی کھول کر مضحکہ اُڑائے کیوں کہ جب تک یونانی علاج کی مذّمت نہ کی جائے، اُس کو روٹی نہیں مل سکتی۔

پیام:

نوجوانانِ ملک کے لیے رائے سری کشن بیرسٹر نے یہ پیام دیا ہے کہ وہ مغرب کی تقلید کرنا چھوڑ دیں۔ تقلید صرف اُن لوگوں کے لیے سزاوار ہے جو تہذیب و تمدّن میں تہی داماں ہوں، ہم لوگوں کو اس کی ضرورت نہیں ہے۔ ہمارے لیے مغرب کی تقلید نہ صرف مضر ہے بلکہ خود کشی کے مترادف ہے۔

ڈاکٹر محمد عبدالطیف سعید:

ڈاکٹر محمد عبدالطیف سعید۔ ایم۔ بی۔ سی۔ ایچ (اڈنبرا*) ملک کے ایک سچے بہی خواہ اور قومی لیڈر ہیں۔ ابتدا میں آپ سر رشتۂ طبابت' سرکارِ عالی میں سوّل سرجن تھے لیکن ۱۹۲۰ء میں اپنی خدمت سے مستعفی ہو کر آپ نے خانگی پریکٹس [351] شروع کی اور آج آپ ملک کے ایک مشہور مسلّمہ ڈاکٹر ہیں۔ آپ کا قیام انگلستان میں ۱۹۰۸ء تا ۱۹۱۵ء رہا۔

انگریزوں کی خصوصیات:

انگریزوں کی زندگی اور معاشرت میں سب سے زیادہ قابلِ قدر اُن کی راست بازی، فرض شناسی اور خانگی اور پبلک زندگی میں ضبط و نظم کا پایا جانا ہے۔ ایک انگریز کا گھر خوشی کا مسکن ہوتا ہے اور اُس کو بجا طور پر خانگی زندگی کا نمونہ کہا جا سکتا ہے۔

یورپین سوسائٹی کی اخلاقی کمزوریوں کے متعلق مشرق میں جو روایات مشہور ہیں وہ بالکل غیر صحیح ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ صنفی معاملات میں یورپ (اور انگلستان) کا اخلاقی معیار کس طرح دوسرے ممالک سے پست نہیں ہے۔ تعجب تو یہ ہے کہ باوجود ہر قسم کی آزادی کے وہاں پر بداخلاقی بہت کم ہے۔

مغرب کے متعلق ہمارا دوسرا خیال یہ ہے کہ وہ مادہ پرست [352] ہے اور روحانیت سے اُسے کوئی تعلق نہیں، یہ بھی صحیح نہیں ہے کیوں کہ روحانی زندگی کے متعلق اہلِ یورپ کا نقطۂ نظر ہم سے جداگانہ ہے۔ معاشری خدمت

گذاری، ایثار اور ہمدردی وہاں کی زندگی کے عام اُصول ہیں اور یہی وہ خصوصیات ہیں جن سے "سوسائٹی کی برائیاں "دُور ہوتی ہیں۔ یہ صحیح ہے کہ وہاں مذہب کا اتنا چرچا نہیں ہے اور لوگ اپنی مذہبیت کی نمائش بھی نہیں کرتے لیکن مذہب سے انسان میں جو خوبیاں پیدا ہو سکتی ہیں وہ اُن میں موجود ہیں۔

ہم میں سے اکثر لوگ جو یورپ جاتے ہیں وہ یورپین زندگی کی اصل روح کو محسوس نہیں کرتے۔ ہم محض صورت پر جاتے ہیں اور ہماری انتہا یہ ہوتی ہے کہ اہلِ یورپ کے ظاہری خط و خال کی نقالی کر لیں اور اس کا بھی حق ہم پوری طرح ادا نہیں کرتے۔

یورپ سے ہم ایک اچھا سبق سیکھ سکتے ہیں اور وہ متحد زندگی میں نظم اور باقاعدگی کا پیدا کرنا ہے تاکہ جلد از جلد زیادہ سے زیادہ تعداد کو زیادہ سے زیادہ فائدہ حاصل ہو سکے۔

مولوی سید حیدر رضا صاحب زیدی:

مولوی سید حیدر رضا صاحب زیدی۔ ایم۔ اے (آکسن*) بیرسٹر ایٹ لا، غالباً وہ پہلے ہندوستانی ہیں جو بالکل بے سروسامانی کے عالم میں انگلستان پہنچے اور محض اپنی قابلیت سے نہ صرف کھایا کمایا بلکہ اعلیٰ ترین تعلیم بھی حاصل کی اور اس کے بعد انگلستان ہی میں متوّطن ہو کر بیرسٹری شروع کر دی۔ اپنے تئیس سال کے طویل قیام میں آپ نے بہت غائر نظر سے یورپ کے حالات کا مطالعہ کیا ہے۔ انگلستان سے مراجعت کے بعد آپ نے حیدر آباد میں پریکٹس شروع کی ہے۔ آپ کا قیام یورپ و انگلستان میں ۱۹۰۹ء تا ۱۹۳۲ء رہا۔

حب الوطنی:

یورپ کی ترقی اور عروج کا راز حب الوطنی میں مضمر ہے اور یہ اندازہ کرنا مشکل ہے کہ اہلِ یورپ کو اپنے وطن سے کس درجہ محبت ہے، اس کی کوئی حد و انتہا نہیں۔ اہلِ یورپ اپنے مقابلہ میں دنیا کی کسی قوم کو عزت کی نگاہوں سے نہیں دیکھتے چناں چہ انگریز عام طور پر امریکہ*، کینیڈا* اور آسٹریلیا* کے باشندوں کو، جو اُن کے سگے بھائیوں کے برابر ہیں، حقیر سمجھتے ہیں اور اُن کا مضحکہ اُڑاتے ہیں۔

جذبہ خدمت گزاری:

ملک اور قوم کی خدمت کرنے کا اہلِ یورپ میں جو ولولہ پایا جاتا ہے وہ ہمارے یہاں ناپید ہے۔ یہاں ایثار کی

بہت کم مثالیں نظر سے گذرتی ہیں، انگلستان میں رشوت ستانی کا کہیں نام نہیں۔ معمولی جوانِ کوتوالی سے لے کر حکومت کے اعلیٰ ترین عہدہ داروں کا یہی حال ہے۔

جذبۂ حق پسندی:

جذبۂ حق پسندی میں بھی اہلِ یورپ کو ہمارے مقابلہ میں ایک امتیازی خصوصیت حاصل ہے۔ وہاں ہر شخص اپنے اور دوسروں کے معاملات میں حق اور انصاف کا حامی رہتا ہے۔

جذبۂ مساوات:

اہلِ یورپ آپس میں بلا تفریق ایک دوسرے سے مساویانہ برتاؤ کرتے ہیں۔ وہاں بڑے بڑے رؤسا یہ ثابت کرنے کی کوشش کرتے ہیں کہ وہ ادنیٰ طبقہ کے لوگوں سے کسی طرح برتر و بالا نہیں ہیں۔ لوگ خود غرض نہیں ہیں کسی ایجاد یا اختراع کو چھپا کر نہیں رکھا جاتا بلکہ اُس کو عام کر دیا جاتا ہے تاکہ ملک اور قوم کو اُس سے فائدہ پہنچے۔

معیارِ زندگی:

اہلِ یورپ کی زندگی دن اور رات کے چوبیس گھنٹوں میں گھڑی کی طرح پابند اور باقاعدہ ہے اور لوگوں میں فوجی قسم کی ترتیب اور باقاعدگی دیکھ کر حیرت ہوتی ہے۔ غرض انسان وہاں اپنے عمل میں مشین سے کم نہیں۔ اہلِ یورپ کی ضروریاتِ زندگی بہت بڑی ہوتی ہیں، کھانے اور کپڑے پر بہت روپیہ صرف ہوتا ہے اور اس کی ضرورت بھی ہے کیوں کہ ان کے بغیر سرد ممالک میں صحت اور توانائی برقرار نہیں رہ سکتی۔ اس اعلیٰ اور بلند معیارِ زندگی کی وجہ سے وہاں لوگوں کی تنخواہیں بھی زیادہ ہیں۔ چناں چہ لندن کے معمولی پولیس کے جوان کی تنخواہ چار پونڈ ہفتہ وار تقریباً دو سو پچاس روپیہ ماہانہ ہوتی ہے۔ وہاں ہر شخص روزانہ عادتاً ورزش کرتا ہے، شام میں عام طور پر لوگ ورزش کی خاطر میلوں پیدل چلتے ہیں اور ہفتہ اور اتوار کے دن تو جنگلوں اور پہاڑوں میں نکل جاتے ہیں۔

قانون کی پابندی:

انگلستان میں قانون کا جتنا احترام کیا جاتا ہے اتنا کسی دوسرے ملک میں نہیں کیا جاتا۔ قانون کی نظر میں امیر و غریب، حاکم و محکوم سب برابر ہیں اور کسی قسم کے اثر و سفارش کو دخل نہیں ہے۔ اس کی توضیح ذیل کے واقعات سے ہو سکتی ہے۔

لندن کے ایک خطاب یافتہ مددگار کوتوال[353] جب برسوں کی ملازمت کے بعد وظیفہ پا کر سبک دوش ہوئے

تو دوسرے ہی روز پولیس نے اُن کا چالان اس الزام میں کیا کہ ہائیڈ پارک[354] میں وہ ایک عورت کے ساتھ قابلِ اعتراض حالت میں پائے گئے۔ کسی قسم کے اثر و سفارش سے کام نہیں چلا اور عدالت نے سزائے جرمانہ صادر کر دی۔

اس طرح کینٹ کونسل[355] کے ایک مستقل معتمد[356] پر بھی پولیس نے اسی قسم کا الزام لگایا اور باوجود ان کے اثر اور رسوخ کے، مقدمہ معمولی طور پر چلا۔

انگلستان میں اس قسم کی بیسیوں مثالیں ملیں گی لیکن حقیقت یہ ہے کہ قانون کی یہ سختی اور غیر تغیر پذیری لوگوں کے لیے باعثِ تکلیف ہے۔ اگر کسی شریف آدمی سے اتفاقی طور پر کوئی جرم سرزد ہو جائے تو اس کے یہ معنی نہیں کہ اُسے سزا بھی دی جائے کیوں کہ ایسی صورت میں جرم کا اعلان ہی اُس کے لیے کافی سزا ہے۔

عورت:

مولوی حیدر رضا صاحب ذاتی طور پر عورتوں کی آزادی کے خلاف ہیں کیوں کہ اس سے عورتوں کے اخلاق پر بُرا اثر پڑتا ہے۔ یورپ میں عورتوں کی آزادی کا ادنیٰ مظاہرہ سمندری تفریح گاہوں پر نظر آتا ہے۔ جہاں پر ہزارہا عورتیں نہانے کا حیاسوز لباس پہنے ہوئے اپنے حسن اور رعنائیوں کی نمائش کرتی ہیں، ان عورتوں کی آنکھوں میں نسوانی شرم و حجاب کا شائبہ تک نہیں ہوتا۔ بسا اوقات اس عریاں لباس میں عورتیں بازار جاتی ہیں اور اس لباس میں بعض عورتوں کی شادیاں بھی ہوئی ہیں۔ لباس اس قدر چست ہوتا ہے کہ جسم کی ہر چیز آئینہ کی طرح نظر آتی ہے۔

مغربی عورتوں کی آزادی:

میرے اس سوال پر کہ مغربی عورتوں کی اس آزادی کی کیا وجہ ہو سکتی ہے۔ مولوی حیدر رضا صاحب نے فرمایا کہ اس کے کئی اسباب ہیں۔ سب سے پہلے عورتوں کا معاشی حیثیت سے اپنے پاؤں پر کھڑا رہنا ہے جس کی وجہ سے والدین کا ان پر کوئی اثر نہیں رہا۔ شہروں میں اکثر ملازم پیشہ عورتیں قصبوں اور دیہاتوں سے آتی ہیں، اُن کے ساتھ اُن کا کوئی سرپرست نہیں ہوتا اور وہ شہر کی دلچسپیوں میں کھو جاتی ہیں۔ بعض نوجوان لڑکیاں اپنے ضعیف والدین کی پرورش کے خیال سے ملازم ہو جاتی ہیں اور چوں کہ ملازمت بڑی مشکل سے ملتی ہے اس لیے اُنھیں مجبوراً اپنے بوالہوس آقاؤں کی ہر جائز و ناجائز خواہش پوری کرنی پڑتی ہے۔ ایک جرمن رئیس کے قول کے مطابق انگلستان اور امریکہ کی ہر دکان ایک حرم سرا[357] ہے۔

عورتوں کے اخلاق خراب ہونے کی ایک اور وجہ ریل، موٹر اور تیز گاڑیاں ہیں۔ غریب گھرانوں کی لڑکیاں عموماً موٹروں میں بیٹھنے کی بڑی شائق ہوتی ہیں۔ اس لیے اگر سرِراہ انھیں کسی موٹر میں مفت جگہ دی جائے تو اس کے

نتائج پر غور کیے بغیر وہ موٹروں میں سوار ہو جاتی ہیں اور موٹریں تفریح کے لحاظ سے اُنھیں دور لے کر نکل جاتی ہیں اور بعد میں اُنھیں معلوم ہوتا ہے کہ اس تفریح کی اُنھیں بڑی قیمت ادا کرنی پڑی۔ چند دن پہلے امریکہ کی بعض نا کتخدا لڑکیوں نے خود کشی کر لی تھی، جس کی پولیس نے اپنی تحقیقات میں یہ وجہ بتلائی کہ یہ حاملہ ہو گئی تھیں اور ایسے مردوں کے ساتھ اُن کی موٹروں میں تفریح کو جایا کرتی تھیں جن کے نام تک اُنھیں نہیں معلوم تھے۔ اس طرح اسقاطِ حمل، خفیہ زچگی یا عاشقی کرنے کے لیے بھی آج کل بڑی سہولتیں پیدا ہو گئی ہیں۔ عورتیں تفریح کے نام سے براعظم چلی جاتی ہیں اور کچھ دنوں بعد بغیر کسی بدنامی کے وطن واپس ہو جاتی ہیں۔

ناچنے سے بھی عورت اور مرد کے اختلاط کے زیادہ مواقع پیدا ہوتے ہیں۔ بس لمسِ جسمانی ہی میں اختلاط کی بہت سی منزلیں طے ہو جاتی ہیں۔

حقیقت یہ ہے کہ یورپ میں عصمت کا کوئی معیار نہیں ہے شادی شدہ اور غیر شادی شدہ دونوں قسم کی عورتیں میں۔ ہندوستان میں متعہ[358] کا اگر کہیں رواج ہے تو چند قیود اور پابندیوں کے ساتھ ہے لیکن یورپ میں تو کوئی قید ہی نہیں۔ امریکہ میں تو ایک معیّنہ مدّت کے لیے امتحانی شادیاں ہو رہی ہیں، انگلستان میں شادی تک اور فرانس میں شادی کے بعد عورتیں اپنے آپ کو ہر قسم کے بندھن سے آزاد سمجھتی ہیں۔ انگریز عورتوں کے کردار کی صحیح ترجمانی مشہور شاعر پوپ * کے اس مصرع سے ہو سکتی ہے کہ ہر عورت کی ایک قیمت ہے۔ وہاں کسی عورت کا حاصل کرنا مشکل نہیں البتہ معیارِ زندگی اور طرزِ ماندوبود کا فرق ہے۔ عورتوں کی اس آزادی کی وجہ سے اہلِ یورپ کی ذہنیتوں میں جو تبدیلی واقع ہوئی ہے وہ ذیل کے ایک معمولی واقعہ سے ظاہر ہو سکتی ہے۔

مولوی حیدر رضا صاحب ایک بس میں بیٹھے ہوئے لندن کے مضافات سے تشریف لا رہے تھے، راستہ میں ایک اسٹیشن پر کچھ لوگ سوار ہوئے جن میں ایک بوڑھی ماں اور اُس کی جوان سال بیٹی بھی تھی۔ ماں کو تو بیٹھنے کی جگہ مل گئی لیکن بے چاری لڑکی کھڑی رہی۔ چوں کہ سفر دُور کا تھا، ماں نے ادھر اُدھر دیکھ کر بہ آوازِ بلند بیٹی سے مخاطب ہو کر کہا:۔

"بیٹی! تو ایسے کب تک کھڑی رہے گی، جا اُس نوجوان کی گود میں بیٹھ جا۔ تجھے بیٹھنے کی جگہ مل جائے گی اور وہ خوش ہو جائے گا"۔

چناں چہ سعادت مند بیٹی نے خوشی سے اچھل کر اپنی ماں کے حکم کی تعمیل کی۔

خانگی زندگی:

عورتوں کی آزادی کی وجہ سے اہلِ یورپ کی خانگی زندگی تباہ ہو گئی ہے۔ اگلے زمانہ میں عورت اپنے شوہر کی محکوم سمجھی جاتی تھی اور مشرق میں تو خدا کے بعد شوہر کا درجہ ہے لیکن یورپ میں حالات بالکل برعکس ہیں وہاں شوہر بیوی کا محکوم سمجھا جانے لگا ہے۔ یورپ میں یہ ایک عام فیشن ہو گیا ہے کہ اپنے مرد احباب کے سامنے عورتیں اپنے شوہروں کا مضحکہ اُڑاتی ہیں اور ان کی کمزوریوں کو چھپانے کے بجائے اُن کو نمایاں کر کے پیش کرتی ہیں۔ اسی طرح سیر و تفریح کے لیے عورتیں بہت کم اپنے شوہروں کے ساتھ باہر نکلتی ہیں۔ عورتوں کے ملازمت اختیار کر لینے کی وجہ سے مردوں کو امورِ خانہ داری میں دلچسپی لینی پڑتی ہے ورنہ گھر کا انتظام اور بچوں کی نگہداشت ناممکن ہو جاتی ہے۔

عورتوں کی اس بڑھتی ہوئی آزادی کو روکنے کے لیے شہر 'وائنا'[359] میں ایک انجمنِ زن مریداں قائم ہوئی ہیں جس میں یورپ کے تقریباً تمام ممالک کے زن مرید شریک ہیں۔ اس انجمن کے اغراض و مقاصد یہ ہیں کہ کس طرح پھر عورتوں پر مردوں کا تسلط قائم ہو جائے۔ جرمنی میں نازی حکومت نے عورتوں پر سخت پابندیاں عائد کر دی ہیں۔ ملازمت کے دروازے اُن کے لیے بند کر دیے گئے ہیں اور اُن کے ذمہ گھر کا انتظام ہو گیا ہے۔ *

جنگ عظیم سے ایک سال قبل ۱۹۱۳ء میں انگلستان میں طلاق کی اوسط تعداد ۶۰۰ سالانہ تھی جو بہت زیادہ سمجھی جاتی تھی۔ آج اس کا اوسط پانچ ہزار ہے۔ جرمنی کا اوسط ۶۰ (ساٹھ) ہزار، امریکہ کا ایک لاکھ اور رُوس *کا ایک لاکھ بیس ہزار ہے۔ انگلستان میں تقریباً ۳/۵ طلاقیں خود عورتوں نے حاصل کیں۔

عورت اور جنگ عظیم:

میرے اس سوال پر کہ جنگ عظیم کا اخلاق پر کیا اثر پڑا آپ نے فرمایا کہ یورپ میں اخلاق کا جنازہ جنگ ہی نے نکالا ہے، زمانۂ جنگ میں یورپ کا ہر ملک نوجوانوں سے خالی تھا اور عورتوں کی حالت ناگفتہ بہ تھی۔ چناں چہ جسٹس ڈارلنگ * کے بیان کے بموجب، جو اس زمانہ میں لندن ہائی کورٹ کے جج تھے، عورتوں کی حالت کا اندازہ سڑکوں پر کیا جاسکتا تھا جہاں وہ مردوں کی تلاش میں ماری ماری پھرتی تھیں اور اُس زمانہ کا یہ فیشن ہو گیا تھا کہ ایک مرد کے ہمراہ سیر و تفریح میں دو عورتیں ہیں۔ مردوں کی اس قلت کے مدِّ نظر جرمنی میں ایک پمفلٹ[360] شائع ہوا تھا جس میں مردوں کے لیے قانوناً تعددِ ازدواج کی حمایت کی گئی تھی۔

بہر کیف یورپ کی عورتوں کی آزادی اور بے راہ روی کو دیکھنے کے بعد یہ کہنا بے جا نہ ہوگا کہ عورتوں کو آزاد ہونے کا موقع ہی نہ دیا جائے، اُن کی تعلیم پر روپیہ صرف کرنا بے کار ہے، اُن کی تعلیم بس اس حد تک ہونی چاہیے کہ وہ

مذہب سے واقف ہو جائیں اور گھر کا کاروبار آسانی سے سنبھال لیں۔ خود انگلستان میں یہ خیال عام ہو رہا ہے کہ عورتوں کی اعلیٰ تعلیم پر زیادہ رقم نہ صرف کی جائے۔ انگلستان میں اس وقت پانچ ہزار لیڈی ڈاکٹر ہیں اور اس تعداد میں مزید اضافہ نہ ہونے کے لیے تقریباً تمام طبّی کالجوں میں عورتوں کے داخلہ پر تحدید عائد کی گئی ہے۔

مذہب:

یورپ پر مذہب کا کوئی اثر نہیں۔ تعلیم یافتہ تثلیث[361] کے سمجھنے سے قاصر ہیں یہی وجہ ہے کہ وہاں مرد بہت کم گرجاؤں کو جاتے ہیں اور جو جاتے بھی ہیں تو محض اپنی بیویوں کے جبر سے یا اُن کو خوش کرنے کے لیے۔ لیکن مذہب کا اثر نہ ہونے کے یہ معنی نہیں ہیں کہ وہاں خدا کے پرستار ہی نہیں ہیں۔ خدا ترسی وہاں کے لوگوں کی ایک عام خصوصیت ہے۔ خیرات، ہمدردی، ایثار اور اس قسم کی دیگر خصوصیات میں وہ لوگ ہم سے بہت آگے ہیں۔

یورپ کا مستقبل:

سرِدست یورپ میں انحطاط کے کوئی آثار نظر نہیں آتے۔ اس میں شک نہیں کہ وہاں عیش پرستی زیادہ ہے لیکن اُس سے زیادہ قوم پرستی ہے۔ مسلمانوں کے انحطاط کی اگر کوئی وجہ تھی تو یہ تھی کہ اُن میں خدمتِ عامہ کا جذبہ تقریباً مفقود ہو گیا تھا۔ وہ جو کام کرتے یا تو جلب منفعت کے لیے کرتے تھے یا اپنے آقاؤں یا بادشاہوں کی خوشنودی کی خاطر۔ جب انسان کا مطمعٔ نظر اتنا گر جائے تو ظاہر ہے کہ ذہنی اور تمدّنی حیثیت سے اُس کا ترقی کرنا محال ہے۔

مولوی حیدر رضا صاحب کا ذاتی خیال ہے کہ کچھ دنوں بعد یورپ سے مستقل شادیوں کا رواج اُٹھ جائے گا اور ہر کرسمس کے زمانہ میں مرد اور عورتیں ایک سال کے لیے اپنے رفیق کا انتخاب کر لیا کریں گے۔

تقلید:

اہلِ یورپ کی بہت سی چیزیں ہمارے لیے قابلِ تقلید ہیں لیکن یہ بہ یک نظر دکھائی نہیں دیتیں اور نہ تین چار سال کے قیام میں ان کا پتہ چلتا ہے۔ یوں تو ان کی برائیاں جہاز سے اُترتے ہی نظر آنے لگتی ہیں اور ہم ان ہی میں رہ جاتے ہیں، اُن کی خوبیاں ہمارے لیے پردہ میں رہتی ہیں اس لیے اس کی ضرورت ہے کہ ہمارے طالب علم اور سیاح ایسی عمر میں یورپ جائیں جب وہ اپنی خواہشاتِ نفسانی پر قابو رکھ سکتے ہیں اور اس کے لیے کم از کم چالیس (۴۰) سال کی عمر کو پہنچنا ضروری ہے۔ علاوہ ازیں یورپ میں دو ایک سال کے قیام سے سطحی چیزوں پر بھی نظر نہیں پڑتی، وہاں پانچ دس سال رہنے کی ضرورت ہے جس کے بعد ہی لوگ کچھ صحیح رائے دینے کے قابل ہو سکتے ہیں۔

مولوی سید محمد حسین جعفری:

مولوی سید محمد حسین صاحب جعفری بی۔ اے (آکسن *) ناظمِ[362] تعلیمات سرکارِ عالی ایک وسیع تعلیمی تجربہ کے مالک ہیں۔ آپ نے فنِ تعلیم پر کئی بلند پایہ کتب و مضامین تحریر فرمائے ہیں۔ آپ کی کتابوں میں سب سے اہم و قابلِ ذکر ''ڈنمارک * کا طریقۂ تعلیم'' ہے۔ یہ کتاب آپ نے بہ زبان انگریزی، ڈنمارک کے حالات کا تفصیلی مطالعہ کر کے تالیف فرمائی ہے۔

اپنے قیامِ آکسفورڈ میں آپ وہاں کی اسلامک سوسائٹی کے معتمد[363] اور اُس کے بعد اُس کے صدر نشین[364] رہے اور جنگِ بلقان * کے وقت انجمنِ ہلالِ احمر * کے کام میں عملی حصہ لینے کے لیے آپ ترکی تشریف لے گئے۔

آپ کا قیام انگلستان میں ۱۹۱۲ء تا ۱۹۱۶ء رہا۔

خصوصیات:

اہلِ یورپ میں اور ہم میں بڑا فرق ہے۔ دُور کیوں جایئے بعض مشرقی ممالک مثلاً ترکی *، ایران *، مصر * و عراق * بھی ہم سے بہت زیادہ ترقی یافتہ ہیں۔ ہم پر ابھی جمود کی گھٹا طاری ہے اور قدامت پرستی نے بھی تباہ و برباد کر دیا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ہم حالاتِ زمانہ کا ساتھ نہیں دے سکتے ہیں۔

اہلِ یورپ میں خدمتِ خلق کا مادہ زیادہ ہے اور ہم میں خود غرضی زیادہ ہے۔ وہاں اجتماعی زندگی پر زور دیا جاتا ہے اور یہاں انفرادی زندگی پر۔ اس کی توضیح یوں ہو سکتی ہے کہ اگر ہم کسی ذمہ دارانہ خدمت پر ہوں تو ہماری کوشش یہ ہوتی ہے کہ جائز و ناجائز طریقے سے اپنے قدم جمائے رکھیں خواہ اُس میں بحیثیتِ مجموعی مفادِ عامہ کا نقصان ہی کیوں نہ ہو۔

مذہب یا قومیت:

ہندوستان میں مذہب پرستی جنون کی حد تک پہنچی ہوئی ہے۔ ہم نے مذہب کو قومیت بنا لیا ہے اور ہماری قومیت کا دار و مدار مسلمان اور ہندو ہونے پر ہے۔ درآں حالی کہ قوم جغرافی[365] حیثیت سے قائم ہوتی ہے۔ ہندوستان میں مذہب کو ہر معاملہ میں اوّلیت حاصل ہے اور یورپ میں مذہب ایک بالکل شخصی چیز ہے۔ جس طرح ہر شخص کو اختیار ہے کہ وہ اپنے لیے کوئی مشغلہ منتخب کر لے بعینہ یہی حال وہاں مذہب کا ہے۔ اس کی ضرورت نہیں کہ آپ کا جو مذہب ہو وہی بیٹے کا بھی ہو۔ اور نہ مذہب کی وجہ سے دینوی کاروبار میں کسی قسم کی رکاوٹ پیدا ہوتی ہے۔ اگر میں

شیعہ *ہوں اور آپ سنّی *ہیں تو اس سے آپس کے تعلقات اور معاملات میں کوئی فرق پیدا نہیں ہوتا۔اعتقاد کی حد تک آپ کسی مذہب کے پابند رہیں لیکن جہاں تک دنیوی معاملات کا تعلق ہے یہ حال ہے کہ آپ کا ضمیر آپ کا ساتھ دے۔ لیکن ہمارے پاس ایسا نہیں ہوتا ہم نے مذہب کو رحمت کے بجائے زحمت بنالیا ہے۔

مولوی سید محمد حسین صاحب جعفری نے اپنے حالیہ سفرِ عراق کا ایک واقعہ بیان فرمایا کہ عراق کی آبادی مسلمانوں، عیسائیوں *اور یہودیوں *پر مشتمل ہے لیکن سب کی زبان عربی ہے اور سب اپنے آپ کو پہلے عراقی سمجھتے ہیں۔ جب حکومتِ عراق نے جبری فوجی بھرتی کے وقت عیسائیوں کو نظر انداز کر دیا تو پچیس تیس ہزار عیسائی نوجوانوں نے دفترِ خارجہ کے سامنے مظاہرہ کیا، یہ بتلانے کے لیے کہ عراق کی مدافعت کا فرض مسلمانوں کے برابر عیسائیوں پر بھی عائد ہوتا ہے جس سے وہ محروم نہیں کیے جا سکتے، حکومت کو مجبور ہونا پڑا۔ بر خلاف اس کے، ہمارے پاس اکھاڑے قائم ہوتے ہیں تو ایک دوسرے کا گلا کاٹنے کے لیے۔

ذاتی خصائل:

عام طور پر یہ خیال ہے کہ یورپ کی اخلاقی حالت خراب ہو گئی ہے۔ یورپین اقوام ظلم و تعدّی کے علم بردار ہیں اور کم زور قوموں کی حمایت کی بجائے ان کے خلاف زیادتیاں روا رکھی جاتی ہیں، اطالیہ *اور جرمنی اس کی زندہ ترین مثالیں ہیں۔ لیکن واقعہ یہ ہے کہ اس قسم کی ظلم اور زیادتی کا تعلق قومی یا عالمی سیاسیات سے ہے۔ انفرادی طور پر وہاں کے لوگوں میں امن اور خدمتِ خلق کا مادہ زیادہ ہے اور ان کی یہی خصوصیات ان کی ترقی کی ضامن ہیں۔ گو وہاں کے لوگ مذہب کے اتنے پرستار نہیں ہیں لیکن مذہب کی تعلیم سے کسی شخص میں جو اچھائیاں پیدا ہو سکتی ہیں وہ اُن میں بدرجہ اتم موجود ہیں۔ وہاں کے رفاہی اور خیراتی اداروں کی تعداد کو دیکھ کر تعجب ہوتا ہے۔ مشرق میں بہت سے ایسے لوگ ملیں گے جو صوم و صلواۃ کے پابند، متشرّع، عالم سب ہی کچھ ہیں لیکن اُن کی ذات سے ان کے سوا کسی کو کوئی فائدہ نہیں پہنچتا۔ پھر ایسی مذہبیّت سے کیا فائدہ جب انسان اپنے سوا دوسروں کے کام نہ آسکتا ہو۔

انگریزوں کی ذاتی خصوصیات:

انگریز دنیا کی بہترین قوموں میں سے ہیں۔ سنجیدگی، توازنِ دماغی اور حکمتِ عملی میں یہ لوگ اپنا ثانی نہیں رکھتے۔ ہندوستان پر ڈیڑھ سو سال کے انگریزی تسلّط کے بعد بھی ہندوستانیوں کو انگریزوں کے توازنِ دماغی کی ہوا نہیں لگی۔ معمولی معمولی چیزوں میں الجھ جاتے ہیں اور بجائے تعمیر کے تخریب کی صورت پیدا کر لیتے ہیں۔ ہمارے نوجوانوں کو چاہیے کہ سب سے پہلے انگریزوں کی یہ خصوصیت اپنے آپ میں پیدا کریں۔ بعض ماہرین نفسیات کا خیال ہے کہ

ہندوستان ایک گرم ملک ہونے کی وجہ سے ہمارے جذبات جلد برانگیختہ ہوتے ہیں۔ ممکن ہے یہ ایک حد تک صحیح ہو لیکن اگر کسی چیز کے حصول کی کوشش کی جائے تو اس کا حاصل کرنا مشکل نہیں ہے۔

تعلیم:

جنگِ عظیم کے بعد یورپ کے حالات میں جو زبردست ردِّ عمل ہوا اس سے یورپین ممالک نے محسوس کیا کہ ملک کی سب سے بڑی دولت نوجوان ہیں، تعلیم یافتہ اور صحت مند۔ آج یورپ کے ہر ملک میں نوجوان اور ان کی تعلیم و تربیت پر غیر معمولی توجہ صرف کی جارہی ہے۔

دماغی اور جسمانی تعلیم کو برابر کی اہمیت حاصل ہے۔ مغربی درس گاہوں میں اوقاتِ مدرسہ میں طلبا کے لیے کھانے کا مفت انتظام کیا جاتا ہے اور انھیں بہترین غذا دی جاتی ہے، اُن کا مفت طبّی معائنہ ہوتا ہے اور ان کے لیے صحت خانے (Clinics) قائم کیے گئے ہیں۔

ہر متمدّن حکومت کا فرض ہے کہ وہ ہر فرد کو ابتدائی تعلیم دلائے۔ یورپ میں ابتدائی تعلیم کی حد تک حکومتیں ساری ذمہ داری قبول کرتی ہیں۔ ثانوی اور اعلیٰ تعلیم کے لیے خانگی کوششوں اور خانگی سرمایہ کو دخل ہے۔ برطانیہ عظمیٰ کی آبادی تقریباً ساڑھے چار کروڑ نفوس پر مشتمل ہے اور وہاں صرف ابتدائی تعلیم کا خرچ دس کروڑ پونڈ سالانہ ہے گویا فی کس تعلیم کا خرچ دو پونڈ یا تیس روپیہ ہوتا ہے۔ ہماری ریاست کی آبادی ڈیڑھ کروڑ کے قریب ہے اور تعلیم پر تقریباً ایک کروڑ روپیہ صرف ہوتا ہے۔ اس سے اندازہ ہو سکتا ہے کہ تعلیمی معاملات میں ہم کس قدر پیچھے ہیں۔ ہندوستان میں فوج پر جو کثیر رقم صرف کی جاتی ہے کاش وہ نوجوانوں کی تعلیم پر صرف کی جاتی کیوں کہ کسی ملک کی بڑی فوج اس کے نوجوان ہیں اور جب یہ تعلیم یافتہ اور روشن ضمیر ہوں تو پھر اس فوج کے ہوتے ہوئے اس ملک کو کوئی دشمن آنکھ اٹھا کر نہیں دیکھ سکتا۔

عورت:

ہندوستانی عورتوں میں مغربی عورت کی تقلید بڑی اچھی چیز ہے لیکن تقلید صرف اچھائیوں کی حد تک ہونی چاہیے۔ ہماری عورتوں کو سب سے پہلے کفایت شعارانہ زندگی کی عادی بننا چاہیے۔ غیر معمولی قیمتی لباس زیب تن کرنا، بناؤ سنگھار اور نمائش پر جان دینا، گھر کا کاروبار چھوڑ کر پارٹیوں اور سوسائٹیوں میں شریک ہونا ایسی چیزیں ہیں جو نہ صرف ہندوستان میں بُری نظروں سے دیکھی جاتی ہیں بلکہ یورپ میں بھی انھیں معیوب سمجھا جاتا ہے۔

یہ خیال کہ یورپ کی ہر عورت عصمت باختہ ہے، غلط ہے۔ وہاں عورت اور مرد مساوی طور پر آزاد ہونے کی وجہ سے عورت میں عصمت کا خیال زیادہ ہے۔ اگر کسی شخص کو ہمیشہ کمرہ میں بند رکھا جائے اور اُس کے متعلق یہ کہا جائے کہ وہ انتہائی نیک چلن ہے تو یہ ایک قسم کی ستم ظریفی ہے۔ نیک چلن یا بد چلنی کا اندازہ تو اس وقت ہو سکے گا جب وہ شخص ہر قسم کے قید و بند سے آزاد رہنے کے بعد اپنے دامن کو معصیّت سے آلودہ نہ کرے۔ بعینہ یہی حال ہماری عورتوں کا ہے۔

یورپ میں دو قسم کے لوگ ہیں۔ ایک وہ جو رین بسیروں کے دل دادہ ہیں اور دوسرے جو لہو و لعب میں حصہ نہیں لیتے۔ اونچے طبقوں میں عیش پرستی زیادہ ہے لیکن متوّسط اور اعلیٰ متوّسط طبقہ انگریزی سوسائٹی کی ریڑھ کی ہڈی اور ملی جان ہے انگریزوں کی ساری قومی خصوصیات، روایات اور احساسات کا یہی طبقہ آئینہ دار ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ اگر انگریز عورت بداخلاق ہوتی جیسا کہ عام طور پر سمجھا جاتا ہے تو یہ قوم زندہ بھی نہیں رہتی۔ کیا تاریخ سے یہ ثابت نہیں ہوتا کہ عیش پرستیوں اور بداخلاقیوں سے قومیں تباہ و برباد ہو جاتی ہیں۔

مسلمان عورتوں کے مقابلہ میں ہندو عورت کی زندگی بہت کفایت شعارانہ ہے۔ پونہ* و بمبئی* میں کئی نسوانی ادارات و مدارس ایسے ہیں جہاں اعلیٰ تعلیم یافتہ ہندو عورتیں معمولی معمولی معاوضہ پر کام کرتی ہیں اور ان کے اس ایثار اور محنت پسندی میں ایک نئی قوم جنم لے رہی ہے۔ ہماری عورتوں کی ترقی بڑی حد تک مردوں کی ذہنیتوں کی تبدیلی پر منحصر ہے۔ عورتوں یا اُن عورتوں کے متعلق جو بے پردہ ہیں، ہمارے خیالات اتنے ارفع و اعلیٰ نہیں ہوتے جتنے کہ خود اپنے گھر کی عورتوں کے متعلق ہوتے ہیں۔

خاتمہ:

آخر میں مولوی سید محمد حسین صاحب جعفری نے فرمایا کہ ہندوستان کی ترقی کے لیے سخت ترین اصلاحات کی ضرورت ہے۔ ترکی کی مثال ہمارے سامنے ہے۔ آج سے دس سال قبل ایرانیوں کی حالت ناگفتہ بہ تھی، وہ افیون [366]اور قہوہ کے عادی تھے، افلاس زدہ، جاہل اور خوابیدہ۔ لیکن رضا شاہ* نے ان میں زندگی کی روح پھونک دی ہے اس بیداری کی بجز اس کے کوئی وجہ نہیں کہ رضا شاہ نے ملک کے لیے جس اصلاح کی بھی ضرورت محسوس کی اس کو بغیر کسی پس و پیش کے نافذ کر دیا گیا اور اس سے سرتابی کرنے والوں کو سخت ترین سزائیں دی گئیں۔ ترکی میں اتاترک *اور ایران میں رضا شاہ نے لوگوں کی ذہنیتوں اور ان کے نصب العینوں کو بدل دیا ہے۔ اور ایک تاراج اور مفلوک حال قوم سے ایک زندہ اور الوالعزم قوم کو پیدا کیا۔

مولوی محمد عبدالرحمن خان:

مولوی محمد عبدالرحمن خان صاحب بی۔اے۔بی۔ایس۔سی (لندن) اے۔آر۔سی۔ایس کی علمی تعلیمی وملکی خدمات کسی تعارف کی محتاج نہیں۔ بحیثیتِ صدر کلیّہ جامعہ عثمانیہ بارہ سال تک آپ نے جس جوش اور خلوص سے اس نوخیز جامعہ کو صحیح راستوں پر گام زن کیا ہے اور نوجوانان ملک کی قسمتوں کی رہنمائی فرمائی ہے آپ کے اس احسان سے جامعہ اور حیدرآباد کبھی عہد برآنہیں ہو سکتا۔

آپ ہندوستان کے ایک مسلّمہ سائنس دان ہیں اور سائنس کی متعدد بلند پایہ نصابی کتب کو آپ نے اردو میں منتقل فرمایا ہے۔ وظیفہ کے بعد آپ بالکلیہ علمی اور سائنٹیفک کاموں کے لیے وقف ہو گئے ہیں۔ آپ کے مضامین و مشاہدات مشہور امریکی و برطانوی جرائد میں شائع ہوتے ہیں۔ حیدرآباد ایجوکیشنل کانفرنس کی گذشتہ میقات کے آپ صدر تھے۔

آپ کا قیام انگلستان میں ۱۹۱۱ء تا ۱۹۱۴ء رہا۔ ۱۹۲۷ء میں بھی آپ نے دوسری مرتبہ یورپ کا سفر فرمایا ہے۔

عام خصوصیات:

اکثر یورپی اقوام اور خصوصاً انگریز بہت سی ایسی خوبیوں کے حامل ہیں جو ہم میں موجود نہیں ہیں۔ ان لوگوں کی تعلیم و تربیت اور نشوونما ہی کچھ اس قسم کی ہوتی ہے کہ وطن پروری، الوالعزمی، شجاعت، ہمدردی، ایثار، عزتِ نفس، خودداری، ضبط و تنظیم جیسی خصوصیات ان کی فطرت میں رچ گئی ہیں۔ ان چیزوں کا عمومیت سے ہر کس و ناکس میں موجود رہنا ہی اس بات کی دلیل ہے کہ یورپ ہمارے مقابلہ میں کتنا ترقی یافتہ ہے۔

باقاعدگی:

باقاعدگی، وقت کی قدر اور اصول کی پابندی یہاں کی زندگی کے عام نصب العین ہیں۔ معمولی معمولی چیزوں میں اتنی باقاعدگی برتی جاتی ہے کہ اس سے انگریزوں کی عام تنظیمی قابلیت کا اندازہ ہو سکتا ہے۔ ایک معمولی تفریح (Picnic) کو بھی نکلتے ہیں تو لوگ پہلے ہی سے اس کا پروگرام بنا لیتے ہیں اور اگر کوئی دُور دراز کا سفر ہو تو راستوں کا نقشہ تک تیار کر لیا جاتا ہے۔ تفریح کے لیے اگر زیادہ لوگ جا رہے ہیں تو ایک لیڈر کا بھی انتخاب کر لیا جاتا ہے۔ جس کے احکام کی ایسی ہی تعمیل ہوتی ہے جیسے سپاہی اپنے افسر کے حکم کی تعمیل کرتے ہیں یہی وجہ ہے کہ اپنے پروگرام سے یہ لوگ رمق برابر ہٹنے نہیں پاتے۔

انگریز وقت کی بڑی قدر کرتے ہیں۔ کوئی شخص بے کار نظر نہیں آتا۔ دولت مند اور ذی ثروت لوگ بھی جنھیں بجز عیش کے کوئی کام نہیں، کچھ نہ کچھ قومی اور رفاہی کام اپنے ذمہ لے لیتے ہیں یا اپنے لیے کوئی ایسا مشغلہ منتخب کرتے ہیں کہ ان کا وقت بے کار نہیں جاتا۔ اس ضرب المثل سے کہ ایک بے کار دماغ شیطانی کارخانہ ہوتا ہے، وہ خوب واقف ہیں اور اپنے آپ کو ہمیشہ مصروف رکھتے ہیں مبادا ان کا دماغ شیطان کی آماج گاہ بن جائے۔

کفایت شعاری:

انگریز انتہائی کفایت شعار ہوتے ہیں اور ایک ایک کوڑی جمع کرتے ہیں۔ دولت کی قدر کرنے ہی سے یہ لوگ دولت مند ہیں۔ کفایت شعاری کا ذکر کرتے ہوئے مولوی محمد عبدالرحمن خان صاحب نے ایک معمولی واقعہ بیان فرمایا جس سے اندازہ ہو سکتا ہے کہ بچپن ہی سے اس عادت کو کس طرح راسخ کیا جاتا ہے۔ انگلستان پہنچنے کے بعد ایک خاندان میں آپ کی رہائش کا انتظام ہوا۔ پہلی مرتبہ جب آپ نے اس مکان میں قدم رکھا تو چائے کا وقت تھا۔ میز پر خاندان کے سارے ارکان اور بچے جمع تھے۔ آپ بھی شریک کر لیے گئے۔ آپ کے لیے چائے بناتے ہوئے مالک مکان نے دریافت کیا کہ آیا آپ کو شکر کی ایک ڈلی کافی ہو جائے گی یا دو؟ آپ نے فرمایا "دو"۔ اس کے بعد بچوں کی باری آئی۔ سب سے بڑے لڑکے نے "ایک" کہا اور چھوٹوں نے تو شکر لینے ہی سے انکار کر دیا۔ آپ تعجب سے بچوں کی صورت دیکھنے لگے تو والدین کا رعب ان پر ایسا طاری تھا کہ کسی کو زبان ہلانے کی ہمت نہ ہوتی تھی حالاں کہ شکر کے لیے ان کا کلیجہ منہ کو آ رہا تھا۔ یہ دراصل ان کی تربیت کا نتیجہ ہے، یہاں کی طرح نہیں کہ بچہ جو ضد کرتا ہے اس کو پوری ہی کر کے رہتا ہے اور رفتہ رفتہ والدین کے لاڈ پیار سے تباہ ہو جاتا ہے۔

صفائی اور نفاست پسندی:

انگریزوں کی صفائی اور نفاست پسندی کے متعلق آپ نے ایک واقعہ اس طرح بیان فرمایا کہ ایک روز آپ اپنے کمرے میں بیٹھے پنسل تراش رہے تھے۔ کمرے میں مالکہ مکان کی موجودگی کا آپ کو علم نہ تھا۔ جوں ہی اس پر نظر پڑی تو آپ نے دیکھا کہ آپ کے قریب گھٹنوں کے بل کھڑی ہے اور قلم کے ریزوں کو اپنی ہتھیلی میں جمع کرتی جا رہی ہے۔ جب آپ نے اس کی اس حرکت پر تعجب کا اظہار کیا تو وہ کہنے لگی کہ کیا ان کو فرش پر پڑے رہنے دینے سے باہر پھینک دینا اچھا نہیں ہے۔ اس واقعہ سے آپ اتنے متاثر ہوئے کہ اس عورت سے زیادہ کمرے کی صفائی کا آپ کو خیال ہو گیا۔

انگلستان میں اکثر مکانوں میں غسل خانے نہیں ہوتے۔ لوگ عام طور پر اتوار کو نہاتے ہیں یا اسپنج باتھ[367] پر اکتفا کرتے ہیں۔ لیکن اس کے باوجود صفائی کا بڑا خیال رکھا جاتا ہے گو مشرقی نقطۂ نظر سے یہ صفائی ظاہری ہوتی ہے۔

آزادیِ نسواں:

میرے اس سوال پر کہ جنگ کے پہلے اور بعد عورتوں کے حالات میں کیا نمایاں تغیّر واقع ہوا، مولوی محمد عبدالرحمن خان صاحب نے فرمایا کہ جنگ عظیم[368] سے پہلے عورتیں ہر قسم کے قید و بند سے آزادی حاصل کرنے کی کوشش میں مصروف تھیں اور جنگ کے بعد انھوں نے اس مقصد میں کامیابی بھی حاصل کرلی۔ چناں چہ آج انگلستان میں عورتیں ہر کام میں مردوں کے دوش بہ دوش ہیں۔ لیکن جب معاشی حیثیت سے عورت اور مرد ایک سطح پر آجائیں تو لازمی طور پر گھر کی زندگی تباہ ہو جاتی ہے اور یورپ میں آج اُسی کا ماتم ہے۔ ہندوستان کے گھر کی زندگی اور آسودگی یورپ میں خواب و خیال ہیں۔ آزادی اور انفرادی ذمہ داری کے احساس نے وہاں کے ہر شخص کو خواہ مرد ہو یا عورت ،اپنے سیاہ و سفید کا مالک بنادیا ہے یہی وجہ ہے کہ پست طبقوں میں والدین کو اپنی اولاد پر قابو نہیں رہا۔ لڑکی اگر رات میں دیر سے گھر واپس آتی ہے تو اس سے کوئی پوچھنے والا نہیں۔ نتیجہ یہ ہے کہ اس بے راہ روی سے جو معاشری خرابیاں پیدا ہو رہی ہیں اس سے سوسائٹی کو گھن لگ گیا ہے۔ انگلستان میں عام طور پر ادنی طبقہ اور مزدوروں کی خانگی زندگی اور اخلاقی حالت پست ہے۔ ملازم پیشہ لوگوں میں بالعموم عورتیں کماتی ہیں اور مرد کھاتے ہیں۔

مغربی عورتوں کی ان حیا سوزیوں کے باوجود اُن کے عیوب پس پردہ ہیں اور ہماری حالت اس کے بالکل برعکس ہے۔ خانگی زندگی خواہ کتنی ہی خراب کیوں نہ ہو لیکن پبلک زندگی میں یورپ کے ہر شخص کے ہاتھ سے قومی خصوصیات کا دامن نہیں چھوٹتا۔ وطن پروری، ضبط و نظم اور ہمدردی میں یہ لوگ آپس میں یکساں نظر آتے ہیں۔ اور یہی اُن کی ترقی کا راز ہے۔

مذہبی رجحانات:

اہل یورپ کے مذہبی رجحانات کے متعلق آپ نے فرمایا کہ یورپ کا کوئی مذہب نہیں۔ انگلستان میں پراٹسٹنٹ ازم * سرکاری طور پر ملک کا مذہب تسلیم کیا جاتا ہے لیکن یہ برائے نام ہے۔ عوام کا دراصل کوئی مذہب نہیں۔ اگر ایک طرف دنیا کی مادی ترقیوں نے مذہب کو دیوالیہ کر دیا ہے تو دوسری طرف لوگوں کی کاروباری مصروفیت اتنی بڑھ گئی ہے کہ ان کو خدا کے متعلق سوچنے کا وقت ہی نہیں ملتا۔ علوم و فنون کی غیر معمولی اشاعت سے

ہر چیز عقل و خرد کی کسوٹی پر پرکھی جاتی ہے۔اس لحاظ سے کہا جا سکتا ہے کہ وہاں کوئی شخص حضرت ابنِ مریمؑ کو خدا کا بیٹا ماننے کو تیار نہیں ہے۔

مذہبی نقطہ نظر سے اہلِ یورپ میں جو اچھائیاں نظر آتی ہیں وہ براہِ راست مذہبی اثرات کا نتیجہ نہیں ہیں کیوں کہ وہاں ہر چیز کے افادی پہلو پر نظر کی جاتی ہے۔ جھوٹ نہ بولنے کی وجہ اللہ اور رسول کا ڈر نہیں ہے بلکہ وہ برے نتائج ہیں جو عملاً جھوٹ بولنے سے پیدا ہوتے ہیں۔ یہی حال دوسری چیزوں کا ہے۔مادہ پرست ہونے کی وجہ سے وہ لوگ ہر شے کو مادی نقطہ نظر سے دیکھتے ہیں۔ہر شخص یہ محسوس کرتا ہے کہ اپنی قوم کی بقا کے لیے اسے دنیا میں کچھ کرنا ہے۔ چناں چہ ایک معمولی سڑک جھاڑنے والے میں بھی اتنا قومی احساس ہے کہ وہ کوئی ایسا کام نہیں کرے گا جو بحیثیتِ مجموعی قومی مفاد کے مغائر ہے۔

یورپ میں خدا کے بعد یا اس کے برابر اگر کسی کا درجہ ہے تو وہ روپیہ ہے اور وہاں کا ہر متنفس اس قاضی الحاجات کا سچا اور حقیقی پرستار ہے۔

ذاتی خصوصیات:

جہاں تک مختلف یورپی اقوام کی خصوصیاتِ ذاتی کا تعلق ہے ، یہ کہا جا سکتا ہے کہ انگریز سب سے زیادہ قابلِ اعتماد ہیں۔ فرانسیسی جتنے جلد دوست بنتے ہیں اتنے ہی جلد بھول بھی جاتے ہیں۔ انگریز بہت مشکل سے دوست بنتے ہیں لیکن دوستی کے بعد اختتام تک اُسے نبھانے کی کوشش کرتے ہیں۔ جس طرح ایک انگریز خود فضول خرچ نہیں ہوتا وہ اپنے کسی دوست کو بھی فضول خرچ نہیں دیکھ سکتا۔ جس طرح دوستی میں انگریز مشہور ہیں اسی طرح ان کی دشمنی بھی سخت ہوتی ہے لیکن وہ کینہ پرور نہیں ہوتے۔ کسی چیز کو معاف کر دیں گے لیکن اُسے بھولیں گے نہیں۔

خاتمہ:

عہدِ حاضر کی جملہ ترقیوں کے باوجود یورپ ابھی اس درجہ کمال کو نہیں پہنچا جہاں مسلمان اپنے عروج کے زمانہ میں پہنچے تھے اور نہ اس کا کوئی مکان ہے۔ قرونِ اولیٰ کے مسلمانوں کی تنظیم، عزم و استقلال، رواداری، راست بازی و خودداری اور دیگر خصوصیتوں سے دنیا ہمیشہ درسِ بصیرت حاصل کرتی رہے گی۔

ڈاکٹر سید حسین:

ڈاکٹر سید حسین متمدّن دنیا میں بحیثیت جرنلسٹ، مقرّر و سیاست دان بے حد مشہور و مقبول ہیں۔ آپ ہندوستان میں اخبار "انڈی پنڈنٹ"[369] اور امریکہ میں "نیو اوریئنٹ میگزین"[370] کے ایڈیٹر تھے۔ ڈاکٹر سید حسین ہندوستانی وفد کے ان تین ارکان میں سے ایک ہیں جو صلح نامہ سیورس* کے وقت ترکی سے متعلق ہندوستانی زاویہ نظر کو پیش کرنے یورپ روانہ کیا گیا تھا۔ واشنگٹن کانفرنس[371] میں آپ نے ہندوستانی صحافت کی نمائندگی بھی کی ہے۔

گذشتہ سترہ اٹھارہ سال سے آپ امریکہ میں متوطّن اور وہاں کی جنوبی کیلی فورنیا کی جامعہ میں اسلامی تاریخ و تمدّنِ ہند کے لکچرار ہیں۔ امریکہ میں آپ کی حیثیت ہندوستان کے ایک غیر سرکاری سفیر کی ہے۔ "مادرِ ہند" جیسی کتابوں کے مبالغہ آمیز پروپگنڈے کے ازالہ میں آپ نے نمایاں حصہ لیا ہے۔

ڈاکٹر سید حسین گذشتہ سال ایک تقریری سفر کے سلسلہ میں ہندوستان تشریف لائے تھے اور جامعہ عثمانیہ کے زیرِ اہتمام حیدرآباد میں بھی آپ کی توسیعی تقاریر ہوئی ہیں۔

اختلافات:

دنیا میں ہندوستان اور ممالک متحدہ امریکہ[372] کی طرح کوئی دو ملک ایسے نہیں ہیں جن میں اتنے نمایاں اختلافات پائے جاتے ہوں۔ ہندوستان دنیا کی قدیم ترین تہذیب و تمدّن[373] کا وارث ہے۔ ممالک متحدہ امریکہ دنیا کا نو خیز ترین ملک[374] ہے۔ زندگی کے متعلق ہندوستانیوں کا نقطہ نظر ایک وسیع بالغ نظری پر مبنی ہے اور ممالک متحدہ امریکہ کا نقطہ نظر ایک جوشیلے نوجوان کا نقطہ نظر ہے۔ ہندوستان میں 'پدرم سلطان بود'[375] کی ذہنیت عام طور پر موجود ہے لیکن خوش قسمتی سے امریکہ کا کوئی ماضی ہی نہیں ہے، ان کے گردوپیش ایک زندہ حال ہے۔ اہلِ امریکہ، خود مختار، آزاد اور قوم پرور ہیں۔ ہندوستانیوں کی زندگی اس کے بالکل برعکس ہے۔ پیدائش ہی سے امریکہ کا ہر بچہ ملک، قوم اور قومی پرچم پر فخر کرنا سیکھتا ہے لیکن ہندوستان کے ماضی قریب میں ایسی کوئی قوم پرورانہ بات نظر نہیں آتی۔ امریکی طریقہ تعلیم ایسے اصولوں پر مبنی ہے کہ اس سے متذکرہ بالا چیزوں کے حصول میں مدد ملتی ہے اور ہندوستان میں برطانوی طریقہ تعلیم کی ہوبہو نقل اتارنے سے کوئی سودمند نتیجہ برآمد نہیں ہو سکتا۔ ہر امریکی تعلیمی ادارہ میں روزانہ ممالک متحدہ امریکہ کے پرچم کو سلامی دی جاتی ہے لیکن وائے نصیب! ہندوستان کا کوئی قومی پرچم ہی نہیں جس کو قانون، ملک یا اقوامِ عالم تسلیم کریں۔[376] ہندوستانی نوجوان اپنے ملک سے محبت کا اظہار کرتے ہوئے جھجکتے ہیں کیوں کہ اس کے معنی سزائیں بھگتنا اور تکلیفیں اٹھانا ہیں۔

جماعتیں اور اختلافات:

اہلِ امریکہ میں اپنی جماعتیں بھی ہیں اور ان کے آپس کے اختلافات بھی ہیں لیکن یہ ساری چیزیں خوش گوار قسم کی ہیں۔ ہندوستان میں یہ بات نہیں ہے، یہاں اختلافات اس قسم کے ہیں کہ ان سے کوئی ٹھوس اور بنیادی کام انجام نہیں پاسکتا۔

ممالکِ متحدہ امریکہ کی ڈیڑھ سو سال کی تاریخ نے جمہوریت کی تعمیر کے سلسلہ میں مختلف قوموں کو ایک خاص رشتۂ اتحاد میں منسلک کر دیا ہے، گو ابتدا میں انگریز، فرانسیسی، ہسپانوی[377] کی تفریقیں تھیں لیکن آج کل ہر شخص حقیقی معنوں میں امریکی ہے اور ان میں کسی قسم کے نسلی امتیازات باقی نہیں رہے۔ اس طرح ممالکِ متحدہ امریکہ ہندوستانیوں کے لیے ایک دلچسپ نمونہ ہے۔ امریکہ میں بیسیوں مذہبی فرقے ہیں اور ہر ایک کو کامل آزادی حاصل ہے لیکن ہندوستان میں مذہبی اعتقادات کو فرقہ واری مناقشات کی بنا کیوں قرار دیا جاتا ہے؟ اس پر ڈاکٹر سید حسین نے تعجب کا اظہار کرتے ہوئے فرمایا کہ بحیثیت اُستاد آپ نے ہزاروں امریکی لڑکے اور لڑکیوں کو دیکھا ہے جو آپ کی جماعتوں میں سے تعلیم پا کر نکلتے رہے ہیں لیکن آپ نے ایک بھی مثال ایسی نہیں دیکھی کہ کسی خاص مذہب کے پیرو ہونے کی وجہ سے کسی کے ساتھ حقارت آمیز سلوک کیا گیا ہو۔ ہندوستان میں جس قسم کا مذہبی تعصب ہے وہ امریکہ میں ناپید ہے۔ یہاں لوگ کتے اور بلیوں کی طرح لڑتے ہیں۔

معاشرتی نفسیات:

ممالکِ متحدہ امریکہ میں تعلیم یافتہ لوگوں کا اوسط بہت زیادہ ہے۔ ۹۹ فیصد امریکی تعلیم یافتہ ہیں۔ بچوں کے مدرسہ بھیجنے کے لیے ایک قانون نافذ کیا گیا ہے جس کے بموجب والدین بچوں کو مدرسہ بھیجنے کے لیے مجبور ہیں۔ اس قانون کی خلاف ورزی کی صورت میں اُنھیں عدالت کے رُو بہ رُو پیش کیا جاتا ہے اور اگر اطمینان بخش توجیہہ نہ پیش کی جائے تو اُنھیں جیل خانہ جانا پڑتا ہے۔ امریکہ کے تعلیم یافتوں کی تعداد کا اندازہ یوں کیا جاسکتا ہے کہ وہاں بے پڑھے لکھے لوگوں کی جتنی تعداد ہے اتنی ہی ہندوستان میں پڑھے لکھوں کی ہے[378]۔ ڈاکٹر سید حسین نے فرمایا کہ وہ یہ سن کر خوش ہوں گے اگر انگریز ہندوستان میں بچوں کو مدرسہ نہ بھیجنے کی علت میں ان کے والدین کو جیل بھیجا کریں لیکن یہاں پر تو جیل خانے ہزاروں کی تعداد میں کسی اور قسم کے جرم کی پاداش میں بھرے جاتے ہیں۔

ممالکِ متحدہ امریکہ میں ہر فرد کو مساوی موقعے حاصل ہیں۔ وہاں والدین کی دلی تمنا رہتی ہے کہ ان کا بچہ ممالکِ متحدہ کا صدر بنے اور اس مقصد کے حصول میں کوئی مشکلات بھی نہیں ہیں۔ قانون کی نظر میں سب ایک ہیں۔

مساوات کا یہ عالم ہے کہ وہاں ایک جماعت کو دوسری جماعت پر ترجیح حاصل نہیں ہے۔ حکومت کی جانب سے کسی شخص کو کوئی خطاب یا اعزاز عطا نہیں کیا جاتا اور نہ اہلِ امریکہ کو غیر ملکی خطابات یا اعزازات قبول کرنے کی اجازت ہے کیوں کہ اس سے لوگوں میں چھوٹے بڑے کا امتیاز پیدا ہوتا ہے۔ لوگ اگر صدرِ جمہوریہ کا بھی نام لیتے ہیں تو محض روز ولٹ یا مسٹر روز ولٹ * کہتے ہیں۔ غرض امریکہ دنیا کے تمام ممالک حتیٰ کہ برطانیہ عظمیٰ سے بھی سیاسی، سماجی، معاشی واقتصادی معاملات میں پچاس سال آگے ہے۔

امریکہ میں آقا اور ملازم کے تعلقات ہم سے بہت مختلف ہیں۔ آقا اپنے ملازم کے ساتھ کبھی غیر شائستہ الفاظ استعمال نہیں کرے گا اور نہ ہی ملازم ان کو برداشت کر سکتا ہے۔ وہاں کی معاشری نفسیات بالکل مختلف ہے۔ وہ آزاد مرد اور عورتوں کی قوم ہے حتیٰ کہ انگریزوں کی معاشری نفسیات بھی امریکہ کے مقابلہ میں ایک صدی پیچھے ہے۔

دوسری اقوام کی طرح امریکی لڑکے اور لڑکیوں کا کوئی ماضی نہیں ہے، ان کو حال سے واسطہ ہے۔ معمولی انسانوں کی طرح زندگی بسر کرنے میں وہ لوگ اتنے مصروف ہیں کہ انھیں ماضی کی الجھنوں میں پھنسنے کی ضرورت ہی نہیں ہے۔ یہ تو صرف ہندوستان ہے جہاں ماضی پر تکیہ کیا جاتا ہے اور لوگوں کو معمولی انسانوں کی طرح زندگی بسر کرنے کا وقت نہیں ملتا۔

عورت:

ڈاکٹر سید حسین نے فرمایا کہ عام طور پر امریکہ کی عورتوں کے متعلق سمجھا جاتا ہے کہ وہ حد سے بہت آگے نکل گئی ہیں اور ان کی اخلاقی حالت گری ہوئی ہے، یہ خلافِ واقعہ ہے۔ اس میں شک نہیں کہ وہاں اس قسم کی عورتیں ضرور موجود ہیں لیکن حقیقت یہ ہے کہ امریکی نسوانیت نے تہذیب کا ایک ایسا اعلیٰ معیار حاصل کیا ہے کہ کوئی دوسرا ملک اس کا مقابلہ نہیں کر سکتا۔ امریکی عورتوں کو وہی مواقع حاصل ہیں جو مردوں کو ہیں، ان کے اپنے انفرادی مشاغلِ حیات ہیں۔ جامعات میں عورتوں کے لیے زندگی کے مختلف پیشوں کی تعلیم کا انتظام ہے۔ امریکہ کا طریقہ تعلیم ہی کچھ اس قسم کا ہے کہ اس کا مقصد ہی یکساں طور پر تمام عورتوں کی حالت سدھارنا ہے تاکہ وہ اپنی روٹی آپ کما سکیں۔ ہندوستان یا دوسرے ممالک میں اکثر صورتوں میں شادی عورت کے لیے اس کی روٹی کا ذریعہ ہوتی ہے۔ چوں کہ امریکہ میں مرد اور عورت ایک سطح پر ہیں وہاں کی عورت روٹی سے شادی نہیں کرتی بلکہ مرد سے شادی کرتی ہے۔ دنیا کے کسی دوسرے ملک کے مقابلہ میں امریکہ میں ہزاروں ایسی عورتیں ہیں جو اپنا پیٹ آپ پالتی ہیں۔ وہاں کے طریقہ تعلیم سے انھیں بڑی مدد ملتی ہے۔ وہاں ہم تعلیمی کا طریقہ رائج ہے جس میں کسی قسم کی بداعتدالیاں پیدا ہونے کا احتمال نہیں

ہے اور یہ پیدا ہوں تو کیوں ہوں ؟ بد قسمتی سے ہمارے پاس اور بہت سی اہم چیزوں کو چھوڑ کر جنس کو مضحکہ خیز اہمیت دے دی گئی ہے یہی وجہ ہے کہ ہندوستان اور دوسرے ممالک میں جنسی خیالات غیر متوازن اور ناساز گار ہیں۔ برٹرینڈ رسل * نے جس کے پیشِ نظر خاص ہندوستان کی مثال تھی شوہر اور بیوی کے تعلقات کو پولیس اور چور کے تعلقات سے تشبیہ دی ہے۔ ہندوستان اور دوسرے ممالک میں کسی نہ کسی صورت میں غاروں میں رہنے والے ابتدائی انسانوں کی ذہنیت پائی جاتی ہے۔

نسلی تعصب:

امریکہ میں رنگ اور نسل کا مسئلہ پہلے کی طرح شدید نہیں رہا ہے۔ دوایک جنوبی ریاستوں میں ایک حد تک یہ چیز پائی جاتی تھی لیکن آج کل تو بعض وفاقی عہدوں پر بھی حبشی مامور ہیں اور آئندہ ربع صدی میں امریکہ میں حبشی مسئلہ کا وجود بھی باقی نہیں رہے گا۔[379]

امتناعِ مسکرات:

امریکہ میں امتناعِ مسکرات میں اس لیے ناکامی ہوئی کہ آبادی کا بڑا حصہ شراب نوشی کی تائید میں تھا۔ امتناع کا قانون بھی دراصل ایک قلیل جماعت کی وجہ سے منظور و نافذ ہوا تھا جو جنگ کے بعد بڑی طاقت ور ہو گئی تھی۔ نفاذِ قانون کے وقت بھی کثرتِ رائے مے نوشی کی حامی تھی مگر اس قانون کی تنسیخ کے بعد لوگوں نے اطمینان کا سانس لیا۔

ملکی قوانین و بین الاقوامیت:

امریکہ میں توطن پذیری کے خلاف اس لیے قوانین نافذ کیے گئے کہ امریکی اپنے معیار زندگی اور معاشرتی مرتبت کو بیرونی اثرات سے محفوظ رکھنا چاہتے ہیں۔

اس سوال پر کہ بین الاقوامیت کے متعلق امریکہ کا کیا طرزِ عمل ہے، ڈاکٹر سید حسین نے فرمایا کہ جنگ اور جنگ کے بعد کے زمانہ میں امریکی نقطہ نظر بین الاقوامی تھا، پریذیڈنٹ ولسن * ہی وہ پہلا شخص ہے جس نے مجلسِ اقوام کی داغ بیل ڈالی لیکن اس کے بعد امریکہ نے ادھر توجہ نہیں کی کیوں کہ اس نے یہ محسوس کیا کہ جنگ میں شریک ہو کر اس نے غلطی کی۔ ثانیاً یہ امر بھی قابلِ ذکر ہے کہ جنگ کے بعد اکثر بڑی طاقتوں نے ممالکِ متحدہ کے قرضۂ جنگ کی ادائی کی جانب توجہ نہیں کی بلکہ گذشتہ چند سال میں اس قرض کا سود تک ادا نہیں کیا لہٰذا اب امریکہ کسی بیرونی طاقت کا

ساتھ دینے پر آمادہ نہیں ہے اور نہ وہ کسی بیرونی جنگ میں حصہ لے گا۔ البتہ اگر اس پر کوئی حملہ آور ہو تو وہ مدافعت ضرور کرے گا۔

ہندوستان کی تاریخی عظمت:

ڈاکٹر سید حسین نے ہندوستان کے حالات پر تبصرہ کرتے ہوئے فرمایا کہ اگر ہندوستان اپنی گذشتہ عظمت حاصل کرنا چاہتا ہے تو اس کے لیے محض سیاسی آزادی ہی حاصل کرنا کافی نہیں ہے۔ سیاسی آزادی تو بہر صورت حاصل ہو جائے گی اور ہونا بھی چاہیے لیکن ہندوستانی مرد اور عورتوں کو سب سے پہلے حقیقی ہندوستان کی از سرِ نو تلاش کرنی چاہیے۔ اس ہندوستان کی جس نے دنیا میں مذہب، فلسفہ اور تہذیب میں مشعلِ ہدایت روشن کی تھی۔ اگر ہندوستانیوں میں ذرا بھی روشن دماغی ہے تو انھیں سب سے پہلے یہ تسلیم کرنا چاہیے کہ ہندوستانی جو کسی زمانہ میں عروج کے انتہائی نقطہ پر تھے، آج انتہائی پستی کی حالت میں ہیں۔ اس کے بعد انھیں فکر کرنا چاہیے کہ گذشتہ عظمت کیسے حاصل کی جا سکتی ہے؟

یہ ایک امرِ واقعہ ہے کہ ابتدائے آفرینش سے تمدّن کے ارتقا میں تسلسل جاری ہے اور خیالات اور تہذیب میں باہمی تبادلہ ہوتا رہا ہے۔ مورّخین نے یونان کو دنیا کا سب سے قدیم تمدّن بتلایا ہے لیکن اب یہ مسلّمہ ہے کہ یونانیوں[380] نے بھی مصری[381] اور ایرانی تمدّن[382] سے اکتساب کیا تھا۔ رومہ کی عالمی شہنشاہیت[383] یونانی بنیادوں پر قائم ہوئی تھی، موجودہ مغربی تمدّن[384] اور رومہ کے تمدّن کی شکست کے درمیان پورے ایک ہزار سال کی خلیج واقع ہے اور یہ وہ زمانہ تھا کہ یورپ اسلامی تمدّن[385] کے زیرِ اثر تھا۔ لیکن ان سب تمدنوں میں ہندوستان کے تمدّن کو سب پر اوّلیت حاصل ہے کیوں کہ یہ سب سے قدیم ہے[386] اور یہ دنیا کی تاریخ کی ایک حیرت ناک حقیقت ہے کہ وہ اب تک زندہ ہے اور اس میں آئندہ بھی زندہ رہنے کی طاقت ہے۔ یوں تو دنیا میں مصری[387]، بینر نطانی[388]، یونانی[389]، رومی[390] اور کارتھیج[391] کے تمدّن آئے اور فنا ہو گئے لیکن صرف ایک ہندوستانی تمدّن ایسا ہے جو فنا کی گود میں پرورش پاکر بھی زندہ ہے اور ابھی تک اس کا سماجی، روحانی اور تہذیبی اثر باقی ہے۔ ہندوستانی تمدّن کے متعلق لارڈ کرزن* نے کہا تھا کہ نوعِ انسان کی تاریخ، مذہب اور فلسفہ پر دنیا کے دوسرے تمدّنوں کے مقابلہ میں ہندوستان نے سب سے زیادہ گہرے اثرات چھوڑے ہیں۔ اب ہندوستانی طلبا کو یہ معلوم کرنا چاہیے کہ کیوں ہندوستان جو کسی زمانہ میں نُور اور ہدایت کا سرچشمہ اور روحانی عظمت کا مسکن تھا آج اخلاقی پستی کے آخری درجہ پر ہے؟ ہندوستانیوں کے ہاتھ میں ایک شمع تک نہیں ہے کہ وہ جدید تمدّنوں کو روشنی بتلا سکیں، اس کی آخر کیا وجہ ہے؟ اس کے لیے طلبا کو سائنٹفک طریقوں

سے یہ معلوم کرنا چاہیے کہ تنزّل کیوں واقع ہوا اور عظمتِ ماضی کے حصول کے کیا طریقے ہو سکتے ہیں؟ سوال یہ ہونا چاہیے کہ اب ہندوستانی کیا کر رہے ہیں؟ نہ یہ کہ ان کے اسلاف نے کیا کیا؟ اسلاف نے تو دنیا کو اپنا سب کچھ دے دیا۔۔۔ مذہب، روحانیت اور فلسفہ، جس پر ہندوستان کو آج بھی ناز ہے۔

مولوی سجاد مرزا:

مولوی سجاد مرزا صاحب ایم۔اے۔ (کنٹب*) عثمانیہ ٹریننگ کالج کے پرنسپل اور ملک کے مشہور تعلیمی رسالہ "المعلم" کے مدیر ہیں۔آپ کا تعلیمی تجربہ بہت وسیع ہے اور آپ نے اردو میں کئی تدریسی کتب کا اضافہ فرمایا ہے۔ آپ کا "اُردو کا قاعدہ" اُردو کا بہترین قاعدہ سمجھا جاتا ہے جس میں بچوں کی فطرت ان کے ذوق اور میلانِ طبع کو خاص طور پر ملحوظ رکھا گیا ہے۔

آپ کا قیام انگلستان میں ۱۹۱۸ء تا ۱۹۲۰ء رہا۔آپ نے ۱۹۲۵ء میں جاپان* کی اور ۱۹۳۷ء میں یورپ و ترکی کی سیاحت بھی فرمائی ہے۔

تعلیمی حالات:

حصولِ علم کے لیے جو لوگ ہندوستان سے انگلستان جاتے ہیں انھیں سب سے زیادہ اس امر پر تعجب ہوتا ہے کہ وہاں کی بڑی بڑی جامعات اور مدارس کی حیثیت خانگی ہے اور اُن کے نظم و نسق اور اخراجات کو مرکزی حکومت سے کوئی تعلق نہیں ہوتا، ان کے سیاہ و سفید کے مالک ایسے اشخاص ہوتے ہیں جنھیں حکومت یا اس کی ملازمت سے کوئی دلچسپی نہیں ہوتی اور حکومتی مداخلت کو روکنے کی کوشش کی جاتی ہے۔ چناں چہ جنگِ عظیم کے دوران میں جب آکسفورڈ اور کیمبرج کے اخراجات کی تنقیح کے لیے مرکزی حکومت نے کوشش کی تو اس کے خلاف سخت احتجاج کیا گیا۔ حقیقت میں قابلِ مبارک باد ہے وہ قوم جس نے حکومتی امداد کے بغیر برسوں سے اپنے نونہالوں کی تعلیم کا اتنا بہتر اور اعلیٰ انتظام کیا ہے اور اُن تعلیمی اداروں کے دروازے بلا تفریقِ مذہب و ملت، دنیا کے ہر فرد کے لیے کھولے ہیں۔

تربیتِ اطفال:

یورپ کی اقوام نے عرصۂ دراز سے انسان کی مساوات کے اصول کو تسلیم کیا ہے اور وہاں ہر شخص کو ہر معاملہ میں یکساں موقعے حاصل ہیں۔اصولِ مساوات میں تقویت کے ساتھ ساتھ بچہ کی اہمیت بھی بڑھنے لگی اور ایک ایسا دَور

آگیا جب بچہ کی تعلیم و تربیت والدین کے ہاتھوں سے نکل کر حکومت کے ہاتھ میں آگئی۔ پانچ برس کے عمر سے تعلیم جبری اور مفت کر دی گئی۔

یورپ کے کسی ملک میں بچوں کو نہ صرف کتابیں، کاپیاں، پنسل اور درستی مشاغل کے سامان مفت حکومت کی جانب سے دیے جاتے ہیں بلکہ اُن کا علاج معالجہ بھی مفت کرایا جاتا ہے۔ اوقاتِ مدرسہ میں اُنھیں موزوں غذا کھلائی جاتی ہے جو نہ صرف صحت مند اور ارزاں ہوتی ہے بلکہ والدین چاہیں بھی تو ایسا انتظام نہیں کر سکتے۔ ہر بچہ کو دن میں ایک مرتبہ پاؤ پاؤ بھر دودھ پلایا جاتا ہے۔ لندن میں دودھ اتنا سستا ہے کہ اس کی قیمت فی سیر ایک پنی[392] یا دو آنہ ہے۔ یہ سب کچھ ایسے مادہ پرست ملک میں ہے جہاں گائے کی پرستش تو نہیں بلکہ اُس کی پرورش دودھ کی خاطر کی جاتی ہے۔

اس میں شک نہیں کہ موثر تعلیمی نتائج کے لیے متذکرہ سہولتوں کے علاوہ موزوں عمارت، بازی گاہ، مناسب اور کافی فرنیچر اور آلاتِ تعلیمی کا ہونا ضروری ہے اور ان چیزوں کی طرف یورپ میں خاص توجہ صرف کی جاتی ہے لیکن مولوی سجاد مرزا صاحب نے بعض ایسے بھی مدارس دیکھے ہیں جو ہماری طرح مشکلات میں گھرے ہوئے تھے۔ مگر اس کے باوجود ان حالات پر قابو حاصل کیا گیا تھا کیوں کہ جب اُصول پر پورا پورا اعتماد ہو تو ان کی تکمیل کے لیے کوئی نہ کوئی راستہ ضرور نکال لیا جا سکتا ہے۔ تعلیت سے تجربہ اور تجربہ سے علم حاصل ہوتا ہو اور علم کے بعد غور و فکر کا مادہ پیدا ہوتا ہے۔

عورت کی زندگی:

انگلستان کے ساحل پر قدم رکھتے ہی دوسری چیز جو جاذبِ نظر ہے وہ عورتوں کو آزادانہ چلتے پھرتے، کام کاج کرتے اور ہر صحبت میں شریک ہوتے دیکھ کر ششدر رہ جانا ہے۔ جنگِ عظیم کے پہلے عورتوں نے مردوں کے مساوی حقوق تو حاصل کر لیے تھے لیکن یہ خیال عام تھا کہ عورتیں پھر بھی صنفِ نازک سے تعلق رکھتی ہیں اس لیے مردوں کو ان کا پاس و لحاظ کرنا چاہیے، محنت طلب اور جوکھم کے کام مرد ہی کو انجام دینے چاہیں لیکن جب گولی بارود کے بے دھڑک استعمال سے ہزاروں نوجوانوں کی جانیں ضائع ہونے لگیں تو جنگ کے جاری رکھنے کے لیے ضرورت محسوس ہوئی کہ ایسے پیشے جو صرف مردوں کے لیے مخصوص تھے ان میں عورتوں کی بھرتی ہونی چاہیے۔ چناں چہ جب رہے سہے ادھیڑ عمر کے مرد بھی میدان جنگ روانہ ہونے لگے تو اُن کی جگہ عورتوں کو لینی پڑی۔ سرکاری محکموں میں عورتیں بھر گئیں، عورتیں موٹرران[393] ہو گئیں، پولیس میں داخل ہو گئیں اور سوائے میدانِ جنگ میں لڑائی لڑنے کے، دوسرے ہر قسم کے فوجی کام کرنے لگیں، اس کا لازمی نتیجہ یہ ہوا کہ معاشری حیثیت سے بھی عورتوں کو مردوں کے

مساوی حقوق حاصل ہو گئے اور اب یہ حالت ہے کہ اگر بھولے بسرے کوئی مردان کی صنف کے خیال سے پاس ولحاظ کرتا ہے تو وہ اس کو حقارت کی نظر سے دیکھتی ہیں اور اپنے لیے اس قسم کا برتاؤ باعثِ ذلّت تصوّر کرتی ہیں۔

عورت کا سماجی اور سیاسی حیثیت سے مرد کے مساوی اور ہم پلہ ہونے کے بعد یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ اُن کے اخلاق کس قسم کے ہوں گے؟ شرم و حیا جو عورت کا حقیقی زیور ہے اس کی کیا نوعیت ہو گی؟ ازدواجی تعلقات نے کیا صورت اختیار کی ہو گی؟ اکثر لوگوں کو یہ سن کر غالباً تعجب ہو گا کہ انگلستان میں دوسرے ممالک کی طرح کوئی عورت اپنے حسن و جمال کو ذریعہ آمدنی نہیں بنا سکتی۔ انگلستان کا قانون اس قسم کے پیشہ کو قطعاً ممنوع قرار دیتا ہے۔ اس سے ظاہر ہے کہ وہاں نہ صرف عورتوں کے لیے بلکہ مردوں کے لیے بھی اخلاق کا معیار بہت بلند ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ معاشی کشمکش ہر جگہ بالخصوص عورت کی اخلاقی خرابی کا باعث ثابت ہوئی ہے اور مصلحانِ مغرب نے جب اس نکتہ کو سمجھا تو انھوں نے معاشی حالت کی درستی کو مضبوط ترین ذریعہ اصلاح اور استحکام اخلاق گردانا۔ بادی النظر میں یہ خیال ہوتا ہے کہ عورت کی آزادی مخربِ اخلاق ہوئی ہے لیکن غور سے دیکھا جائے تو خود آزادی بڑی ذمہ داریاں عائد کرتی ہے اور انگلستان کی عورت جتنی آزاد ہے اتنی ہی وہ اپنی عفت و عصمت کی زبردست پاسبان بھی ہے۔ جنگِ عظیم میں جس طرح یورپ کی قوموں نے اپنا خون بہایا، عورتوں نے سخت ترین مصائب جھیلے اور زبردست مشکلات کا مقابلہ کیا اس سے ثابت ہوتا ہے کہ ان کے اخلاق کا معیار کتنا بلند ہے جس سے ہر شخص سبق حاصل کر سکتا ہے۔

حریّت و مساوات کی بدولت ازدواجی زندگی بھی خوش گوار ہوتی ہے کیوں کہ ایسے ہی لوگ شریکِ زندگی بنتے ہیں جو ایک دوسرے سے واقف اور اپنے اخراجات کے کفیل ہوتے ہیں، دونوں اپنی ذمہ داریوں کو خوب سمجھتے ہیں اور اپنی اولاد کو اپنے سے زیادہ بہتر زندگی بسر کرنے کے لیے تیار کرتے ہیں۔ چناں چہ نسلاً بعد نسلاً تموّل، تہذیب اور شائستگی میں ترقی کا سلسلہ برابر قائم رہتا ہے۔

ہمارے ملک میں عام طور پر یورپ کی حریّت پسند عورتوں کے متعلق بڑی غلط فہمی پھیلی ہوئی ہے۔ ہمارے ملک کی فضا ایسی ہے کہ یورپ کی عورتوں کے بجائے اگر ترکی یا عراق* کی عورتوں کے حالات کا تذکرہ کیا جائے تو شاید یہ چیز اہلِ ملک کے جمود میں کچھ حرکت کا باعث ثابت ہو۔ کسی اسلامی ملک کا کونہ کونہ چھاننے پر بھی وہ "پردہ" نظر نہیں آئے گا جو ہندوستان میں عورتوں کی زندگی کا جزوِ اعظم بنا دیا گیا ہے۔ ترکی میں حرم سرا کی زندگی نے عورتوں کے عادت و اخلاق خراب کر دیے تھے، ان کے قویٰ کمزور ہو گئے تھے، اُن میں مختلف امراض مثلاً تپ دق[394]، سُل[395] پیدا ہو گئے تھے ان میں ذہنی انحطاط پیدا ہو گیا تھا اور خودداری مفقود ہو گئی تھی، ان کے دل میں یہ بات بیٹھ گئی تھی کہ

عورت کا ذریعۂ معاش صرف ایک ہی ہے یعنی اپنی صنف کا استعمال۔ ظاہر ہے ان حالات اور ایسے تاریک ماحول میں کس قسم کے بچے پیدا ہوں گے اور اُن کی نشو و نما کا نازک زمانہ کس فضا میں بسر ہو گا۔ یہی وہ اسباب ہیں کہ ترکی کے محبّانِ قوم نے حرم سرا کی مصنوعی زندگی کو یک لخت مِسمار کر دیا اور ترک عورت کو صدیوں کی غلامی و بے چارگی سے نجات دلائی۔

ہندوستانی عورت کے یاس انگیز حالات کے متعلق مولوی سجاد مرزا صاحب کے دماغ میں جو سوالات پیدا ہوئے وہ یہ ہیں کہ کیا نحیف، مریض اور غمگیں عورت کا بچہ تنومند، صحت ور اور خوش مزاج ہو سکتا ہے؟ کیا تنگ خیال عورت کا بچہ روشن خیال اور کیا مقیّد عورت کا بچہ آزاد ہو سکتا ہے؟

مولوی قادر حسین خان:

مولوی قادر حسین خان صاحب۔ ایم۔ اے، بیرسٹرایٹ لا، نظام کالج کے پرنسپل اور جامعہ مدراس کے سینٹ، اکاڈمک کونسل اور سنڈیکیٹ کے رکن ہیں۔ آپ سر رشتہ معلوماتِ عامہ[396] سرکارِ عالی کے ۱۹۱۳ء تا ۱۹۳۴ء ناظم رہ چکے ہیں۔ معاشیات[397] و نظمِ عامہ[398] آپ کے خاص مضامین ہیں جن پر آپ نے جامعہ آکسفورڈ، لندن اور پیرس *میں تحقیقات بھی فرمائی ہیں۔ انگلستان میں آپ کا قیام ۱۹۲۰ء تا ۱۹۲۸ء رہا۔

یورپ کی تقلید:

یورپین اقوام کی زندگی کی تقلید کرنے کی ہمیں مطلق ضرورت نہیں ہے۔ یورپ نے بہت سی چیزیں ہم سے سیکھی ہیں، ہم ان چیزوں کو بھلا بیٹھے ہیں اور ہم پر ادبار کی گھٹا چھائی ہے، یورپ ان پر عمل پیرا ہے اور بامِ ترقی پر ہے۔

قرونِ وسطی تک یورپ پر جہالت کی تاریکی چھائی ہوئی تھی۔ اس ظلمت میں مسلمانوں نے شمعِ ہدایت روشن کی اور اپنے زندۂ جاوید کارناموں سے یورپ کے تنِ مردہ میں بیداری کی روح پھونکی۔ یہ وہ زمانہ تھا کہ مسلمان اپنی ترقی کے اوج پر تھے۔ جہاں آج بھی یورپ اخلاقی نقطۂ نظر سے باوجود اتنی تہذیب و تمدّن کے، اس معیار کو نہیں پہنچا ہے۔

نظرِ غائر سے دیکھنے والوں کو اسلامی اور یورپین تہذیب میں ایک بڑا فرق محسوس ہو گا، وہ یہ کہ آخر الذکر کی بنیاد عیسائیت پر قائم ہے۔ ایسی عیسائیت پر، جس کے خدا کے تصوّر کو عقلِ انسانی تسلیم نہیں کر سکتی، جہاں انسانی اعمال کی کوئی حقیقت نہیں اور جہاں گناہ کا تصور انسانی کفارہ پر رکھا گیا ہے۔ یہی وہ تہذیب ہے جس سے ہم درسِ بصیرت حاصل کرنا چاہتے ہیں۔ اسلام کی بنیادیں ایسی کھوکھلی نہیں ہیں، یہاں ہر چیز فطرتِ انسانی کے مطابق ہے۔ علاوہ ازیں یورپ کی

ترقی نتیجہ ہے صدیوں کی مسلسل سعی و کاوش کا۔ مسلمانوں نے صرف تین سو سال کے قلیل عرصہ میں اتنی ترقی کی تھی کہ یورپ ابھی صدیوں تک یہ بات پیدا نہیں کر سکتا۔

اسلامی اصول:

آج بھی اسلامی اصول یورپ کے لیے سرمایۂ بصیرت ہیں۔ یورپ میں گداگری قانوناً ممنوع ہے لیکن افلاس زدہ لوگوں کی تعداد میں کمی نہیں ہوئی۔ کیا ہماری زکوٰۃ کے بعد معاشرہ کو ایک بھی شخص محتاج رہ سکتا ہے؟ یورپ میں قانوناً صرف ایک عورت سے شادی کی جاسکتی ہے لیکن بداخلاقی عام ہے۔ عورتوں کے بے راہ روی اور حیا سوز آزادی، ناجائز اولاد کی کثرت اور طلاق کی زیادتی اس قانون کے اٹل ہونے کے نتائج ہیں۔ اسلام نے خاص حالات میں ایک سے زیادہ بیویوں کی اجازت دی ہے اور اس قانون کی مصلحت اور عمدگی کا اندازہ یورپ کے حالات دیکھ کر ہی کیا جاسکتا ہے۔ اس طرح شراب خوری اور جوئے بازی کی کثرت کی وجہ سے یورپین سوسائٹی میں بہت سے خرابیاں پیدا ہوگئی ہیں جو فوری اصلاح کی محتاج ہیں۔ اسلامی قانونِ وراثت یورپ کے قوانینِ وراثت سے بہتر اور اعلیٰ ہیں۔ یہ نہیں کہ انگلستان کی طرح صرف فرزندِ اکبر ہی ساری جائیداد کا مالک بن بیٹھا اور دوسرے ہوا پر اُڑ گئے۔ اسلام میں ہر شخص اپنے پاؤں پر کھڑا کر دیا جاتا ہے۔ دولت کی تقسیم اور سیال پذیری جتنی اسلام میں ہے وہ کہیں نظر نہیں آتی۔ حقیقت یہ ہے کہ اشتراکیت * کے بہترین اصول اسلام میں موجود ہیں۔

یورپ کی معاشی ترقی کی بنیاد سود خوری پر ہے جس کی وجہ سے سوسائٹی میں ایک ایسے مفت خور طبقہ کا اضافہ ہو گیا ہے جو اپنا بے کار پیسہ کفالتوں اور دیگر سودی کاروبار میں لگا کر محض دولت بٹور رہا ہے یہی وجہ ہے کہ وہاں سرمایہ اور محنت میں سخت کشمکش جاری ہے جس سے پوری سوسائٹی متاثر ہے۔ ان دونوں طبقوں میں جو خلیج حائل ہے اس کو عبور کرنے کے لیے آئے دن تجاویز پیش ہوتی رہتی ہیں لیکن کوئی نتیجہ برآمد نہیں ہوتا کیوں کہ جب تک ملک میں ایک طبقہ مال دار اور اس کے مقابلہ میں دوسرا مفلس موجود ہے تو دونوں میں آویزش کا پیدا ہونا لازمی ہے۔

اس کے برخلاف اسلامی اصول اور قوانین ایسے ہیں کہ ان سے افراد میں معاشی کشمکش کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا کیوں کہ اس کشمکش کی جو بنیاد ہے یعنی سود، اس کو اسلام نے حرام قرار دیا ہے۔ اس طرح منافع کمانے کے لیے بھی اسلام نے طریقے بتلائے ہیں، قحط سالی کے زمانہ میں اجناس کا جمع کر لینا تا کہ زیادہ سے زیادہ منافع حاصل کیا جائے، ہمارے پاس جائز نہیں ہے۔

خاتمہ:

یورپ کی ترقی اگر محنت اور تنظیم کا نتیجہ ہے تو کیا اسلام نے محنت کی تلقین نہیں کی ہے اور کیا مسلمانوں میں تنظیم نہیں تھی۔ ان کی تنظیم اور ضبط ہی نے انھیں ایک قلیل مدّت میں دنیا کے فاتحین کی صفِ اوّل میں لا کھڑا کر دیا تھا۔ یورپ میں کوئی شخص محنت سے جی نہیں چراتا اور کوئی پیشہ اس کی نظروں میں ذلیل نہیں ہے لیکن ہمارے لیے سرکاری ملازمت معراج ہے، ہم نے محنت کو عیب سمجھ رکھا ہے۔ ہم نے ساری چیزیں قسمت پر چھوڑ دی ہیں جس کا خمیازہ بھی ہم بھگت رہے ہیں۔

مختصر یہ کہ یورپ کی کون سی ایسی چیز ہے جو ہم میں موجود نہیں ہے یا جو ہم نہیں کر سکتے ہیں، صرف جوش، خلوص اور سلیقہ کی ضرورت ہے۔ کیا آنحضرت صلعم کے اسوۂ حسنہ میں ہمیں وہ سب حاصل نہیں ہو جاتا جس سے انسانیت کی تکمیل ہوتی ہے؟

پروفیسر حسین علی مرزا:

پروفیسر حسین علی مرزا، بیرسٹرایٹ لا، جامعہ عثمانیہ کے شعبۂ قانون کے صدر ہیں۔ آپ کو اصولِ تعلیم سے بے حد دلچسپی ہے اور انگلستان کے حالات کا آپ نے غائر نظر سے مطالعہ کیا ہے۔ قانون بین الاقوام[399] اور تاریخِ دوستوری[400] آپ کے خاص مضامین ہیں۔ "وفاق اور حکومتِ ہند" پر آپ نے انگریزی زبان میں ایک کتاب بھی تحریر فرمائی ہے جو زیرِ طبع ہے۔ آپ کا قیام انگلستان میں ۱۹۲۰ء تا ۱۹۲۴ء رہا۔

تعلیم:

انگلستان میں اعلیٰ تعلیمی ادارات زیادہ تر خانگی جدوجہد کا نتیجہ ہیں۔ زمانۂ قدیم میں جامعات اور کالجوں کا قیام مذہبی اوقاف کے ذریعہ ہوتا تھا، آکسفورڈ اور کیمبرج کی بنا اس طرح ہوئی لیکن انگلستان میں ابتدائی جبری تعلیم کا آغاز ۱۸۷۰ء کے بعد سے ہوا جب کہ جرمنی میں سماجی قانون سازی کی تحریک[401] زوروں پر تھی لیکن اس کے باوجود انگلستان میں تعلیم کی توسیع واشاعت کا یہ عالم ہے کہ اپنے چار سال کے قیام میں پروفیسر حسین علی مرزا کو انگلستان میں صرف ایک شخص ایسا ملا جو اَن پڑھ تھا اور جس کی وجہ اس نے اپنا مفلوج ہونا بیان کیا۔

انگلستان میں پبلک اسکول کا طریقہ بھی بہت ہی قدامت سے چلا آرہا ہے لیکن ان جملہ قدیم ادارات کی خصوصیت یہ ہے کہ یہاں تعلیم ایک خاص اصول اور نصاب کے تحت دی جاتی ہے جو بیسویں صدی کی عملی زندگی کی ضروریات کے لیے ناکافی ہے اور اس کمی کو نئی جامعات اور ادارات کے قیام کے ذریعہ پورا کیا جارہا ہے، چناں چہ لندن

میں برناڈشا*، سڈنی وب*اور گراہام والس* کی کوششوں سے ایک مدرسۂ معاشیات قائم کیا گیا ہے جہاں نہ صرف اجرتِ تعلیم ہی کم رکھی گئی ہے بلکہ پڑھائی کے اوقات بھی صبح و شام ایسے رکھے گئے ہیں کہ ہر شخص اپنی سہولت اور فرصت کے لحاظ سے استفادہ کر سکتا ہے،آج اس مدرسۂ معاشیات[402] نے ایک بین اقوامی اہمیّت حاصل کر لی ہے اور ہر شعبۂ علم کی ڈگری جو بہت ہی مستند تسلیم کی جاتی ہے، یہاں سے حاصل کی جاسکتی ہے، یورپ کے جملہ ممالک کے طلبا یہاں جمع ہوتے ہیں اور یہاں کے اساتذہ بین الاقوامی شہرت کے مالک ہیں جیسے گراہم والس آں جہانی*، لی سمتھ ایم۔ پی*، پروفیسر لاسکی*، ڈاکٹر گریگری*، ڈاکٹر ولف* وغیرہ۔

اس ادارے کی طرح لندن میں ایک اور ادارہ "حرفت" ہے جہاں پر ہر قسم کی پیشہ ورانہ تعلیم کا انتظام ہے اور درس کے اوقات بھی صبح و شام کے ہیں۔

تعلیم یافتہ بے روزگاری:

میرے اس سوال پر کہ ملک میں تعلیم اتنی عام ہونے کے باوجود وہاں تعلیم یافتہ بے روزگاری کا سوال کیوں نہیں پیدا ہوتا، آپ نے فرمایا کہ اپنے چار سال کے قیام میں آپ کو ایک بھی طیلسانی[403] ایسا نہیں ملا جو بے روزگار ہو۔ البتہ جسمانی محنت کرنے والوں میں بے روزگاری شدّت سے پائی جاتی ہے جو نہ صرف انگلستان تک محدود ہے بلکہ یورپ کے ہر صنعتی ملک کا یہی حال ہے۔ یورپ میں بے روزگاری کے اسباب بین الاقوامی ہیں اور اُس کا تعلق دنیا کی تجارت سے ہے لیکن تعلیم یافتہ بے روزگاری کے نہ ہونے کی یہ وجہ ہے کہ بچوں کی تعلیم شروع ہونے کے قبل ہی سے والدین کو حکومتی اور خانگی اداروں کے ذریعہ یہ معلومات آسانی سے مہیا ہوتے رہتے ہیں کہ کس قسم کے افراد کی کھپت کس قسم کے پیشوں میں ہے یا ہونے والی ہے اور اسی لحاظ سے بچوں کو تعلیم دلائی جاتی ہے اور اس معاملہ میں بچوں کے ذہنی رجحانات کو خاص طور پر ملحوظ رکھا جاتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ بہت کم طلبا فنون کی ڈگریوں کی طرف توجہ کرتے ہیں اور جو ادھر رہ جاتے ہیں ان کے لیے پوری سلطنت برطانیہ کے دروازے کھلے ہوئے ہیں لیکن آج کل چوں کہ شہنشاہی علاقوں میں بھی قومی جذبات ترقی پذیر ہیں للہٰذا انگلستان میں تعلیم یافتہ بے روزگاروں کی تعداد بھی آہستہ آہستہ بڑھ رہی ہے۔

نقائص:

یورپی طرزِ تعلیم کے متعلق اوپر جو کچھ کہا گیا ہے اس سے بادی النظر میں یہ اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ وہاں کے تعلیمی حالات شاید بہترین ہیں اور ان میں اب مزید ترقی کی گنجائش نہیں ہے اور اس سے لازماً یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ کیا

تمام ایشیائی ممالک کو تعلیمی معاملات میں یورپ کی اتّباع کرنی چاہیے۔ اگر نظرِ غائر سے دیکھا جائے تو معلوم ہوگا کہ یورپ کے نظامِ تعلیم میں بعض بنیادی نقائص بھی پائے جاتے ہیں۔ انیسویں صدی سے یورپ کا رجحان ہر شے میں پیدائش بر پیمانہ کبیر کی جانب رہا ہے جس کا اثر غیر شعوری طور پر تعلیمی ادارات پر بھی پڑا جہاں سے فیکٹریوں یا کارخانوں کی کسی پیداوار کی طرح طلبا ایک مقررہ معیار کے بموجب، جس کو عام اصطلاح میں 'امتحان' کے نام سے موسوم کیا جاتا ہے، بڑی تعداد میں نکلنے لگے۔ اس میں شک نہیں کہ آج کل طلبا کی انفرادی خصوصیات کو اجاگر کرنے کے لیے بہت سے نئے تجربات کیے جارہے ہیں، خاص کر تحتانی تعلیم میں، لیکن اس کے باوجود عام رجحان پیدائش بر پیمانہ کبیر ہی کی جانب ہے، یہ ایک بڑا نقص ہے۔

دوسری خرابی یہ ہے کہ تعلیمی نصاب اور ماحول کچھ اس قسم کا ہے کہ بین الاقوامی مطمعِ نظر کے مقابلہ میں قومی نقطۂ نظر پر زیادہ توجہ صرف کی جاتی ہے جس کا لازمی نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ اقوامِ عالم میں باہمی کشمکش اور منافرت کے جذبات پرورش پاتے ہیں اور جنگ کے لیے میدان صاف ہوتا ہے۔ بظاہر جنگ کے اسباب معاشی ہوا کرتے ہیں لیکن آج کل اس کا اصلی سبب یہ ہے کہ اقوام کو آپس میں ایک دوسرے سے نفرت ہے اور ہر قوم اپنے آپ کو ہر معاملہ میں دوسرے کے مقابلہ میں برتر و بالا سمجھنے پر مجبور ہوگئی ہے۔ چناں چہ ان ہی خیالات کے پیشِ نظر تعلیمی نصاب بھی مرتب ہوتا ہے اور ابتدا ہی سے بچوں کے دلوں میں قوم پرورانہ خیالات جاگزیں کیے جاتے ہیں۔ اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ یورپ اور سارے عالم کا امن برقرار نہیں رہ سکتا۔ لہٰذا افسوس کے ساتھ اس امر کا اظہار کیا جاتا ہے کہ یورپی طریقۂ تعلیم نے دنیا میں ممکن ہے اچھے سائنس دان، صنّاع اور سپاہی پیدا کیے ہوں لیکن امن پسند شہریوں کے پیدا کرنے میں یہ نمایاں طور پر ناکام ثابت ہوا۔ بعض وقت یہ کہا جاتا ہے کہ بعض قومی اور سیاسی لیڈروں کی وجہ سے عوام جنگ میں شریک ہوتے ہیں، یہ صحیح نہیں ہے کیوں کہ جب تک کسی قوم کے مزاج میں یہ رجحان نہ پیدا ہو جائے کہ اسے کسی دوسری قوم کے مقابلہ میں صف آرا ہونا ہے، اس وقت تک ان پر کسی لیڈر کا اثر قائم نہیں ہو سکتا۔

اس بین الاقوامی مصیبت اور کشمکش کا اگر کوئی حل ہو سکتا ہے تو وہ ایک ہی ہے یعنی یہ کہ امنِ عالم کے قیام کے لیے یورپ اپنے تعلیمی نظام کی بنیادی نقطۂ نظر سے نظرِ ثانی کرے کیوں کہ قومی نقطۂ نظر سے تعلیم دلانا اور بین الاقوامی امن کی توقع رکھنا دو متضاد سی چیزیں ہیں، یہ کام بجز مجلسِ اقوام کے تنہا کسی قوم سے ممکن نہیں ہے۔ بعض وقت یہ بھی خیال کیا جاتا ہے کہ چوں کہ فی زمانہ عورتوں کو پہلے کے مقابلہ میں حقوقِ نمائندگی حاصل ہیں اور وہ سیاسی، سماجی اور معاشی حیثیت سے مرد کے دوش بہ دوش ہیں اس لیے امنِ عالم کے قیام میں ان سے بڑی مدد ملے گی لیکن یہ خیال صحیح

نہیں ہے کیوں کہ عورتیں بھی آخر اسی نظامِ تعلیم کی پیداوار ہیں جو مردوں کے لیے مقرر ہے۔ ایچ۔ جی ولس * کے قول کے مطابق آج کل لوگوں نے قومیت کو اپنا قومی خدا بنالیا ہے جو بین الا قوامیت کا دشمن ہے اور جب تک یہ دشمنی باقی ہے امنِ عالم خطرہ میں ہے۔

ذاتی خصوصیات:

یورپ کے ہر خود مختار ملک میں حب الوطنی کا جذبہ یکساں طور پر پایا جاتا ہے اور اگر قومی احساس اور ایثار کا مادہ کہیں زیادہ ہے تو انگلستان میں ہے۔ برخلاف اس کے ہمدردی اور حریّت کے جذبات فرانس میں بڑھے ہوئے ہیں۔ جتنی باقاعدگی انگلستان میں ہے، اتنی فرانس یا یورپ کے کسی ملک میں نہیں ہے البتہ عام اخلاق فرانس میں زیادہ خوش گوار نظر آتے ہیں۔ انگریز نہ صرف ہندوستانیوں سے دُور اور علیحدہ رہنے کی کوشش کرتے ہیں بلکہ اہلِ یورپ سے بھی انھیں خاصی اجنبیت ہے جس کی وجہ ان کے جغرافیائی حالات ہیں اور یورپ کے جملہ شمالی ممالک کا یہی حال ہے۔ برخلاف اس کے جنوبی یا لاطینی ممالک میں پردیسیوں سے اتنی اجنبیت نہیں پائی جاتی ہے۔

انگلستان میں جبری فوجی خدمت کا طریقہ رائج نہیں ہے لیکن جب ملک پر کوئی آفت آن پڑتی ہے تو ہر شخص اپنی جان و مال کی قربانی کے لیے تیار ہو جاتا ہے۔ یہی جذبۂ ایثار دراصل انگلستان کی ترقی کا راز ہے۔ ایک معمولی انگریز بھی ذاتی مفاد کے مقابلہ میں قومی مفاد کو ترجیح دے گا خواہ اس میں اُسے کتنا ہی نقصان کیوں نہ برداشت کرنا پڑے۔

انگلستان کی ہر جامعہ میں خانگی اشخاص کی جانب سے کثیر چندے جمع ہوتے ہیں تاکہ کسی خاص علم یا فن کی "کرسی"404 قائم کی جائے۔ قوم پرستی کا یہ عالم ہے کہ تعلیمی اور رفاہی کاموں میں حکومت سے زیادہ خانگی اشخاص کو دلچسپی ہے اور اکثر ادارے کلیتہً خانگی سرمایہ سے چلائے جاتے ہیں۔

معیارِ زندگی:

یوں تو اہلِ یورپ کا معیارِ زندگی ہم لوگوں کے مقابلہ میں بہت بلند ہے لیکن اس معاملہ میں خود یورپ کے ممالک میں امتیاز کرنے کی ضرورت ہے۔ مثلاً انگلستان کا معیارِ زندگی اطالیہ سے بہت بلند ہے۔ جہاں معیارِ زندگی بلند ہو تو لازماً ہر شخص کا میلان خود مختارانہ زندگی کی طرف ہو گا چناں چہ انگلستان کی لڑکیاں بھی یہ گوارا نہیں کرتیں کہ چودہ پندرہ سال کی عمر کے بعد اُن کے خورونوش کا بار والدین پر پڑے لیکن جہاں یہ انفرادیت جذبۂ خود مختاری کی نشوونما کے لیے معاون ثابت ہوتی ہے وہاں اخلاق پر بھی اس کا بڑا اثر پڑتا ہے۔ مشرقی نقطۂ نظر سے یہ چیز عجیب معلوم ہوتی ہے کہ یورپ میں اگر بیٹا ضرورتاً باپ سے ایک ڈاک کا ٹکٹ بھی لیتا ہے تو اس کی نیّت اس کو واپس کرنے کی ہوتی ہے یا وہ اس

کی قیمت ادا کر دیتا ہے۔ ایک خاص عمر کو پہنچنے کے بعد بچے اپنے کھانے پینے کا خرچ والدین کو پابندی سے ادا کرتے ہیں اور گھر ان کے لیے ہوٹل بن جاتا ہے۔ یہ نتیجہ ہے ملک کی صنعتی ترقی کا، اس سے خاندان کا قدیم تصوّر کمزور پڑ جاتا ہے اور انفرادیت کا جذبہ ترقی کرتا ہے۔ جہاں انفرادیت کا جذبہ اتنا ترقی یافتہ ہو اور ہر شخص خود مختار رہے وہاں قومی تصورات بھی عجیب و غریب ہوتے ہیں۔ اپنوں سے بے گانگی ایک حد تک جائز سمجھی جاتی ہے لیکن قومی معاملات میں جذبۂ ایثار دیوانگی کی صورت اختیار کر لیتا ہے۔

انگلستان میں حکومت اور رعایا میں قدیم زمانہ کی طرح کسی قسم کی کشمکش نہیں پائی جاتی۔ یہ غالباً برطانوی دستور کی خوبی کی وجہ ہے۔ حکومت میں بظاہر دو جماعتیں ہیں، ایک حکومتی اور دوسری مخالف جماعت اور یہ دونوں اپنے اپنے نقطۂ نظر میں ایک دوسرے کی مخالف ہیں۔ لیکن جب قوم کا معاملہ در پیش ہوتا ہے تو لوگ تمام تفرقے بھول جاتے ہیں اور ملک میں ایک جماعت قائم ہو جاتی ہے۔ چناں چہ جنگ کے زمانہ میں اور حالیہ قومی حکومت[405] کے وقت ایسا ہی ہوا۔ جب کوئی خاص قومی اہمیت کا معاملہ در پیش ہوتا ہے تو دونوں جماعتوں میں سمجھوتہ ہو جاتا ہے اور کوشش کی جاتی ہے کہ ایسے امور کو جماعتی سیاسیات سے بالاتر رکھا جائے۔

عورت:

میرے اس سوال پر کہ یورپ کی عورتوں کی ترقی اور آزادی کی ہماری عورتیں کہاں تک اتّباع کر سکتی ہیں؟ پروفیسر حسین علی مرزا نے فرمایا کہ اس سوال کا جواب دینے کے قبل تمہید کے طور پر بعض چیزوں کا بیان کرنا ضروری ہے۔ ہمارے پاس عام طور پر یہ خیال کیا جاتا ہے کہ یورپ کی عورتوں کی اخلاقی حالت بہت گری ہوئی ہے اور ہم میں بعض ایسے لوگ ہیں جو وہاں کی عورتوں کو بہت ہی ترقی یافتہ سمجھتے ہیں اور چاہتے ہیں کہ ہندوستانی عورتیں ان کی تقلید کریں۔ آپ نے ان دونوں خیالات کی مخالفت کی اور فرمایا کہ اس کی وجہ بظاہر یہ معلوم ہوتی ہے کہ ہندوستان میں اخلاق کے جانچنے کے لیے دو معیار ہیں، مردوں کے لیے ایک اور عورتوں کے لیے ایک۔ ایک مثال کے ذریعہ اس کی یوں توضیح ہو سکتی ہے، اگر کوئی ہندوستانی مرد شراب خور یا آوارہ ہو تو سوسائٹی اس کو اتنا برا نہیں سمجھتی، اس کے برعکس کسی ہندوستانی شریف گھرانے کی لڑکی اگر اپنی عمر میں ایک مرتبہ بھی شراب پی لے یا اتفاقی طور اس سے کوئی لغزش ہو جائے تو سوسائٹی کے نزدیک وہ بدترین گناہ کی مرتکب قرار پاتی ہے اور معاشرہ میں اُس کے لیے کوئی جائے پناہ نہیں۔ یورپ میں عورتوں اور مردوں کے لیے ایک ہی معیار ہے خواہ وہ ان کی برائیوں سے متعلق ہو یا اچھائیوں سے۔ اگر

شراب خوری یاآوراگی مردوں کے لیے جائز تصور کی جاسکتی ہے تو کوئی وجہ نہیں کہ عورتوں کے لیے یہ ناجائز قرار دی جائے۔

یورپ کے اخلاقی حالات پر رائے قائم کرتے وقت ہم سے ایک اور غلطی ہوتی ہے، وہ یہ کہ ہم غیر شعوری طور پر ہندوستان کے متوسط یا اعلیٰ متوسط طبقہ کے اخلاق کا مقابلہ عمومیت سے یورپ کے کام کرنے والے ادنی طبقے کے لوگوں کے اخلاق سے کرتے ہیں۔ ہم اُن کی برائیوں اور کمزوریوں کو دیکھ کر اپنے اعلیٰ اخلاق اور کردار پر دل ہی دل میں خوش ہوتے ہیں اور یہ بھول جاتے ہیں کہ ہمارا مقابلہ بنیادی طور پر غلط ہے کیوں کہ ہم صرف اپنے ایک طبقہ کا وہاں کی جملہ آبادی سے مقابلہ کررہے ہیں۔ دونوں کے مقابلہ کا سائنٹفک طریقہ یہ ہے کہ ہندوستان کی پوری آبادی کے محاسن و معائب کو ترازو کے ایک پلڑے میں اور یورپ کے محاسن و معائب کو دوسرے پلڑے میں رکھ کر دیکھا جائے تو فطرتِ انسانی دونوں جگہ ایک ہی نکلے گی۔ آپ کی رائے میں سوال یہ نہیں ہے کہ سیاہ یا زرد لوگوں کی اخلاقی حالت اچھی ہوتی ہے اور سفید لوگوں کی خراب بلکہ اصل سوال دولت اور عُسرت کا ہے۔ اگر اس چیز کو ایک عام مفہوم میں ادا کیا جائے تو یہ کہا جاسکتا ہے کہ انتہائی عُسرت اور انتہائی دولت سے بداخلاقی پیدا ہوتی ہے کیوں کہ ایک صورت میں عیش و عشرت کی فراوانی ہوتی ہے اور دوسری میں ضرورت کی مجبوری، گویا صرف متوّسط طبقے ہی میں اخلاق کا ایک اعلیٰ معیار قائم رہ سکتا ہے۔

ہم لوگ دراصل معاشری اور معاشی ماحول کا نتیجہ ہیں اور ہمارے اخلاق کا بھی نسل اور رنگ کے بجائے ان ہی حالات پر دار و مدار ہے۔ پروفیسر حسین علی مرزا کا خیال ہے کہ جماعتوں میں لڑکے اور لڑکیوں کے آپس کے میل جول سے ان میں جنسی ترغیبات کا سدِباب ہو جاتا ہے اور جہاں 'ہم تعلیمی' طریقہ کا رواج نہیں ہے، وہاں یہ بات حاصل نہیں ہوسکتی۔ آپ نے فرمایا کہ کیا یہ واقعہ نہیں ہے کہ ہندوؤں یا عیسائیوں کے مقابلہ میں مسلمانوں میں جذبات شہوانی زیادہ ہیں جس کی وجہ بعض لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ ہم گوشت خور ہیں حالاں کہ اہلِ یورپ ہم سے زیادہ گوشت کے عادی ہیں۔ یہاں مسلمانوں سے مراد عامہ الناس اور وہ لوگ ہیں جن پر مذہب اور اسلامی تہذیب کا کوئی خاص اثر نہیں اور جو تہذیبِ جدید کی تقلید میں اندھے ہوگئے ہیں۔ ہمارے مدارس اور تعلیمی ادارات میں مسلمان طلبا جتنی غلط کاریوں کا شکار ہوتے ہیں اتنے دیگر اقوام کے طلبا نہیں ہوتے۔ اس کی وجہ بظاہر اس کے سوا کچھ نہیں معلوم ہوتی کہ ہمارے تمدّن میں عورت اور مرد کے میل جول کے مواقع نہیں ہیں، جس نظر سے ہم اپنے گھر کی عورتوں کو دیکھتے ہیں اسی نظر سے باہر کی عورتوں کو نہیں دیکھتے۔ عورت ہمارے لیے ایک معمّہ ہے، عورت کے متعلق مسلم نوجوانوں میں

جتنا تجسّس پایا جاتا ہے اتنا دیگر اقوام کے نوجوانوں میں نہیں پایا جاتا کیوں کہ انہیں اپنے گھر کی عورتوں کے سوا غیر عورتوں سے گھل ملنے کے مواقع حاصل ہیں جن سے بڑی حد تک جنسی ترغیبات پر قابو حاصل ہو جاتا ہے۔ بہرِ کیف یہ مسئلہ ایسا ہے جس پر مصلحانِ قوم کو سنجیدگی سے غور کرنا چاہیے۔

یورپ کی تقلید:

پروفیسر حسین علی مرزا کا خیال ہے کہ ہماری عورتوں کے لیے یورپین عورتوں کی تقلید مہلک ثابت ہو گی۔ اس کے ہر گز معنی نہیں کہ ہم قدامت پرست رہیں۔ معاشی اور سائنٹفک ترقیات اور اصلاحات کی حد تک ہمیں یورپ کی پیروی کرنی ضروری ہے لیکن ہمیں کسی ایسی تقلید کی ضرورت نہیں جس سے ہماری تہذیب و تمدّن اور قومی خصوصیات کو نقصان پہنچے۔

ہماری تہذیب و تمدّن کی اصلی خصوصیات کو قائم رہنا چاہیے، ترکی کی ترقی کا یہی راز ہے۔ اسلحہ جنگ اور دیگر قومی ضروریات کی حد تک ترک یورپ کی ترقی یافتہ قوموں کی صف میں ہیں مگر ترکی تہذیب کا دامن انھوں نے اپنے ہاتھ سے نہیں چھوڑا اور خانگی زندگی میں یورپ کی غلط پیروی نہیں کی۔ زمانہ کا ساتھ دینے اور اپنی قومی وحدت اور وقار کو قائم رکھنے کے لیے جن چیزوں کی ضرورت ہے ہم کو ان کے حاصل کرنے میں کوئی کسر نہ اُٹھا رکھنی چاہیے۔ مثلاً موٹر[406]، ہوائی جہاز[407]، مشین گن[408]، وائرلس[409]، ریڈیو[410] وغیرہ ایسی چیزیں ہیں کہ ان کے بغیر آج کل کسی قوم کا زندہ رہنا مشکل ہے لیکن خانگی زندگی میں یورپ کی تقلید کرنا اپنی تہذیب کا گلا گھوٹنا ہے۔ کیا میز کرسی اور کانٹے چھری کے استعمال ہی سے ہم ترقی یافتہ کہلائیں گے اور بغیر اس کے نہیں۔ بعض لوگوں کے بچوں کی زبان پر اماں اور ابا کے بجائے "مما" اور "پپا" کے الفاظ ہیں۔ جب ہماری زبان میں پہلے ہی سے الفاظ موجود ہوں تو دوسری زبان کے الفاظ کے اختیار کرنے کے کیا معنی ہیں۔ اس سلسلہ میں آپ نے ایک یورپ زدّہ حیدرآبادی صاحب کا واقعہ بیان فرمایا۔ یورپ میں معمر عورتوں کے حسن اور جوانی کی تعریف کی جائے تو وہ بہت خوش ہوتی ہیں، ایک صاحب نے یورپ سے واپس آنے کے بعد اپنی ماں کی کچھ ایسی ہی تعریف کر جس پر وہ بے چاری تین روز تک روتی رہی، بھلا مشرقی تہذیب ان چیزوں کی متحمل ہو سکتی ہے۔

مغربی تہذیب کس طرح غیر محسوس طور پر ہمارے تمدّن کو تباہ کر رہی ہے اس کا اندازہ اس معمولی واقعہ سے ہو سکتا ہے۔ ایک انگریز نے، جو سیر و سیاحت کی غرض سے حیدرآباد آیا ہوا تھا، ہندوستانی بچوں کے کھلونے[411] دیکھنے کی

خواہش کی کیوں کہ اس سے کسی ملک کے تمدّن اور ذہنی ارتقا کا پتہ چلتا ہے لیکن باوجود تلاش کے کسی گھر میں یہ دستیاب نہ ہو سکے، ہر جگہ مغربی کھلونوں ہی کی بھرمار تھی۔ بالآخر نواب سالار جنگ بہادر* سے استدعا کی گئی اور موصوف نے قدیم وضع کی کچھ گڑیاں بنوا کر اس انگریز کو عنایت فرمائیں۔ بہرکیف مغربی طرزِ زندگی کی تقلید میں اخراجات اتنے بڑھ جاتے ہیں کہ نہ صرف قرض کی مصیبت ہی مول لینی پڑتی ہے بلکہ ہر جائز و ناجائز طریقوں سے آمدنی میں اضافہ کی کوشش کی جاتی ہے۔ حتیٰ کہ آج کل نوجوان اپنی شادی بھی اس مقصد سے کرتے ہیں کہ بیوی کے پیسہ سے ٹھاٹھ کیے جائیں۔

مغربی عورتوں سے شادی کے متعلق پروفیسر حسین علی مرزا نے فرمایا کہ رفتہ رفتہ یہ چیز ہماری نسل اور خون کی خرابی کا باعث ثابت ہوگی اور ہماری حیثیت آئندہ چل کر چٹیکاروں کی سی ہو جائے گی۔ ایک انگریز عورت سے شادی کرنے کے بعد کیا یہ توقع کی جا سکتی ہے کہ ہماری تہذیب و تمدّن کے اعلیٰ روایات برقرار رہ سکیں اور کیا ہماری اولاد اُن چیزوں کی جائز وارث ہو سکتی ہے جو ہماری معاشرت کا جزوِ لاینفک ہیں اور پھر اس شادی کے معاملہ میں بھی ہم میں وہی دو عملی ذہنیت کارفرما ہے۔ جس طرح ایک ہندوستانی نوجوان ایک مغربی عورت سے شادی کر لیتا ہے کیا وہ اس کو گوارا کر سکتا ہے کہ اس کی بیٹی یا بہن یا کوئی اور قریبی عزیزہ کسی غیر قوم کے مرد سے شادی کر لے۔

ڈاکٹر جے سوریا:

ڈاکٹر جے سوریا۔ ایم۔ ڈی (برلن*) مسز سروجنی نائڈو* کے فرزندِ اکبر ہیں۔ پیشہ کے لحاظ سے آپ ڈاکٹر ہیں لیکن معاشیات و اقتصادیات سے بھی آپ کو غیر معمولی دلچسپی ہے اور ان علوم میں آپ کو اچھی بصیرت حاصل ہے۔ اپنے تیرہ سالہ قیام یورپ میں آپ نے جرمنی، روس، انگلستان اور دیگر یورپی ممالک کا غائر نظر سے مطالعہ کیا ہے۔

آپ کا قیام یورپ میں ۱۹۱۲ء تا ۱۹۳۴ء رہا۔

برطانوی تہذیب:

جب یورپ اور یورپین تہذیب کا ذکر آتا ہے تو اکثر ہندوستانی غیر ارادی طور پر برطانوی تہذیب مراد لیتے ہیں۔ اس خام خیالی کی بادی النظر میں یہ وجہ معلوم ہوتی ہے کہ یورپین زبانوں کے من جملہ ہم صرف انگریزی زبان ہی سے واقف ہیں اور بعض ایسے بھی اسباب ہیں (جو فی الوقت ہمارے قابو سے باہر ہیں) جس کی وجہ سے ہم انگلستان کو نافِ علم سمجھنے پر مجبور ہیں۔ کیوں کہ برطانوی ڈگریوں کو ہندستان میں سارے جہاں کی ڈگریوں کے مقابلہ میں "شاہی ترجیح" حاصل ہے۔ اور یہ ڈگریاں تجارتی نقطہ نظر سے اتنی ارزاں بھی ہیں کہ ایک معمولی تعلیم یافتہ شخص انگلستان جاکر اگر کوئی خانگی اتالیق (جس کی فیس زیادہ ہوتی ہے) مقرر کرلے تو وہ آسانی سے کوئی نہ کوئی ڈگری یا ڈپلومہ لے کر واپس آ جاسکتا ہے اور یہاں اس کی قدر میں چار چاند لگ جاتے ہیں اور اُسے کم از کم کسی دیسی ریاست میں تو ایک اعلیٰ ملازمت مل جاتی ہے۔

ہندوستانی اچھوت:

لیکن مشکل یہ ہے کہ وہ اوسط طالب علم جو اس تجارتی ڈگری کے حصول کے لیے انگلستان جاتا ہے اسے اتنا وقت ہی نہیں ملتا کہ وہ وہاں کی سوسائٹی میں گھل مل سکے۔ بجز انگلستان کی بعض مشہور گلیوں اور سمندری تفریح گاہوں کے وہ کچھ اور دیکھ ہی نہیں سکتا، علاوہ ازیں دیکھنے کے لیے وقت درکار ہے اور پیسہ بھی اور ہمارے طالب علموں کو یہ دونوں میسر نہیں۔ دوسری بڑی مشکل یہ ہے کہ انگریز نیچے کے طبقے سے لے کر اونچے طبقہ تک ہندوستانیوں کو اچھوت سمجھتے ہیں۔ انگلستان کے قیام کے زمانہ میں برِ اعظم کا جو سفر کیا جاتا ہے وہ بالکل اچٹتا ہوا ہوتا ہے اور اس کا دائرہ پیرس اور برلن کے شب بسروں اور عیش گھروں سے آگے نہیں ہوتا۔

یورپ سے سبق:

لیکن ہندوستانی طلبا میں بعض نوجوان طبائع ایسے بھی ہوتے ہیں جو یورپی زندگی کو آنکھیں کھول کر دیکھنا چاہتے ہیں اور سطح سے نیچے جانے کی کوشش کرتے ہیں۔ یہ لوگ اشیا کے باہمی تعلق پر نظر کر کے یہ معلوم کرنے کی فکر کرتے ہیں کہ آیا ہندوستانی مسائل کا حل آکسفورڈ کا لہجہ حاصل کرنے سے ہو سکتا ہے یا آکسفورڈ کی تعلیم ہی محض بے کار ہے جس سے ہندوستانی مسائل کے سلجھانے میں کوئی مدد نہیں ملتی۔ لیکن اُن بے چاروں کو بڑی دقّتوں کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ ایک طرف اُن کی پڑھائی ہے، اُن کے اور پروفیسروں کے آپس کے تعلقات ہیں، انڈیا آفس کے منکر نکیر ہیں اور گھر کے لوگ ہیں جو اُن سے کسی اور چیز کی توقع نہیں رکھتے بجز اس کے کہ وہ تعلیم ختم کر کے گھر واپس آجائیں اور ایک اعلیٰ خدمت حاصل کر لیں۔ ایسی صورت میں وہ کر ہی کیا سکتے ہیں لیکن آخر یہ معلوم کرنا ضروری ہے کہ یورپ ہے کیا چیز اور وہاں کی کون سی چیزیں ہمارے ملک کے لیے کارآمد ہو سکتی ہیں؟ اب وقت آگیا ہے کہ ہم کھلے بندوں اس امر کا اظہار کر دیں کہ ہم یورپ سے کچھ حاصل نہیں کر سکتے بجز ایک چیز کے اور وہ اعلیٰ اصطلاحی تعلیم ہے جس سے ہندوستان جیسا زرعی ملک صنعتی ملک بن سکے۔ اصطلاحی تعلیم میں سائنس کے تمام شعبہ جات داخل ہیں بشمول طب کے اور اس سلسلہ میں یہ کہا جا سکتا ہے کہ ان چیزوں کے حصول کے لیے بیمار اور تنزل پذیر یورپ سے کہیں زیادہ ترقی یافتہ امریکہ، روس اور جاپان ہیں۔ ڈاکٹر صاحب کا روئے سخن دیسی ریاستوں کے اُن نام نہاد بلند حوصلہ لوگوں سے نہیں ہے جو کم از کم چھ ماہ ہی کے لیے یورپ جا کر اپنی قدر میں اضافہ کر کے ملازمت حاصل کرنا چاہتے ہیں بلکہ اُن لوگوں سے ہے جو یورپ کو علم کی خاطر حاصل کرنے جاتے ہیں اور ایسے علم کی خاطر جس کا ہندوستان میں انتظام نہیں ہے۔ ڈاکٹر جے سوریا کا خیال ہے کہ قانون، فلسفہ یا تاریخ کی تعلیم کے لیے یورپ جانا عبث ہے اور اس سے ہندوستان کو اب یا آئندہ کسی قسم کا فائدہ نہیں پہنچ سکتا۔

یورپ میں انتشار:

یورپ میں اس وقت ایک انتشار کی کیفیت برپا ہے۔ جن اشیا کی قدر کل تک معیّن تھی اُن میں مسلسل تغیّر ہو تا جا رہا ہے اور معاشی حالات دن بدن ابتر ہوتے جا رہے ہیں۔ ان گتھیوں کو سلجھانے کے لیے آئے دن نئے نئے حل پیش ہوتے رہتے ہیں لیکن اُن سے کوئی مفید نتیجہ برآمد نہیں ہوتا۔ یورپ ایک تاریک غار کی طرف بڑھتا جا رہا ہے جس کو عبور کرنے کی ممکنہ کوششیں کی جا رہی ہیں۔ ان تمام لاینحل مسائل کا ایک حل، جنگ ہے یعنی اقوامِ عالم کی خودکشی بر پیمانہ کبیر۔ تنزل پذیر یورپ کے لیے بجز اس کے کوئی راستہ نہیں ہے۔

ہندوستان کا افلاس:

جہاں تک ہندوستان کا تعلق ہے، دوز بردست مسائل ہمارے سامنے ایک بھیانک منظر لیے ہوئے پیش ہیں اور جو تقریباً لاینحل نظر آتے ہیں، بھوک اور افلاس۔ لہٰذا آئندہ ہم جو بھی تعلیم حاصل کریں اس کا تعلق ان مسائل کے حل سے ہونا ضروری ہے۔ اب تک ہم نے جو بھی تعلیم حاصل کی وہ بے کار ثابت ہوئی کیوں کہ اس سے ہمارے مسائل کے سلجھانے میں کوئی مدد نہیں ملی بلکہ اُلٹا تعلیم یافتہ بے روزگاری کا مسئلہ ہمارے مسائل میں ایک ناخوش گوار اضافہ ہے۔ ہندوستان دولت مند ترین ملک ہے جہاں کے لوگ مفلس ترین ہیں۔ کچھ دنوں قبل مجلسِ اقوام کے شعبۂ تہذیب و تمدّن کے ایک رکن، بیاسل میاتھیوس* نے ہندوستانی نوجوانوں کی حالت بیان کرتے ہوئے کہا تھا کہ نوجوانوں میں اس وقت تک انتشار اور بے چینی رہے گی جس وقت تک کہ لوگوں کے افلاس اور بھوک کا علاج نہ کیا جائے گا۔ یہ اندازہ لگایا گیا ہے کہ ہندوستانی کاشت کاروں کے زرعی قرض کی مقدار پندرہ سو کروڑ روپیوں سے کہیں زیادہ ہے۔ ایسی صورت میں بھوکے مقروض لوگوں سے جو اپنی غذا تک نہیں خرید سکتے دوسری ارزاں ترین اشیا کے خریدنے کی کیا توقع کی جاسکتی ہے جو متمدن زندگی کے معمولی احتیاجات میں داخل ہیں۔

افلاس کا علاج:

تو پھر کیا کیا جائے؟ کیا یورپ یا کسی اور بیرونی ملک کی کسی چیز سے ہم کو کوئی فائدہ پہنچ سکتا ہے؟ ہاں! اصطلاحی تعلیم سے صنعتی ترقی اور صنعتی نظام کے طریقوں سے۔ ہمیں چاہیے کہ پہلے ہندوستانی معاشیات کے بنیادی مسائل کا جائزہ لیں اور یہ معلوم کرنے کی کوشش کریں کہ ان میں کون سی خرابیاں ہیں اور یہ کیسے دور ہو سکتی ہیں؟ بھوکے لوگ جنھیں جیل خانوں کے قیدیوں کے مقابلہ میں بھی کم غذا ملتی ہے، جو کھانا نہ ملنے کی وجہ سے ٹھہرے ہوئے ہیں ان سے بھلا کیا توقع کی جاسکتی ہے کہ وہ پیدائشِ دولت میں حصہ لیں یا تمدّن کی ابتدائی چیزوں کو اختیار کریں۔ وہ محض اس لیے زندہ ہیں کہ انھیں مرنا نہیں آتا اور نہ انھیں اس وقت تک زندگی کی حقیقت معلوم ہوتی ہے جب تک کوئی ایسے مہلک اور متعدی امراض جو ہندوستان اور چین جیسے افلاس زدہ ملکوں ہی میں پیدا ہو سکتے ہیں، ہزاروں کی تعداد میں انھیں فنا کی نیند نہیں سلا دیتے کیوں کہ اُن کے خون میں ان بیماریوں کا مقابلہ کرنے کی طاقت نہیں ہے۔ لہٰذا ہمیں یہ معلوم کرنے کی مطلق ضرورت نہیں کہ انھیں کیا کھانا اور کیا نہ کھانا چاہیے بلکہ ہمیں یہ دیکھنا چاہیے کہ ان کی قوت خرید میں ہم کیسے اضافہ کر سکتے ہیں تاکہ وہ پیٹ بھر کر کھا سکیں۔ جب تک اس مسئلہ کا حل نہ ہوگا اُس وقت تک ہر قسم کی دیہی تنظیم، دیہی طبّی امداد اور دیگر اصلاحات کا خیال ہی بے کار ہے۔ ایسی صورت میں ہم کو یورپ بلکہ امریکہ، جاپان اور روس سے بجز اصطلاحی تعلیم کے کچھ اور حاصل کرنے کی ضرورت نہیں اور یہی چیز ممکن ہے ہماری نجات کا ذریعہ ثابت ہو۔

ایس۔ایم۔ہادی:

مسٹر ایس۔ ایم۔ ہادی ،بی۔ اے۔ (کنٹب*) سر رشتہ ہائے اسکاوٹس ،سرکارِ عالی کے ناظم ہیں۔ ایک اسپورٹس مین کی حیثیت سے آپ سارے ہندوستان میں مشہور ہیں۔آپ کا شمار ٹینس کے بہترین کھلاڑیوں میں رہاہے اور ڈیوس کپ[412] میں آپ نے ہندوستان کی نمائندگی بھی کی ہے۔

انگلستان میں آپ کا ابتدائی قیام ۱۹۱۲ء تا ۱۹۲۵ء رہا۔اس کے بعد ۱۹۲۹ء، ۱۹۳۱ء میں بھی آپ نے یورپ اور امریکہ کا سفر کیا ہے۔ ۱۹۳۲ء میں ہندوستانی کرکٹ ٹیم کے ہمراہ اس کے خازنِ اعزازی[413] کی حیثیت سے آپ انگلستان تشریف لے گئے تھے۔

انگریزوں کی خصوصیات:

انگلستان کی زندگی میں تین چیزیں سب سے زیادہ جاذبِ نظر ہیں؛فرض شناسی،ضبط و تنظیم اور اخلاق اور یہی انگریزوں کی ترقی کا راز ہیں۔اپنے لیڈر کی عزت و تعظیم کرنے میں ہم کو انگریزوں سے سبق حاصل کرنا چاہیے۔ ہندوستانی کرکٹ ٹیم کے حالیہ سفرِ انگلستان میں اسی ایک چیز کے نہ ہونے سے ہماری شہرت اور نیک نامی کو صدمہ پہنچا۔ اگر بفرضِ محال ہندوستانی ٹیم کے کپتان، سر مہاراج کمار و جینگرم[414] اہلیت کے جوہر سے عاری تھے تو اس کے متعلق انتخاب سے پہلے ہی غور وخوض ہو جانا چاہیے تھا،انتخاب کے بعد اس سوال کو اُٹھانا ہی بے کار تھا۔

جسمانی نشوونما:

میرے اس سوال پر کہ آیا ہم میں کوئی جسمانی انحطاط ہے جس کی وجہ سے ہم اہلِ یورپ کا کھیل کود میں مقابلہ نہیں کر سکتے؟ مسٹر ایس۔ایم ہادی نے فرمایا کہ ہم میں جسمانی انحطاط تو نہیں ہے البتہ ہماری تربیّت اور نشوونما کے طریقوں میں اصلاح کی ضرورت ہے۔ہمارے پاس بچوں کی فطری قابلیتوں کا لحاظ نہیں کیا جاتا۔لکیر کے فقیر کی طرح بچے مدرسے میں شریک کر دیے جاتے ہیں اور والدین یہ سمجھتے ہیں کہ اُنھوں نے اپنے بوجھ کو استادوں کے کندھوں پر ڈال دیا اور اس طرح ہر قسم کی ذمہ داری سے سبک دوش ہو گئے۔علاوہ ازیں والدین بچوں کی پڑھائی پر اتنا زور دیتے ہیں کہ بچوں کی جسمانی نشوونما میں رکاوٹ پیدا ہو جاتی ہے حالاں کہ اصولاً دماغی اور جسمانی دونوں قسم کی تعلیم میں توازن قائم رہنا ضروری ہے۔اکثر بچوں کا فطری میلان کھیل کود کی طرف ہوتا ہے اور اگر ایسے مواقع بہم پہنچائے جائیں تو کھیل کود ہی میں وہ بڑی ترقی کر سکتے ہیں لیکن اُنھیں موقع نہیں ملتا۔عام طور پر متوسّط اور غریب طبقہ کے لوگ بچوں کو

اس وجہ سے بھی کھیل کود میں زیادہ حصہ لینے نہیں دیتے مبادا وہ اسی کے ہو رہیں اور خاندان کی جو توقعات ان سے وابستہ ہیں وہ پوری نہ ہوں۔

علاوہ ازیں کھیل کود کے معاملہ میں ہمارے یہاں کی فضا حوصلہ شکن ہے۔ ہمارے کھلاڑی کو خاطر خواہ تحریص اور ترغیب نہیں ملتی۔ حکومت تنہا اس کام کو انجام نہیں دے سکتی، دولت مند لوگ اور خانگی ادارے اس میں دلچسپی نہیں لیتے۔ انگلستان میں عام طور پر جامعاتی ڈگریوں کے مقابلہ میں کیمبرج یا آکسفورڈ سے (بلیو)* لینے والوں کو زیادہ وُقعت کی نظروں سے دیکھا جاتا ہے۔

ساتھ ہی ہمارے کھیل کود کی حالت منظّم نہیں ہے۔ ملک میں تنظیمی قابلیّت والوں کی کمی نہیں لیکن ہمارے افلاس اور عدم توجہی سے کوئی سرمایہ فراہم نہیں ہوتا اور ہر چیز میں محض حکومت پر تکیہ نہیں کیا جا سکتا۔

کھیلوں کے میدان:

ہمارے پاس کھیل کود کے میدانوں کی بڑی کمی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ہم باقاعدگی کے کھیل کود کی طرف توجہ نہیں کر سکتے۔ ومبلڈن میں پچیس ہزار ناظرین وقتِ واحد میں سنٹرل کورٹ کا کھیل دیکھ سکتے ہیں۔[415] یہاں پر ۱۹۳۱ء میں اسٹیڈیم تعمیر ہوا اور پہلے ہی سال اس کے حصہ داروں کو پانچ فی صد منافع اور آج کل منافع کی مقدار ۴۵ فیصد تک پہنچ گئی ہے۔ معین الدین کرکٹ ٹورنامنٹ میں ڈیروں کی تنصیب سے بمشکل دو ہزار روپیہ کرایہ وصول ہے۔ حالاں کہ ڈیرے لگانے والے کافی منافع حاصل کرتے ہیں۔ حسین ساگر[416] کٹی کے زیریں میدان میں ایک اسٹیڈیم تعمیر کرنے کی تحریک عرصہ سے حکومتِ سرکارِ عالی کے پیشِ نظر ہے، جو نہ صرف ہماری ریاست کے وقار کے شایانِ شان ہے بلکہ اس میں ہماری نوجوان نسلوں کے لیے بھی بے حد فوائد مضمر ہیں۔

عورت:

مسٹر ایس۔ ایم ہادی ہمارے موجودہ چار دیواری کے پردے میں ترمیم کے حامی ہیں۔ آپ کے خیال کے بموجب یورپیّن عورتوں کو ورزش کی اتنی ضرورت نہیں جتنی کہ ہماری عورتوں کو ہے۔ لہٰذا اُن کے کھیل کود کے لیے دو ایک ایسے میدان مخصوص ہونے چاہیں جہاں عورتیں ہر شام جمع ہو سکیں اور جہاں پردے کا بھی کافی انتظام ہو۔ عورتوں کے لیے فٹ بال یا دوسرے کھیلوں کے مقابلہ میں ہاکی اور ٹینس بہترین بلکہ ہمارے زنانہ مدارس میں ان کھیلوں کا رواج ہونا چاہیے اور ان کے ٹورنامنٹ بھی ہونے چاہیں۔

یورپ کی عورتوں کی آزادی کے بیان کرنے میں ہمارے پاس انتہائی مبالغہ سے کام لیا جاتا ہے۔ انگلستان میں بہت سے ایسے شریف خاندان ہیں جہاں عصمت مشرقی معیارِ تہذیب کے مطابق قائم ہے۔ عورتیں عام طور پر اپنے پیروں پر کھڑے رہنے کی کوشش کرتی ہیں۔ میرے اس اعتراض پر کہ اس سے گھر کی زندگی تباہ ہو جاتی ہے۔ مسٹر ہادی نے فرمایا کہ ممکن ہے ایک حد تک یہ خیال صحیح ہو لیکن اس سے خاندان تباہی سے بچ جاتا ہے۔ اگر خاندان میں ایک مرد کمانے والا ہو اور وہ فوت ہو جائے تو خاندان کے لیے بجز بھیک کے کوئی سہارا باقی نہیں رہتا لیکن اگر عورتیں پہلے ہی سے اپنی روزی آپ کماتی ہیں تو وہ اس قسم کی شدید صورتِ حال کا آسانی سے مقابلہ کر سکتی ہیں۔

یورپ میں بڑے بڑے گھرانے کی عورتیں باوجود تموّل کے اپنی آمدنی بڑھانے کی فکر میں رہتی ہیں۔ اس سلسلہ میں آپ نے لارڈ سواتلنگ *آں جہانی کے خاندان کا تذکرہ فرمایا جو لارڈ مان ٹیگو* وزیرِ ہند کے بڑے بھائی تھے۔ اُن کی خاندانی شرافت کا اندازہ اس سے ہو سکتا ہے کہ شاہ جارج پنجم *آں جہانی بھی اُن کے پاس ایک روز مہمان تھے۔ لیڈی سواتلنگ * کے متعلق آپ نے فرمایا کہ وہ ایک بہترین بیوی، بہترین ماں اور بہترین میز بان تھیں۔

ایک مرتبہ مسٹر ایس۔ ایم۔ ہادی ان کے مکان میں بیمار ہو گئے تو اُن کی تیمارداری میں اُنھوں نے کوئی کسر نہ رکھی حتیٰ کہ جب اُنھیں خیال ہوا کہ ممکن ہے انگریزی کھانوں سے آپ کی طبیعت اکتا گئی ہو تو سر علی امام کو جو برار[417] کے معاملہ میں لندن آئے ہوئے تھے، ٹیلی فون کیا گیا اور اُن کے پاس سے کھچڑی اور پاپڑ کا انتظام ہوا۔

ترکہ تقسیم ہونے کے بعد لیڈی سواتلنگ کی اکلوتی لڑکی اپنی ماں کو گھر کا کرایہ اور اپنے کھانے کے اخراجات ادا کرتی تھی اور خود ایک دکان لگا کر اس میں کام کیا کرتی تھی۔ جب مسٹر ایس ایم۔ ہادی نے اس پر تعجب کا اظہار کیا تو لیڈی سواتلنگ نے ہنس کر فرمایا کہ جب تک جائیداد غیر منقسم تھی اور لڑکی خاندان کی دستِ نگر تھی تو اس کے ساتھ ہر قسم کا سلوک کیا گیا لیکن جب وہ خود ایک جائیداد کی مالک بن گئی ہے اور اس کی اپنی ایک دکان بھی ہے تو دوسرے اس کا بار کیوں اُٹھانے لگے۔ یہ دراصل انگلستان کی کاروباری ذہنیت کا نتیجہ ہے۔

نسلی تعصب:

میرے اس سوال پر کہ کیا انگلستان میں کھیل کود کی دنیا میں بھی نسلی تعصب پایا جاتا ہے۔ مسٹر ایس ایم۔ ہادی نے فرمایا کہ بد قسمتی سے اسپورٹ کی دنیا میں بھی جو چیز موجود ہے جس کا خود آپ کو کیمبرج میں شکار ہونا پڑا۔ آپ کو محض ٹینس کے بہترین کھلاڑی ہونے کی وجہ سے ۱۹۳۲ء میں بلیو ملا۔ اُس کے کچھ دنوں بعد کیمبرج یونیورسٹی کی ایک ٹینس ٹیم بلجیم روانہ کی گئی جس میں مسٹر ایس۔ ایم۔ ہادی اور راما سوامی[418] بھی شریک تھے۔ روانگی کے قبل ٹیم کے

کپتان نے ان دونوں سے کہا کہ چوں کہ بلجیم میں نسلی تعصب زیادہ ہے لٰہذا ان دونوں کے کھیلنے کے لیے خاص طور پر اجازت حاصل کی گئی ہے۔ یہ چیز مسٹر ہادی کے دل میں کانٹے کی طرح کھٹکنے لگی۔ علاوہ ازیں بلجیم * پہنچنے کے بعد ان دونوں ہندوستانیوں کی رہائش کا انتظام ایک ہوٹل میں کیا گیا اور ٹیم کے بقیہ لوگ ایک فیملی میں ٹھہرے۔ اس واقعہ کو بھی آپ لوگوں نے زیادہ اہمیت نہیں دی۔ جب میچ شروع ہوئے تو آپ دونوں اپنے کھیل اور اخلاق کی وجہ سے بے حد مقبول ہو گئے۔ ہر شخص ان کے ساتھ خندہ پیشانی کے ساتھ پیش آرہا تھا لیکن رہ رہ کر مسٹر ہادی کو ہندوستانیوں کی سُبکی کا خیال ستا رہا تھا۔ آپ سے رہا نہیں گیا، آپ نے بلجیم ٹیم کے کپتان سے سارا واقعہ بیان کیا اور اُن کے اس طرزِ عمل کی مذمّت کی جس پر اس نے برہم ہو کر اپنی لاعلمی کا اظہار کیا اور اپنی صفائی میں کیمبرج ٹیم کے کپتان کا وہ خط پیش کیا جس میں تحریر کیا گیا تھا کہ ٹیم میں دو ہندوستانی کھلاڑی بھی ہیں جن کے متعلق ممکن ہے بلجیم میں اعتراض ہو لٰہذا انھیں خاص طور پر کھیلنے کی اجازت دی جائے۔ کیمبرج ٹیم کی واپسی کے بعد حکومت بلجیم نے سرکاری طور پر اس غلط بیانی کے خلاف احتجاج کیا جس کی انگلستان نے معذرت چاہی۔

اس طرح مسٹر ایس۔ ایم۔ ہادی کے کپتان منتخب ہونے کے وقت ایک شور مچایا گیا۔ کیمبرج میں کپتان کا انتخاب وہاں کے "بلیو" کرتے ہیں۔ آپ سب میں سنیئر تھے لیکن انتخاب کے قبل کلب کے صدر نے آپ سے خواہش کی کہ ہندوستانی ہونے کی وجہ سے آپ کے انتخاب سے یونیورسٹی کے روایات کو صدمہ پہنچے گا اور پبلک میں چہ میگوئیاں ہوں گی لٰہذا مناسب یہ ہے کہ آپ کپتانی کے لیے کھڑے ہی نہ ہوں۔ اس سے آپ کے قومی جذبات کو سخت ٹھیس لگی اور آپ نے اس مشورہ کو ٹھکرا دیا لیکن جب آپ کے ساتھ انتخاب کنندگان کا طرزِ عمل ناقابلِ برداشت ہو گیا تو آپ نے یونیورسٹی کورٹ پر کھیلنا ہی چھوڑ دیا اور دوسری جگہ کھیلنے لگے۔ یہ بات عام ہو گئی، اخبارات میں چرچے ہوئے۔ آپ کے بیانات شائع ہونے لگے حتیٰ کہ مہاتما گاندھی نے بھی "ینگ انڈیا" میں اس پر تبصرہ کیا۔ بالآخر اس نازک صورتِ حال پر آپ کو کپتان منتخب کر کے قابو حاصل کیا گیا۔ اس سارے جھگڑے میں آپ کو افسوس اس بات کا ہے کہ آپ کے دو ہندوستانی ساتھیوں میں سے ایک نے ساتھ نہیں دیا۔ دوسرے سال بلجیم جانے والی ٹیم کا آپ کو کپتان بنایا گیا جس کی وجہ غالباً یہ معلوم ہوتی ہے کہ کیمبرج یونیورسٹی اپنی سابقہ خفت کو مٹانا چاہتی تھی۔ لیکن آپ سے ٹینس کی اس کامیابی کا انتقام ہاکی میں لیا گیا اور ہاکی کے بہترین کھلاڑی ہونے کے باوجود آخر وقت تک آپ کو اس کا "بلیو" نہیں ملا۔

ہندوستانی کرکٹ ٹیم کی ناکامی:

ہندوستانی کرکٹ ٹیم کے حالیہ سفرِ انگلستان کی ناکامی کے وجود دریافت کرنے پر مسٹر ایس۔ایم۔ہادی نے جواس ٹیم کے اعزازی خازن تھے،فرمایا کہ ہمارے کھلاڑیوں میں قومی احساس کی کمی ہے،ہر شخص اپنے ملک کی نیک نامی سے زیادہ اپنی شہرت کا خواہاں تھا۔کھلاڑیوں کی انانیت،خود غرضیاں،رقابتیں اور کمزور سر کردگی نے ہندوستان کی شہرت کو ناقابل بیان نقصان پہنچایا۔

خاتمہ:

ہم میں ڈسلپن کی بڑی ضرورت ہے۔یورپ میں اسپورٹس کو فوجی ڈسلپن سے بہتر سمجھا جاتا ہے۔جرمنی نے اس کی وجہ سے جو غیر معمولی قوت بہم پہنچائی ہے اس سے سیاستِ حاضرہ کا ہر طالبِ علم واقف ہے۔حال ہی میں یعنی ماہ جون ۱۹۳۶ء میں جسمانی تعلیم اور اسپورٹس کے لیے فرانس میں ایک وزارت قائم ہوئی ہے کیوں کہ یورپی ممالک یہ محسوس کرنے لگے ہیں کہ سلطنت کے دیگر امور کے مقابلہ میں جسمانی تربیت کو زیادہ اہمیت دی جانی چاہیے۔

آخر میں مسٹر ایس۔ایم۔ہادی نے فرمایا کہ ہر ہندوستانی کو اپنے ملک کی عزت اور ناموس کا سب سے زیادہ خیال رکھنا چاہیے۔جو لوگ ہندوستان سے غیر ممالک تعلیم یا سیاحت کی غرض سے جاتے ہیں اُنھیں اپنے ملک کا سفیر بن کر جانا چاہیے کیوں کہ ایک فرد کے اطوار اور کردار سے سارے ملک اور قوم کے متعلق رائے قائم کی جاتی ہے۔

ڈاکٹر خلیفہ عبدالحکیم:

ڈاکٹر خلیفہ عبدالحکیم ایم۔اے۔،پی۔ایچ۔ڈی(ہایڈل برگ*)جامعہ عثمانیہ کے شعبۂ فلسفہ کے صدر ہیں۔ ایک بلند پایہ شاعر، مقرر اور ادیب کی حیثیت سے آپ سارے ہندوستان میں مشہور ہیں۔ فلسفۂ رومی آپ کا خاص مضمون ہے، جس پر آپ نے اپنا مقالہ بھی تحریر فرمایا ہے[419]۔

آپ کا قیام جرمن میں ۱۹۲۲ء تا ۱۹۲۵ء رہا۔ کچھ دنوں لندن اور کیمبرج میں بھی آپ نے تحقیقات فرمائی ہیں۔ ۱۹۲۳ء میں بھی چھ ماہ کے لیے آپ یورپ تشریف لے گئے تھے اور یہ مدّت آپ نے فرانسیسی زبان کے حصول میں صَرف کی اور جامعہ سوبورن*(پیرس) میں شریک ہے۔

یورپ کی ترقی کے دور:

میرے اس سوال پر کہ یورپ کی ترقی کے کیا اسباب ہیں؟ ڈاکٹر خلیفہ عبدالحکیم نے فرمایا کہ مشرقی یورپ کے اکثر ممالک ہندوستان کے مقابلہ میں کوئی زیادہ ترقی یافتہ نہیں ہیں لیکن جو ممالک واقعی ترقی یافتہ ہیں مثلاً انگلستان، جرمنی اور فرانس اُن کی ترقی کے اسباب معلوم کرنے کے لیے ہم کو گزشتہ دو سے تین سو برس پہلے کی تاریخ پر نظر ڈالنے کی ضرورت ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ یورپ کی ترقی کی ابتدا نشاۃ جدیدہ[420] سے ہوتی ہے جب کہ قسطنطنیہ پر ترکی قبضہ کے بعد یونانی عالموں کی جماعت نے اقصائے یورپ میں پھیل کر سارے یورپ میں علم کی روشنی پھیلائی۔ علوم و فنون کی اس اشاعت نے لوگوں کی آنکھیں کھول دیں اور اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ اکثر یورپی ممالک نے کلیسا کے جوئے کو اتار پھینکا۔ یورپ کی ترقی کی یہ دوسری منزل ہے۔ یورپ کا تیسرا قدم جو ترقی کی طرف اُٹھا وہ بحری راستوں کی دریافت ہے جس سے نہ صرف یورپین ممالک کی تجارت کو فروغ ہوا بلکہ کم زور قوموں پر تسلّط قائم کرنے کا موقع بھی ہاتھ آیا۔ اس کا بانی مبانی واسکوڈی گاما* ہے جس کو ہندوستان کا راستہ احمد نامی ایک عرب نے بتلایا تھا۔ کاش احمد کو معلوم ہوتا کہ اس گم کردہ راہ کو راستہ بتلانے میں اکثر مشرقی اقوام کی قسمتوں میں غلامی لکھی جانے والی ہے۔

جہاز رانی کے فروغ کے ساتھ یورپ کے اقبال کا ستارہ چمکا۔ اس جہاز رانی سے یورپی ممالک نے سب سے پہلے لوٹ اور غارت گری کا آغاز کیا۔ چناں چہ انگلستان کی ترقی کی بنیاد لوٹ پر قائم ہوئی۔

انگلستان کی قومی دولت کی فراوانی اور خوش حالی کی ابتدا ملکہ الزبیتھ* کے دورِ حکومت سے ہوتی ہے۔ یہ سولہویں صدی کے وسط کا زمانہ ہے، ڈریک* کو ہسپانوی بیڑے کو لوٹنے کی اس شرط پر اجازت دی گئی کہ مالِ غنیمت

میں ملکہ کا بھی حصہ رہے گا۔ اسی حصہ کی بدولت ملکہ الزبتھ نے نہ صرف اپنا قرض ادا کیا بلکہ دیگر اخراجات کے بعد بھی کافی دولت بچائی۔ ڈریک کی حوصلہ مندی کی وجہ سے جب ملک میں سونے کی بہتات ہوئی تو اکثر لوگوں نے اس کی مصرف پر غور کے اور اُن کے ذہن میں یہ خیال پیدا ہوا کہ اس سے تجارتی کمپنیاں قائم کی جائیں جو دُنیا کے مختلف ممالک سے تجارتی تعلقات پیدا کریں۔ یہیں سے ایسٹ انڈیا کمپنی کی ابتدا ہوئی۔

یہ وہ زمانہ تھا کہ انگلستان کی آبادی کم تھی اور ملک کی خوش حالی میں اضافہ ہونے لگا تھا۔ سوچنے والے دماغ اس فکر میں لگے ہوئے تھے کہ کس طرح کم سے کم لوگوں سے زیادہ کام لیا جائے۔ یہیں سے ایجادات واختراعات کا سلسلہ شروع ہوتا ہے اور یہی چیز صنعتی انقلاب کی محرّک ہے۔

یہاں یہ امر قابل ذکر ہے کہ انگلستان کے جن لوگوں کے ہاتھوں میں ڈریک کہ وجہ سے دولت آگئی تھی وہ طبقہ جاگیر داران سے نہیں تھے۔ ملک میں عوام کا ایک نیا طبقہ پیدا ہو رہا تھا جو رفتہ رفتہ نہ صرف دارالعلوم کی تقویّت کا باعث ہوا بلکہ جس سے نظام پارلیمانی میں استحکام اور برطانیہ کی طاقت میں اضافہ بھی ہوا۔

یورپ کی ترقی کا راز:

سائنس کی ترقی دراصل صنعتوں کی ترقی کا نتیجہ ہے اور صحیح معنوں میں سائنس اور صنعت کی ترقی ہی یورپ کی ترقی کا راز ہیں۔ انگلستان کی ترقی کی ایک وجہ یہ بھی تھی کہ یہ ایک چھوٹا جزیرہ ہے۔ بلحاظ آبادی انگریزوں کی تعداد زیادہ نہیں ہے لیکن نسل، زبان اور مذہب کے اعتبار سے یہ لوگ ایک ہیں۔ ان میں قومی ہمدردی اور یک رنگی پیدا ہونے کے زیادہ امکانات تھے۔ ساتھ ہی براعظم کی دوسری بڑی طاقتوں کی دستبرد سے محفوظ رہنے کے لیے بھی ان میں اتحاد ویگانگت کا پیدا ہونا ضروری تھا۔

یورپ کی ترقی میں انقلابِ فرانس کو بھی بڑا دخل ہے جس سے حریّت، آزادی اور جمہوری خیالات کی ترویج میں بڑی مدد ملی۔

مغربی یورپ کی ترقی کا ایک بڑا سبب عیسائیت سے بیزاری اور بغاوت ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ عیسائی مذہب بہت بودا ہے۔ دُنیا میں کسی مذہب کی اتنی مخالفت نہیں ہوئی جتنی کہ عیسائیت کی ہوئی ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ عیسائیت نے اپنے پیروؤں کے سارے قوائے ذہنی و عقلی کو سلب کر لیا تھا اور افراد کو دنیا میں ابھرنے کا موقع ہی نہیں ملتا تھا۔ عیسائیت سے پیچھا چھڑانے کے بعد لوگوں نے از سرِ نو زندگی نئے نئے تجربات کرنے شروع کیے۔ سوسائٹی، مذہب، اخلاق، قانون، سیاسیات، غرض ہر چیز کے متعلق تحقیقات کے دفتر کھلنے لگے اور یورپ کی وہی کیفیت ہوگئی جو

کسی زمانہ میں یونان کی تھی جہاں سقراط*، ارسطو* اور دیگر مفکرین نے آزادیٔ فکر کے ذریعہ حیاتِ انسانی سے ساری مزاحمتوں کو ہٹادیا تھا۔

مگر اس تمام ترقی اور آزادی کا فائدہ متوسّط اور تجارتی جماعتوں کو پہنچا۔ مزدور پیشہ لوگ ان تمام انقلابات سے غیر متاثر رہے۔ لہٰذا آخر میں ایک ایسے انقلاب کی ضرورت تھی جس میں مزدور پیشہ لوگوں کو اُبھرنے کا موقع ملتا۔ عوام الناس کے انقلاب کی ہی ابتدا ہے۔

اس سلسلہ میں ایک عام مغالطہ دُور ہونا ضروری ہے۔ وہ یہ کہ مشرقی ممالک میں یہ خیال عام ہے کہ یورپ نے مادی ترقی کی ہے اور روحانیت سے اُسے کوئی سروکار نہیں ہے۔ یہ ایک مغالطہ ہے اور اس کے پیدا ہونے کی یہ وجہ ہے کہ گذشتہ دو صدیوں میں فطرت کی قوتوں کو سمجھنے اور اُن کو بروئے کار لانے میں دنیا نے اتنی سُرعت سے ترقی کی ہے کہ گزشتہ دس ہزار سال میں بھی اتنی ترقی نہیں ہوئی تھی۔ یہی وجہ ہے کہ یورپ کی مادی ترقی سب سے زیادہ نمایاں نظر آتی ہے اور اس کے مقابلہ میں روحانی اور اخلاقی ترقی کی رفتار سست ہے لیکن اس کے ہرگز یہ معنی نہیں ہیں کہ یورپ کی اخلاقی یا روحانی حالت پہلے سے بدتر ہو گئی ہے۔ آج کل یورپ میں جو مذہبی لوگ ہیں وہ ازمنۂ وسطیٰ کے کلیسائی لوگوں سے بہتر عیسائی ہیں کیوں کہ ایک طرف ان میں ذہنی شائستگی ہے تو دوسری طرف جمہوری تحریکات اور رجحانات کی وجہ سے ان میں معاشری خدمت گذاری کا جذبہ عام ہو گیا ہے۔ آج کل کا پادری تثلیث* کے رموز سمجھانے یا آخرت کی دھمکیاں دینے کی بجائے خدمتِ خلق کی طرف زیادہ مائل ہے۔

یورپ کے متعلق ایک خیال یہ بھی ہے کہ وہاں خود غرضی کی پیکار بہت چھائی ہوئی ہے لیکن تاریخی لحاظ سے یہ کوئی انوکھی چیز نہیں ہے۔ مختلف انسانوں کے گروہ مختلف انسانوں سے ہمیشہ لڑتے رہے ہیں۔ یورپ کی ان مادی اور علمی ترقیوں کے بعد یہ امر بالکل ناگزیر تھا کہ پس ماندہ اقوام خواہ وہ دنیا کے کسی حصہ میں ہوں اُن کے قبضۂ اقتدار میں آ جائیں۔

یہاں اس مغالطہ کا ذکر بھی ضروری ہے جو خود اہلِ یورپ کو اپنے متعلق پیدا ہو گیا ہے کہ نسل کے اعتبار سے دنیا کی دوسری اقوام کے مقابلہ میں اُنھیں فوقیت حاصل ہے۔ یہ مغالطہ گذشتہ صدی میں پورے یورپ پر ایک یقین اور ایمان کی طرح طاری تھا۔ اس بت کے توڑنے میں سب سے پہلے جاپان نے پیش قدمی کی۔ جاپان کا روس کو شکست دینا ایک ملک کی شکست نہیں تھی بلکہ پوری تہذیبِ جدید کی شکست تھی۔ لیکن یہ مغالطہ ابھی دُور نہیں ہوا اور اب بھی مغرب میں کثرت سے ایسے لوگ ملتے ہیں جو اپنے ملک اور قوم میں اس مغالطہ کی پرورش کرنا اپنا بہترین فرض سمجھتے

ہیں۔ مسولینی *اور ہٹلر *کا بہت کچھ دار و مدار اسی مغالطہ پر ہے۔ نٹیشے * کے بعض شاگردوں نے اس کے فلسفہ کی غلط تعبیر کر کے اس خیال کو تقویت بہم پہنچائی کہ آئندہ منازلِ ارتقا میں فوق الانسان ہستیوں کی ایک نوع پیدا ہونے والی ہے اور وہ سفید رنگ کے اقوام ہی سے ہو گی۔ واقعہ یہ ہے کہ ترقی کے گھمنڈ میں نسلی تفوّق یا مغالطہ کا پیدا ہو نا تاریخ میں کوئی نئی چیز نہیں ہے۔ عربوں کا جب اسلام کی قوت سے دنیا پر تسلّط قائم ہوا تو بعض عرب مصنفین نے اہلِ فرنگ کے متعلق یہ لکھا تھا کہ سرد ممالک کے لوگ سردی کی وجہ سے غبی ہو جاتے ہیں اس لیے علوم و فنون میں ان کو کبھی کمال حاصل نہیں ہو سکتا۔

مغرب کی ترقی کا ایک بڑا راز قومیّت کا فروغ ہے اس سے پہلے کبھی کوئی قوم بحیثیت قوم کے نہیں سوچتی تھی۔ رومن شہنشاہیت اور کلیسا کی قوت ٹوٹنے کے بعد یورپ کے مختلف گروہوں میں قومی اتحاد کا خیال پیدا ہوا۔ چھوٹے گروہ بھی جب بحیثیت ایک قوم کے منظم ہوتے ہیں تو اُن کو بڑی قوت حاصل ہو جاتی ہے۔ ان گروہوں کو حُبِ وطن کی بنا پر ایک دوسرے کے مقابلہ میں اس قدر کشمکش کرنی پڑی کہ ان کی تمام خفتہ قوتیں بیدار ہو گئیں۔ یورپ کی جنگیں اور شدید تباہیاں اسی حبِ وطن کا نتیجہ ہیں لیکن اس کے ساتھ ہی یورپ کی تمام ترقی بھی اسی جذبہ کی مرہونِ منّت ہے۔ اسی جذبے سے اب بھی قومیں اپنے آپ کو سنبھال رہی ہیں اور ترقی کر رہی ہیں۔ لیکن یہ بھی ہو سکتا ہے کہ یہی جذبہ یورپ کی خودکشی کا باعث ہو۔

دیکھ لو گے سطوّتِ رفتارِ دریا کا مآل
موجِ مُضطر ہی اسے زنجیرِ پا ہو جائے گی

عورت:

یورپ میں جنسی تعلقات پر اتنی شدید پابندیاں کبھی نہیں رہیں جتنی کہ اکثر مشرقی تہذیبوں میں ملتی ہیں وہاں جنسی تعلقات مشرق کی بہ نسبت بہت زیادہ آزاد رہے ہیں۔ حتیٰ کہ پوپ جیسی برگزیدہ ہستیوں نے بھی عورتوں سے ناجائز تعلقات رکھے اور ان کی اولاد بھی ہوئی۔ یورپ میں ایک زمانہ ایسا بھی تھا کہ مہمان کی خاطر تواضع میں گھر کی عورتوں کو پیش کرنا اچھے آداب و اطوار میں داخل تھا اور اس کا جا بجا رواج بھی تھا۔ آج سے ڈیڑھ سو سال قبل تک عورتیں اعلانیہ مارکیٹ میں نیلام ہوتی تھیں اور بعض خاوند اپنی بیویوں کو سرِ بازار نیلام کر دیتے تھے۔

یورپ میں جنسی بداعتدالیوں کی ایک بڑی وجہ یہ ہے کہ کلیسا تعددِ ازدواج کا حامی نہیں ہے۔ قانوناً اور مذہباً ایک سے زائد عورت سے شادی نہیں کی جا سکتی حالاں کہ بعض حالات میں انسان ایک عورت پر اکتفا نہیں کر

سکتا۔ کلیسا کی ان ہی پابندیوں کی وجہ سے یورپ میں ناجائز جنسی تعلقات کو غیر معمولی فروغ حاصل ہوا۔

باجود ان ساری باتوں کے انیسویں صدی کے آخر تک عورتوں پر کچھ پابندیاں ضرور عائد تھیں اور کھل کھیلنے کا موقع عام نہیں تھا۔ صنعتی انقلاب نے عورتوں کو معاشی طور پر آزاد کرنا شروع کیا اور بڑی کثرت سے عورتیں اور مرد اپنے اپنے دیہاتی اور قصباتی ٹھکانوں سے اکھڑ گئے اور شہروں کے انجان اور بے پہچان ہجوموں میں گھس کر سارے رسوم اور قیود سے آزاد ہو گئے۔ بڑے بڑے کارخانوں کے مزدور واڑوں میں دُور دُور سے آئے ہوئے مردوں اور عورتوں کے اختلاط نے جنسی بد اخلاقی کے تمام دروازے کھول دیے۔ یہ اسی قسم کی صورتِ حال ہے جو بمبئی کے کارخانوں کے مزدوروں کے طرزِ ماندوبود میں پائی جاتی ہے۔ اسی سلسلہ میں زندگی کے مختلف شعبوں میں عورتوں کی ملازمت عام ہوتی گئی۔ جو عورتیں زندگی کے عام کاروبار میں بے تعلق مردوں کی ملازمت کرتی ہیں اور صبح سے شام تک اُنھیں رنگارنگ کے مردہم کار ملتے ہیں تو پھر اُن کے لیے اپنی عصمت کا بچانا ناممکن ہے۔ الا ماشاء اللہ۔

یہاں اسلام کی اس خوبی کو بیان کرنا ضروری ہے کہ فطرت کی جن قوتوں سے آپ بچ کر نہیں نکل سکتے ہیں۔ اسلام نے ان میں ایک تنظیم کی شکل پیدا کر دی ہے اور شتر مرغ بننے کی کبھی کوشش نہیں کی۔ مثال کے طور پر مسلمانوں میں جو لونڈیوں کا رواج ہے اس کے متعلق اسلام نے خاص اصول وضوابط مقرر کر دیے ہیں۔ تعددِ ازدواج کی خاص اشکال ہیں جن سے بدکاری وزناکاری کا قلع قمع ہو جاتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ بالشوی ممالک میں عورتوں کی حالت نسبتاً اچھی ہے۔ چناں چہ رُوس میں اسلامی ممالک کی طرح چکلے نہیں ہیں، مرد اور عورت آزاد ہیں۔ نکاح اور طلاق میں غیر معمولی سہولتیں ہیں۔

یورپ میں عورتوں کی آزادی کا تیسرا اقدم جنگِ عظیم ہے۔ مرد تو میدانِ جنگ میں تھے اور عورتوں نے ملک میں رہ کر آزادی حاصل کر لی۔ مردوں کا سارا کاروبار انھوں نے سنبھال لیا جس سے ان میں بڑی خود اعتمادی پیدا ہو گئی۔ ساتھ ہی جنسی تعلقات بڑی کثرت سے ناجائز پیدا ہونے شروع ہو گئے۔ زمانہ جنگ میں جب فوجیں کسی حصہ ملک پر قابض ہوتی تھیں تو وہاں کی عورتیں بڑی کثرت سے برضا ورغبت یا بالجبر فوجیوں کے ساتھ آلودہ ہو جاتی تھیں۔

عورتوں کی تقلید:

مشرق کے لیے اب بڑا سوال یہ ہے کہ عورتوں کے مساوی حقوق تسلیم کرتے ہوئے اُن کو زندگی کی جدوجہد کے مختلف شعبوں میں داخل ہونے کی اجازت دیتے ہوئے اور ان کی آزادانہ نشوونما کے لیے ان کے راستہ سے تمام رکاوٹوں کو دور کرتے ہوئے کیا طریق زندگی اختیار کرنا چاہیے جس سے وہ خوبیاں تو حاصل ہو جائیں جو آزادی کے صحیح

استعمال سے حاصل ہو سکتی ہیں لیکن وہ خرابیاں پیدا نہ ہوں جو یورپ میں نظر آتی ہیں؟ آیا اس سلسلہ میں خذ ماصفا ودع ما کدر[421] (کیا بیان کیا جاسکتا ہے اور کیا غلط ہے) ممکن بھی ہے یا نہیں اس کا جواب آنے والے واقعات ہی دے سکیں گے۔ مغرب میں عورتوں کی بے لگام آزادی نے بعض ایسے خوف ناک نتائج پیدا کیے کہ مشرق والوں کے اس خیال کو تقویت ہو گئی کہ چار دیواری ہی عورتوں کے لیے موزوں و درست مقام ہے۔ لیکن کوئی شخص بھی جو اپنی قوم کے حالات سے صحیح طور پر واقف ہے اس سے انکار نہیں کر سکتا کہ رسمی پردے کی شدتوں نے نہ صرف عورتوں کو اپاہج کر دیا ہے بلکہ تمام جسدِ قومی اس سے مفلوج ہو گیا ہے۔

قابلِ تقلید خصوصیات:

مہذب یورپ کا عام انسان ہمارے ہم وطنوں کے مقابلہ میں بہت زیادہ محنتی اور بہت زیادہ فرض شناس ہوتا ہے۔ اس معاملہ میں خصوصیت سے انگریز اور جرمن قوم بہت زیادہ قابلِ تقلید ہے۔ جرمنوں کی ایک عام قومی خصوصیت یہ ہے کہ وہ جس کام میں ہاتھ ڈالتے ہیں اسے پایۂ تکمیل تک پہنچاتے ہیں۔ قومی ڈسپلن جتنا جرمنی میں پایا جاتا ہے اتنا دنیا کی کسی قوم میں شاید آج تک نہیں پایا گیا۔ ہر چیز کے لیے ایک قاعدہ اور قانون ہے اور سوسائٹی کا نظام اس قسم کا ہے کہ ہر فرد کو قاعدہ کی پابندی کرنے کے بغیر چارہ نہیں ہے تمام زندگی زنجیرِ آئین میں جکڑی ہوئی ہے اور ہر فرد کو اس کا احساس ہے کہ آئین کی پابندی ہی سے افراد اور اقوام حقیقی آزادی سے بہرہ ور ہو سکتی ہیں۔

ہندوستان کی ترقی کی پہلی منزل وہ ہو گی جب کہ ہندوستانیوں میں صحیح معنوں میں حُبِ وطن پیدا ہو جس کے معنی یہ ہیں کہ اس ملک کے مختلف گروہ اپنی مذہبی و اقتصادی کشاکش کو چھوڑ کر ملک کی بہتری اور آزادی کی نئی کوشش کریں گے۔ اب تک اس ملک کی یہ حالت ہے کہ افراد یا تو اپنی انفرادی خود غرضی میں مبتلا ہیں یا مختلف گروہ فریقانہ تعصب کے شکار ہیں۔ جب تک یہ صورتِ حال باقی ہے اس ملک کی تمام قوتیں باہمی کشاکش میں اسی طرح غارت ہوتی رہیں گی جس طرح ایک بڑی ندی ریگستان میں سے گذرتے ہوئے گم ہو جاتی ہے۔

یہ تمدّن کا ایک عام اصول ہے کہ جب پس ماندہ اقوام کا ترقی یافتہ اقوام کے ساتھ واسطہ پڑتا ہے تو پس ماندہ قومیں پہلے ترقی یافتہ قوموں کے ظواہر اور اُن کے عیوب کی نقل کرتی ہیں۔ ہماری قوم ابھی اسی منزل سے گزر رہی ہے۔ پرستارانِ مغرب کا زیادہ تر گروہ ایسا ہے جو انگریزی کپڑوں، انگریزی طرزِ ماند و بود، انگریزی خوراک اور اسی طرح بعض اور ظاہری چیزوں میں اہلِ یورپ کی تقلید کرنے کے بعد اپنے آپ کو ترقی یافتہ سمجھ کر مطمئن ہو جاتا ہے۔ یہاں یہ امر بیان کرنا ضروری ہے کہ اہلِ مغرب نے پہلے علوم و فنون کو حاصل کیا اور اس کے بعد اپنی محنت اور الوالعزمی سے

افزائشِ دولت کی طرف توجہ کی اور اپنے معیارِ زندگی اور رہائش کو ایک خاص سطح تک بلند کیا لیکن ہمارے مفلس اور اپاہج ملک نے علوم و فنون کے حصول کی کوشش اور افزائشِ دولت کی جد و جہد کے بغیر دولت مند اقوام کی نقل شروع کر دی جس سے ملک کو شدید نقصان پہنچا۔ اس لحاظ سے مہاتما گاندھی نے بڑا شاندار کام کیا کہ آزادی کی جد وجہد میں سادگی کو زندگی کی ضروری اساس قرار دیا۔ افسوس ہے کہ مسلمانوں نے جو اپنے دوسرے ہم وطنوں کی بہ نسبت بہت زیادہ مفلس ہیں اور جن کو سادگی کی بہت زیادہ ضرورت ہے، ابھی اس طرف توجہ نہیں کی۔

پیام:

پہلے مغرب کی دولت پیدا کرو، مغرب کی ہمت پیدا کرو، مغرب کا حبِ وطن پیدا کرو اور مغرب کا ذوقِ حرّیت پیدا کرو، اس کے بعد مادی آسائشیں خود بہ خود پیدا ہو جائیں گی، گاڑی کو آگے اور گھوڑے کو پیچھے مت کرو۔ ان سب باتوں کے باوجود مشرقی انسان کو فراموش نہیں کرنا چاہیے کہ وہ بڑی بڑی عظیم الشان تہذیبوں کا وارث ہے۔ زند گی کے اعلیٰ نصب العینوں کے لیے مشرقی انسان کو محض مغرب کا دریوزہ گر ہونے کی ضرورت نہیں ہے نہ اس بات کی ضرورت ہے کہ وہ جھوٹے فخر سے مغرب کو ہمیشہ ہدفِ دُشنام بناتا رہے۔ مستقبل کی اعلیٰ تہذیب وہ ہو گی جس میں مشرق کے بعض قدیم نصب العین مغرب کی کامیابیوں سے ہم آغوش رہیں گے۔

محترمہ صغرا ہمایوں مرزا:

محترمہ صغرا ہمایوں مرزا حیا حیدرآبادی خواتین میں ایک ممتاز حیثیت رکھتی ہیں، آپ شاعرہیں، آپ نے کئی کتابیں تصنیف فرمائی ہیں اور متعدد زنانی رسائل کی مدیرہ رہ چکی ہیں۔ آج کل رسالہ "زیب النساء"[422] آپ کی ادارت میں لاہور سے نکل رہا ہے۔ آپ ایک اچھی مقرّرہ بھی ہیں اور حیدرآباد کی اکثر زنانی و مردانی کانفرنسوں میں آپ سرگرم حصہ لیتی ہیں۔

آپ ۱۹۲۴ء میں اپنے شوہر، مسٹر ہمایوں مرزا، بیرسٹر کے ہمراہ سیاحت کی غرض سے یورپ تشریف لے گئی تھیں اور دوسری مرتبہ ویمبلی نمائش[423] کے وقت بھی آپ یورپ ہو آئی ہیں۔

اہلِ یورپ کی خصوصیات:

محترمہ صغرا ہمایوں مرزا کے خیال میں یورپ کی ترقی کا راز یہ ہے کہ وہاں کے لوگ ہر چیز میں آگے بڑھنا چاہتے ہیں، اُن کے حوصلے بلند ہیں۔ وہ جس کام کو کرتے ہیں، خلوص اور محنت سے کرتے ہیں۔ وہ ایک دوسرے سے ہمدردی کرتے ہیں اور ملک و قوم کے لیے ہر قسم کے ایثار اور قربانی سے دریغ نہیں کرتے۔ برخلاف اس کے ہم لوگ کاہل ہیں، ہماری ہمتیں پست ہیں۔ ہم سمجھتے ہیں کہ جب لاالہ الا اللہ محمد رسول اللہ کہ کر سیدھے جنت میں جا سکتے ہیں تو ہمیں کسی اور کام کی ضرورت نہیں ہے، اس فرسودہ خیالی نے ہمیں تباہ و برباد کرر کھا ہے۔

اہلِ یورپ وقت کے بڑے پابند ہوتے ہیں اور وقت کو بے کار ضائع نہیں کرتے حتیٰ کہ لنگڑے، لولے اور اپاہج سب ہی کام کرتے ہیں۔ وہاں کے بیت المعذورین میں مختلف طریقوں سے ناکارہ لوگوں کو کام پر لگایا جاتا ہے۔

جرمنی میں غیر ملکی سیاحوں کے لیے ایک محکمہ قائم ہے جس کا کام سیاحوں کو ہر قسم کی سہولتیں بہم پہنچانا ہے۔ اس کی غرض و غایت یہ معلوم ہوتی ہے کہ سیاح وہاں سے اچھے ارتسامات لے کر واپس جائیں تاکہ دُور دُور جرمنی کی شہرت پھیلے۔ اس محکمہ میں یہ بتلادینا کافی ہے کہ آپ جرمنی کی کون سی چیزیں دیکھنا چاہتے ہیں، جس کے بعد ہفتہ میں دو دن اس محکمہ کے صدر آپ کو ان مقامات کی سیر کو لے جاتے ہیں۔ آپ کی سواری اور خورد و نوش کا انتظام تک اس محکمہ کی جانب سے ہوتا ہے۔ محترمہ صغرا ہمایوں مرزا نے اس محکمہ کے توسّط سے بچوں کی تعلیم گاہیں، زچگی خانے اور اپاہج خانے دیکھے۔ آپ اس محکمہ کے لوگوں کے اخلاق اور برتاؤ کی بڑی تعریف فرماتی ہیں۔

یورپ اور ہندوستان کی عورتوں کا مقابلہ کرتے ہوئے آپ نے فرمایا کہ ہمارے پاس مسلمان عورتوں سے کچھ کام نہیں لیا جاتا جب تک مرد اور عورت مل کر کوئی کام نہیں کریں گے اس وقت تک ہمارا ترقی کرنا محال ہے۔ میرے

اس اعتراض پر کہ اس سے گھر کے انتظامات میں مشکلات پیدا ہونے کا احتمال ہے، آپ نے فرمایا کہ اس میں شک نہیں کہ گھر کا کام کاج سب سے مقدّم ہے لیکن کم از کم فرصت کے اوقات میں عورت اگر چاہے تو مرد کا بہت کچھ ہاتھ بٹا سکتی ہے، لیکن آج کل کی تعلیم یافتہ لڑکیوں کا یہ حال ہے کہ انھیں دعوتوں، تقاریب اور جلسوں میں تو شریک ہونا آتا ہے لیکن نہیں آتا ہے تو گھر کا کام کاج۔ امورِ خانہ داری سے انھیں دلچسپی نہیں اور اس پر طرفہ یہ کہ انھیں فرصت بھی نہیں۔ خود اپنی غیر معمولی مصروفیت کا ذکر کرتے ہوئے محترمہ نے فرمایا کہ گھر کے جملہ انتظامات اور پریشانیوں کے بعد وہ مضامین لکھنے، تقاریر کرنے، کانفرنسوں اور جلسوں میں شریک ہونے کے لیے وقت نکالتی ہیں۔ آپ کے خیال کے بموجب، انسان اگر کرنا چاہے تو بہت کچھ کر سکتا ہے۔ اس کے برعکس یورپ میں کام کا یہ عالم ہے کہ زچگی خانوں میں زچاؤں کو بھی بے کار نہیں چھوڑا جاتا۔ وہاں کے معذورین سے جو کام لیا جاتا ہے اس کو دیکھ کر حیرت ہوتی ہے۔ اگر کسی کا ہاتھ نہیں ہے تو اسے پاؤں یا دانتوں سے لکھنا سکھایا جاتا ہے، کوئی گونگا، بہرا ہو تو اسے باغبانی سکھائی جاتی ہے۔ جرمنی کے ایک بیت المعذورین میں آپ نے دیکھا کہ ایک کمرے میں اُن تمام اپاہجوں کی تصویریں آویزاں تھیں جنھوں نے باوجود بدترین جسمانی ناقابلیتوں کے کچھ نہ کچھ کام سیکھا اور اس میں ترقی کی۔ اس سے دوسرے اپاہجوں کی ہمت افزائی ہوتی ہے اور اُن کے دلوں سے یہ خیال جاتا رہتا ہے کہ دنیا میں ان کی ہستی کسی مصرف ہی کی نہیں اور وہ سوسائٹی کے ناکارہ افراد ہیں۔

پردہ:

ہندوستان کی مسلمان عورتوں میں آج کل جس قسم کے پردے کا رواج ہے اس میں محترمہ صغرا ہمایوں مرزا ترمیم کی ضرورت محسوس کرتی ہیں اور آپ کا خیال ہے کہ ہماری عورتوں کو اسلامی پردہ اختیار کرنا چاہیے جس سے زندگی کے کاروبار میں ہرج نہ ہو۔ آپ بے پردگی کی حامی نہیں ہیں لیکن آپ چاہتی ہیں کہ عورتوں کا لباس ستر پوش ہو اور عورتیں برقعہ پہن کر کاروبار میں حصہ لیں۔

میرے اس سوال پر کہ ہماری عورتیں یورپ کی عورتوں کی کس حد تک اتّباع کر سکتی ہیں؟ آپ نے فرمایا کہ ہمیں ان کی اچھی اچھی چیزیں اختیار کرنی چاہیے۔ یورپ کی سب ہی عورتیں بُری نہیں ہیں۔ اچھے اور بُرے نمونے ہر ملک میں ہوتے ہیں۔ ہم کو اچھوں کی تقلید کرنی چاہیے۔ اس سلسلہ میں آپ نے اپنی کسی زمانہ کی ایک یورپین پڑوسن مسز گھوش کا ذکر فرمایا جو باوجود ناتجربہ کار، جوان اور حسین ہونے کے اپنے شوہر کی اجازت کے بغیر گھر کے باہر قدم نہیں رکھتی تھی۔ وہ پردہ تو نہیں کرتی تھی لیکن کیا مجال کہ ملازم لڑکا کمرے میں گھس آئے یا شوہر کی عدم موجودگی میں

اس کا کوئی دوست گھر آجائے۔ برخلاف اس کے ہمارا نیم پردہ ہمارے لیے وبائے جان بن گیا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ عورت کی عصمت مآبی کا امتحان اس کو گھر کی چار دیواری میں مقیّد رکھ کر نہیں کیا جا سکتا۔ ایک جانور کو بھی باندھ کر رکھا جائے تو اس سے کوئی لغزش سرزد نہیں ہو گی، اصل آزمائش باہر پھرنے والیوں کے لیے ہے کہ باوجود موقعوں اور دلچسپیوں کے ان کے ہاتھ سے عصمت کا ہاتھ نہیں چھوٹتا۔

خاتمہ:

آخر میں محترمہ صغرا ہمایوں مرزا نے فرمایا کہ ہماری عورتوں کی غیر ترقی یافتہ حرکت کے مرد بھی بڑی حد تک ذمہ دار ہیں، خود مردوں کو چاہیے کہ اپنی عورتوں کو کام پر لگائیں، اُن کو ایسے کام سکھلائیں کہ اپنی فرصت کے اوقات میں وہ مصروف رہ سکیں۔ اُن کو دنیا کے حالات سے باخبر رکھا جائے، اخبار بینی کی اُن میں عادت ڈالی جائے۔ اُن میں وطنیّت کے جذبے پیدا کیے جائیں، ان میں وسیع النظری پیدا کی جائے تاکہ وہ شیعہ، سنی، ہندو پارسی* یا عیسائی کی تفریقوں کو نظرانداز کر کے قومی ترقی کا خیال رکھیں۔ ہماری ماؤں کو چاہیے کہ گہوارہ ہی سے بچوں کے دلوں میں محبت اور صلح و آشتی کے بیج بوئیں تاکہ آئندہ چل کر جب یہ بیج تناور درختوں کی شکل اختیار کریں تو ہزار تفرقوں کی آندھیاں چلیں لیکن یہ اپنی جگہ سے جنبش نہ کر سکیں۔

مولوی میر اکبر علی خان:

مولوی میر اکبر علی خان صاحب بی اے۔، ایل۔ ایل۔ بی۔ آنرز (لندن)، بیرسٹر اٹ لا۔ ملک کے مشہور لیڈر اور جامعہ عثمانیہ کے قابل فخر سپوت ہیں۔ انجمنِ طیلسانینِ عثمانیہ[424] کے صدر کی حیثیت سے آپ نے دو تین سال ملک کی اس نوجوان جماعت کی بہترین سر کردگی فرمائی ہے۔ آپ مجلسِ وضع قوانین سرکارِ عالی کے رکن اور مجلسِ بلدیہ[425] کے نائب صدر رہ چکے ہیں۔ آپ اینگار کمیٹی[426] کے بھی رکن ہیں جس کو حکومتِ سرکارِ عالی نے ملک کی سیاسی ودستوری اصلاحات کے متعلق سفارشات کرنے قائم فرمایا ہے۔ آپ کا قیام انگلستان میں ۱۹۲۵ء تا ۱۹۲۸ء رہا۔

خصوصیات:

انگلستان کی سب سے پہلی چیز جو ایک نووارد کو متحیر کرتی ہے وہ لوگوں کی مصروفیت ہے۔ آپ کسی روز صبح کام کے اوقات شروع ہونے سے قبل سڑک پر نظر دوڑائیں تو اندازہ ہوگا کہ کس طرح ہر شخص اپنی دھن میں لگا ہوا ہے اور وقت کے سیلاب کے ساتھ بہا جا رہا ہے۔ اس گڑبڑ اور نفسا نفسی میں جو چیز قابلِ تعریف ہے وہ لوگوں میں انتہائی ضبط اور نظم کا پایا جانا ہے، ادنیٰ سے ادنیٰ آدمی کو اپنے اور دوسروں کے حقوق اور ذمہ داریوں کا احساس ہے۔

ضبط و نظم:

میرے اس سوال پر کہ اہلِ فرنگ میں اس ضبط و نظم کی کیا وجہ ہے اور یہ چیزیں ہم میں کیسے پیدا ہو سکتی ہیں۔ مولوی اکبر علی خان صاحب نے فرمایا کہ یہ چیزیں تعلیم سے زیادہ تربیّت کا نتیجہ ہیں۔ ماحول اور گرد و پیش کے حالات سے یہ عادتیں اتنی راسخ ہوگئی ہیں کہ اب یہ قومی خصوصیات میں داخل ہوگئی ہیں۔ اس کے برعکس ہمارے خیالات اور احساسات زبانی جمع و خرچ کی حد تک تو بہت اعلیٰ و ارفع ہوتے ہیں لیکن عمل نہ ہونے کی وجہ سے ان کی حیثیت بالکل تصوّری ہوتی ہے۔

ایثار:

انگریزوں کے متعلق یہ کہنا مبالغہ نہ ہوگا کہ وہ مجسّم ایثار اور ہمدردی ہیں۔ اس کی توضیح آپ نے اپنے ایک معمولی تجربہ سے یوں فرمائی۔ آنرز کے آخری امتحان کے دو تین روز قبل آپ کا مزاج ناساز ہوگیا، آپ سخت متردّد تھے کہ کیا ہوگا لیکن لینڈ لیڈی نے آپ کی تیمارداری اور دلدہی میں کوئی کسر اُٹھا نہ رکھی۔ وہ روزانہ امتحان گاہ تک آپ کے ساتھ آتی اور پرچہ ختم ہونے تک باہر موٹر میں بیٹھی رہتی اور آپ کے لیے تھوڑے تھوڑے وقفوں سے میوہ جات اور

کھانے کی دوسری ہلکی چیزیں بھیجتی رہتی۔ امتحان کے اختتام تک اس کا یہی حال تھا بلکہ اُس نے اپنے شوہر سے بھی کہ دیا تھا کہ اس نے اپنا سارا وقت مسٹر خان کے لیے وقف کر دیا ہے۔ بر خلاف اس کے ہمارے پاس موقع و محل کا لحاظ نہیں کیا جاتا، جہاں ضرورت نہیں وہاں ہمدردی کا اتنا مظاہرہ ہوتا ہے کہ تکلیف ہونے لگتی ہے اور جہاں فی الواقع اس کی ضرورت ہوتی ہے وہاں سرد مہری برتی جاتی ہے۔

ضبط و تحمّل:

انگریزوں کے ضبط و تحمّل کا اندازہ اس واقعہ سے ہو سکتا ہے۔ ایک مرتبہ مولوی اکبر علی خان صاحب اپنی لینڈ لیڈی کے ہمراہ برائٹن[427] تفریح کے لیے گئے اور اس عورت کے شوہر نے وہاں سیکل پر آنے کا وعدہ کیا لیکن چالیس پچاس میل کا فاصلہ ہونے کی وجہ سے یہ شخص وہاں دیر سے پہنچا اور مقامِ متعیّنہ پر ان لوگوں کو منتظر نہیں پایا۔ علاوہ ازیں مجمع زیادہ ہونے کی وجہ سے ان کا پتہ بھی نہیں چل سکا، اس کو وہاں کسی ہوٹل میں ٹھہرنے کی بھی جگہ نہیں ملی۔ ناچار کوفت کھا کر وہ مکان واپس ہو گیا۔

دوسرے روز جب یہ لوگ واپس ہوئے تو راستہ میں ایک دوست کی زبانی اس کی پریشانیوں اور غصّہ کا حال معلوم ہوا۔ مکان پہنچنے کے بعد بیوی نے اپنی غلطی کی معذرت چاہی۔ شوہر نے نیچی نظریں کیے ہوئے جواب دیا کہ آئندہ کے لیے احتیاط کی جائے اور سارا قصّہ ختم ہو گیا۔ ورنہ مولوی اکبر علی خان صاحب دل میں ڈر رہے تھے کہ معلوم نہیں دونوں کی لڑائی کیا صورت اختیار کرتی۔

کمزوریاں:

انگلستان کے لوگوں میں بظاہر دو خامیاں نظر آتی ہیں، ایک جذبات کی کمی اور دوسرے عورتوں کے معاملات۔ اول الذّکر محض کاروباری ذہنیّت کا نتیجہ ہے جس نے لوگوں کو حددرجہ کاروباری بنا دیا ہے۔ سرِراہ ممکن ہے کسی اپاہج کو خیرات دیتے ہوئے لوگ پس و پیش کریں لیکن اس سے ہرگز یہ نتیجہ نہیں نکالا جا سکتا کہ ان میں خیرات کا تصوّر ہی نہیں ہے۔ اس معاملہ میں یہ لوگ ہم سے بھی زیادہ پابند ہیں لیکن انفرادی خیرات کے طریقوں کے مخالف ہیں۔ ملک میں بڑے بڑے خیراتی ادارے ہیں جہاں لوگ بڑی پابندی سے چندے ادا کرتے ہیں۔ اس طرح اجتماعی طور پر جو چندہ جمع ہوتا ہے وہ انفرادی چندوں سے اپنی افادیت میں بڑھا ہوا ہوتا ہے۔ معاشری خدمت گذاری کا جتنا احساس انگلستان میں ہے وہ کسی ملک میں نظر نہیں آتا۔ ملک میں ہزاروں ایسے ادارے ہیں جو محض عطیّوں اور خیراتی رقوم پر چلتے ہیں جس سے انگریزوں کی بیدار مغزی بھی ظاہر ہوتی ہے۔

یورپی عورتوں کے متعلق ہندوستان میں عجیب مبالغہ آمیز روایات مشہور ہیں۔ ہمارے اور اُن کے نقطہ نگاہ میں فرق ہے، ہم جن چیزوں کو عیب سمجھتے ہیں وہاں وہ عیب نہیں ہیں۔ مثلاً ناچنے کو ہی لیجیے، ہم اس کو معیوب سمجھتے ہیں لیکن وہاں یہ بمنزلہ احتیاج کے ہے۔ یورپ میں پردہ نہ ہونے کی وجہ سے جسم کی وہ چیزیں جو چھپی رہنی چاہیں نمایاں ہو کر نظر آتی ہیں لہٰذا ان کے معمولی عیوب بھی ہمیں بہت نمایاں ہو کر نظر آتے ہیں حالاں کہ یورپ کے تمدّنی اور معاشرتی حالات کے مدِّ نظر یہ چیزیں قابلِ در گزر ہیں۔ عورتوں کے آزاد رہنے کی وجہ سے معاشرے میں جو خرابیاں پیدا ہو سکتی ہیں وہ اُن اچھائیوں سے ہزار درجہ بہتر ہیں جو عورتوں کو پردے میں رکھنے سے پیدا ہوتی ہیں۔ ہماری موجودہ چار دیواری کے پردے نے عورتوں کی جسمانی اور ذہنی نشو و نما کو تباہ کر دیا ہے، ان میں وسیع النظری اور بلند حوصلگی پیدا نہیں ہو سکتی اور اُن کی تمام صلاحتیں اور قابلیتیں گھر کے انتظام اور بچوں کی نگہداشت میں صرف ہو کر رہ جاتی ہیں یا یوں ہی ضائع ہو جاتی ہیں۔

مولوی محمد صلاح الدین صاحب:

مولوی محمد صلاح الدین صاحب ایم۔اے، کا شمار جامعہ عثمانیہ کی بہترین پیداوار میں ہے۔ آپ نے آکسفورڈ میں پانچ سال قیام فرمایا ہے۔ فلسفہ آپ کا مضمون ہے لیکن انگریزی ادب سے آپ کو غیر معمولی دلچسپی اور لگاؤ ہے۔ آپ جامع عثمانیہ میں انگریزی و فلسفہ کے لکچرار ہیں۔ آپ کا قیام انگلستان میں ۱۹۲۵ء تا ۱۹۳۱ء رہا۔

ابتدائی تعلیم:

پانچ سال کی عمر میں بچے لازمی طور پر کنڈر گارٹن میں شریک کیے جاتے ہیں، جہاں تعلیم مفت دی جاتی ہے۔ یہاں بچوں کی تربیت اور کھیل کود کی طرف خاص طور پر توجہ دی جاتی ہے، ہر مہینہ اِن کا طبّی معائنہ ہوتا ہے اور خصوصیت سے ان کے دانت اور آنکھوں کا امتحان کیا جاتا ہے۔ بچوں کی تعلیم کے لیے بیمہ کا ایک بہت اچھا طریقہ رائج ہے، وہ یہ کہ ماہانہ چھ پنس کی اقساط کی ادائی پر اکیس سال کی عمر میں دو ڈھائی سو پونڈ بچوں کو یک مُشت مل جاتے ہیں اور یہ رقم اتنی کافی ہوتی ہے کہ اعلیٰ تعلیم پر یا کسی اور کام کے شروع کرنے میں اس سے بڑی مدد ملتی ہے۔

کنڈر گارٹن میں آٹھ نو سال کی عمر ختم کرنے کے بعد بچے ہائی سکول میں شریک ہوتے ہیں۔ بچوں کی تعلیم میں خاص طور پر ان کے صنعتی میلانات کا لحاظ کیا جاتا ہے اور ان میں مشین اور اس کے کل پر زوں کے اعمال سے متعلق تجسّس پیدا کرایا جاتا ہے۔ علاوہ ازیں اُنھیں مدرسہ کی جانب سے میوزیم، نمائش گھر اور اس قسم کے دوسرے مقامات

کی باقاعدہ تفریح کرائی جاتی ہے تاکہ بچے اپنی فطری قابلیتوں کو نشو و نما دے سکیں۔ شہنشاہی نمائش 428 کے اس واقعہ سے اس کی مزید توضیح ہو سکتی ہے کہ نمائش سے متعلق انگلستان کے بچوں کے لیے ایک انعامی مضمون نویسی کا مقابلہ منعقد ہوا۔ جس لڑکے کا مضمون بہترین قرار پایا اس کو ملکِ معظّم نے اپنے ہاتھوں سے انعام مرحمت فرمایا۔ اس نمائش سے متعلق یہ امر قابلِ ذکر ہے کہ اس میں شہنشاہت کے جملہ ممالک کی صنعت و حرفت، زراعت، پیداواریں اور دیگر اہم چیزوں کے نمونے فراہم کیے گئے تھے۔ انگلستان کی جملہ صنعتوں کی نمائش یہاں اس طور پر کی گئی تھی کہ اُن کی تیاری کے سارے مراحل از ابتدا تا انتہا بتلا دیے گئے تھے، مثلاً صنعت بسکٹ سازی میں گیہوں سے بسکٹ بننے تک جتنے مراتب ہوتے تھے اُن کو نمائش کا ہر ناظر دیکھ سکتا تھا۔

پبلک اسکول:

پبلک اسکولوں کا انگلستان میں آج کل رواج کم ہوتا چلا ہے اور برناڈ شا* اور دیگر ماہرینِ تعلیم ان کی ضرورت محسوس نہیں کرتے۔ کسی زمانہ میں یہ تہذیب سکھلانے اور اوصافِ حکمرانی پیدا کرنے کے مخصوص ادارے تھے اور موجودہ صنعتی تعلیم کا اُن پر کوئی اثر نہیں تھا۔ پبلک اسکول اور میٹرک کا نصاب اتنا معیاری ہوتا ہے کہ ان کے بعد طلبا ہر قسم کے کاروبار میں شریک ہو سکتے ہیں۔ ہندوستانی طلبا کے لیے یہاں کے میٹرک کا نصاب بہت مشکل ہے۔

مخلوط تعلیم:

کنڈرگارٹن تک تعلیم مخلوط ہوتی ہے۔ ہائی سکول تک زنانی اور مردانی مدارس ہیں لیکن کالج میں پھر تعلیم مخلوط ہو جاتی ہے۔ ہم تعلیمی کے نتائج کے متعلق مولوی صلاح الدین صاحب نے فرمایا کہ ملک کے معاشرتی حالات اس قسم کے ہیں کہ مخلوط تعلیم کی برائیوں کی طرف کوئی توجہ نہیں کی جاتی۔ یہ ایک حقیقت ہے کہ تعلیم اور سوچنے سے اِخلاقی معیارات میں تزلزل کا پیدا ہونا یقینی ہے۔ تعلیم حاصل کرنے کے بعد اخلاق کے پرانے اُصول و ضوابط کی پوری طرح پابندی ناممکن ہے کیوں کہ جب تک اخلاقی معیارات موجودہ سوسائٹی کے تغیر پذیر حالات کا ساتھ نہ دیں عقلِ سلیم انھیں تسلیم نہیں کر سکتی۔

کتب خانے:

لوگوں میں ذوقِ مطالعہ پیدا کرنے کے لیے انگلستان میں مختلف طریقے رائج ہیں جن کے من جملہ 'ٹائمز بک کلب' کا طریقہ ہمارے لیے قابلِ تقلید ہے۔ روزنامہ 'ٹائمز' لندن کی جانب سے ہر شہر اور قصبہ میں ایک کلب

قائم ہے جس کی رکنیت کا چندہ ۱/۲ ۷ (ساڑھے سات) شلنگ ماہانہ ہے۔اراکین کو ہر کتاب جس کی قیمت ۳۰ شلنگ سے زیادہ نہ ہو مطالعہ کے لیے فراہم کی جاتی ہے،افسانوی ادب پر عام طور پر زور دیا جاتا ہے۔

علاوہ ازیں ہر مقام پر بلدی کتب خانے قائم ہیں تاکہ ادنیٰ طبقہ کے لوگ جو ماہانہ چندہ ادا نہیں کر سکتے ان سے استفادہ کر سکیں لیکن اس کا رکن بننے کے لیے حدودِ بلدیہ میں رہنا ضروری ہے۔

کاروباری ذہنیت:

انگلستان بالکل ایک کاروباری ملک ہے۔نپولین* نے بجا طور پر انگریزوں کو دوکان داروں کی قوم کا نام دیا ہے۔کاروباری ذہنیت زندگی کے ہر شعبے میں سرایت کی ہوئی ہے جس کی وجہ سے انفرادیت پر اتنا زور دیا جاتا ہے کہ گھر کی زندگی تباہ ہو جاتی ہے۔جہاں لڑکا کمانے لگا وہ اپنی دنیا الگ قائم کرنا چاہتا ہے،یہی حال لڑکیوں کا ہے اس سے لازماً محبت اور خلوص میں کمی واقع ہو جاتی ہے اور یہ فطرتِ انسانی ہے کہ جہاں عقل و خرد میں اضافہ ہوا،جذبات میں کمزوری پیدا ہونا ضروری ہے۔یوں بھی سرد ملک ہونے کی وجہ سے لوگ زیادہ حساس نہیں ہوتے اور کوئی چیز دائرۂ اعتدال سے متجاوز نہیں ہونے پاتی۔چناں چہ انگلستان میں یہ ایک عام بات ہے کہ نوجوان عموماً قسمت آزمائی اور مہم جوئی کے لیے دور دراز کے ممالک کو نکل جاتے ہیں جس کا والدین ذرا بھی اثر نہیں لیتے بلکہ خوش ہوتے ہیں کہ لڑکا ٹھکانے لگ گیا اور اپنے پیروں پر کھڑا ہے۔ہر چیز کو وہ لوگ افادی نقطہ نظر سے دیکھتے ہیں چناں چہ ہماری طرح وہاں کوئی شخص اپنے کسی عزیز کے پاس مہینوں مہمان نہیں رہتا۔کرسمس یا خاص موقوں پر اگر کسی عزیز کے پاس ٹھہرنا مقصود ہو تو بہت پہلے اس کی اطلاع دے دی جاتی ہے اور پھر قیام بھی دو چار روز سے زائد نہیں ہوتا۔کاروباری ذہنیت کے علاوہ اس کی ایک اور بھی وجہ ہو سکتی ہے،وہ یہ کے بلحاظ گنجائش مکانات مختصر اور پلنگ مکینوں کی تعداد سے زیادہ نہیں ہوتے۔ سردی اتنی سخت ہوتی ہے کہ کوئی شخص فرش پر سو نہیں سکتا لہٰذا قبل از وقت اپنے قیام کے متعلق اطلاع دینی ضروری ہو جاتی ہے ورنہ کسی ہوٹل میں ٹھہرنا پڑتا ہے۔

نظم و باقاعدگی:

انگریز جتنے کاروباری ہیں اتنا ہی ان میں ضبط اور نظم بھی پایا جاتا ہے۔انگریزوں کی باضابطگی اور تنظیم کا اندازہ ۱۹۲۶ء کی عام ہڑتال سے ہو سکتا ہے۔ہڑتال کے زمانہ میں تین روز تک ہر قسم کا کاروبار بند تھا،شہر لندن پر اس قدر اُداسی چھا گئی تھی کہ معلوم ہوتا تھا کہ اُسے سانپ سونگھ گیا ہے۔ہڑتال سے روزانہ کروڑوں پونڈ کا نقصان ہو رہا تھا لیکن ملک میں کہیں بھی ایک فساد یا ہنگامہ رونما نہیں ہوا۔اتنی زبردست اور انقلاب انگیز ہڑتال میں اتنی منظم کیفیت کا پیدا

ہو نا صرف انگلستان میں ممکن ہے۔ ہڑتال کے زمانہ کی یہ چیز قابلِ ذکر ہے کہ آکسفورڈ اور کیمبرج کے انڈر گریجو یٹوں نے جہاز کے حمالوں اور قلیوں کی طرح کام کیا۔

انگریزوں کی تنظیم اور ڈسپلن کا اندازہ اس واقعہ سے بھی ہو سکتا ہے کہ عام ہڑتال کے بعد ہی انتخابات ہوئے اور عمالی حکومت قائم ہوئی۔ انگلستان میں انتخابات کے نتائج سنیما میشن کے ذریعہ ایک بڑے اونچے پردے پر دکھلائے جاتے ہیں جن کے دیکھنے کے لیے لاکھوں آدمی جمع رہتے ہیں۔ سر بالڈوِن کی شکست کا منظر جس طرح دکھلایا گیا، اگر ہندوستان میں دکھلایا جاتا تو کشت و خون کی نوبت آجاتی۔ پردے پر مسٹر بالڈوِن کی آنکھوں سے آنسو رواں تھے، ہچکیوں سے منہ میں پائپ ہل رہا تھا اور چہرے سے انتہائی شکست خوردگی کی علامات ظاہر تھیں لیکن قدامت پرستوں نے اور ہر شخص نے اس منظر کو بڑی خندہ پیشانی سے دیکھا اور کسی کی پیشانی پر بل تک نہ آیا۔

وطن پروری:

اس طرح انگریز دنیا میں زبردست قوم پرست ہیں، اپنے وطن کے لیے یہ ہر قسم کے ایثار کے لیے تیار ہیں۔ کسی غیر ملکی چیز کی طرف انگریز آنکھ اُٹھا کر نہیں دیکھتے۔ زمانۂ قیامِ آکسفورڈ میں محمد صلاح الدین صاحب روسی دیاسلائی خریدتے تھے لیکن جب ۱۹۲۶ء میں روس کے خلاف عام نفرت پیدا کی گئی تو کسی دکان پر یہ دیاسلائی نظر نہیں آتی تھی اور اس کا نام لیجیے تو لوگ ناک بھوں چڑھاتے اور مشتبہ نظروں سے دیکھنے لگتے تھے۔ کمپنی کے صدر دفتر لندن سے استفسار کرنے پر معلوم ہوا کہ آکسفورڈ کی کوئی دکان اس دیاسلائی کو اپنے پاس رکھنے کے لیے آمادہ نہیں ہے۔ اس طرح "عمالی ہفتہ وار" جو ایک اشتمالی اخبار تھا بجز دفترِ اشاعت کے کسی نیوز ایجنٹ کے پاس دستیاب نہیں ہوتا تھا۔

عورت:

مولوی محمد صلاح الدین صاحب نے آزادیٔ نسواں کے متعلق اپنے خیالات کی بڑی دلچسپ توضیح فرمائی۔ آپ کا خیال ہے کہ جن حالات اور موقعوں سے ایک یورپین لڑکی کو سابقہ پڑتا ہے اگر وہی حالات اسی عمر کی ایک ہندوستانی لڑکی کے درپیش ہوں تو ضبطِ نفس میں یورپین لڑکی بازی لے جائے گی۔ وہاں لڑکیوں سے کھلے بندوں جنسی معاملات اور اس کے دلچسپ پہلوؤں پر تبادلۂ خیالات کرنا کوئی بات ہی نہیں اور اس سے کوئی خاص نتائج بھی پیدا نہیں ہوتے۔ یورپ میں تعلیم، آزاد خیالی اور مرد اور عورت کی معاشی یکسانیت نے عورتوں کو اپنی حد سے دو ایک قدم آگے بڑھا دیا ہے۔ آج کل ضبطِ تولید کے عجیب و غریب ایجادات اور طریقوں نے رہی سہی قید بھی اُٹھادی۔ ضبطِ تولید کا انگلستان میں کافی چرچا ہے۔ جب تک مالی حالت اچھی نہ ہو لوگ شادی نہیں کرتے اور شادی ہو جائے تو اس وقت تک اولاد پیدا

کرنے کی کوشش نہیں کی جاتی جب تک کہ مالی حالت اولاد کی پرورش اور ان کی تعلیم و تربیت کی کفیل نہ ہو لیکن بجز اونچے طبقوں کے ادنی متوّسط اور غریب لوگ ابھی اس تحریک کے اثر سے دُور ہیں۔

یورپ کی عصمت فروشی ہندوستان کے لیے بڑا دلچسپ اور پامال موضوع ہے۔ انگلستان میں تو فرانس کی طرح اس کی قانوناً اجازت نہیں ہے۔ فرانس میں پیشہ ور عورتوں کی باقاعدہ رجسٹری ہوتی ہے اور معائنہ طبّی کے بعد اجازت نامے دیے جاتے ہیں جو ان کے "صحت مند" ہونے کی دلیل ہوتے ہیں۔ علاوہ ازیں محکمۂ صحت کی جانب سے امراضِ متعدی کے روکنے کی خاص کوشش کی جاتی ہے۔ چناں چہ پیرس کے پیشاب خانوں میں ان امراض سے بچنے کی تدبیریں اعلان کی شکل میں شائع کی جاتی ہیں حتیٰ کہ ڈاکٹروں کے نام تک درج کر دیے جاتے ہیں تاکہ مریض فوراً رجوع ہو سکیں۔ انگلستان میں ایسا نہیں ہوتا یہاں پر اگر کوئی عورت سڑک یا عام شاہراہ پر مردوں کو اپنی طرف راغب کرتے ہوئے نظر آئے تو پولیس اسے گرفتار کر لیتی ہے لیکن اس کے باوجود انگلستان میں پیشہ ور عورتوں کی کثرت سے اور اس کے لیے پکیڈلی، رَسل اسکوائر وغیرہ مشہور اکھاڑے ہیں۔ جہاں سن رسیدہ عورتیں تک، جن میں مشکل جوانی کے دھندلے آثار رہتے ہیں، بناؤ سنگھار کر کے مردوں کا پیچھا کرتی ہیں۔

عورت اور مرد کے اختلاط کے مظاہرے تفریح گاہوں پر بنک کی تعطیلات اور خصوصیت سے ایسٹر کی چھٹیوں میں دیکھنے میں آتے ہیں۔ ایسٹر کا زمانہ تو بڑی دل کشیوں کا حامل ہوتا ہے۔ بہار کی ابتدا کے دن ہوتے ہیں، مطلع صاف رہتا ہے اور آفتاب اپنی پوری تابناکیوں کے ساتھ نکلنے لگتا ہے۔ ایک مرتبہ ایسٹر[429] کے زمانہ میں مولوی صلاح الدین صاحب شیکسپیر کے وطنِ مالوف اسٹرافورڈ آن ایون[430] گئے جہاں اس موسم میں خوش باشوں کا ایک میلہ لگا رہتا ہے۔ تفریح کرتے کرتے جب آپ ایک پگڈنڈی سے جنگل کی طرف نکلے تو کچھ دُور جانے کے بعد آپ نے دیکھا کہ راستہ کے دونوں جانب مرد اور عورتوں کے جوڑے تھوڑی تھوڑی دُور پر پڑے ہوئے عیش منا رہے ہیں۔ عجیب دلچسپ اور ہوش رُبا مناظر دیکھنے میں آئے لیکن نہ راستہ چلنے والوں کو اس کا احساس تھا اور نہ یار لوگوں کو اس کی پرواہ تھی گویا ایک حمام میں سب ہی برہنہ تھے۔

یورپ کی عورتوں کا جذبات انگیز لباس اور ان کی عریاں پسندی بھی ہم لوگوں کے لیے عجیب خیال آرائیوں کا مرقّع ہے لیکن وہاں یہ چیزیں اتنی عام ہیں کہ جذبات کی برانگیختگی کے لیے اب کافی متصوّر نہیں ہوتیں۔ عام طور پر سمندر کے کنارے یا نہانے کے مقامات پر عریانی کے دلچسپ مناظر دیکھنے میں آتے ہیں لیکن پبلک مقامات پر عورتوں کو

برہنہ نہانے کی اجازت نہیں ہے مگر پھر بھی روزانہ کے ملبوس سے نہانے کا لباس پہننے میں جو وقفہ لگتا ہے وہ نظر بازوں کے لیے بہت کچھ ہے۔

آکسفورڈ میں دریائے چرول(CherWell)[431] پر ایک ایسا مقام ہے جہاں مرد برہنہ نہاتے ہیں۔ اس مقام کے اطراف ٹٹیاں لگی ہیں اور عورتوں کے لیے یہاں سے گزرنے کے لیے ایک دوسرا راستہ ہے لیکن اس کے باوجود شریر لڑکیاں ٹٹیوں کے سوراخوں میں سے جھانکتی ہیں جس کی بجز جنسی کشش کے، کوئی اور وجہ نہیں ہو سکتی۔

جہاں تک ازدواجی زندگی کا تعلق ہے یہ کہا جا سکتا ہے کہ عورت اپنے مرد احباب سے بے تکلف ملتی ہے اور اس کو وہاں کوئی خاص اہمیت نہیں دی جاتی لیکن جب یہ دوستی اعتدال کے دائرہ سے بڑھنے لگتی ہے تو شوہر کچھ قیود اور پابندیاں عائد کرنے کی کوشش کرتا ہے اگر معاملہ یہیں رفع دفع نہ ہو جائے تو بعض وقت شرم ناک نتائج کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔

یورپ میں عصمت مآبی ہی دراصل عورت کو جانچنے کا معیار نہیں ہے، وہاں بے عصمتی سے زیادہ وطن فروشی، فریب دہی، بددیانتی اور اس قسم کی دوسری چیزیں معیوب ہیں۔

خصوصیاتِ ذاتی:

انگریز بالطبع بہت خاموش قسم کے لوگ ہیں، بغیر متعارف ہوئے آپ سے گفتگو نہیں کریں گے اور کریں گے بھی تو عام چیزوں سے متعلق، موسم، سیاسیات، کھیل کود وغیرہ۔ اس معاملہ میں فرانسیسی انگریزوں کے بالکل متضاد ہیں، ایک سرسری ملاقات میں آپ اُن کے متعلق ساری باتوں سے واقف ہو جا سکتے ہیں لیکن ساتھ ہی ان کی طبیعت میں اشتعال بھی زیادہ ہے، معمولی معمولی باتوں پر الجھ جاتے ہیں۔

نسلی تعصب:

انگلستان میں ہندوستان سے کافی تعصب برتا جاتا ہے۔ اکثر ہوٹل، رسٹوران، بال روم ایسے ہیں جن کے دروازے رنگین اقوام کے لیے بند ہیں لیکن یہ خیال رفتہ رفتہ ناپید ہوتا جا رہا ہے۔ لندن میں بجز حبشیوں کے دیگر اقوام کے لوگوں کو ہوٹلوں اور دیگر پبلک مقامات پر آنے کی عام اجازت ہے۔

لیکن رنگ کا یہ تعصب سب سے زیادہ اڈنبرا* میں موجود ہے جہاں خود ہندستانیوں نے اپنے آپ کو ذلیل کیا۔ وہاں کے بڑے ہوٹلوں میں ہندوستانی طالب علم اپنے ساتھ معمولی قسم کی فاحشہ عورتوں کو لے جانے لگے جس

سے ہوٹلوں کی نیک نامی پر برا اثر پڑنے لگا تو مجبوراً ہندوستانیوں کے لیے ان کے دروازے بند کر دیے گئے۔ اس پر بہت شور و شغب ہوا حتیٰ کہ مسٹر چیٹرجی *، ہائی کمشنر کو تحقیقات کے لیے اڈنبرا جانا پڑا۔

عام اخلاق:

اہلِ انگلستان کے عام اخلاق اور شائستگی کے متعلق محمد صلاح الدین صاحب نے ایک انتہائی دلچسپ اور سبق آموز واقعہ بیان فرمایا۔ ایک صبح آپ آکسفورڈ میں کارفاکس کے ایک بس اسٹینڈ پر بس کے انتظار میں کھڑے ہوئے تھے، برف پڑ رہی تھی اور بس کے آنے کا وقت قریب تھا اتنے میں ایک عورت اسٹینڈ کی طرف دوڑتی ہوئی نظر آئی۔ بس آ رہی تھی، ہر شخص کی نظریں عورت پر تھیں لیکن ابھی وہ اسٹینڈ تک پہنچنے بھی نہ پائی تھی کہ اس کا پیر پھسل گیا اور وہ چت گر گئی اور اس کا لباس منہ تک اُلٹ گیا۔ اس ہوش رُبا منظر کو وہاں کھڑے ہوئے ہر شخص نے دیکھا لیکن حیرت ہے کہ کسی کے چہرے پر ہنسی تو کجا خفیف سی مسکراہٹ تک نمودار نہیں ہوئی حتیٰ کہ مجمع میں سے کسی نے اس کی دست گیری نہیں کی۔ عورت گھبرائی ہوئی تھی، اس نے اپنا لباس درست کیا اور آکر بس میں بیٹھ گئی لیکن یہاں بھی کسی کے چہرے سے یہ ظاہر نہیں ہوتا تھا کہ ابھی تھوڑی دیر پہلے ان کی نظروں کے سامنے کوئی غیر معمولی واقعہ پیش آیا ہے۔ انگریزوں میں یہ ضبط و تنظیم ان کی قومی خصوصیات میں سے ہے اور قوم کا ہر فرد خواہ وہ امیر ہو یا غریب ان چیزوں کی پابندی کرتا ہے۔

صحت و بیمہ:

انگلستان کے ہر قصبہ میں ایک پبلک ہسپتال ہوتا ہے جو خانگی چندوں سے چلتا ہے۔ ماہانہ چار پنس ادا کرنے کے بعد ہر شخص اس کا رکن بن سکتا ہے۔ علاوہ ازیں فیکٹریوں، اخباروں، دکانوں میں کام کرنے والے مزدوروں (بجز خانگی ملازمین) کی صحت کا بیمہ حکومت کی جانب سے کرایا جاتا ہے، جس کی معمولی اقساط مقرر ہیں۔ اگر کوئی مزدور بیمار پڑے تو اس کو اپنے خاص ڈاکٹر کے پاس رجوع ہونا پڑتا ہے جس کو پہلے ہی سے اس کے علاج کے لیے نامزد کر دیا جاتا ہے۔ چوں کہ پیٹنٹ دوائیں عام طور پر مہنگی ہوتی ہیں اس لیے ان ڈاکٹروں کے پاس اچھی قسم کی سستی دواؤں کی ایک فہرست رہتی ہے جن سے مزدوروں کا علاج کیا جاتا ہے۔ اس طریقہ کو پینل سسٹم[432] کہتے ہیں۔

حضرت بندگانِ عالی کے متعلق ایک غلط خبر:

عام طور پر انگریز اتنے مصروف ہوتے ہیں کہ انھیں بجز اپنے ملک کے حالات کے، دوسرے ممالک کے حالات سے کوئی خاص دلچسپی نہیں ہوتی اور نہ ہی ان کے معلومات اچھے ہوتے ہیں یہی وجہ ہے کہ بعض وقت بے بنیاد خبریں اخباروں تک میں شائع ہو جاتی ہیں۔ ذیل کے واقعہ سے اس کی توضیح ہو سکتی ہے۔

برار کے مطالبہ اور لارڈ ریڈنگ[433] کے مشہور خط کی اشاعت کے وقت برطانوی اخبارات میں حیدر آباد کو نمایاں جگہ حاصل تھی اور ہماری ریاست سے متعلق بڑی دلچسپ خبریں شایع ہوا کرتی تھیں۔ چناں چہ ایک اخبار نے یہ بتلایا کہ حضور بندگانِ عالی دنیا کے سب سے دولت مند انسان ہیں۔ یہاں تک تو خیر کوئی بات نہ تھی لیکن ستم ظریفی کی انتہا ہو گئی جب ایک دوسرے اخبار نے یہ بے سر و پا خبر شایع کی کہ حضورِ پر نور کی اسپیشل ٹرین میں اتنا بڑا حقہ ہے جو انجن میں رکھا رہتا ہے اور اس کا تعلق ایک نلی اور نیتچے کے ذریعہ ہر ڈبہ سے ہے اور جس ڈبہ میں سے چاہو، اسے پی سکتے ہیں۔ اس سے لوگوں کے معلومات کا اندازہ ہو سکتا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ بجز چند ممبرانِ پارلیمنٹ یا ہندوستان سے واپس شدہ وظیفہ یاب لوگوں کے، ہندوستان سے کسی کو کوئی دلچسپی نہیں۔

عدم واقفیت:

انگریزوں کی عدم واقفیت کی محمد صلاح الدین صاحب نے ایک اور مثال دی۔ ایک کتاب خانہ میں آپ نے بڑے اشتیاق سے ہندوستان سے متعلق ایک انگریز خاتون کی ایک تصنیف دیکھی جس کی اخبارات میں بڑی تعریف ہوئی تھی لیکن اس کا پہلا یا دوسرا ورق الٹتے ہی آپ پر یہ جغرافی انکشاف ہوا کہ "بنارس* جو بنگال* کا ایک مشہور شہر ہے۔۔۔۔۔"

افغانی طالب علم کا جھگڑا:

آپس کے جھگڑوں اور فساد میں فریقین کو ایک دوسرے کے خلاف موقع دیا جاتا ہے، یہ نہیں کہ ایک کے مقابل دو چار کھڑے ہو گئے۔ اس کی توضیح محمد صلاح الدین صاحب نے اس واقعہ سے فرمائی۔ ایسٹ بورن* ایک مشہور سمندری تفریح گاہ ہے جہاں یار باش لوگوں کا خوب مجمع رہتا ہے۔ ایک مرتبہ جامعہ آکسفورڈ کے ایک افغانی طالب علم کا پاؤں چلتے چلتے پھسل گیا اور وہ ایک انگریز پر جا گرا جو کسی ہندوستانی فوج کا وظیفہ یاب کرنل تھا۔ کرنل صاحب کے منہ سے غصہ میں "ڈام انڈین"[434] نکل گیا جس کے سنتے ہی جو شیلے افغانی نے زور سے ایک چانٹا رسید کیا اور دونوں میں ہاتھا پائی ہونے لگی۔ بوڑھے اور جوان کی لڑائی تھی، جو ایسے مقام پر ہو رہی تھی جہاں بوڑھے کی قوم کے

ہزاروں افراد جمع تھے لیکن کسی نے بوڑھے کی دست گیری نہیں کی۔ اُس کی خیر اسی میں تھی کہ اپنی ہار مان لیتا یا صلح کر لیتا اور انگریزوں کی حکمت عملی مشہور ہے، آخر چائے کی دعوت دے کر بوڑھے نے اس قصہ کو ختم کیا۔

ظالم مرد:

ایک مرتبہ محمد صلاح الدین صاحب ایک انگریز خاتون سے، جو آپ سے متعارف تھی، اشتراکیت* کی اہمیت بیان کر رہے تھے۔ آپ نے سرمایہ داری* کی مذمّت کی، انگلستان کے مزدوروں کی ناگفتہ بہ حالت پر اظہارِ افسوس کیا اور ہندوستان کی مثال پیش کی کہ کس طرح یہاں آپس میں ہمدردی اور خلوص ہے۔ آخری جملہ پر یہی خاتون برہم ہو کر کہنے لگی کہ ہندوستانیوں میں اتنی ہمدردی کہاں سے آئی جب وہ گھر کے نوکروں کو مارنے اور گالیاں دینے کے عادی ہیں۔ آپ نے اس بیان کی تردید کی لیکن اس نے اصرار کیا اور اپنی ایک ہندوستانی شوہر والی سہیلی کا ذکر کیا جس نے اس کو یہ بات بتلائی تھی۔ بالآخر لاجواب ہو کر آپ کو خاموش ہو جانا پڑا۔

جس مکان میں محمد صلاح الدین صاحب قیام پذیر تھے اس میں ایک پٹھان طالب علم بھی رہتے تھے۔ مالک مکان کی لڑکی جوان تھی اور اس کی ماں اور باپ متوسّط سے کچھ اونچی عمر کے تھے۔ لڑکی کا باپ بڑا پُر گو اور باذاق آدمی تھا۔ ایک روز سب بیٹھے خوش گپیوں میں مصروف تھے کہ بوڑھے نے مذاق سے کہا کہ وہ اپنی بیوی بچوں حتیٰ کہ انگلستان سے بیزار آگیا ہے اور اس کا ارادہ ہندوستان جا کر کسی دیسی عورت سے شادی کر لینے کا ہے۔ اس پر لڑکی نے برجستہ کہا کہ مسٹر خان کی تین بہنیں ناکتخدا ہیں، ان میں سے وہ کسی ایک سے شادی کر سکتا ہے۔ اس جملہ پر خان صاحب مشتعل ہو گئے اور آستین چڑھانے لگے۔ محمد صلاح الدین صاحب نے اُنھیں اُردو میں سمجھایا کہ یہ محض مذاق تھا، اس پر بگڑ بیٹھنا، اپنا خود تمسخر کرانا ہے۔ بڑی دیر میں خان صاحب ٹھنڈے پڑے۔ حقیقت یہ ہے کہ لڑکی کی زبان سے جو جملہ ادا ہوا تھا وہ ایسا تھا کہ اس پر انگلستان میں غصہ کا تصوّر بھی نہیں کیا جا سکتا۔ اس کی مزید توضیح محمد صلاح الدین صاحب نے انگلستان کے ایک واقعہ سے یوں فرمائی۔ ایک طالب علم کالج میں شرکت کی غرض سے پروفیسر کے پاس گیا جس نے اس کے وطن، خاندان و دیگر حالات کے متعلق مختلف سوالات کیے اور آخر میں اس کو پہچان کر فرمایا کہ کسی زمانہ میں اس کی ماں سے اُن کی بڑی دوستی تھی، اس سے بڑھ کر اشتعال کے لیے اور کیا بات ہو سکتی ہے لیکن لڑکا اس سے ذرا بھی برہم نہیں ہوا۔

اظہارِ محبت:

ایک مرتبہ محمد صلاح الدین صاحب ایک لڑکی کے ہمراہ ایک میلہ میں تشریف لے گئے۔ بنجاروں (Gypsies) کا ڈیرہ دیکھ کر اس نے اپنی قسمت معلوم کرنے کی خواہش ظاہر کی، آپ چوں کہ ان چیزوں کے قائل نہیں ہیں، آپ نے انکار کر دیا۔ آخر لڑکی اکیلے ہی ڈیرہ میں گئی اور آپ باہر کھڑے رہے۔ تھوڑی دیر کے بعد وہ ہنستی ہوئی نکلی، آپ نے مذاقاً دریافت کیا کہ کہیں اس کی شادی کے متعلق کوئی انکشاف تو نہیں ہوا۔ لڑکی نے ایک زور کا قہقہہ لگایا اور آپ کے کان کے قریب اپنا منہ لا کر کہنے لگی، "ہاں! بالکل، ایک کالے آدمی کے ساتھ۔"

دانت:

انگلستان میں ہندوستانیوں کے دانتوں کو بڑی قدر کی نگاہوں سے دیکھا جاتا ہے کیوں کہ وہاں اکثر لوگوں کے دانت خراب ہوتے ہیں اور پیوریا عام مرض ہے۔ ایک مرتبہ ایک نوجوان لڑکی نے جس کو اپنے دو دانت پیوریا کی وجہ نکلوا دینے پڑے تھے، آپ کے دانتوں کو دیکھا کر کہا کہ دانت کی مضبوطی اور خوبصورتی شاید کالے رنگ کے ساتھ مخصوص ہے۔

گرمی:

ہندوستانیوں کے متعلق عام طور پر یہ سمجھا جاتا ہے کہ وہ انگلستان کی گرمی کے متعلق محسوس نہیں کرتے کیوں کہ ہندوستان کے (۱۱۵) یا (۱۲۰) درجہ کی حرارت کے مقابلہ میں یہاں پارہ (۹۰) سے اونچا نہیں جاتا۔ لیکن یہ خیال صحیح نہیں ہے، گرمی برابر محسوس ہوتی ہے اور ماہِ اگست میں تو حبس ہونے لگتا ہے۔

ڈاکٹر محمد مقبول:

ڈاکٹر محمد مقبول علی، بی۔ اے۔، ایل۔ آر۔ سی۔ پی۔، ایم۔ آر۔ سی۔ ایس (لندن)۔ جامعہ عثمانیہ کے پہلے طیلسانی ہیں جنھوں نے انگلستان سے طب کی ڈگری حاصل کی۔ آپ سر رشتۂ طبابت، سرکارِ عالی میں سوّل سرجن ہیں۔

۱۹۲۰ء میں آپ علی گڑھ میں زیرِ تعلیم تھے جب رئیس الاحرار، مولانا محمد علی* نے جامعہ ملّیہ* کی بِناڈالی تو آپ اس میں شریک ہو گئے، اس طرح آپ کو مولانا کے بہت قریب رہنے کا موقع ملا ہے۔ تحریکِ خلافت کے زمانہ میں صوبہ سرحدی و صوبہ متوسّط میں پروپگنڈے کا کام آپ کے تفویض تھا۔ انگلستان میں آپ کا قیام ۱۹۲۶ء تا ۱۹۳۳ء رہا۔

تنظیم:

ابتدا میں جب ایک ہندوستانی طالب علم انگلستان میں قدم رکھتا ہے تو اُس کی کیفیت بالکل ایک رنگروٹ کی سی رہتی ہے۔ اس کا ماحول نیا رہتا ہے، اس کے لیے دنیا نئی ہوتی ہے اور ہر چیز نئی۔ اپنے گرد و پیش کے حالات سے واقف ہونے کے لیے اُسے کچھ مدّت درکار ہوتی ہے۔ اپنے اس ابتدائی زمانہ میں ڈاکٹر صاحب کو جس چیز نے سب سے زیادہ حیرت میں ڈالا وہ بس اسٹینڈ کا ایک معمولی واقعہ ہے۔ موسلا دھار بارش ہو رہی تھی لیکن بس کے انتظار میں لوگ برساتیاں اوڑھے یا چھتری لگائے قطار (کیو) باندھے کھڑے تھے۔ تھوڑے تھوڑے وقفوں سے بس آتی تھی، کنڈیکٹر خالی نشستوں کی تعداد بتلا دیتا تھا اور سلسلہ کے لحاظ سے اتنے ہی لوگ بس میں داخل ہو جاتے تھے۔ انگریزوں کی ترقی کی سب سے بڑی وجہ یہی ان کا ضبط و تنظیم ہے جو اُن کی زندگی کی ہر چیز پر حاوی ہے۔

محنت کی قدر:

اس طرح لوگ اصول کے بڑے پابند ہوتے ہیں، اوقات کی پابندی کرتے ہیں اور خوب محنت کرتے ہیں۔ کام کرنے کے شوق کا یہ عالم ہے کہ ہر ادنیٰ و اعلیٰ اپنے آپ کو کسی نہ کسی کام میں لگائے رکھتا ہے خواہ اس میں آمدنی کی کوئی صورت ہو یا نہ ہو اپنے ایک واقعہ کے ذریعہ ڈاکٹر صاحب نے اس کی یوں توضیح فرمائی۔ لندن کے جس ہسپتال میں آپ زیرِ تعلیم تھے وہاں دو ادھیڑ عمر کی نرسیں بیماروں کی پالکیاں اٹھایا کرتی تھیں اور آپریشن تھیٹر کی صفائی بھی ان ہی کے ذمہ تھی۔ یہ دونوں وقت کی بڑی پابند تھیں اور اپنا کام بہت ہی عمدگی سے انجام دیتی تھیں۔ ایک مرتبہ ڈاکٹر صاحب نے ایک ہمدردانہ لہجہ میں ان کی غیر معمولی محنت کی ستائش کرتے ہوئے ان کا مشاہیرہ دریافت فرمایا، لیکن آپ کو یہ سن کر تعجب ہوا کہ انھیں ہسپتال سے کسی قسم کا معاوضہ نہیں ملتا اور وہ جو بھی کام کرتی ہیں وہ محض شوق، وقت گذاری اور جذبۂ ایثار کے تحت کرتی ہیں۔

اس طرح شاہ جارج پنجم *آں جہانی کی ہمشیرہ کا بھی ایک واقعہ ہے جو لندن کے ایک بچوں کے ہسپتال میں بطور نرس کام کرتی تھیں۔ ابتداً ہسپتال والوں نے اُن سے ایسا کام لیا جو اُن کے اعزاز کے لحاظ سے مناسب ہو سکتا تھا لیکن جب اس کا انھیں پتہ چل گیا تو اس کو انھوں نے منظور نہیں فرمایا اور دوسرے روز سے ایک نرس کی حقیقی خدمات انجام دینے لگیں جس میں فرش کا دھونا بھی داخل ہے۔ مذکورہ دو واقعات سے اندازہ ہو سکتا ہے کہ انگلستان میں محنت کی کیسی قدر کی جاتی ہے اور کام سے لگے رہنے کے کیا معنی ہیں۔

ہسپتال:

شہر لندن میں بارہ پندرہ بڑے بڑے ہسپتال ہیں جہاں طبّی تعلیم کا بھی انتظام ہے۔ یہ ہسپتال بالکل چندوں اور عطیوں پر قائم ہیں جس سے انگریزوں کی بیدار مغزی ظاہر ہوتی ہے۔ حکومت کی جانب سے بھی کچھ رقمی امداد مل جاتی ہے جو بہت قلیل ہوتی ہے۔ ان ہسپتالوں میں جتنے ڈاکٹر کام کرتے ہیں انھیں کوئی تنخواہ نہیں دی جاتی البتہ طبّی جماعتوں کو پڑھانے کا برائے نام کچھ معاوضہ مل جاتا ہے، لیکن ہسپتال میں مفت کام کرنے کے یہ معنی نہیں کہ انھیں کچھ فائدہ پہنچتا ہی نہیں۔ ان کی خانگی پریکٹس کا دارومدار اسی اعزازی خدمت پر ہے اور یہیں سے اُنھیں شہرت حاصل ہو تی ہے۔

ہر محلہ میں پینل پریکٹس کا طریقہ رائج ہے جس میں کم قیمت کی دواؤں سے غربا کا علاج کیا جاتا ہے۔ یوں دیکھا جائے تو انگلستان میں ڈاکٹر بڑے مہنگے ہیں اُن سے ملنے کے لیے اوقات مقرر ہیں، مشورے کی فیس کم از کم دو پونڈ یا تیس روپیوں کے قریب ہوتی ہے۔

عورت:

یورپ کی عورتوں کے متعلق مشرق میں عجیب و غریب قصے مشہور ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ وہاں عورتوں کو جن حالات سے دوچار ہونا پڑتا ہے اگر وہی بات ہندوستان میں پیدا ہو جائے تو یہاں حالات اور بھی بدتر ہو جائیں۔ یورپ میں باوجود اتنی آزادی کے، آپ بغیر متعارف ہوئے کسی عورت سے ملاقات یا گفتگو نہیں کر سکتے۔ اکثر عورتوں سے باوجود شناسائی کے اختلاط نہیں بڑھایا جا سکتا جب تک وہ خود اس پر رضامند نہ ہوں۔ عورتیں عام طور پر خوش طبعی اور بذلہ سنجی کو بہت پسند کرتی ہیں اور ایسے لوگ عورتوں میں کافی مقبول رہتے ہیں۔ علاوہ ازیں ہر اُس شخص کی قدر کی جاتی ہے جس میں کچھ نہ کچھ کمال ہو۔

فرانسیسی عورتیں اخلاقی معیار میں انگریزی عورتوں سے بڑھی ہوئی ہیں۔ وہاں سرِ راہ، ہائیڈ پارک کے جیسے اختلاط کے مناظر دیکھنے میں نہیں آتے البتہ امریکہ کے خوش باشوں یا دیگر سیاحوں کے لیے عورتوں کا ایک خاص طبقہ موجود ہے۔

نسلی امتیاز:

انگلستان میں حاکم و محکوم اور کالے گورے کا بھی امتیاز کیا جاتا ہے۔ ڈاکٹر صاحب نے برٹش میوزیم کے قریب ایک ہوٹل میں ایک نئے آنے والے حیدرآبادی صاحب کے لیے ایک کمرہ محفوظ کرایا لیکن جب ہوٹل کے مالک

کو اُن کی قومیت معلوم ہوئی تو اس نے صاف انکار کر دیا۔ انگریزوں کی یہ خصوصیت ہے کہ کسی طرح اپنا کام نکالنے کی کوشش کرتے ہیں لیکن جہاں اُن سے کوئی کام نکلنا ہو یا جب مساویانہ سلوک کا موقع آئے تو کترا جاتے ہیں۔

عام اخلاق:

انگلستان کے اعلیٰ طبقہ کے لوگ بہت ذی خُلق ہوتے ہیں۔ ہسپتال کا بڑے سے بڑا سرجن معمولی سے معمولی مریضوں کے ساتھ انتہائی خندہ پیشانی سے گفتگو کرتا ہے۔ مریضوں کے جوتے خود اپنے ہاتھوں سے اتارنے اور پہنانے میں بھی اسے عار نہیں ہوتا۔ اس طرح چھوٹے درجہ کے لوگ بھی خلیق ہوتے ہیں لیکن ان میں متضاد مثالیں بھی مل جاتی ہیں۔ ایک مرتبہ ڈاکٹر صاحب کرایڈن[435] تشریف لے گئے اور سگریٹ پیتے ہوئے اس مقام کا گشت لگا رہے تھے جہاں پر ہوائی جہاز ٹھہرے ہوئے تھے۔ آپ کو سگریٹ پیتا دیکھ کر ایک معمولی قسم کے آدمی نے جو غالباً وہاں کا نگران تھا آپ سے مخاطب ہو کر کہا "جناب: اگر میں آپ کی جگہ ہوتا تو یہاں سگریٹ نہیں پیتا"، ڈاکٹر صاحب فرماتے ہیں کہ آپ کو سگریٹ پینے سے منع کرنے کا اس سے بہتر اور مؤثر طریقہ کوئی نہیں ہو سکتا تھا۔ اس قسم کے اخلاق وہاں کی سوسائٹی میں عام طور پر برتے جاتے ہیں۔

جذبۂ ایثار:

انگریزوں میں ایثار و ہمدردی کا بھی بڑا مادہ ہے۔ اگر کوئی حادثہ ہو جائے یا کوئی شخص کسی تکلیف میں مبتلا ہو جائے تو لوگ ہر قسم کی مدد کے لیے تیار ہو جاتے ہیں۔ چناں چہ خود ہندوستان کے مشہور قتل باؤلا کے واقعہ سے اس کی تصدیق ہوتی ہے کہ کس طرح دو انگریز عہدہ داروں نے اپنی جان کو خطرہ میں ڈال کر باؤلا کی دست گیری کی تھی۔ بہر کیف ہندوستان اور انگلستان کے حالات کا مقابلہ کرنے کے بعد یہ کہا جا سکتا ہے کہ وہاں کتے کی جان کی جتنی قدر کی جاتی ہے اتنی یہاں انسان کی نہیں کی جاتی۔

ڈاکٹر میر سیادت علی خان:

ڈاکٹر میر سیادت علی خان، ایم۔اے۔، پی۔ایچ۔ڈی۔، بی۔سی۔ایل (آکسن *)، بیرسٹرایٹ لا، جامعہ عثمانیہ کی ایک بہترین پیداوار ہیں۔آپ سر رشتۂ عدالت سرکارِ عالی میں ناظمِ ضلع ہیں۔اس کے قبل آپ جامعہ عثمانیہ کے شعبۂ قانون میں پروفیسر تھے۔ شرعِ شریف[436] اور اُصولِ فقہ[437] آپ کے خاص مضامین ہیں۔ انگلستان میں آپ کا قیام ۱۹۲۶ء تا ۱۹۳۱ء رہا۔

تنظیم:

یورپ کے عروج کا راز، ڈاکٹر میر سیادت علی خان کے نزدیک صرف ایک لفظ "تنظیم" میں مضمر ہے جو اہلِ یورپ کی زندگی کے ہر پہلو پر حاوی ہے۔ صرف ایک طریقہ "کیو" سے اہلِ فرنگ کی باقاعدگی، تنظیم اور فرض شناسی کا اندازہ ہو سکتا ہے۔ کسی سنیما گھر، کسی تفریح گاہ اور اس طرح کسی عام مقام پر کسی قسم کا شور یا ہنگامہ نظر نہیں آتا۔ لوگ قطاریں باندھے کھڑے رہتے ہیں اور باری باری سے ٹکٹ حاصل کرتے ہیں۔ ریل چھوٹ جائے، سنیما دیکھنا نصیب نہ ہو، سیر و تفریح سے محروم ہو جائیں لیکن "کیو" کی پابندی لازم ہے۔ یہاں کی طرح نہیں کہ سینما دیکھنے جتنے لوگ جاتے ہیں وہ بیک وقت ٹکٹ خریدنے کی کوشش کرتے ہیں خواہ اس میں کسی کا دم کیوں نہ گھٹ جائے۔

کاروباری ذہنیت:

وقت کی پابندی، ایفائے عہد اور فرض شناسی وہاں کی زندگی کے عام اصول ہیں۔ صنعتی ملک ہونے کی وجہ سے لوگوں میں یہ عاتیں راسخ بھی ہو گئی ہیں۔ اس کاروباری ذہنیت کا یہ اثر ہے کہ لوگ بے حد خلیق، ہمدرد اور وسیع النظر ہیں۔ کسی معاملہ میں رواروی اور جلد بازی نظر نہیں آتی اور بڑے سے بڑے معاملہ میں لوگ کبھی الجھتے دکھائی نہیں دیتے۔ یہ چیزیں وہاں کے معمولی سے معمولی لوگوں میں پائی جاتی ہیں۔ چناں چہ ایک مرتبہ ڈاکٹر صاحب برٹش میوزیم میں پانچ ساتھ گھنٹے مطالعہ کر کے ایک بس اسٹینڈ کی طرف جارہے تھے۔ سامنے سے ایک بس (موٹر) آرہی تھی اور ڈاکٹر صاحب اس کے بیچ راستہ میں تھے۔ ڈرائیور ہارن پر ہارن بجارہا تھا۔ ڈاکٹر صاحب اس خیال میں تھے کہ وہ کھرنجہ (پیومنٹ) پر چل رہے ہیں لہٰذا انھوں نے ہارن پر کوئی توجہ نہیں کی۔ بالآخر بس بُری طرح آپ کے سامنے آکر رُکی اور اس کا مڈگارڈ آپ کی پتلون کو چاٹ کر رہ گیا۔ اس وقت کہیں ڈاکٹر صاحب اپنے مراقبہ سے بیدار ہوئے۔ پریشانی میں ڈرائیور کی صورت پر جو آپ نے نظر ڈالی تو وہاں بجز مسکراہٹ کے اور کچھ نہ تھا۔

پابندیٔ وقت:

وقت کی پابندی کا یہ عالم ہے کہ معمولی دودھ لانے والا روزانہ صبح اپنے وقت پر اس پابندی سے آتا ہے کہ آپ اس کو دیکھ کر اپنی گھڑی کا وقت درست کر سکتے ہیں۔ اس سلسلہ میں ڈاکٹر صاحب نے ایک اور واقعہ بیان فرمایا۔ آپ کو حیدرآباد ہی سے رات میں سونے سے قبل پیالی بھر دودھ پینے کی عادت تھی۔ چناں چہ انگلستان پہنچنے کے بعد آپ نے اپنی لینڈ لیڈی کو اس کے متعلق ہدایت کر دی لیکن اپنے پانچ سالہ قیام میں ڈاکٹر صاحب نے ایک مرتبہ بھی دودھ کو ناغہ نہیں پایا حالاں کہ یہ واقعہ ہے کہ ہندوستان میں اتنی غیر معمولی پابندی تو ماں بہنوں سے بھی ممکن نہیں۔ انگلستان کے ادنیٰ ملازمین کے معیارِ کارکردگی، راست بازی اور فرض شناسی کو دیکھ کر کہنا پڑتا ہے کہ وہاں محنت کتنی بامہارت ہے جس نے وہاں کی زندگی کو جنت بنا دیا ہے۔ برخلاف اس کے ہندوستان میں یہی چیز سب سے زیادہ تکلیف دہ ہے، یہاں تو معمولی ماماؤں کا ملنا محال ہے اور پھر ان کی ناز برداریاں۔۔۔ خدا کی پناہ!

تربیتِ اطفال:

تربیتِ اطفال کے سلسلہ میں ڈاکٹر صاحب نے فرمایا کہ مدرسہ میں تعلیم پانے والے چھوٹی عمر کے بچوں کے عام معلومات اتنے وسیع ہوتے ہیں کہ حیرت ہوتی ہے۔ سائنس، ایجادات اور دوسری کارآمد چیزوں سے متعلق بچوں کو جو معلومات گھر میں کھیل کود کے دوران میں حاصل ہوتے ہیں وہ ہمارے پاس کے بڑی عمر کے سائنس پڑھنے والوں میں بھی نہیں پائے جاتے۔ اس طرح ملک کی تاریخ، جغرافیہ، سیاست، انتخابات، سائنس کے مبادی، ملک کی پیداوار، پھول، پودے اور پرندوں سے متعلق موٹی موٹی باتیں اور ان کے نام بچوں کی نوکِ زبان ہیں۔

ڈاکٹر صاحب آکسفورڈ کی ایک فیملی میں سات آٹھ ماہ سے مقیم تھے۔ کرسمس میں اپنی لینڈ لیڈی کے چودہ سالہ لڑکے کو آپ کچھ تحفہ دینا چاہتے تھے جو وہاں کا ایک عام طریقہ ہے۔ آپ نے اس لڑکے سے دریافت کیا کہ اُسے کون سی چیز دی جائے۔ ڈاکٹر صاحب کے اصرار کرنے پر اُس نے جواب دیا کہ اُسے صرف پانچ شلنگ[438] دیے جائیں کیوں کہ اپنے وائرلیس سیٹ کے لیے، جو خود اس نے تیار کیا ہے ایک پُرزہ کی ضرورت ہے جس کی قیمت پانچ شلنگ ہے اور اس رقم کے دینے میں اس کی ماں کو ایک زمانہ سے تامل ہے۔ چناں چہ اس رقم سے اس لڑکے نے نہ صرف اپنا سیٹ ہی مکمل کیا بلکہ گھر کے سب لوگ اس عید کے موقع پر وائرلیس سے لطف اندوز بھی ہوئے۔

عورت:

انگلستان کی عورتوں کے متعلق ڈاکٹر صاحب نے فرمایا کہ زندگی کی دوڑ میں یہ مرد کے دوش بدوش ہیں، گھر کا انتظام، کفایت شعاری اور سلیقہ ان کے فرائض کے اہم جزو ہیں۔ شوہر کی آسائش کے معاملہ میں بھی مغربی عورت ہمارے معیارِ تہذیب پر پوری اترتی ہے۔ البتہ وفاداری اور عصمت مآبی کے متعلق ان کا تصور کچھ ہم سے مختلف ہے۔ لیکن مغرب کی ہر عورت کے متعلق عمومیت سے اس نظریہ کا اطلاق نہیں کیا جاسکتا۔ اچھے اور بُرے نمونے ہر ملک میں پائے جاتے ہیں۔ تربیت، ماحول، معاشی و اقتصادی حالات اور خاندانی شرافت کا بھی اخلاق پر بڑا اثر پڑتا ہے۔

عورت کی حیثیت قانونی:

انگلستان میں ایک زمانہ وہ تھا کہ عورتوں کو مردوں کے مقابلہ میں کسی قسم کے حقوق حاصل نہیں تھے لیکن لارڈ برکن ہیڈ[439] ایکٹ کے بعد سے عورت کی حیثیت قانونی میں بڑا اضافہ ہو گیا ہے۔ انگلستان میں شادی نہ صرف مذہبی بندھن ہے بلکہ دیوانی[440] معاہدہ بھی۔ قوانینِ شادی اچھے ہیں اور شوہر بیوی کے حقوق و فرائض متعین ہیں۔ لیکن طلاق کے معاملہ میں اب بھی فریقین کو بڑی مشکلات کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ عام طور پر طبیعتوں کا اختلاف، شوہر کا ظلم اور زیادتی، بیوی کا بانجھ پن یا خرابیٔ صحت حصولِ طلاق کے لیے کافی وجوہات تسلیم نہیں کیے جاتے۔ طلاق کے لیے زنا کا ثابت کرنا ضروری ہے۔ یہاں یہ امر قابلِ ذکر ہے کہ طلاق حاصل کرنے کے بعد بیوی نہ صرف شوہر سے اپنا نفقہ حاصل کرتی ہے بلکہ اپنے نکاحِ ثانی کے بعد بھی وہ نفقہ کی حق دار ہوتی ہے۔

وصیت:

وصیت کے معاملہ میں بھی موصی پر کوئی قانونی تحدید نہیں ہے وہ جتنی چاہے جائیداد وصیت کے ذریعہ منتقل کر سکتا ہے لیکن قابلِ تعریف بات یہ ہے کہ وصیت کرنا لوگوں کی عادت میں داخل ہو گیا۔ اب شرعِ شریف میں بھی اپنے اعمال کی خامیوں کو وصیت کے ذریعہ پورا کرنے کا حکم ہے لیکن انگلستان میں حقیقی معنوں میں اس حکم کا منشا پورا ہوتا ہے۔ ہمارے پاس عام طور پر جیتے جی وصیت کرنا معیوب سمجھا جاتا ہے اور جب تک موت سر پر نہیں پہنچ جاتی وصیت کی طرف ذہن بھی منتقل نہیں ہوتا یہی وجہ ہے کہ وصیت کرنے کا موقع بالعموم ہاتھ سے نکل جاتا ہے۔ وصیت کی طرح وہاں ہر شخص عادتاً اپنی زندگی کا بیمہ بھی کراتا ہے۔

قومی خصوصیات:

اس میں شک نہیں کہ اسلامی یا مشرقی نقطۂ نظر سے یورپ اور انگلستان کی اخلاقی حالت پست ہے۔ شراب خواری، عصمت فروشی اور اس قسم کے دوسرے عیوب وہاں بکثرت پائے جاتے ہیں لیکن اس کے باوجود اہلِ فرنگ میں بعض قومی خصوصیات ایسی موجود ہیں کہ ان کی برائیوں پر پردہ پڑ جاتا ہے۔

عروج کے انتہائی نقطہ پر پہنچنے کے بعد ممکن ہے مسلمانوں کی پستی اور نکبت کا سبب بنی عباس *اور بنی امیہ * یا دیگر قبائل کے خاندانی مناقشات و باہمی منافرت ہو لیکن سب سے زیادہ مسلمان حکمرانوں کو جس چیز نے تباہ کیا وہ ان کی عیش پرستی تھی اور اس میں بھی ان لوگوں نے اتنا غلو کیا کہ امورِ سلطنت کو پسِ پشت ڈال دیا جس کا لازمی نتیجہ یہ ہوا جو ہم دیکھ رہے ہیں۔ یورپ کی حالت اس کے بالکل برعکس ہے باجود اِس کے یورپ میں شراب خواری و عصمت فروشی کی کثرت ہے لیکن لوگ اصول کے اتنے پابند ہیں کہ ہر کام وقت پر کرتے ہیں۔ دن بھر کے کام کاج کے بعد لوگ رات میں خوب عیش مناتے ہیں اور یورپ میں اس کے بے حد مواقع بھی حاصل ہیں لیکن صبح دیکھیے وہ اپنے کام پر برابر حاضر ہیں اور اپنا کام اس مستعدی اور دلجمعی سے انجام دیتے ہیں کہ اس وقت ان کے دماغ میں عیش کا کوئی تصوّر بھی نہیں ہوتا۔

ڈاکٹر یوسف حسین خان:

ڈاکٹر یوسف حسین خان بی۔ایل۔(پیرس)، جامعہ عثمانیہ میں تاریخِ ہند کے استاد ہیں۔آپ نے جامعہ ملّیہ دہلی سے اپنا فیصلسان حاصل کیا ہے۔ایک مؤرخ، ادیب اور مقرّر کی حیثیت سے آپ بے حد مشہور ہیں۔آپ کی انگریزی کتاب نظام الملک آصف اول تاریخی نقطۂ نظر سے حضرت آصف اول کی بہترین سوانح ہے۔آپ کا قیام فرانس میں ۱۹۲۶ء تا ۱۹۳۱ء رہا۔

یورپ کی برتری کے اسباب:

ڈاکٹر یوسف حسین خان کا ذاتی خیال یہ ہے کہ کسی قوم کی برتری کے دو اسباب ہوتے ہیں:۔

۱۔ خود اس قوم کی اجتماعی تنظیم

۲۔ اس قوم کی وہ صلاحیت جو کائنات اور فطرت کو تسخیر کرنے کے لیے بروے کار لائی جاتی ہے۔

باوجود اپنی کمزوریوں کے یورپ کا نظامِ اجتماعی دنیا کے دوسرے نظاماتِ اجتماعی سے برتر ہے اور اس کا اصلِ اُصول حرّیت -- انفرادی حرّیت ہے۔ازمنۂ وسطیٰ کی تاریکی سے نکلنے کے بعد یہی آزادی اور حرّیت تھی جس کی بدولت اہلِ یورپ کے دماغ روشن رہے۔رسوم اور توہمات کی بیڑیاں اسی کی دھار سے کاٹی گئیں اور فلسفہ اور سائنس کے حقائق اسی کی بدولت دنیا کے سامنے بے نقاب ہوئے۔یہ آزادی سیاسی آزادی نہیں بلکہ عقلِ انسانی کی آزادی ہے جس سے اہلِ یورپ نے ایک بہتر اجتماعی تنظیم کی داغ بیل ڈالی جس میں مساوات، عدل و انصاف اور ہر اس شخص کو جو صلاحیت رکھتا ہو، اپنی صلاحیتوں کو کام میں لانے کا موقع دیا گیا۔چناں چہ مغربی یورپ میں پچھلے تین سو سال میں ایسی مثالیں ملیں گی کہ ادنیٰ بلکہ اسفل طبقہ کے لوگوں نے علمِ طب، فلسفہ ٔادب اور دیگر میدانوں میں دوسروں کی رہنمائی کی ہے اور ظاہر ہے کہ یہ موقع افراد کو اسی وقت ملتا ہے جب ان کی اجتماعی تنظیم کا محرک عدل و مساوات ہو۔مسلمانوں نے دنیا کو جو تمدّن دیا تھا اس کی خصوصیات بھی ان کی اجتماعی تنظیم کی برتری تھی جس کی وجہ سے افراد کو اپنی قابلیت چمکانے کا موقع ملتا تھا اور وہ قوم اور ملک کے بڑے سے بڑا کام کر سکتے تھے۔اسی اجتماعی تنظیم کے بگڑنے سے انھیں زوال آیا اور علم و فن کی مشعل ان کے ہاتھوں سے نکل کر دوسروں کے ہاتھوں میں چلی گئی، جو اَب ہماری رہنمائی کر رہی ہے۔باوجود اس کے کہ پورے طور پر مساواتِ کلّی یورپ میں بھی موجود نہیں ہے لیکن کم از کم فرانس اور انگلستان میں اس کا امکان ہے کہ ایک ادنیٰ طبقہ کا فرد، اگر اس میں صلاحیت ہے تو وہ وزیرِ اعظم تک بن سکتا ہے۔بغیر اس اجتماعی

تنظیم کے انفرادی قابلیت بروئے کار نہیں آتی کیوں کہ اس کے چشمے گھٹ کر رہ جاتے ہیں اور ان کو فروغ دینے والے محرکات فنا ہو جاتے ہیں۔

یورپ کی برتری کا دوسرا سبب تسخیرِ فطرت کی صلاحیت ہے۔ گذشتہ دو تین سو سال میں سائنس نے یورپ میں خاص اہمیت حاصل کی ہے اور اس کی ابتدا وہاں سے کی گئی جہاں پر کہ مسلمانوں نے اس کو اپنے عروج کے زمانہ میں لا کر چھوڑا تھا۔ یہ دراصل اجتماعی قابلیت ہے کہ فطرت کے رازہائے سربستہ معلوم کر کے اور اُن پر قابو پر کر انھیں اپنے فروغ کے لیے استعمال کیا جاتا ہے۔ اعلیٰ اجتماعی زندگی کا یہ خاصہ ہے کہ وہ نہ صرف تمدّن کو بہتر اور اعلیٰ بناتی ہے بلکہ اس کے ساتھ ساتھ علم اور فن کے پوشیدہ رازوں کو بھی آشکار کرتی ہے اور فطرت کے یہی رازہائے سربستہ جب اجتماعی ملک بن جاتے ہیں تو بجائے خود، تمدّن کو فروغ دیتے ہیں گویا دونوں ایک دوسرے کے لیے لازم و ملزوم ہیں۔ اہلِ یورپ کی نظم و ترتیب اور ضبطِ اجتماعی کا یہ ایک بڑا کارنامہ ہے کہ اس نے افراد کو اس لیے کہ فرد ہی دراصل زندگی میں سب کچھ ہے اور جماعت بھی اس کے بغیر کچھ نہیں، آزاد کیا اور جب ذہن انسانی آزاد ہے تو وہ لامتناہی ہے۔ فطرت کا کوئی راز اس سے بچ کر نہیں نکل سکتا۔ وہ فطرت کو اُسی طرح اپنا غلام بنالیتا ہے جس طرح ادنی تمدّنوں میں انسان اپنے ہم جنسوں کو غلام بناتے ہیں۔ بجائے اس کے کہ آدمی اس کی گاڑی کو کھنچیں وہ فطری قوت سے اپنی گاڑی کھچواتا ہے۔

یورپ کی سائنٹیفک ترقی، جس کے مظاہرے سے اہم اس قدر مرعوب ہیں وہ دراصل ذہنِ انسانی کی آزادی کا نتیجہ ہے۔ سائنس کے مظاہر کو تباہی کے لیے بھی اور تمدّن کی ترقی کے لیے بھی استعمال کیا جاسکتا ہے کیوں کہ بجائے خود علوم طبیعہ کا مقصد یہی ہے کہ فطرت پر انسان کی گرفت اور قابو کو مستحکم کیا جائے اور ظاہر ہے کہ یہ نہایت شان دار اور نہایت ہی قابلِ قدر مقصد ہے کیوں کہ اس کے مدِ نظر انسانی فلاح و بہبود ہے۔ لیکن اگر انسان چاہیں تو ان ہی مظاہر کو ایک دوسرے کی تباہی کے لیے بھی استعمال کر سکتے ہیں، جیسا جنگ عظیم میں ہوا لیکن یہ سائنس کا قصور نہیں بلکہ نفسِ انسانی کا قصور ہے جو سائنس کو اعلیٰ مقاصد کی بجائے ادنی مقاصد کے لیے استعمال کرتا ہے۔ غرض یہ ذہنِ انسانی کی کارفرمائی ہے کہ آج ہمیں زمین، پانی اور ہوا پر انسانی تسلّط نظر آرہا ہے اور انسان کی یہی وہ قوت ہے جس نے پہاڑوں کے جگر شق کر دیے، سمندروں کو عبور کیا اور بُعدِ زمانی و مکانی کو تابع کیا۔

ترقی کا مفہوم:

میرے اس سوال پر کہ آیا ہمارے نظامِ معاشرت میں کوئی ایسی خامیاں ہیں کہ ہم ان کی وجہ سے ترقی نہیں کر سکتے اور کیا اہلِ یورپ کی خانگی اور اخلاقی زندگی خصوصاً عورتوں کی آزادی بعض لوگوں کے نزدیک انسانیت پر ایک بدنما

داغ ہے۔ ڈاکٹر یوسف حسین خان نے فرمایا کہ ترقی اور عروج نتیجہ ہیں، قوموں کی بعض خوبیوں کا۔ جس طرح ایک کیمیائی تحلیل سے ایک خاص نتیجہ پیدا ہونا لازمی ہے اس طرح تاریخ کا بھی ایک مفروضہ ہے کہ جب کسی قوم میں بعض خاص خصوصیات پیدا ہو جائیں تو اس کا ترقی کرنا ایک ضروری امر ہے۔ جنگِ عظیم نے جرمنی کے پرخچے اُڑا دیے تھے، معاہدہ ورسائی* نے اسے اتنا بے دست و پا اور بے سر و سامان کر دیا تھا کہ صدیوں جرمنی کی ترقی کا امکان نظر نہیں آتا تھا۔ لیکن زمانہ نے دیکھ لیا اور تاریخ نے اس واقعہ کو محفوظ کر لیا کہ اس کسمپرسی کے عالم میں بھی جرمنی نے وہ قوت بہم پہنچائی کہ سار اس کے قبضہ میں آگیا اور رہین لینڈ پر اس نے اپنا تسلط جما لیا اور دنیا کی کوئی طاقت اس کو اپنے ارادے سے باز نہ رکھ سکی۔ یورپ کی چھوٹی چھوٹی حکومتیں جو رقبہ میں حیدرآباد سے بھی کم ہیں اپنے اندر اتنا ضبط و ترتیب رکھتی ہیں کہ بڑی سے بڑی حکومت ان کی طرف آنکھ اُٹھا کر نہیں دیکھ سکتی۔

عورت:

جہاں تک اخلاقی کمزوریوں کا تعلق ہے یہ کہا جا سکتا ہے کہ دنیا کے سارے ممالک کا یہی حال ہے۔ فرق اتنا ہے کہ یورپ کی عورتیں آزاد ہونے کی وجہ سے ان کی آزادیاں نمایاں ہیں اور ہماری عورتیں مقیّد ہونے کی وجہ سے ہماری برائیاں پس پردہ ہیں۔ کیا یہ واقعہ نہیں ہے کہ کچھ دنوں قبل لکھنو اور دلی کے امراء کی اولاد تہذیب اور شائستگی سیکھنے کے لیے رنڈیوں کے پاس بھیجی جاتی تھی اور کیا اُس زمانہ کا یہ فیشن نہیں تھا کہ ہر امیر کے گھر ایک طوائف ہوتی تھی اور کیا اب یہ چیزیں ہماری سوسائٹی میں موجود نہیں ہیں۔ یورپ کی اور ہماری عورتوں میں فرق اتنا ہے کہ وہاں کی عورتیں آزاد رہ کر اپنی عصمت کی حفاظت کرتی ہیں اور ہماری عورتیں چار دیواری میں مقیّد رہ کر عفت مآب کہلاتی ہیں اور اس کو ایک بڑا کارنامہ سمجھا جاتا ہے۔

ترقی کے وسائل:

میرے اس سوال پر کہ ہمیں ترقی کرنے کے لیے کون سے وسائل اختیار کرنے چاہئیں ڈاکٹر صاحب نے فرمایا کہ اس وقت ہمارا نظامِ معاشری جن اصولوں پر قائم ہے وہ ہماری ترقی کے لیے کافی ہے البتہ کچھ عقل اور بصیرت سے کام لینے کی ضرورت ہے۔ جب تک ہم نظم و ترتیب اور سائنٹیفک ترقی میں یورپ کے ہم پلہ نہ ہو جائیں، اس وقت تک ہم اس کا مقابلہ نہیں کر سکتے۔ جب ہم میں یہ قوتیں پیدا ہو جائیں گی تو اس وقت عقل کا عقل سے، سیاست کا سیاست سے، علم کا علم سے، غرض تمدّن کا تمدّن سے مقابلہ ہو گا اور اس میں جو بہتر ہو گا وہی دنیا میں برقرار رہے گا۔ اس وقت یورپ ہر معاملہ میں ہم سے برتر و اعلیٰ ہے۔ کیا یہ واقعہ نہیں کہ یورپ نے ہماری ہی چیزوں کو لے کر اُن میں اتنی ترقی

کی ہے کہ ہم اس کی طرف اپنا دستِ سوال دراز کرنے پر مجبور رہیں۔ سنسکرت [441] کی سب سے بہترین اور مستند لغت ایک جرمن [442] نے لکھی ہے، عربی، فارسی اور مشرقی علوم کے گہوارے یورپ کی جامعات ہیں، کیا ان حقائق سے انکار کیا جا سکتا ہے؟

فرانسیسی قوم کی خصوصیات:

فرانسیسی، ''یورپ کا رِند'' مشہور ہے اور اس میں رِند کی تمام خصوصیات، اچھائیاں اور برائیاں بدرجہ تمام موجود ہیں۔ لیکن ڈاکٹر صاحب نے کم از کم اپنے زمانۂ قیام میں وہ تصوّر نہیں دیکھا جو 'رِند' کے لفظ کے ساتھ ذہنِ انسانی میں پیدا ہوتا ہے۔ آپ کے ایک فرانسیسی پروفیسر نے فرمایا تھا کہ پیرس کی سڑکوں پر جو لوگ مدہوش نظر آتے ہیں، ان میں فرانسیسی بہت کم ہوتے ہیں۔ اس کی تصدیق بلدیہ فرانس کے اعداد و شمار سے بھی کرائی گئی کہ ان لوگوں کی 90 فیصد تعداد امریکن، انگریز، جرمن، اطالوی اور دیگر لوگوں پر مشتمل ہوتی ہے۔ خود ڈاکٹر صاحب کا تجربہ ہے کہ فرانسیسی نہایت معتدل طبیعت رکھنے والے لوگ ہیں۔ جس طرح ان کے ملک میں ایک خاص قسم کی موزونی اور اعتدال ہے اس طرح ان کے مزاج کی بھی یہی کیفیت ہے۔ ان کے ملک کے پہاڑ اور دریا نہایت متناسب اور خوبصورت ہیں، فطرت نے کہیں مبالغہ نہیں کیا۔ اس طرح ان کے مزاجوں میں بھی مبالغہ نہیں ہے۔ یہ لوگ شراب بھی پیتے ہیں، رقص و سرُود میں بھی حصہ لیتے ہیں اور زندگی کے دوسرے لطف بھی حاصل کرتے ہیں لیکن نہایت اعتدال کے ساتھ۔ ایک اوسط درجہ کے فرانسیسی کی خانگی زندگی اپنے اندر ایک نہایت موزونیت لیے ہوئے ہوتی ہے۔ چناں چہ کہا جاتا ہے کہ پیرس کے اوسط طبقے کی عورتیں جس قدر سلیقہ کے ساتھ لباس پہنتی ہیں وہ سلیقہ انگلستان کے طبقہ اعلیٰ کی عورتوں کو بھی نصیب نہیں ہے اور اس سلیقہ کو سیکھنے کے لیے وہ فرانس آتی ہیں۔ ان کا کھانا سستا، اچھا اور لذیذ ہوتا ہے اور اس میں ایک طرح کی ایشیاییت پائی جاتی ہے اور ایشیا والوں کو اپنے اور ان کے کھانوں میں زیادہ فرق محسوس نہیں ہوتا۔

فرانسیسی بڑے منطقی لوگ ہوتے ہیں، ان کی بہت سے ناکامیاں ان کی اس کمزوری کے باعث ہیں۔ بقول برناڈشا جب فرانسیسی جمہوریت کا قائل ہوتا ہے تو اس کا فرض ہو جاتا ہے کہ سب سے پہلے اپنے بادشاہ کا سر کاٹے لیکن جب انگریز قائل ہوتا ہے تو وہ بادشاہ کو تخت پر برقرار رکھ کر جمہوریت قائم کرتا ہے۔

فرانسیسیوں کے فلسفہ اور ادب میں بھی اس منطقیت کی جھلک نظر آتی ہے۔ یہ دراصل ان کے ذہن کی ایک تجریدی عادت ہے۔ جس طرح ریاضی میں دو اور دو چار ہوتے ہیں اس طرح وہ زندگی میں بھی دو اور دو کو چار دیکھنا

چاہتے ہیں، جو ممکن ہی نہیں اور یہیں انھیں ناکامی سے سابقہ پڑتا ہے۔ انگریزوں نے بالخصوص فرانسیسیوں پر سیاست میں جو فوقیت حاصل کی ہے وہ دراصل ان کی غیر منطقیت کی وجہ ہے۔

فرانسیسی طبعاً خوش مزاج واقع ہوا ہے، وہ کبھی یاس مشرب نہیں ہو سکتا وہ زندگی کو ہمیشہ روشن دیکھنا چاہتا ہے اور امید کی جھلک ہمیشہ اس کی آنکھوں کے سامنے رہتی ہے۔

فرانسیسی بہت جلد بے تکلف ہو جانے والا شخص ہے۔ آپ سے پہلی ملاقات میں وہ آپ کے خاندان بیوی بچوں اور آپ کی ساری دنیا کی چیزیں معلوم کرنے کی کوشش کرے گا اور اپنی بھی چیزیں بیان کرتا جائے گا کیوں کہ اس کا دل انسانی ہمدردی سے گرم ہے اور جب وہ کسی سے ملتا ہے تو کھل کر ملتا ہے۔ کسی قسم کے تکلفات اس کے دماغ میں نہیں ہوتے وہ کم آمیزی اور دیر آشنائی کو پسند نہیں کرتا۔ برخلاف اس کے انگریز سے اگر آپ کئی سال کی ملاقات رکھتے ہوں تو آپ اس سے اسی حد تک واقف ہوں گے جس حد تک کے آپ کے اس کے معاملات ہیں۔ اس لیے کہ وہ غیر ضروری چیزوں کو معرضِ بحث میں نہیں لاتا نہ وہ دوسروں کے حالات معلوم کرتا ہے اور نہ اپنے بیان کرتا ہے، یہ اس کے دل کی تنگی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ہمارے نوجوان باوجود متعدد سال انگلستان میں رہنے کے شاید ہی کسی گرم اختلاط آدمی سے ملے ہوں جو کھل کر ان سے ملا ہو اور ان کے ساتھ ہمدردی رکھتا ہو اور وقت پر ان کے کام آسکے۔ بالخصوص جنوبی فرانس کے لوگ نہایت ہنس مکھ واقع ہوئے ہیں۔ آپ ان سے چاہے کتنی غمگیں باتیں کریں وہ آپ کو ہنسا دیں گے اور خود بھی ایسے موقعوں پر ہنستے نظر آئیں گے۔

فرانسیسی سخت محنتی اور جفاکش ہوتا ہے۔ پیرس کی گلیوں میں عیش منانے والے باہر کے غیر ملکی ہوتے ہیں۔ اس کو اپنی روٹی کمانے سے اتنی کم فرصت ملتی ہے کہ بجز اس کے کہ وہ دوسروں کے لیے سامانِ عیش مہیا کرے خود اس میں بہت کم منہمک ہوتا ہے۔ اس کی خوش سلیقگی کا عالم یہ ہے کہ دوسرے خود بخود اس کی طرف راغب ہوتے ہیں۔

فرانسیسی عورتیں:

فرانسیسی عورتیں زیادہ تر گھریلو عورتیں ہیں جو گھروں میں رہتی، بچوں کی دیکھ بھال کرتی اور کھانے پکانے کا کام کرتی ہیں۔ پیرس کی عورتوں کو دیکھ کر فرانس کی عام زندگی کے متعلق رائے قائم نہیں کی جاسکتی۔ فرانسیسی عورتیں عام طور پر اعلیٰ تعلیم حاصل نہیں کرتیں لیکن سب تعلیم یافتہ ہوتی ہیں۔ یونیورسٹی کی تعلیم صرف وہی عورتیں حاصل کرتی ہیں جو یا تو بدصورت ہوتی ہیں یا عمر میں متجاوز ہونے کی وجہ سے شادی نہ کر سکتی ہوں۔ لڑکیوں میں شادی کی عمر

اوسطاً(۲۰،۱۹) سال کی ہے۔ اس لیے کوئی تعجب نہیں اگر یونی ورسٹی میں بدصورت اور زائد عمر کی عورتیں نظر آتی ہیں۔

فرانسیسی عورتوں کو اب تک سیاست میں حقِ رائے دہی حاصل نہیں ہے اور نہ وہ اس کے لیے بے چین ہیں کیوں کہ وہ جانتی ہیں کہ جب تک ان کی حکومت مردوں کے دلوں پر ہے ان کو اس کی ضرورت نہیں، اس طرح بالواسطہ حکومت ان کے ہاتھوں میں ہے اور ان کی رائے عامہ اپنے گھر کے مردوں کے ذریعہ حکومت کے فیصلوں میں بڑی حد تک دخیل ہوتی ہے۔ یہ دراصل فرانس کے پیچھے ہونے کی دلیل نہیں کہ اس کی عورتوں کو حق رائے حاصل نہیں ہے بلکہ فرانسیسی عورت سیاسی الجھنوں میں پڑ کر اپنی نسوانیت کو تباہ کرنا نہیں چاہتی۔

بالعموم اعلیٰ تعلیم صرف ایسی عورتیں حاصل کرتی ہیں جو آئندہ زندگی میں معلمی یا اخبارات وغیرہ میں کام کرنا چاہتی ہیں۔ دوسرے پیشوں میں عورتوں کو کسی قسم کے موانعات نہیں ہیں۔ اکثر عورتیں شوفر[443] ہیں، ٹرام[444] اور بس چلاتی ہیں اور اب پولیس میں بھی بھرتی ہو رہی ہیں۔

فرانسیسی محب وطن:

فرانسیسی انتہا درجہ محبِ وطن واقع ہوا ہے اور اس کی سپہ گری کے معترف جرمنوں سے زیادہ دنیا میں کوئی نہیں۔ وہ نہایت بے جگری سے لڑنے والا ہے جس کا خود جرمن جرنیلوں کو اعتراف ہے۔ اپنے وطن کے لیے جان دینا اس کے لیے ایک ادنیٰ بات ہے۔ سیاست میں عام طور پر اس کو تنگ نظر کہا جاتا ہے کیوں کہ وہ ساری دنیا کی سیاست کو اپنی سیاست کے تابع دیکھنا چاہتا ہے۔

ڈاکٹر محمد رضی الدین صدیقی:

ڈاکٹر محمد رضی الدین صدیقی ایم۔ اے۔ پی۔ ایچ۔ ڈی۔ (کنٹب *) جامعہ عثمانیہ کے مایہ ناز سپوت اور ریاضی میں اپنی غیر معمولی قابلیتوں کی وجہ سے ہندوستان اور یورپ میں بے حد مشہور ہیں۔ ۱۹۳۸ء میں انڈین نیشنل اکاڈمی آف سائنس نے ہندوستان میں گذشتہ سات سال کے دوران میں بہترین سائنٹیفک کام انجام دینے کے صلہ میں آپ کو ایک طلائی تمغہ عطا فرمایا ہے جو ایک ایسا اعزاز ہے جس پر حیدرآباد اور جامعہ عثمانیہ جتنا فخر کرے کم ہے۔

جرمنی کے قیام کے زمانہ میں آپ نے آئن سٹائن * کے ساتھ کام کیا ہے اور مسئلہ اضافیت * پر آپ نے انگریزی میں ایک کتاب تحریر فرمائی ہے، جو زیرِ طبع ہے۔

آپ ہندوستان کی اکثر سائنٹیفک سوسائٹیوں کے فیلو اور بعض معیاری سائنٹیفک رسائل کے شعبہ ادارت کے رکن ہیں۔ اس سال آپ انجمن طیلسانینِ عثمانیہ کے صدر بھی ہیں۔ آپ کا قیام یورپ میں ۱۹۲۶ء تا ۱۹۳۰ء رہا۔ ۱۹۳۲ء میں بھی آپ یورپ تشریف لے گئے تھے۔

زندہ قوموں کی خصوصیات:

جب ۱۹۲۶ء میں پہلی مرتبہ ڈاکٹر محمد رضی الدین صدیقی یورپ تشریف لے گئے تو اس وقت یہ برِاعظم، جنگِ عظیم کے اثرات سے سنبھالا لے رہا تھا۔ جنگ کی تباہ کاریاں جرمنی اور فرانس میں سب سے زیادہ نمایاں تھیں اور یہی وہ دو ممالک تھے جن کا براہِ راست جنگ سے تعلق بھی تھا اور جنگ نے بعد میں ان ہی دونوں کو سب سے زیادہ نقصان بھی پہنچایا۔ عام طور پر یہ خیال کیا جاتا تھا کہ یہ دونوں اقوام یا کم از کم شکست خوردہ جرمنی صفحۂ ہستی سے ناپید ہو جائے گا جیسا کہ اس کے قبل یونان، روم اور دیگر اقوام یا تو نابود ہو گئیں یا انتہائی تنزل کی حالت میں ہیں۔ اگر اس صورتِ حال سے کسی دوسری قوم جو طاقت و توانائی میں جرمنی سے کم تر ہوتی اور جو اندرونی انتشار اور بین الاقوامی نزع میں گھری رہتی، دوچار ہونا پڑتا تو اس کی جگہ کوئی اور طاقت ور قوم لے لیتی۔

لیکن دس سال کے بعد پھر ۱۹۳۶ء میں آپ کو یورپ جانے کا اتفاق ہوا تو آپ نے دیکھا کہ وہاں پہلے سے بھی زیادہ زندگی کے آثار ہیں۔ اگر مادی نقطۂ نظر سے دیکھا جائے تو یہ کہا جا سکتا ہے کہ یورپ پہلے کی بہ نسبت بہت آگے نکل گیا ہے اور آج بھی پہلے کی طرح سیاسی چال بازیوں اور حکمتِ عملیوں کا اکھاڑا بنا ہوا ہے۔ اس کی ساری قوتیں ایک دوسری جنگ کی تیاری کے لیے صرف ہو رہی ہیں اور یہ ایک ایسی جنگ ہو گی جو نوعِ انسانی کی تباہی کا باعث ہو گی۔ اخلاقی نقطۂ نظر سے جنگ کی خواہ کتنی ہی مذمّت کی جائے لیکن اس سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ صرف وہی قوم لڑ سکتی ہے جو اپنے آپ کو زندہ محسوس کرے۔ ایک مردہ قوم ہر قسم کی ذلتوں کو برداشت کر لیتی ہے اور اس میں مقابلہ کی ہمت نہیں ہوتی۔ اس مثال سے ایک زندہ قوم کی اُس خصوصیت کو بتلانا مقصود ہے کہ کس طرح وہ ملک کے حوصلہ شکن حالت کے باوجود طاقت بہم پہنچا کر ترقی کی راہ نکال لیتی ہے۔

اجتماعی احساس:

یورپ کے مختلف ممالک میں اپنے کئی سال کے قیام کے دوران میں ڈاکٹر محمد رضی الدین کو جس چیز نے سب سے زیادہ متاثر کیا وہ اہلِ یورپ کا اجتماعی احساس ہے، سب کو ایک کا خیال اور ایک کو سب کا۔ انفرادیت کو بالکل قربان نہیں کر دیا جاتا اور جب تک مفادِ عامہ سے انفرادیت متصادم نہیں ہوتی اس کو ترقی دی جاتی ہے۔ انانیت کو

سوسائٹی برداشت نہیں کرتی اور ہر قسم کی حکومتیں، شہنشاہیت سے لے کر جمہوریت تک، اس کو کچلنے کی کوشش کرتی ہیں۔ اگر کسی شخص نے ایک معینہ مقدار سے زیادہ دولت جمع کر لی ہو اور وہ بہ خوشی خیراتی کاموں میں اپنی کچھ رقم نہیں لگاتا ہے تو محاصل کی صورتوں میں اس سے یہ رقم وصول کر لی جاتی ہے۔ راک فیلر*، کارنیج* اور نفیلڈ* جیسے لوگوں نے اتنی خیرات کی کہ ان کا شمار قومی خیر خواہوں میں ہو گیا۔ تقریباً تمام سائینٹفک ترقی جامعات، تجربہ خانوں اور تحقیقاتی اداروں میں ہوتی ہے، جو خانگی اشخاص کے قائم کردہ اور ان کے سرمایہ سے چلائے جاتے ہیں۔ بعض وقت حکومت بھی ان چندوں میں شریک ہو جاتی ہے لیکن یہ بھی محض اس لیے ہوتا ہے کہ خانگی اشخاص کو ترغیب دی جائے۔ مثال کے طور پر جب جامعہ کیمبرج کے کتب خانہ کی از سر نو تعمیر کی شدید ضرورت محسوس کی گئی تو حکومت نے اس شرط پر نصف اخراجات کی پابجائی کا وعدہ کیا کہ آدھی رقم خانگی طور پر جمع کی جائے۔

ایک اور مثال ہے وہ یہ کہ تمام ہسپتال بالکلیہ خانگی چندوں سے چلائے جاتے ہیں۔ اور ایک غریب مزدور بھی جب وہاں علاج کے لیے جاتا ہے تو وہ خیراتی صندوقچہ میں ایک آدھ پیسہ ڈالنا کبھی نہیں بھولتا۔ اگر اُس کا یہ فعل کسی کارِ خیر میں حصہ لینے کی نیت سے نہ بھی ہو تو کم از کم اس کو یہ خیال ضرور ہے کہ ممکن ہے اس کا یہی پیسہ کل اسی کے کام آئے اور ان دونوں صورتوں میں ہسپتال کا فائدہ ہے۔ اس طرح ہسپتال کے اخراجات کے لیے چندے جمع ہو جاتے ہیں۔

اس طرح سائنٹفک ایجادات و اختراعات کے لیے انعامات مقرر ہیں تاکہ کام کرنے والے بیٹھے نہ ہوں اور انھیں کام کرنے کی ترغیب ملتی رہے۔ فنون کی تائید میں کتنا ہی کیوں نہ کہا جائے لیکن اس بیسویں صدی کی دنیا میں کسی قوم کی حقیقی ترقی کا انحصار سائنٹفک ایجادات پر ہے ورنہ اس کے بغیر جاپان کے مقابلہ میں ہندوستان کی سیاسی و معاشی پستی کی کیسے توجیہہ ہو سکتی ہے۔ حالاں کہ یہ حقیقت ہے کہ ادب، موسیقی اور فلسفہ میں ہندوستانؔ جاپان سے کہیں بڑھ چڑھ کر ہے لیکن ہم مشینری کا تخیّل سے مقابلہ کرنے سے رہے۔

رائے عامہ:

لیکن محض سائنٹفک معلومات ہی کافی نہیں ہیں۔ نہ صرف ہماری جامعات اور تجربہ خانوں میں بلکہ زندگی کے ہر شعبہ میں سائنٹفک زاویۂ نظر کی ضرورت ہے۔ علاوہ ازیں افراد اور جماعتوں کے اعمال پر صحیح رائے قائم کرنے کے لیے ملک میں تعلیم یافتہ رائے عامہ کا پیدا ہونا ضروری ہے۔ مغربی ممالک میں اکثر چیزیں محض اس وجہ سے کامیاب یا ناکام ہوتی ہیں کہ رائے عامہ ان کی تائید یا مخالفت میں ہوتی ہے۔ لیکن رائے عامہ کے لیے عام تعلیم کی ترویج

ضروری ہے اور اس کے بعد ہی لوگ اپنے حقوق اور ذمہ داریوں سے آگاہ ہو سکتے ہیں۔ یورپ کے کسی قصبہ کے کوچوں اور ہوٹلوں میں مزدور پیشہ مرد اور عورتوں کو اہم مسائل حاضرہ پر بحث و تمحیص کرتے دیکھنا ایک معمولی سی بات ہے۔ براعظم میں ڈاکٹر محمد رضی الدین کو بارہا اتفاق ہوا کہ معمولی لوگوں نے آپ سے ٹیگور اور ان کی "گیتان جلی"[445]، مہاتما گاندھی اور ان کی قومی تحریک[446] اور اس قسم کی دیگر چیزوں کے متعلق استفسار کیا۔ ہر یورپ جانے والے کو اس قسم کے تجربات سے سابقہ پڑتا ہے۔

یورپ کی ترقی کا راز:

ترقی کوئی جامد و ساکن شے نہیں ہے اور نہ ترقی کرنے کے کوئی معین اصول ہیں۔ ہر قوم کو اپنی موجودہ حالت کا جائزہ لے کر آئندہ کے لیے ایک لائحہِ عمل مرتب کرنا چاہیے۔ یورپ کی ترقی کے راز کو کسی ایک ضابطہ کے ذریعہ نہیں بتلایا جا سکتا۔ لیکن اگر کوئی شخص یورپین ممالک کی ترقی کے متعلق اپنے مشاہدات کو مختصر الفاظ میں پیش کرنا چاہے تو وہ یہ کہے گا کہ وہ لوگ علم حاصل کر کے اس کی اشاعت کرتے ہیں، اس علم سے قوت حاصل کی جاتی ہے اور اس قوت کو چند افراد کے فائدہ کے لیے نہیں بلکہ پوری قوم کے فائدہ کے لیے استعمال کیا جاتا ہے۔

ڈاکٹر سید محی الدین قادری زورؔ:

ڈاکٹر سید محی الدین قادری زورؔ ایم۔اے۔،پی۔ایچ۔ڈی۔(لندن) ادبی دنیا میں کسی تعارف کے محتاج نہیں۔آپ جامعہ عثمانیہ میں اُردو کے پروفیسر ہیں۔ایک بلند پایہ مصنف،ادیب و نقاد کی حیثیت سے آپ سارے ہندوستان میں مشہور ہیں۔آپ کی بعض تصانیف[447] اکثر ہندوستانی جامعات کے نصاب میں شامل ہیں۔آپ حیدرآباد کے مشہور ادارہ "ادبیاتِ اُردو" کے معتمدِ عمومی[448] ہیں اور آپ کی سرکردگی میں زبان و ادب کے مختلف اصناف پر نوجوان مصنفین کی ایک جماعت کام کر رہی ہے۔آپ کا قیام انگلستان و فرانس میں ۱۹۲۷ء تا ۱۹۳۱ء رہا۔

خصوصیات:

ہندوستانی طالب علم کا مطمعِ نظر عام طور پر انگلستان ہے جو زیادہ مفید نہیں۔انگلستان کی تعلیم اس حد تک مفید ہے کہ وہاں کی ڈگریاں ہندستان میں مستند سمجھی جاتی ہیں اور دوسرے ممالک کی ڈگریوں کے مقابلہ میں ان ہی کو ترجیح دی جاتی ہے۔یہی وجہ ہے کہ حیدرآباد کے نوجوان بھی برطانوی ہند کے طلبا کی طرح زیادہ تر انگلستان جاتے ہیں۔جس شخص کو انگلستان کے علاوہ یورپ کے دوسرے ممالک مثلاً فرانس، جرمنی، سوئیٹرر لینڈ اور اٹلی ☆ میں کافی عرصہ تک رہنے کا اتفاق ہوا ہے،وہی اس امر کا اندازہ لگا سکتا ہے کہ ان ممالک کی زندگی میں کیا فرق ہے اور طالب علم کی ذہنی نشوونما وہاں کس حد تک متاثر ہو سکتی ہے۔متذکرہ ممالک کے من جملہ،فرانس کی زندگی ہندوستان کے طالب علموں کے لیے انگلستان کے قیام سے زیادہ سود مند ثابت ہو گی۔انگلستان میں ہندوستانی طالب علم اپنے سر سے اس خیال کو کسی وقت جدا نہیں کر سکتا کہ وہ ایک محکوم قوم سے تعلق رکھتا ہے اور اپنے آقاؤں کے ملک میں شاید غلامی کے طریقے سیکھنے آیا ہے۔کوئی انگریز خواہ وہ قدامت پرست ہو یا لبرل کسی کالے آدمی کو برابر کی نظر سے دیکھنا گوارا نہیں کرے گا اور شاید یہی وہ راز ہے جس نے انگریزوں کی شہنشاہیت کے بھرم کو اب تک باقی رکھا اور آئندہ کیا تعجب ہے کہ یہی اس کے نقصان کا باعث ثابت ہو۔لیکن جو طالب علم محض انگلستان میں رہ کر ہندوستان واپس آجاتا ہے وہ کبھی محسوس نہیں کر سکتا کہ اہلِ انگلستان کا تعلق اس کے ساتھ کس قدر حوصلہ شکن ہے۔بہت سے اصحاب انگلستان کو جاتے یا آتے ہوئے براعظم کے بھی بعض شہروں کا چند دنوں اور بعض وقت تو چند گھنٹوں کے لیے معائنہ کر لیتے ہیں اور وہاں کی بعض ایسی چیزیں دیکھ لیتے ہیں جنھیں ان بڑے بڑے شہروں کے لالچی رہنما،ان سے پیسہ وصول کرنے کے لیے دکھانے لے جاتے ہیں اور یہ حضرات سمجھتے ہیں کہ یہی ان شہروں کی زندگی ہے اور اسی کو دیکھ کر وہ سارے ملک کی زندگی اور معاشرت کے متعلق اندازہ قائم کر لیتے ہیں۔ایسے ہی مقامات اور اسی قسم کی دلچسپیاں خاص شہر لندن میں بھی موجود

ہیں لیکن یہاں یہ باتیں قانوناً جرم ہیں اور خفیہ طور پر جاری ہیں۔ برِاعظم کے شہروں میں ان پر زیادہ قیود عائد نہیں ہیں۔ لندن کی ان دلچسپیوں سے ہندوستانی طالب علم شاید بہت کم مستفید ہوتے ہیں اس لیے کہ وہ اپنے آقاؤں کے رعب اور قانونی شکنجے کے خوف سے ان باتوں کی طرف کھلم کھلا رخ نہیں کرتے اور یہ سمجھتے ہیں کہ لندن میں ایسی چیزیں موجود ہی نہیں ہیں۔

فرانس کے تعلیمی ادارے:

جہاں تک تعلیمی اداروں کا تعلق ہے پیرس ایک بین الاقوامی مرکز ہے۔ یہاں مصر*، شام*، ایران*، افغانستان*، ترکی*، سیام*، چین*، الجزائر* اور مراکش* وغیرہ کے ہزارہا طلبا سے میل جول اور تبادلۂ خیالات کا موقع ملتا ہے۔ لندن یونیورسٹی میں سینکڑوں ہندوستانی طلبا ہر سال شریک ہوتے ہیں لیکن وہاں پیرس یونیورسٹی کی طرح کوئی "ادارہء تمدّنِ ہند" موجود نہیں ہے۔ پیرس کی سوربون یونیورسٹی* کے اس ادارے کا ہر ماہ ایک جلسہ ہوتا ہے جس میں وہ تمام فرانسیسی، انگریز اور ہندوستانی اصحاب جمع ہوتے ہیں جنھیں ہندوستانی تہذیب و تمدّن سے دلچسپی ہے۔ اس مجمع کو صرف طالب علموں ہی سے تعلق نہیں رہتا بلکہ ہر طبقہ اور ہر خیال کے لوگوں کا (جن میں پروفیسروں، عہدہ داروں، وکلا اور تاجروں کے بھی کافی افراد شریک ہوتے ہیں) دخل ہوتا ہے۔ اس طرح سے ہندوستانی طالب علم نہایت آزادی اور خوبی کے ساتھ اپنے مسائل، ضروریات اور رجحانات کے متعلق ان ہمدردوں سے تبادلۂ خیالات کر سکتے ہیں۔

یہی حال "ادارہ تہذیب و تمدّنِ اسلامیہ" کا بھی ہے۔ یہ ادارہ متذکرہ ادارہ سے زیادہ شان دار، کامیاب اور مفید ہے۔ اس لیے کہ اس میں ہندوستان کے طالب علم کو وہ چیز حاصل ہوتی ہے جو شاید ہی دنیا کی کسی اور یونیورسٹی میں حاصل ہو سکے۔ اس ادارہ میں شرکت کے بعد ایک مسلمان طالب علم یہ محسوس کرتا ہے کہ پیغمبرِؐ اسلام نے حج کے لیے مکہ معظمہ میں دنیا کے ہر خطے سے مسلمانوں کو جمع کرنے کا جو انتظام کیا تھا وہ کن فوائد کی بنا پر تھا۔ اس ادارے کے اجلاس میں ہر اسلامی ملک کے باشندے جمع ہوتے ہیں اور یہیں ایک مسلمان طالب علم کو معلوم ہوتا ہے کہ اس کے ہم مذہب دنیا کے دوسرے خطوں میں سرسبز شاداب ہیں یا مصائب سے گذر رہے ہیں۔ ان ہی جلسوں میں وہ تمام اصحاب اور ان کے متعلقین شریک ہوتے ہیں جو کسی زمانہ میں کسی نہ کسی اسلامی ملک کے حکمران رہ چکے تھے۔ ترکی خاندانِ شاہی کے افراد[449]، امان اللہ خان* کے بھتیجے[450]، سلطان احمد شاہ*، سابق شہنشاہِ ایران کے متعلقین[451]، مصر و الجزائر وغیرہ کے جملہ امراء کی نئی پود[452]، سب یہاں ایک دوسرے سے ملتی ہے اور اس طرح سے یہ بکھرے ہوئے موتی ایک

دوسرے کو اپنی آب وتاب دکھا سکتے ہیں۔ یہ وہ جگہ ہے جو لندن میں رہنے والا مسلمان طالب علم خواب میں بھی نہیں دیکھ سکتا۔ اس ادارے کے جلسوں کا پہلے ہی سے نظام الاوقات مقرر ہو جاتا ہے اور کبھی ایرانی طلبا اور طالبات اپنے مشاہیر شعرا کے کلام سے اہلِ جلسہ کو لطف اندوز کرتے ہیں اور کبھی مصر و شام یا ترکی و مراکش کے طلبا اپنی ادبیات اور معاشرت کے متعلق دلچسپ باتوں سے مستفید کرتے ہیں۔ ان اداروں میں جو پروفیسر یا حکومت کے عہدہ دار شریک ہوتے ہیں وہ اپنے موضوع کے اس قدر گرویدہ ہوتے ہیں کہ ان نوجوانوں کے ساتھ ان کے تعلقات نہ صرف مساویانہ بلکہ بعض دفعہ ایسے خاکسارانہ ہوتے ہیں کہ یہ طلبا اپنے آپ کو ان سے بلند و برتر سمجھنے پر مجبور ہو جاتے ہیں۔ یہ پروفیسر اور دیگر حضرات استفادے کی خاطر آتے ہیں نہ کہ حکومت اور فوقیت جتانے کے لیے۔ اسی طرح ایک انگریز پروفیسر اور ایک فرانسیسی پروفیسر کے برتاؤ میں ہندوستانی طالب علم کو بیّن فرق محسوس ہوگا۔

جاپان اور حیدر آباد کا مقابلہ:

میرے اس سوال پر کہ جاپان اور حیدر آباد نے ایک ساتھ مغربی تعلیم شروع کی[453] اور مغربی تمدّنی اثرات قبول کیے لیکن ترقی کی دوڑ میں جاپان بہت آگے نکل گیا اور ہم جہاں تھے وہیں رہے۔ ڈاکٹر صاحب نے فرمایا کہ اس سوال کا جواب دینے کے لیے سب سے پہلے یہ بات معلوم کرنی ضروری ہے کہ جاپان سے مغربی تعلیم حاصل کرنے کے لیے جو طلبا نکلے وہ کن ممالک میں گئے اور واپس آنے کے بعد کس ماحول میں انھیں کام کرنا پڑا۔ یوں تو دونوں جگہ سے طالب علم نکلے لیکن ہندوستان اور خاص کر حیدر آباد کے طالب علموں کا مطمعِ نظر آخر تک صرف انگلستان رہا۔ اس کے برخلاف جاپانی طلبا امریکہ، فرانس اور جرمنی بھی جاتے رہے۔ انگلستان سے حیدر آباد کے طلبا نے انگریزوں کی تنظیمی قابلیت کو سیکھنے کے مقابلہ میں ان کی اس خصوصیت کو حاصل کیا جو حکومت اور شہنشاہیت سے متعلق ہے۔ حیدر آبادی طالب علم حیدر آباد کو واپس ہونے کے قبل اس حاکمانہ رعونیت اور خود پسندی میں ڈوب کر آتا ہے جو وہ انگلستان میں اپنے آقاؤں سے سیکھتا ہے۔ وہ یہ نہیں سمجھتا کہ اگر ایک انگریز اس کو اپنی ماتحت قوم کا ایک فرد ہونے کی وجہ سے کم رتبہ سمجھے تو شاید حق بجانب ہے لیکن وہ اپنے وطن میں آنے کے بعد اس کا غلط استعمال کرنے لگتا ہے اور سمجھتا ہے کہ اپنے غریب ہم وطنوں اور اپنے قدیم ساتھیوں کے ساتھ غرور سے ملنا اور حماقت کے آثار ظاہر کرنا اعلیٰ درجہ کا تعلیم یافتہ، خوددار اور مدّبر ہونے کی دلیل ہے۔ وہ انگلستان یہ سمجھ کر جاتا ہے کہ میں وہاں سے حکومت کے طریقے سیکھ کر آؤں گا اور اس خیال سے نہیں جاتا کہ میں ملک کی خدمت کے طریقے سیکھ کر آؤں۔ جاپانی طلبا پہلے تو انگلستان کو کم جاتے

ہیں اور جو جاتے بھی ہیں تو وہ اپنے کو انگریزوں کے ماتحت نہیں سمجھتے اور نہ انگریز اُن کے ساتھ آقاؤں کا سا برتاؤ کرتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ وہ بجائے خواجگی اور بندگی کے شیوں[454] کو حاصل کرنے کے انگریزوں کی وہ خصوصیتیں حاصل کر لیتے ہیں جو ملک و مالک کی خدمت سے متعلق ہوں۔ انگلستان کے علاوہ جو جاپانی طلبہ دوسرے ممالک میں جاتے ہیں انھیں تو ان خصوصیات سے سابقہ ہی نہیں پڑتا۔

جاپانیوں اور حیدرآبادیوں میں بہت بڑا فرق ملکی ماحول کا بھی ہے۔ جاپان اتفاق سے بیرونی اثر و اقتدار سے محفوظ رہا اور حیدرآباد اتنا ہی ان اثرات کا شکار۔ حیدرآبادی طالب علم انگلستان یا یورپ کے کسی اور ملک سے خواہ کیسے ہی اعلیٰ اوصاف سے متّصف ہو کر آئے یہاں آ کر اس کو ایک ایسے ماحول سے سابقہ پڑتا ہے جس میں اُسے اپنے ان تمام اوصاف سے ہاتھ دھو دینا ضروری ہے۔ یہاں کے حالات کچھ اس قسم کے ہیں کہ انسان اپنے اصلی جوہر سے محروم ہو جاتا ہے اور اس کو کام کرنے کا موقع ہی نہیں ملتا۔

قومی نصب العین کا تعین:

کام کا سب سے بڑا محرّک کسی مقصد کا تعیّن ہے۔ جب تک ملک و قوم کے آگے کوئی خاص نصب العین معیّن نہ ہو جائے گا اس وقت تک اس کی تمام قوّتیں معطّل رہیں گی۔ اگر ہمارے یورپ جانے والے نوجوانوں کا کوئی نصب العین ہے تو وہ بظاہر اس کے سوا کچھ نہیں معلوم ہوتا کہ اپنے ملک کو واپس ہونے کے بعد کسی اچھے عہدے پر فائز ہو جائیں۔ ذاتی اغراض اور وقتی مفاد کسی قوم کو شاہ راہ ترقی پر نہیں آنے دیتے اور ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ان ہی دو امور کے سوا نوجوان حیدرآبادیوں کے پیشِ نظر کوئی اور امر نہیں ہوتا۔ اس کی کیا وجہ ہے' اس پر بحث کرنے کی ضرورت نہیں، جب تک حیدرآباد کے جُملہ اربابِ اقتدار ایک نصب العین کی طرف نہ بڑھیں گے اور ہر ایک کے پیشِ نظر سوائے اس خاص سرزمین کی بہبود اور فلاح کے کوئی اور خیال نہ ہو گا اس وقت تک یورپ سے تعلیم پا کر واپس شدہ حضرات کی کوششیں تو کیا اگر کوئی شخص آسمان سے بھی کام کرنے کے ولولے اور اہلیّت کی صلاحیتیں لے کر آئے تو کوئی فائدہ نہیں ہو سکتا۔ بحالاتِ موجودہ، سرزمینِ دکن کی مثال کانِ نمک کی سی ہے' ہر صلاحیت اور ہر خصوصیت اس میں آ کر نمک بن جاتی ہے۔[455]

مولوی حبیب الرحمن صاحب:

مولوی حبیب الرحمن صاحب ایم۔اے۔،بی۔ایس۔سی۔(لندن) سر رشتۂ معلوماتِ عامہ، سرکارِ عالی کے ناظم ہیں۔ اس سے قبل آپ جامعہ عثمانیہ کے شعبہ معاشیات کے صدر اور حیدرآباد اکنامک سوسائٹی کے سر گرم معتمد تھے۔ ہندوستانی اور حیدرآبادی معاشی و اقتصادی مسائل پر آپ کو بڑی دست گاہ حاصل ہے۔ آپ نے اصولِ معاشیات پر اُردو میں ایک کتابِ معاشیات بھی تحریر فرمائی ہے جو اس موضوع پر ایک بہترین، معیاری کتاب ہے۔ آپ کا قیام انگلستان میں ۱۹۲۹ء تا ۱۹۳۲ء رہا۔

خانگی ادارے:

انگریزوں کی زندگی میں پروفیسر حبیب الرحمن کو جس چیز نے سب سے زیادہ متاثر کیا وہ ان کے خانگی اداروں (Voluntary Organisations) کی جدوجہد ہے۔ جب کسی شخص کے ذہن میں کوئی بات آتی ہے اور وہ سمجھتا ہے کہ ملک و قوم کو اس سے کوئی فائدہ پہنچ سکتا ہے تو انگلستان کی فضا میں اس کا امکان ہے کہ ایسا شخص کچھ اپنے ہم خیال پیدا کر کے اُن کے اتحاد سے ایک خاص جماعت تشکیل دے اور اپنے خیالات کی توسیع و اشاعت کے لیے خانگی کوششوں سے عملی تدابیر اختیار کرے۔ بہر کیف وہاں کسی اصلاح یا تحریک کے لیے اس کی ضرورت نہیں کہ وہ سرکاری عہدہ داروں ہی کو سجھائی دے اور حکومت ہی کی جانب سے اس کو عملی جامعہ پہنایا جائے۔ ملک میں بیسیوں ایسے ادارے اور خانگی انجمنیں قائم ہیں جو مختلف طریقوں سے ملک کی معاشری خدمت گذاری میں مصروف ہیں۔ ان انجمنوں کے کام کی نوعیت اور مقاصد پر ایک سرسری نظر ڈالی جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ دنیا کی کوئی چیز جس میں مشترک مفاد اور اجتماعی کام کرنے کا امکان ہو، ایسی نہیں جس کے لیے ایک آدھ انجمن قائم نہ ہو۔ پھر خوبی یہ ہے کہ ملک کی یہ تمام انجمنیں ایک مرکزی قومی انجمن کے تحت ہیں جس کو حکومت وقعت کی نظروں سے دیکھتی ہے اور اس کی کارروائیوں کا احترام کیا جاتا ہے۔ اس انجمن سازی سے نام و نمود حاصل کرنے کی کوشش نہیں کر جاتی بلکہ اس کا اوّلین مقصد ملک کی خدمت اور اراکین میں اتحاد پیدا کرنا ہوتا ہے۔ ان انجمنوں کو سرسبز اور کام کرتا دیکھ کر کہنا پڑتا ہے کہ انگریزوں میں اجتماعی طور پر کام کرنے کی کتنی صلاحیت ہے، ممکن ہے ہم میں سے بعض لوگ یہ خیال کریں کہ ہمارے افلاس کی وجہ سے ہم اس قسم کے رفاہی کاموں میں حصہ نہیں لے سکتے کیوں کہ ان کے لیے سرمایہ کی ضرورت ہے، یہ خیال صحیح نہیں ہے جب ایک بار کوئی کام شروع ہو جائے تو اس کے چل پڑنے کی خود بہ خود سبیل نکل آتی ہے کیوں کہ بے لوث اور بے غرض محنت رائگاں نہیں جاتی۔ علاوہ ازیں ان معاملات میں دلچسپی لینے کے لیے تنہا

حکومت کو ذمہ دار قرار نہیں دیا جا سکتا کیوں کہ مثل مشہور ہے، جیسی روح ویسے فرشتے۔ جیسے افراد ہوں گے، ویسی ہی حکومت ہو گی اگر افراد کو ان چیزوں کا خیال ہے تو حکومت کو بھی ان کا خیال کرنا ضروری ہے۔

انگلستان میں ابتدائی تعلیم بالکلیّہ خانگی اداروں کے ہاتھ میں ہے۔ اس سے ایک طرف حکومت اخراجات سے بچ جاتی ہے تو دوسری طرف اکثر تعلیم یافتہ لوگوں کے لیے معاش کا ذریعہ نکل آتا ہے۔ کیا یہ حقیقت نہیں کہ ہمارے پاس کے اکثر عہدہ دار اپنی ملازمت کی وجہ سے اضلاع پر رہنے کے لیے مجبور ہیں لیکن ان کے بچوں کی تعلیم کا خاطر خواہ انتظام نہیں ہے، بلدہ میں دو، ایک اقامت خانے قائم ہو جائیں تو کیا یہ مشکل آسان نہیں ہو سکتی۔

انگریزوں کی خصوصیات:

انگریزوں کی ایک اور قابلِ قدر خصوصیت یہ ہے کہ وہاں کے دولت مند اور ذی ثروت لوگوں میں اپنے ملک و قوم کو فائدہ پہنچانے کا بڑا خیال ہے۔ چناں چہ اخبارات میں روزانہ وصیتوں کی متعدد اطلاعیں شائع ہوتی رہتی ہیں جن میں خصوصیت سے خیراتی کاموں کے لیے بڑی بڑی رقمیں دی جاتی ہیں۔ لیکن انگلستان اور ہمارے ملک کی خیرات کے طریقوں میں بڑا فرق ہے، وہاں اجتماعی خیرات پر زور دیا جاتا ہے اور یہاں انفرادی طریقوں پر۔ خیرات کا مفہوم سمجھنے میں بھی انگریزوں کے اور ہمارے نقطۂ نظر میں فرق ہے وہ لوگ خیرات 'خیرات کی خاطر کرتے ہیں اور ہم حصولِ ثواب اور عاقبت کے خیال سے، جس کا یہ نتیجہ ہے کہ ہماری خیرات میں غیر مستحقین زیادہ حق دار ہیں اور ان کی خیرات میں مستحقین۔ مثال کے طور پر کسی درگاہ یا مندر کے لیے کسی جائیداد کا وقف کرنا قومی نقطۂ نظر سے کوئی اعلیٰ درجہ کی خیرات نہیں ہے کیوں کہ اس میں بجز سجادہ نشین یا پجاری کے بحیثیتِ مجموعی قوم کو کوئی فائدہ نہیں پہنچتا۔

اس طرح ہماری اور انگریزوں کی ذہنی کیفیتوں میں بھی بڑا فرق ہے۔ ہم سمجھتے ہیں کہ زندگی کسی طرح گذر جاتی ہے لیکن وہاں کوشش کی جاتی ہے کہ اچھی طرح گذرے۔ اس کی ادنی مثال یہ ہو سکتی ہے کہ چھٹیاں یہاں بھی ہوتی ہیں اور وہاں بھی۔ فرق اتنا ہے کہ ہماری چھٹیاں ہمارے آرام کے گھنٹوں میں، گپ بازی میں اور اسی قبیل کی دوسری چیزوں میں اضافہ کر دیتی ہیں تو وہاں ان کا ہر لحہ بہترین طور پر صَرف کیا جاتا ہے۔ اگر عثمان ساگر[456] یا حمایت ساگر[457] جیسے خوبصورت تالاب انگلستان میں ہوتے تو دیکھتے ان کی کیسی قدر ہوتی۔ ان کے اطراف آبادیاں بس جاتیں، آمد روفت کے لیے موٹروں اور ٹرام کا انتظام ہو جاتا، دکانیں کھل جاتیں، ہوٹل اور رستوران لگ جاتے لیکن یہاں بجز خوش حال لوگوں کے ان تالابوں کا کوئی پُرسان حال نہیں ہے۔

عورت:

یورپ اور انگلستان کی زندگی میں خرابیاں بھی ضرور پائی جاتی ہیں۔ عورتوں کی آزادی کے جو معنی وہاں لیے جاتے ہیں وہ ایک صحت مند معاشرہ کے لیے زیب نہیں دیتے۔ مرد اور عورت کی معاشی یکسانیت نے اخلاقی نصب العینوں کو تباہ برباد کر دیا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ یورپ کے جس ملک میں بھی آمریت قائم ہو رہی ہے وہاں عورتوں کے خلاف سخت طرزِ عمل اختیار کیا جارہا ہے۔ چناں چہ ہٹلر* نے عورتوں کو ملازمتوں سے علیحدہ کر کے گھر بٹھادیا ہے اور ان پر سخت پابندیاں عائد کر دی ہیں۔

یورپ کی عورتوں کی آزادی کے جتنے قصے سنے جاتے ہیں وہ جنگ کے بعد کے ہیں اور نتیجہ ہیں جنگ کے معاشی واقتصادی اثرات کا۔ ورنہ جنگ سے پہلے یورپ کی عورتیں دائرۂ اعتدال میں تھیں۔ ہمارے ملک کے بھی بعض حلقوں میں یہ خیال عام ہو رہا ہے کہ ہماری عورتوں کا پردہ ہماری ترقی میں بڑا سدِ راہ ہے۔ اس کے اٹھتے ہی ساری بندشیں ٹوٹ جائیں گی اور ہم بڑی سُرعت سے ترقی کے منازل طے کر لیں گے۔ یہ محض سراب ہے اس کے لیے خاص ماحول اور خاص حالات کا پیدا ہونا ضروری ہے اور سب کے پہلے تعلیم کی ترویج کی سخت ضرورت ہے۔ بہ حالتِ موجود ہمارا پردہ ہماری ترقی میں کس طرح مزاحم نہیں ہے۔

مسز جمال الدین:

مسز جمال الدین۔ بی۔ اے۔ ملک کی ایک روشن خیال خاتون ہیں۔ آپ نے ۱۹۱۱ء میں میٹرک کامیاب کیا لیکن بلدہ میں کوئی زنانہ کالج ہونے کی وجہ سے آپ سلسلۂ تعلیم جاری نہ رکھ سکیں۔ تیرہ سال بعد جب کلیۂ اناث [458]، جامعہ عثمانیہ کا افتتاح ہوا تو باوجود اس کے کہ بیوی اور ماں کی حیثیت سے آپ کی ذمہ داریوں میں اضافہ ہو گیا تھا، آپ نے تعلیم کی طرف توجہ کی اور ۱۹۲۸ء میں بی۔ اے کامیاب کیا۔ ۱۹۲۹ء میں سرکاری وظیفہ پر یورپ گئیں۔ لندن میں فروبل* اور اٹلی میں مانٹیسوری* طریقۂ تعلیم کی ٹریننگ حاصل کی۔ آپ ماڈل پرائمری اسکول کی صدر معلمہ [459] ہیں۔ آپ کا قیام یورپ میں ۱۹۲۹ء تا ۱۹۳۲ء رہا۔

تعلیم:

مسز جمال الدین کے خیال میں یورپ کے اکثر ممالک سے بہ درجہا بہتر جاپان ہے جہاں آپ حال ہی میں عالمی تعلیمی کانفرنس ۱۹۳۲ء کے سلسلہ میں حکومتِ سرکارِ عالی کے نمائندہ کی حیثیت سے تشریف لے گئی ہیں۔ آپ

جاپان اور اس کے تعلیمی، معاشی و اقتصادی حالات سے اتنی متاثر ہیں کہ آپ مشرق کے اس نوخیز ملک کو یورپ پر ترجیح دیتی ہیں۔

جاپان کے ہر مدرسہ میں ایک شعبہ صنعت ضرور رہتا ہے۔ بچپن ہی سے بچوں کو مختلف پیشوں اور مشینریوں سے واقف کرایا جاتا ہے۔ کنڈر گارٹن میں مشین و آلات سب بچگانی ہوتے ہیں اور بچے بڑے شوق سے ان اشیا کو استعمال کرتے ہیں۔ ہر مدرسہ میں نہانے کے حوض ہوتے ہیں اور تین تین چار چار سال کے بچوں کو تیرنا سکھلایا جاتا ہے۔ بچوں کی پڑھائی میں کسی وقت نامے [460] کی پابندی نہیں کی جاتی۔ بچوں کو اپنے فطری میلانات کو فروغ دینے کا کافی موقع دیا جاتا ہے۔

جاپان میں لڑکیوں کے لیے ایک فن کاری کا مدرسہ ہے عموماً میٹرک کے بعد لڑکیاں اس میں شریک ہوتی ہیں۔ جو لڑکیاں کالج کا کورس ختم کرنے کے بعد آتی ہیں ان کا نصاب مختصر ہوتا ہے۔ اس مدرسہ میں لڑکیوں کو مختلف کام کاج سکھلائے جاتے ہیں۔

مدرسہ عروسی:

جاپان میں ایک اور تعلیم گاہ ہے جس کو مدرسہ عروسی کہتے ہیں۔ شادی سے قبل ہر لڑکی کو ایک سال یہاں تعلیم حاصل کرنی لازمی ہے اور انھیں ازدواجی زندگی، صنعتی معاملات، بچوں کی نگہداشت، بچوں کی بیماریاں، گھر کی صفائی اور اس قسم کی دوسری چیزوں سے واقف کرایا جاتا ہے۔ جاپان میں اس مدرسہ کی اتنی اہمیت حاصل ہے کہ جب تک لڑکی کے پاس یہاں کا صداقت نامہ [461] نہ ہو اس سے کوئی شادی نہیں کرتا۔

وطن پرستی:

تعلیم ختم کرنے کے بعد لڑکوں کے لیے دو سال فوجی تعلیم حاصل کرنا ضروری ہے۔ چناں چہ جاپان کا ہر مرد سپاہی ہے خواہ وہ کاروبار کرے، فیکٹری میں ملازم رہے یا کوئی اور کام کرے۔ حالیہ جنگ چین و جاپان کے شروع ہونے کے وقت مسز جمال الدین جاپان میں تھیں اور آپ نے اپنی آنکھوں سے دیکھا کہ کس طرح لوگ بغیر کسی وسوسے کے جنگ میں شریک ہوتے ہیں۔ ایک زمانہ وہ تھا کہ جاپانی اپنے بادشاہ کو خدا کے برابر سمجھتے تھے۔ تعلیم اور ترقی کے ساتھ گو آج کل ان خیالات میں اتنی شدّت باقی نہیں رہی تاہم وطن پرستی میں جاپانی کا کوئی مقابلہ نہیں کر سکتا۔

بچے:

جاپان میں بچوں کو بڑی اہمیت حاصل ہے۔ بچوں کو ہمیشہ ساتھ رکھا جاتا ہے۔آپ نے یورپ کے اس طریقہ کی مذمّت کی کہ ماں باپ اپنی سیر و تفریح کی خاطر بچوں کو یا تو اکیلے گھر میں چھوڑ جاتے ہیں یا ملازمین کے حوالے کر دیتے ہیں۔ جاپان میں بڑے بڑے سنیما اور دکانوں میں بچوں کی دیکھ بھال کے لیے ایک ہال رہتا ہے، یہاں بچوں کو چھوڑ کر ایک نمبر حاصل کر لیا جاتا ہے۔ اگر بچہ روئے یا بھوکا ہو جائے یا غلاظت کر دے تو نمبر کے حوالہ سے آلہ مکبر صوت[462] پر اعلان کر دیا جاتا ہے۔ نمبر کا قاعدہ مدرسوں میں بھی ہے جو بچے ملازمین کے ساتھ مدرسہ آتے ہیں انھیں مدرسہ کی جانب سے ایک نمبر[463] دے دیا جاتا ہے۔ اگر والدین چاہیں بھی تو بچوں کو اس نمبر کے بتلائے بغیر نہیں لے جاسکتے۔

یورپ کی تقلید:

مسز جمال الدین کا خیال ہے کہ یورپ کی عورتوں کی تقلید کی ہمیں مطلق ضرورت نہیں۔ وہاں کی عورتوں کو قومی کاموں میں حصّہ لینے کے موقعے حاصل ہیں اگر ہماری عورتوں کو بھی ایسے موقعے ملیں تو ہم سب کچھ کر سکتے ہیں۔ لیکن پبلک امور میں دلچسپی لینے کے ہر گز یہ معنی نہیں ہو سکتے کہ گھر کے انتظام میں انتشار پیدا ہو۔ ان دونوں میں توازن کا برقرار رہنا ضروری ہے۔ جن مخصوص پیشوں یا ملازمتوں میں عورتیں داخل ہو سکتی ہیں وہ تعلیم و تدریس، طبابت اور نرسنگ ہیں۔ اس کے علاوہ دیگر ملازمتیں ہماری عورتوں کے لیے بے کار ہیں۔

پردہ:

جب تک تعلیم عام نہ ہو اور ملک کے حالات اجازت نہ دیں، پردہ کا اُٹھ جانا مناسب نہیں ہے۔ لیکن موجودہ پردے میں کچھ ترمیم ہونی ضروری ہے۔ عورتیں نہ بالکل پردے میں رہیں اور نہ اعلانیہ باہر پھریں۔ ان دونوں کے بین بین رہنا اچھا ہے۔ عورتوں کی صحت و تندرستی کے مدِّنظر ان کے لیے سیر و تفریح کا انتظام ہونا چاہیے۔

لڑکوں اور لڑکیوں کی تعلیم میں جو یک نصابی پائی جاتی ہے، اس کا ختم ہونا ضروری ہے۔ علاوہ مذہبی تعلیم کے لڑکیوں کی تعلیم میں امورِ خانہ داری کو زیادہ دخل ہونا چاہیے۔ ساتھ ہی ہمارے پاس اگر عروسی مدارس بھی قائم ہوں تو اس سے بہت مفید نتائج برآمد ہوں گے۔ تعلیم ادھوری ہونے کی وجہ سے لڑکیاں ہر کام میں ادھوری رہ جاتی ہیں۔

ہم تعلیمی:

ہم تعلیمی[464] کے متعلق مسز جمال الدین فرماتی ہیں کہ تحتانیہ[465] کی حد تک تو یہ ٹھیک ہے لیکن اس کے بعد اس کی ضرورت نہیں البتہ تحتانیہ تک جن لڑکوں اور لڑکیوں کی تعلیم ایک ساتھ رہی ہے اگر یہی بچے ساتھ ساتھ اعلیٰ تعلیم بھی حاصل کریں تو ان کی ہم تعلیمی جاری رکھی جاسکتی ہے۔

سفر:

عورتوں کو اگر سفر کے موقع بہم پہنچائے جائیں تو اس سے ان کو بہت فائدہ حاصل ہوگا۔ سفر سے وسیع النظری اور خیالات میں پختگی پیدا ہوتی ہے اور تکالیف برداشت کرنے سے تجربہ حاصل ہوتا ہے اور دوسرے لوگوں کو دیکھ کر اپنی برائیوں اور اچھائیوں پر نظر پڑتی ہے۔

ڈاکٹر محمد حمید اللہ:

الحاج ڈاکٹر محمد حمید اللہ ایم۔اے۔، ایل۔ایل۔بی۔، پی۔ایچ۔ڈی۔(بان)، ڈی۔لٹ۔(پیرس) جامعہ عثمانیہ کے ایک مایۂ ناز فرزند اور اس کے شعبۂ قانون کے لکچرار ہیں۔ جامعہ سوبورن (پیرس)* نے جس کے آپ ہندوستان میں سرکاری نمائندہ بھی ہیں، حال ہی میں اپنے پاس توسیعی تقاریر کے لیے آپ کو مدعو کیا ہے چناں چہ گذشتہ دسمبر آپ فرانس تشریف لے گئے ہیں۔ آپ نے "اسلامی قانون بین المالک" کے نام سے اُردو میں ایک کتاب شائع کی ہے جو اس موضوع پر پہلی کتاب ہے۔ آپ کا قیام یورپ میں ۱۹۳۲ء تا ۱۹۳۵ء رہا۔

تربیتِ اطفال:

جرمنی میں والدین بچوں کو چھ سال کی عمر کے بعد مدرسہ بھیجنے پر مجبور ہیں جہاں ابتدا ہی سے انھیں فوجی زندگی کا خوگر بنایا جاتا ہے۔ ہوائی بندوق ان کے ہاتھ میں آجاتی ہے اور ان کے لیے ایسے کھیل منتخب کیے جاتے ہیں کہ آئندہ چل کر وہ سپاہیانہ زندگی کے لیے تیار رہیں۔

جرمنی میں بچوں کی تربیت لے لیے Wander Vogel کا طریقہ جس کے لفظی معنی "بھٹکنے والا پرندہ" ہیں، بہت مقبول ہے۔ اس کا یہ مطلب ہے کہ جتنا ممکن ہو کھلی ہوا میں زندگی بسر کی جائے۔ یہ تحریک زیادہ

تر نو عمر لڑکوں اور لڑکیوں میں عام ہے، حکومت بھی امداد کرتی ہے۔ راتوں میں قیام کے لیے حکومت کی جانب سے ہر آٹھ دس میل پر مکانات تعمیر کر دیے گئے ہیں۔

کتب خانے:

فرانس کے سرکاری کتب خانہ کا شمار دنیا کے مشہور کتب خانوں میں ہے، عربیات پر اس کتب خانہ میں بہت کم مطبوعہ کتب ہیں، یہاں پر ناظرین کو کسی دن تین سے زائد کتابیں نہیں دی جاتیں اور گرمیوں کے زمانہ میں تو ۷۵ فیصد کتب فرمائش کے خلاف لائی جاتی ہیں اور اس غلطی کا خمیازہ ناظر ہی کو بھگتنا پڑتا ہے۔ پیرس میں مشرقی زندہ زبانوں کا ایک قومی کتب خانہ ہے جہاں عربی کے تحقیقاتی کام میں کافی مدد ملتی ہے مگر اس کتب خانہ سے استفادہ کرنے کے لیے خصوصی اجازت حاصل کرنی پڑتی ہے۔ یونیورسٹی کا کتب خانہ ابتر حالت میں ہے، پروفیسر زمن مانی کتابیں لے لیتے ہیں ،جس کی وجہ سے طلبا کو وقت پر کتابیں نہیں ملتیں۔

جرمنی کے کتب خانے دنیا کے دوسرے ممالک کے کتب خانوں سے بہتر حالت میں ہیں۔ پبلک کتب خانوں میں ایک قسم کا وفاق پایا جاتا ہے اور تمام کتب خانے آپس میں ایک دوسرے کو کتابیں مستعار دیتے ہیں، اس کی فیس بھی برائے نام ہوتی ہے۔ اس طریقہ کو Leihe System[466] کہتے ہیں۔ اس وفاق میں بعض غیر ممالک کے کتب خانے بھی شریک ہیں جیسے روس، آسٹریا کے کتب خانے، کیمبرج اور انڈیا آفس کے کتب خانے وغیرہ۔

جامعات میں شعبہ داری کتب خانے ہوتے ہیں۔ ریسرچ کے طلبا کو کتب خانوں کی کنجیاں دے دی جاتی ہیں۔ بون یونیورسٹی کے کلیہ شرقیات کا کتب خانہ صبح کے سات سے رات کے بارہ بجے تک کھلا رہتا ہے اور طلبا جتنی چاہیے کتابیں لے سکتے ہیں اور گھر بھی لے جا سکتے ہیں۔

لیپزگ * کے ایک کتب خانہ میں جرمن زبان کی جُملہ مطبوعہ کتب موجود ہیں اور یہ اس سُرعت سے ترقی کر رہا ہے کہ دس سال کے اندر بلحاظِ تعدادِ کتب، یہ یورپ کا سب سے بڑا کتب خانہ ہو جائے گا۔ اس کتب خانے کے دو حصے ہیں:۔(۱) حصہ کتب (۲) عجائب خانہ، جہاں زمانہ قدیم سے اب تک دنیا کی ہر زبان کی تحریر کے نمونے اور لکھائی سے متعلق جُملہ چیزیں مہیا کی گئی ہیں۔

جرمنی میں جامعات اور کتب خانوں کا جو جال پھیلا ہوا ہے اس کی وجہ یہ ہے کہ ۱۸۷۰ء تک جرمنی میں متعدد خود مختار ریاستیں تھیں جو بسمارک کے زمانہ میں ایک وفاق میں منسلک ہوئیں۔ خود مختار ہونے کی وجہ سے ہر ریاست میں ایک جامعہ اور کتب خانہ کو ہونا ضروری تھا۔ جرمنی میں مشرقی علوم وفنون سے غیر معمولی دلچسپی کی بھی

ایک خاص وجہ ہے۔ جب جرمنی کے مشہور مستشرق اور جامعہ بون کے عربی کے پروفیسر مسٹر سی۔ ایچ۔ بکر*،وز یر تعلیمات مقرر ہوئے تو انھوں نے مشرقی علوم کی طرف زیادہ توجہ صرف کی۔ اس خدمتِ جلیلہ سے سبک دوش ہونے کے بعد مسٹر بکر نے پھر پروفیسری قبول کی لی تھی۔ ان کا 1933ء میں انتقال ہوا۔

مشرقی ذخائر کی سرگذشت:

ابتدا سے عیسائیت کو اسلام سے رقابت رہی ہے اور یہ گویا عیسائی پادریوں کے فرائض میں داخل تھا کہ جس طرح چاہیں اسلام اور آنحضرت صلعم کو بدنام کریں۔ قرونِ وسطیٰ میں یورپ نے اس موضوع پر اس قدر لٹریچر تیار کیا کہ دو فرانسیسی مصنفوں کی کتاب Roman de Moamet آج تک مشہور ہے۔ اس میں آنحضرت صلعم کے خلاف جُملہ اتہامات کو جمع کرکے انھیں ایک انتہائی دلچسپ پیرائیہ میں پیش کیا گیا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ یورپ میں اب تک اسلام کے متعلق عجیب وغریب روایات مشہور ہیں۔

لیکن جب سے کہ یورپ تہذیبی اور تمدّنی حیثیت سے ترقی کرنے لگا تو اسلام کے خلاف ایک دوسرا تہذیبی حربہ اختیار کیا گیا اور یہ اسلامی ادبیات کی طرف توجہ تھی۔ یہ وہ زمانہ تھا کہ یورپین ممالک کا رفتہ رفتہ مشرق پر تسلّط بڑھتا جارہا تھا اور ہر جائز و ناجائز طریقے سے مشرقی علوم وفنون کی کتابیں حاصل کرنے کی کوششیں کی جارہی تھیں۔ اس کے بعد دوسرا قدم جو اُٹھا وہ اسلامیات کی تعلیم کے لیے مدارس اور درس گاہوں کا قیام تھا۔ اس معاملہ میں ہالینڈ سب کا پیش رو ہے جس کا سب سے پہلے جاوا* پر قبضہ ہوا۔ ان مدارس کے فارغ التحصیل طلبا نے جو عام طور پر دینیات کے طالب علم ہوا کرتے تھے، اسلام پر علانیہ اعتراضات شروع کیے لیکن زمانہ کے حالات بدلنے سے یہ طریقہ بھی کارگر ثابت نہیں ہوا اور مختلف سائنٹفک ادارات اور ایشیائی سوسائٹیاں قائم کرکے علمی پیرایہ میں اسلام پر نکتہ چینی کی جانے لگی۔ آج یورپ میں مشرقی اور اسلامی علوم کی ترقی کا یہ عالم ہے کہ اعلیٰ سے اعلیٰ ڈگریاں حاصل کرنے کے لیے مسلمان طلبا وہاں جاتے ہیں۔ یہ دراصل وہ کامیابی ہے جو یورپ نے ہماری ذہنیتوں پر حاصل کی ہے۔

میونک[467] میں جو بویر یا[468] کا صدر مقام ہے ،تحقیقاتِ قرآنیہ Qwrauic ReSearch کے نام سے فنِ قرات، تفسیر اور دیگر علومِ قرآنیہ کے متعلق ایک زبردست ادارہ ہے جس کے تحت قرآن مجید کے رسم الخط، اعراب اور املا کی غلطیاں اور دیگر اختلافات کو بڑے اہتمام سے جمع کیا جارہا ہے اور ابتدائے اسلام سے اب تک قرآن مجید کے جتنے نسخے دنیا میں رائج ہیں، اُن کے حاصل کرنے کے لیے اس ادارہ کے پروفیسر مختلف اسلامی ممالک کا دورہ کررہے ہیں۔ اس ساری تحقیقات اور تلاش کا مقصد یہ ثابت کرنا ہے کہ قرآن مجید الہامی کتاب

نہیں ہے کیوں کہ اب تک عیسائی دنیا قرآن مجید کو آنحضرت کی تصنیف ثابت کرنے میں ناکام رہی ہے۔ غرض یورپ میں اسلامیات سے دلچسپی کی یہ سرگزشت ہے اور اس کے مقابلہ میں ہمارا جمود ظاہر ہے۔

نازی تحریک:

جرمنی میں نازی تحریک* کی وجہ سے قومی برتری کا خیال شد و مد سے پیدا ہو گیا ہے اور اس کا وبال سب سے زیادہ یہودیوں پر پڑا جو اپنی نام نہاد قومی خصوصیات اور تموّل کی وجہ سے ملک کے معاشی و اقتصادی حالات پر چھائے ہوئے تھے۔ عدالت، طبابت، وکالت، صحافت، سینما غرض ذرائع آمدنی کی ساری چیزیں یہودیوں کے ہاتھ میں تھیں۔ جنگِ عظیم نے سیاسی، سماجی، معاشی، اقتصادی ہر حیثیت سے جرمنی کو تباہ و برباد کر دیا لیکن یہودی اس سے غیر متاثر رہے۔ لہٰذا ملک میں اس کا ردّ عمل پیدا ہونا ضروری تھا اور یہ ردّ عمل' نازی تحریک ہے۔ اس تحریک کا اوّلین مقصد معاہدہ ورسائی* کو کالعدم کر کے جرمن قوم کے ساتھ جو ناانصافیاں کی گئیں ان کا انتقام لینا ہے۔ صلح کے بعد سے خود حکومت بھی خفیہ طور پر فوجی تعلیم و تربیت کی طرف راغب تھی اور یہ امر اس کے پیش نظر تھا کہ معاہدہ ورسائی سے سب کچھ ہو لیکن ملک میں جسمانی انحطاط نہ پیدا ہو۔ اس غرض کے لیے ملک میں بیسیوں ادارے قائم ہوئے۔ سوّل ہوا بازی کے نام سے ہوائی قوت حاصل کی گئی۔ خود ہٹلر کی نازی جماعت کا حال ایک باقاعدہ فوج کا سا تھا کیوں کہ اس میں اکثر جنگ کے برخواست شدہ فوجی شریک تھے۔ جس وقت نازیوں کی تعداد دس لاکھ تک پہنچ گئی تو یہ جماعت حکومت کی اعلانیہ مخالف پر اتر آئی۔ غرض دس سال کی پیہم سعی و کاوش کے بعد پارلیمنٹ میں نازی جماعت نے غیر معمولی قوّت بہم پہنچائی۔ یہ وہ زمانہ تھا کہ ہر دوسرے تیسرے مہینے وزارت تبدیل ہو رہی تھی اور حکومت سے بددلی پیدا ہونے لگی تھی۔ جنوری 1933ء میں پہلی مرتبہ ہٹلر کو قیامِ وزارت کی دعوت دی گئی جس کے ساتھ ہی ملک میں زندگی کی لہر دوڑ گئی۔ اس سلسلہ میں ڈاکٹر حمید اللہ نے اپنے ایک پروفیسر کا قصہ بیان فرمایا جو ہٹلر اور نازی تحریک کے بدترین مخالف تھے لیکن وزارت کے اعلان کے ساتھ ہی انھوں نے جماعت میں ہٹلر کی تعریف و توصیف کا قصیدہ پڑھا۔ اس معاملہ میں بے چارے ہندوستانی مفت بدنام ہیں۔

نازی حکومت نے قومی اشتراکیت کے اصول پر نئے نئے قوانین نافذ کیے جس کے بموجب مملکت کو ہر معاملہ میں فوقیت دی گئی اور اس کے لیے ایک نئی اصطلاح Totalitarian وضع کی گئی۔ سب سے پہلے پریس پر احتساب قائم ہوا اور اس کو حکومت کی تائید پر مجبور کیا گیا۔ یہودی سرکاری ملازمت سے علیحدہ کیے گئے۔ ان کی تجارت اور کاروبار کا مقاطعہ کیا گیا، اور ان کی دکانوں پر چوکسی کی جانے لگی۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ چند ہی ہفتوں میں سینکڑوں

یہودیوں نے دیوالہ نکال دیا۔ بالآخر انھیں ملک چھوڑنے پر مجبور کیا گیا اور عام طور پر یہ قانون نافذ کر دیا گیا کہ کوئی شخص جرمنی چھوڑتے وقت اپنے ساتھ ایک ہزار پونڈ سے زائد نہیں لے جاسکتا۔ آج کل یہ قواعد اور بھی سخت کر دیے گئے۔ غرض اس طرح ملک کی معاشی اور اقتصادی حالات پر قابو حاصل کیا گیا۔

چوں کہ معاہدہء ورسائی سے جرمنی میں اسلحہ سازی اور فوجی قوت پر تحدید قائم کی گئی تھی لہٰذا سوّل ہوابازی کو ملک میں غیر معمولی فروغ دیا گیا اور ایسے ہوائی جہاز بنائے جانے لگے جو بآسانی جنگی جہاز میں تبدیل ہو سکتے تھے۔ علاوہ ازیں خفیہ اسلحہ سازی کی طرف توجہ کی گئی اور دو سال کی قلیل مدّت میں جرمنی کی جنگی قوت فرانس کے برابر ہو گئی۔

ابتدا ہی سے حکومت کے پیشِ نظر ملک کی معاشری اور اخلاقی اصلاح کا بھی مسئلہ تھا۔ چناں چہ برہنہ کلب بند کر دیے گئے، تھیٹروں میں عریاں مظاہروں کی ممانعت کی گئی اور یہ مشہور کیا گیا کہ یہ سارے یہودی ادارے تھے۔ اُن تمام عورتوں کو ملازمت سے علیحدہ کیا گیا جن کے شوہر برسرِکار تھے۔ ملک کے ہر اخبار میں پروپگنڈے کے طور پر یہ سرخی قائم کی گئی۔ "جرمن عورت سگریٹ نہیں پیتی" ورنہ جنگ کے بعد عورتوں میں سگریٹ اور منشّیات کا عام رواج ہو گیا تھا۔

مختصر یہ کہ نازی تحریک سے جرمنی کے تنِ مردہ میں جان پڑ گئی لیکن جرمن قوم ساری دنیا میں بدنام ہو گئی جس کی بڑی وجہ یہ ہے کہ یہودیوں نے جو اکثر یورپی ممالک وامریکہ میں صحافت پر چھائے ہوئے ہیں جرمنی کو بدنام کرنے میں کوئی دقیقہ اُٹھا نہ رکھا۔ ایک اور وجہ یہ بھی ہے کہ یورپی ممالک کو جرمنی کی بڑھتی ہوئی فوجی قوت کے خلاف دنیا کی رائے عامہ کو متاثر کرنے کا زرّیں موقع ہاتھ آیا۔

جرمنی کی یہ ترقی تاریخِ عالم کا ایک زبردست واقعہ ہے کہ کس طرح ایک مفلوک الحال قوم جو تباہی کی سرحد کو پہنچ چکی ہو محض اپنے عزم واستقلال کے بل بوتے ایک قلیل عرصہ میں اپنی کھوئی ہوئی عظمت حاصل کر کے پھر از سرِ نو دنیا کی طاقت ور ترین قوت بن جاتی ہے۔

عورت:

فرانس میں عورتوں کو بناؤ سنگار کا بڑا شوق ہے۔ آئے دن فیشن میں تبدیلی ہوتی رہتی ہے۔ اس معاملہ میں انگریزی عورتیں بہت پیچھے ہیں البتہ لباس کی حد تک ان کے مرد موزونیت اور فیشن کا بڑا خیال رکھتے ہیں۔ انگلستان میں ادھیڑ اور بوڑھی عمر کی عورتوں کو چہرے پر غازے اور سرخیاں لگانے کا بڑا شوق ہے۔ فرانس کی عورتوں کے بناؤ سنگھار

سے یہ نہ سمجھنا چاہیے کہ وہ بد اخلاق ہوتی ہیں۔ یورپ کے دار السلطنتوں میں پیرس کے شرفا کی زندگی بہترین ہے اور انگلستان کے مقابلہ میں عورتوں کا کردار زیادہ تر عفت مآبی کی طرف مائل ہے۔ فرانس میں ایک کنواری لڑکی بجز مدرسہ یا کالج جانے کے باہر تنہا نہیں جا سکتی، اس کے کسی قریبی عزیز کا ساتھ رہنا ضروری ہے۔ یورپ کے ہر ملک میں اعلیٰ تعلیم یافتہ یا جامعہ کی طالبات اخلاقی معاملات میں اپنے آپ کو زیادہ پابند نہیں سمجھتیں۔ تعلیم، آزاد خیالی اور عمر کے تجاوز کر جانے سے عصمت کا تصوّر باقی نہیں رہتا۔ ضبطِ تولید کے انگلستان میں زیادہ حامی ہیں۔ فرانس، جرمنی اور اطالیہ میں کثرتِ اولاد کی تحریک کو حکومت کی سرپرستی حاصل ہے۔

اطالیہ میں ایک نوجوان عورت کا تنہا سفر کرنا بے حد مخدوش ہے۔ ڈاکٹر حمید اللہ کے ایک دوست کی منگیتر اپنے والد کے انتقال کی وجہ سے اپنا غم غلط کرنے ڈیڑھ دو ماہ کے قیام کے ارادہ سے اطالیہ گئی تھی لیکن پندرہ روز ہی میں وہ واپس آ گئی۔ معلوم ہوتا ہے کہ قدیم رومنوں کی شہوت پرستی اب تک وہاں کے چپہ چپہ میں سرایت کی ہوئی ہے۔ فرانس میں لوگ کثرت سے شراب پیتے ہیں حتیٰ کہ چھوٹی عمر کے بچے بھی درخت رز[469] کے شیدائی ہیں۔

معیارِ زندگی:

یورپ کا معیارِ زندگی بہت بلند ہے اور یہ محض دولت کی فراوانی کی وجہ ہے۔ انگلستان میں ادنیٰ ملازمین کی تنخواہیں معقول ہوتی ہیں جس سے احساسِ فرض و دیانت باقی رہتا ہے۔ یورپ میں ایک ٹائپسٹ عورت کو اوسطاً دو سو روپے ماہوار ملتے ہیں لیکن خرچ کا بھی یہی حال ہے۔ ڈاکٹر صاحب کو ایک مرتبہ اپنی شیروانی کی دھلوائی کے لیے تقریباً پانچ روپیہ ادا کرنے پڑے تھے۔ وہاں کے ادنیٰ ادنیٰ لوگوں میں جو دیانت اور اپنے فرائض کا احساس ہے اس کا اندازہ اس واقعہ سے ہو سکتا ہے۔ بون (جرمنی) پہنچنے کے قبل ڈاکٹر صاحب کو کولون اسٹیشن[470] پر ریل تبدیل کرنی پڑی۔ آپ نے قلی کو تین ڈاک اُٹھانے کی اجرت ایک مارک (=یک صد فنش) دی[471]۔ یہ جانتے ہوئے کہ ڈاکٹر صاحب اجنبی ہیں قلی نے اپنے حقیقی اجرت لے کر 70 فنش واپس کر دیے۔

خصوصیاتِ ذاتی:

یورپ کے ہر ملک کے حالات دوسرے سے مختلف ہیں۔ جرمنی میں ڈسپلن بہت زیادہ ہے اور لیڈر کی اندھا دھند تقلید کی جاتی ہے۔ فرانس میں انفرادیت زیادہ ہے۔ فرض شناسی اور باقاعدگی انگریزوں کی گھٹی میں پڑی ہے جس کی وجہ سے یہ قوم زندہ بھی ہے۔ لیکن مہمان نوازی، ہمدردی اور عام اخلاق میں کوئی ملک جرمنی سے بازی نہیں لے جا سکتا۔ اس کی توضیح ڈاکٹر حمید اللہ نے ان واقعات سے فرمائی۔ پہلی مرتبہ آپ بون رات کے بارہ بجے پہنچے۔ آپ یہاں کسی

سے واقف نہیں تھے۔آپ کی پریشانی کو دیکھ کر آپ کے ایک ہم سفر نے ایک ہوٹل میں لے جا کر ٹھہرایا اور سارے انتظامات کر دیے۔ رخصت ہوتے وقت اس نے جو جملہ کہا اس نے ہمیشہ کے لیے آپ کو اس شخص کا ممنون احسان کر دیا۔"اگر آپ میرا شکریہ ادا کریں گے تو مجھے تکلیف ہوگی"۔

اس طرح اپنی تعلیم ختم کرنے کے بعد جب آپ بون سے روانہ ہونے لگے تو ٹرین رات کے تین بجے نکلتی تھی لیکن آپ کے پروفیسر آپ کو اسٹیشن پر چھوڑنے آئے تھے۔اس کے برعکس فرانس میں آپ کا ایک سال سے زائد قیام رہا لیکن کسی پروفیسر نے ایک وقت بھی آپ کو چائے پر مدعو نہیں کیا حالاں کہ بون میں آپ اکثر پروفیسروں کے پاس ڈنر پر مدعو رہا کرتے تھے۔

فرانس میں سرکاری ملازمین کی تنخواہیں بہت کم ہیں اور محاصل زیادہ ہیں۔اسی لیے آسانی سے لوگ قوم فروشی پر آمادہ ہو جاتے ہیں۔آئے دن وہاں راز کی کارروائیوں کا افشا ہوتا رہتا ہے۔

جرمنی میں کسی غیر ملکی کا تین ماہ سے زائد قیام رہے تو پولیس میں اپنا پتہ لکھنا پڑتا ہے، فرانس میں بھی یہی اصول ہے۔علاوہ ازیں وہاں ایسے اشخاص کو ننگے سر اپنی پانچ تصویریں داخل کرنی پڑتی ہیں۔فرانس میں متوّطن ہونے کے لیے فیس مقرر ہے۔طالب علموں کو، جو کس طرح کماتے ہیں، 20 فرانک ادا کرنے پڑتے ہیں۔

مذہب:

مذہبیت سب سے زیادہ اطالیہ میں پائی جاتی ہے، اس کے بعد فرانس ہے جہاں گرجے لوگوں سے بھرے رہتے ہیں۔ یہاں کے گرجوں میں کرسیوں پر بیٹھنے والوں سے کچھ رقم بھی بطور محصول وصول کی جاتی ہے۔ جرمنی میں بھی راسخ الاعتقادی زیادہ ہے۔انگلستان میں ہندوستان کے تعلیم یافتہ لوگوں کی طرح لوگ اپنے آپ کو مذہب پرست کہتے ہوئے شرماتے ہیں لیکن مذہب کے یہ بڑے پکے ہوتے ہیں۔انگریزوں نے سیاست میں ظاہر داری کا جو سبق سیکھا ہے وہ ان کی زندگی کے ہر پہلو پر حاوی ہے۔

برتری کے اسباب:

ہر قوم کی ترقی کا ایک زمانہ ہوتا ہے جس کے لیے قدرتاً کچھ اسباب بھی مہیا ہو جاتے ہیں۔ چناں چہ انگریزوں کا ہندوستان پر جیسا قبضہ ہوا اس سے تاریخ کا ہر طالب علم واقف ہے۔اس طرح مسلمانوں کی ۱۲۰۰ کی ایک قلیل جماعت نے محض اپنے عزم واستقلال سے اسپین پر فتح حاصل کی تھی اور ۸۰۰ سال تک مسلمان وہاں حکمران رہے۔یورپ اور مسلمانوں کی ترقی کا مقابلہ کرتے وقت یہ امر ذہن نشین رکھنا چاہیے کہ مسلمانوں نے اس وقت ترقی کی جب ان کے

پاس ایک خاص تہذیب تھی یعنی اسلامی تعلیمات۔ لیکن یورپ میں تہذیب و تمدّن اس وقت پیدا ہوا جب مادی حیثیت سے یورپ نے خاطر خواہ ترقی حاصل کر لی۔ یہی وجہ ہے کہ مسلمان ابتدا ہی سے اخلاق، رواداری، ہمدردی اور دیگر خصوصیات میں دنیا کے سامنے مجسم نمونہ بن کر پیش ہوئے اور یورپ میں یہ چیزیں اس وقت شروع ہوئیں جب اس نے ترقی کے جُملہ منازل طے کر لیے۔

قابلِ تقلید خصوصیات:

ہر ترقی یافتہ قوم میں بعض خصوصیتیں قدرتاً پیدا ہو جاتی ہیں۔ کاروبار کی ترقی کے لیے اس بات کی ضرورت ہے کہ معاملہ اچھا ہو، فوج کے لیے ڈسلپن کی ضرورت ہے، سوّل سروس میں شخصی مفاد پر قومی مفاد کو ترجیح دی جاتی ہے۔ جو نواجون یورپ جاتے ہیں انھیں اپنے ملک کا اچھا نمونہ بن کر پیش ہونا چاہیے اور نمونہ ہمیشہ نصیحت سے بہتر ہوتا ہے۔ حیدرآبادی اور خصوصاً سرکاری طور پر جانے والے طلبا کے متعلق برِاعظم میں مشہور ہے کہ یہ بڑے مسرف ہوتے ہیں۔

یورپ کا مستقبل:

ہر قوم اور تمدّن کے لیے ترقی اور تنزل لازم و ملزوم ہیں اور یہ قانونِ قدرت ہے۔ مسلمانوں کو باوجود اپنی اعلیٰ تہذیب و تمدّن کے اسپین خالی کرنا پڑا۔ ممکن ہے ایک دن یورپ کو بھی اسی قسم کے حالات سے دوچار ہونا پڑے۔ یورپ کی ترقی اس کی عالم گیر قوت کا نتیجہ ہے اور اس کی یہی قوت اس کی تباہی کا باعث بھی ثابت ہو گی۔ زوال کی دوسری وجہ جس کا قرآن مجید میں بھی ذکر ہے وہ آپس کا نفاق ہے اور یورپ آج کل نااتفاقیوں کا اکھاڑا بنا ہوا ہے۔

آخر میں ڈاکٹر صاحب نے یہ خیال ظاہر فرمایا کہ یورپ غیر محسوس طور پر اسلام کی آغوش میں آرہا ہے، عقائد اور معاشری دونوں حیثیتوں سے۔ یورپ میں سرمایہ داری اور اشتمالیت[472] کی دو بڑی خلیجیں موجود ہیں اور اُن میں اتصال صرف زکوٰۃ ہی سے پیدا ہو سکتا ہے۔ اشتمالیت قانونِ فطرت کے خلاف ہے، اس میں انسان کی تخلیقی قوت کا خاتمہ ہو جاتا ہے۔

خود یورپ اپنے مستقبل کے متعلق امید افزا نہیں ہے۔ یورپ کے مفکرین آئندہ کے متعلق بڑے یاس انگیز خیالات رکھتے ہیں۔ اسلام کی یہ تعلیم ہے کہ "تیار رکھو اپنے مخالفین کے لیے جہاں تک ہو اپنی قوت کو"[473]، جس کا مفہوم انگریزی میں (Be Prepared) ہے اور جو قوم تیار رہے گی، وہ زندہ بھی رہے گی۔

مولوی محمد صدیق:

مولوی محمد صدیق صاحب ایک جرنلسٹ کی حیثیت سے ہندوستان میں کافی مشہور ہیں۔ آپ "بمبئی کرانیکل" اور "نیشنل ہیرلڈ" کے چیف سب ایڈیٹر تھے۔ اوّل الذکر اخبار کی ہفتہ وار اشاعت اور فری پریس نیوز سروس کی شاخ دہلی کے آپ ایڈیٹر بھی رہ چکے ہیں۔ کچھ دنوں سے آپ ایک طرح صحافت سے کنارہ کش ہو گئے ہیں لیکن حیدرآباد کے سیاسی معاملات میں آپ کی پُر خلوص دلچسپیاں ناقابلِ فراموش ہیں۔ ۱۹۳۷ء میں شاہ جارج ششم* کی تاج پوشی کے وقت آپ انگلستان دو ماہ کے لیے تشریف لے گئے تھے۔

انگریزوں کی ذہنیت:

انگریزوں کی ذہنیت کے متعلق آپ نے فرمایا کہ ہر انگریز کا یہ ایقان ہے کہ برطانیہ کا ہندوستان پر ایسا مستحکم قبضہ ہے کہ ہندوستان کی کسی قسم کی سیاسی شورش سے اس تسلّط میں ذرا بھی فرق پیدا نہیں ہو سکتا۔ اس خیال کی وجہ یہ نہیں ہے کہ انگریز اپنی فوجی وقت پر نازاں ہیں بلکہ گنجفہ[474] کے ایک اچھے کھلاڑی کی طرح ان کے ہاتھ میں جتنے بھی پتے ہیں ان کو وہ بہترین طریقہ پر کھیلنا جانتے ہیں اور موقع و محل کے لحاظ سے وہ جو بھی چال چلتے ہیں وہ بہترین ہوتی ہے۔ ہندوستانی ذہنیتوں کا انھوں نے اس غائر نظر سے مطالعہ کیا ہے کہ ان لیے غلطی کا امکان باقی نہیں رہا۔ اس لحاظ سے ہندوستان کی سیاسی تحریک یا قومی مطالبات میں کامیابی محض ایک چیز سے ہو سکتی ہے اور وہ بین الاقوامی صورتِ حال ہے۔

یہ ایک عجیب بات ہے کہ انگریز ہندوستانی لیڈروں میں گاندھی جی سے زیادہ پنڈت جواہر لعل* سے خائف ہیں۔ اسی طرح ہندوستانی صوبوں میں صوبہ سرحدی اور بنگال کے نام خوف و دہشت سے لیے جاتے ہیں کیوں کہ ایک بھیت[475] کے لیے مشہور ہے اور دوسرا راجیت[476] کے لیے۔ ہندوستان سے متعلق اگر کسی سے گفتگو ہو تو پہلے سرحد کے متعلق سوال کیا جاتا ہے۔ یہ ایک نفسیاتی حقیقت ہے کہ انسان جس چیز سے ڈرتا ہے اتنی ہی اس کی عزت بھی کرتا ہے۔ اس کا اندازہ اس واقعہ سے ہو سکتا ہے کہ فینسی ڈریس بال میں سرحد کے مرد یا عورت کے سوانگ بھرنے والے عام طور پر انعامات کے مستحق قرار پاتے ہیں۔

طبقہ واری تعصّب:

انگلستان میں طبقہ واری تعصّب بہت ہے۔ معمولی طبقے کے لوگ اونچے طبقوں میں آزادی سے گھل مل نہیں سکتے۔ ہندوستانیوں سے عام طور پر تعصّب برتا جاتا ہے اور جتنا اونچے طبقوں میں جائے اتنا ہی ہندوستانی اپنے آپ کو کم تر محسوس کرتے ہیں۔ اس کا اندازہ زمانۂ تاج پوشی کے اس واقعہ سے ہو سکتا ہے جب کہ بادشاہ کے چاروں ہندوستانی اے

ڈی سی 477 کو، جو والیان ریاست ہیں، تاج پوشی کے دن ناشتہ پر نظر انداز کیا گیا۔ یہ لوگ وقتِ مقررہ پر شاہی محل پہنچے لیکن انھیں ایک ایسے کمرے میں بٹھا دیا گیا کہ ناشتہ کے بعد جلوس کے وقت ہی ان کی یاد ہوئی اور اس کو محض بھول پر محمول کیا گیا۔ ہندوستانی اخبارات میں اس پر کافی احتجاج ہوا لیکن بے سود جو ہونا تھا وہ ہو گیا۔

ایک بنگالی لڑکے کا بھی ایک واقعہ ہے جو گھوش خاندان کا رکن ہے، بے حد حسین اور بہترین ڈانسر تھا۔ تاج پوشی کے زمانہ میں وہ ایک مشہور ہال میں، جس کی فیس داخلہ ہی تین گنی تھی، شریک ہوا۔ اس کی صورت سے وہ ہندوستانی نہیں معلوم ہوتا تھا۔ اس کے حسن کو دیکھ کر لڑکیاں اس پر ٹوٹنے لگیں۔ چناں چہ ایک لڑکی کے ساتھ وہ ڈانس کر رہا تھا۔ دو راؤنڈ تک لڑکی اس سے کافی مانوس ہو چکی تھی لیکن جب تیسرے راؤنڈ میں لڑکی کو معلوم ہوا کہ وہ ایک ہندوستانی کے ساتھ ناچ رہی ہے تو اس نے عین ڈانس میں اپنے آپ کو اس کی گرفت سے چھڑا لیا۔

عورت:

مغربی عورتوں کے متعلق مسٹر صدیق نے کسی قسم کی رائے کا اظہار نہیں فرمایا البتہ ایک دوست کے ساتھ آپ کو سُوہو جانے کا اتفاق ہوا جو لندن میں رنگین اقوام کا مشہور اکھاڑہ ہے اور جہاں کے شب خانے پُراسرار ہونے کی وجہ سے بہت مشہور ہیں۔ بڑی سوسائٹی کی انگریز عورتیں یہاں چھپ چھپ کر آتی ہیں۔ اس دنیا میں حبشی مرد انتہائی آؤ بھگت کے شکار ہوتے ہیں۔ ان عیش گھروں میں بجز ارکان کے غیر لوگوں کی رسائی ممکن ہے۔ اس مقام پر پولیس کی سخت نگرانی ہے۔

دفاتر:

مسٹر صدیق انگلستان کے دفتروں اور ان کی باضابطگی کے بڑے قائل ہیں۔ آپ دفتر نوآبادیات کسی کارروائی کے ضمن میں تشریف لے گئے تھے جس کی پہلے ہی اطلاع دے دی گئی تھی۔ وقتِ مقررہ پر افسر متعلقہ سے ملاقات ہوئی تو آپ کی حیرت کی انتہا نہ رہی جب آپ نے دیکھا کہ پہلے ہی سے ساری کارروائی اس کے پاس سلجھی ہوئی رکھی تھی۔ طے شدہ اور طے شدنی امور کو علیحدہ علیحدہ نوٹ کر لیا گیا تھا اور ان کو پڑھ کر سنانے کے بعد آپ کو صرف طے شدنی امور کے متعلق اپنے نقطۂ خیال کو پیش کرنے کہا گیا۔ اس کے بعد گفتگو کی ساری تفصیل اسٹینو گرافر کو لکھوا دی گئی جس کے ٹائپ کرنے کے بعد کاغذات پر آپ کی دستخط حاصل کر لے گئی اور مناسب کارروائی کا وعدہ کرنے کے بعد آپ کو رخصت کر دیا گیا۔ غرض نصف گھنٹے کے اندر ساری باتیں طے ہو گئیں۔

ضبط و نظم:

مسٹر صدیق انگریزوں کے ضبط و نظم، عورتوں کی محنت پسندی، پولس کے ضبط راہ اور دکان پر گاہکوں سے حسنِ سلوک کر بڑے مدّاح ہیں۔ ایک مرتبہ آپ ایک حیدرآبادی نواب صاحب کے ہمراہ تھیٹر تشریف لے گئے۔ ٹکٹ لینے کے لیے دس پونڈ کا نوٹ بنایا گیا لیکن تیزی میں باقی رقم حاصل نہ کی جاسکی۔ وقفہ کے وقت آلہ مکبّر الصوت پر نواب صاحب کی شکل و شباہت کے حوالہ سے رقم کے بھول جانے کا اعلان کیا گیا اور اس طرح یہ رقم حاصل ہوئی۔

کفایت شعاری:

انگریز انتہائی کفایت شعار اور سادگی پسند ہوتے ہیں۔ حتیٰ کہ جو انگریز ہندوستان میں ایک شان دار زندگی بسر کر کے وطن واپس لوٹتے ہیں ان میں بھی "صاحبیت" باقی نہیں رہتی۔ اس کی توضیح اس واقعہ سے ہو سکتی ہے۔ مولوی اکبر علی خان صاحب بیرسٹر نے زمانہ تاج پوشی میں حیدرآباد کے ایک سابق انگریز عہدہ دار کے اعزاز میں ایک عصرانہ ترتیب دیا تھا جس میں اکثر عمائد مدعو تھے۔ لیکن مسٹر صدیق نے حیرت سے دیکھا کہ معزز مہمان جن کے لیے سارا انتظام کیا گیا تھا، چھتری بغل میں دبائے ایک بس سے اتر کر دعوت میں شریک ہوئے۔

ملاقاتیں:

زمانہ قیامِ لندن میں مسٹر صدیق نے انگلستان کے اکثر اہل الرائے اور سر برآوردہ لوگوں سے ملاقاتیں کیں جن میں قابل ذکر ارل بالڈون (وزیر اعظم وقت)* ،جارج لانس بری*، براکوے*، بریلسفورڈ (مشہور مصنف)*، سر فریڈرک سائیکس*، سر ریجنالاڈ گلانسی* و سر ارنسٹ ہڈسن* ہیں۔

ارل بالڈون:

ارل بالڈون سے آپ کی بالکل اچانک اور اتفاقیہ طور پر ارنڈیل کیزل 478 میں ملاقات ہوئی جہاں آپ ایک دعوت میں شریک ہونے گئے تھے۔ یہیں وزیر اعظم دو ایک روز کی تعطیلات بسر کر رہے تھے۔ غالباً وقت سے کچھ پہلے پہنچنے کی وجہ سے مسٹر صدیق تنہا اس قدیم محل میں گھوم رہے تھے کہ آپ کی نظر وزیر اعظم پر پڑی جو اپنی اہلیہ کے ساتھ بالا خانہ سے نیچے اتر رہے تھے۔ ایک جرنلسٹ سے کہیں ایسے موقعوں پر غلطی ہو سکتی ہے۔ چناں چہ آپ نے فوراً پیش قدمی کر کے اپنا آپ تعارف کرایا اور ادھر اُدھر کی باتیں ہونے لگیں۔ جس وقت ارل بالڈون نے فرمایا کہ وہ آرام کی خاطر اس محل میں فروکش ہیں تو مسٹر صدیق نے بے ساختہ ہنستے ہوئے کہا کہ اگر آپ کو آرام کے ساتھ ساتھ

شہنشاہیت کی خدمت کا بھی خیال ہے تو وائسرائے بن کر ہندوستان تشریف لائیں۔ ارل بالڈون نے اس جملہ پر ایک قہقہہ بلند کیا۔

لانس بری:

جارج لانس بری لیڈر حزب الاختلاف و سابق وزیر سے ملاقات کرنے میں مسٹر صدیق کو پہلی مرتبہ بڑی دقّت پیش آئی۔ گو وقت مقرر ہو چکا تھا اور وقت سے کچھ پہلے ہی آپ ایک ٹیکسی میں روانہ بھی ہوئے تھے لیکن تاج پوشی کے زمانہ میں سڑکوں پر اتنی غیر معمولی آمد ورفت تھی کہ وقتِ مقررہ کے دو گھنٹے بعد بھی آپ کا منزلِ مقصود پر پہنچنا ناممکن تھا۔ آپ نے شوفر سے اپنی پریشانی کا اظہار کیا جس نے مشورہ دیا کہ آپ فوراً زمین دوز راستے سے جائیں۔ اس طرح آپ ٹھیک وقت پر جارج لانسبری کے مکان پر پہنچ سکے۔ لیکن اس ملاقات سے آپ کی تشفّی نہیں ہوئی اور جب آپ نے اس کا اظہار کیا تو لانسبری نے کسی صبح اپنے ساتھ چہل قدمی کرنے کے لیے کہا کیوں کہ یہی اس کی سب سے بڑی فرصت کا وقت ہوتا ہے۔ چناں چہ مسٹر صدیق کو انگلستان کی اس زبردست شخصیت سے دل کھول کر ملنے کا اتفاق ہوا۔ چہل قدمی سے واپس ہوتے وقت لانسبری نے آپ کو لائنس کافی ہاؤس میں اپنے ساتھ کافی پلائی۔ مسٹر صدیق کا بیان ہے کہ یہ کافی گھر اتنا معمولی تھا کہ کم از کم حیدرآباد کے اوسط قسم کے عہدہ دار بھی ایسی جگہ آنا اپنی کسرِ شان سمجھیں گے۔

لارڈ ہیلی فاکس:

لارڈ ہیلی فاکس *سابق وائسرائے ہند (حال معتمد امور خارجہ برطانیہ عظمیٰ[479]) سے بھی آپ کی ایک دلچسپ مڈبھیڑ ہوئی۔ قصرِ بکنگھم میں انڈین کنٹنجنٹ[480] کی دعوت تھی جس میں باہر کے بھی بہت سے لوگ مدعو تھے۔ انگلستان میں عام طور پر یہ قاعدہ ہے کہ کسی بڑے مکان میں داخل ہوتے ہی اپنی ٹوپی اور بڑا کوٹ ملازم (Valet) کے حوالہ کر دینا پڑتا ہے جو سلسلہ وار انھیں محفوظ رکھتا ہے۔ اور یہاں بھی "کیو" کی پابندی کرنی پڑتی ہے۔ چناں چہ مسٹر صدیق کے پیچھے لارڈ ہیلی فاکس اپنی باری کا انتظار کرنے کھڑے تھے۔ ایک سابق وائسرائے ہند کی اس سے بڑھ کر اور کیا عزت کی جا سکتی تھی کہ مسٹر صدیق نے انھیں اپنی جگہ پیش کی۔ لیکن لارڈ صاحب نے یہ کہتے ہوئے انکار فرمایا کہ یہ انگلستان ہے، ہندوستان نہیں۔

تعلیقات (شخصیات)

مصطفٰی کمال اتاترک (Mustafa Kemal Atatürk):

آپ سالونیکا کے متوسط الحال خاندان میں ۱۹ مئی ۱۸۸۱ء کو پیدا ہوئے۔ سات برس کے تھے کہ باپ کا سایہ سر سے اٹھ گیا۔ سالونیکا اور مناستیر کے کیڈٹ سکولوں میں تعلیم پائی اور ۱۹۰۵ء میں وہاں سے سٹاف کیپٹن بن کر نکلے۔ طالب علمی کے ایام میں ہی ایک منجھے ہوئے مقرر کی حیثیت سے شہرت حاصل کی۔

آپ نے ترکی کو عثمانی سلطنت اور پہلی جنگِ عظیم کے فاتح اتحادیوں سے آزاد کرانے کے لیے اندرونی اور بیرونی دشمنوں سے لڑائی لڑی۔ بہترین دفاعی صلاحیتوں اور بہادری کی وجہ سے ترقی پانے لگے، فوج میں آپ نے ترکی کو ایک ''ترک'' قوم کی صورت میں اکٹھا کرنے کا فیصلہ کیا۔

۱۹۰۵ء میں کیڈٹ اسکول سے اسٹاف کیپٹن بن کر نکلے۔ زمانہ طالب علمی میں ہی خلیفہ عبدالحمید کے خلاف سرگرمیوں میں حصہ لینے پر قید رہے۔ فوجی ملازمت اختیار کی۔ خفیہ تنظیم مجلسِ اتحاد و ترقی سے رابطہ ہوا۔ تحریک کی نشاۃ کے لیے کام کرنے لگے۔ ۱۹۰۸ء کے انقلاب کے بعد سیاست سے الگ جنگ' اطالیہ اور بلقان میں فوجی خدمات، حاضر دماغی اور جرأت سے لڑی۔ ۱۹۱۵ء میں انگریزوں اور فرانسیسیوں کے خلاف دفاعی کارناموں پر جنرل بن گئے۔ ۱۹۱۶ء میں روس سے ترکی کا علاقہ چھڑایا۔ ۱۹۱۸ء میں امن معاہدہ ہوا۔ اُس زمانے میں ملک کی حالت خراب تھی۔ سلطان وحیدالدین نے انھیں نویں فوج کا انسپکٹر جنرل بنایا۔

۱۹۱۹ء میں یونانی فوج نے ازمیر پر قبضہ کیا تو قبضے کے خلاف احتجاج کو دبانے کے لیے سلطان نے کمال کو مختصر افواج کا انسپکٹر جنرل بنایا۔ کمال نے اپنے ہم وطنوں کا ساتھ دیا اور پورے ملک میں یہ تحریک چلا دی۔ اپریل ۱۹۲۰ء میں انھوں نے انقرہ میں عبوری حکومت قائم کی اور دو سال میں غیر ملکی قابضین کو نکال باہر کیا۔ ۱۹۲۰ء میں انگورہ میں ترکی کی پہلی اسمبلی کے صدر بنے۔ نومبر ۱۹۲۲ء کو سلطنت کا خاتمہ کیا اور ۲۹ اکتوبر ۱۹۲۳ء کو جمہوریہ ترکی کا اعلان کر دیا۔ ۱۹۳۴ء میں انھیں اتاترک کا خطاب ملا۔ آپ نے ۱۰ نومبر ۱۹۳۸ء میں وفات پائی۔

ارسطو(Aristotle):

ارسطو قدیم یونان کا عظیم فلسفی، سائنسدان، ریاضی دان، استاد، تحقیق نگار اور مصنف تھا۔ اس کی تحریروں کے مضوعات فزکس، مابعد الطبیعات(Metaphysics) ، شاعری، تھیٹر، موسیقی، منطق، فن بلاغت، فن لسانیات، سیاسیات، حکومت، اخلاقیات، حیاتیات اور حیوانیات تھے۔ ارسطو ۳۸۴ قبل مسیح میں یونان کے ایک چھوٹے سے ساحلی قصبے Stagira میں پیدا ہوا۔ اس کے باپ کا نام Nicomachus تھا جو کہ ریاست میسیڈونیا کے بادشاہ Amyntas کا درباری طبیب تھا۔ یہ خیال کیا جاتا ہے کہ ارسطو کے آباؤاجداد کئی نسلوں سے اس ریاست کے شاہی دربار میں بطور معالج کام کرتے چلے آ رہے تھے، اگرچہ ارسطو جب ابھی لڑکپن میں ہی تھا تو اس کا باپ فوت ہو گیا لیکن اس کے باوجود ساری عمر ارسطو کا شاہی دربار سے قریبی واسطہ رہا اور اس نے اس ماحول کا کافی اثر بھی لیا۔ ارسطو کی ماں کا نام Phaestis تھا لیکن اس کے بارے میں مزید کچھ معلوم نہیں۔ یہ خیال کیا جاتا ہے کہ ارسطو کی ماں بھی اس کے بچپن میں ہی فوت ہو گئی۔

ارسطو نے حیاتیاتی سائنسوں پر تجربات کا ایک طویل سلسلہ شروع کیا۔ ارسطو نے نباتات اور حیوانیات پر اپنے جو مشاہدات کیے وہ انہی دنوں کے تجربات پر مشتمل ہیں۔ انہی علاقوں میں اس کی ملاقات اپنے جیسے ایک اور شخص Theophrastus سے ہو گئی، اور ان دونوں نے مل کر سائنسی میدان میں کافی تجربات کیے۔ جب ایتھنز میں ارسطو نے اپنی اکادمی Lyceum قائم کی تو ارسطو کے بعد اس اکادمی کا سربراہ بھی یہی شخص مقرر ہوا۔ ارسطو نے اس زمانے میں موجود نہ صرف تمام علوم کا مطالعہ کیا، بلکہ ان علوم میں اضافہ کرنے کے لیے اپنا خاطر خواہ حصہ بھی ڈالا۔ طبیعی سائنس میں ارسطو نے علم تشریح الاعضاء، فلکیات، جنینیات (embryology) جغرافیہ، علم ارضیات، فن موسیمیات، فزکس اور حیوانیات کا مطالعہ کیا۔ فلسفے میں ارسطو نے جمالیات، اخلاقیات، حکومت، مابعد الطبیعات، سیاسیات، معاشیات، نفسیات، فن بلاغت، اور دینیات کے بارے میں مضامین لکھے۔ اس کے علاوہ ارسطو نے تعلیم، غیر ملکی رسوم و رواج، لٹریچر اور شاعری کا مطالعہ کیا۔ اگر ارسطو کی تمام تحریروں کو جمع کر لیا جائے تو اس سے یونانی علوم کا ایک انسائیکلوپیڈیا تشکیل دیا جا سکتا ہے۔ یہ بھی خیال کیا جاتا ہے کہ ارسطو ہی وہ واحد شخص تھا جو اپنے زمانے کے تمام علوم سے واقف تھا۔ اس کی کتب و تحقیقی رسائل کی تعداد ہزار سے اوپر ہے، جن میں سے اہم یہ ہیں:

المقولات، الاخلاق، مابعد الطبیعیہ، العبارۃ، البرہان، الجدل، الخطابہ، الشعر، النفس، الحیوان، الحس و المحسوس اور بوطیقا وغیرہ۔

جب اس پر یہ الزام لگایا گیا کہ ارسطو دیوتاؤں کا احترام نہیں کرتا تو اسی بنا پر اسے ملحد قرار دے دیا گیا۔ یہی وہ الزام تھا جس کے تحت ۳۹۹ قبل مسیح میں افلاطون کے استاد سقراط کو سزائے موت دی گئی تھی۔ اس سے پہلے کہ اس پر مقدمہ چلایا جاتا، ارسطو ایتھنز سے نکل گیا اور Euboea جزیرے میں Chalcis کے مقام پر چلا گیا اور اپنی زندگی کا باقی حصہ اس نے اپنی دوسری بیوی کے ساتھ وہیں گزارا۔ اس علاقے میں جا کر ارسطو کے نظامِ انہضام میں خرابی پیدا ہو گئی اور ۳۲۲ قبل مسیح میں ۶۳ سال کی عمر میں ارسطو کا انتقال ہو گیا۔ اسے اس کی پہلی بیوی کی قبر کے قریب دفنا دیا گیا۔

اسٹینلے بالڈون (Stanley Baldwin):

انگلستان کے ایک قصبے بیوڈلے (Bewdley) کے پہلے "ارل" اسٹینلے بالڈون اگست ۱۸۶۷ء میں پیدا ہوئے۔ برطانیہ کے قدامت پسند پارٹی سے آپ کا تعلق تھا، آپ ۱۹۲۳ء سے ۱۹۷۳ء تک کنزرویٹو پارٹی کے قائد رہے۔ بالڈون نے طویل عمر پائی اور عمر بھر سیاست سے وابستہ رہے۔ دو عالمی جنگوں میں اپنے علاقے کا انتظام چلایا۔ انگلستان کے وزیر اعظم بنے اور یہ اعزاز تین بار حاصل کیا۔ اس کے علاوہ آپ کو یہ منفرد اعزاز بھی حاصل ہے کہ تین مختلف بادشاہوں کے دور میں وزیر اعظم کا عہدہ سنبھالنے والے آپ واحد سیاست دان ہیں۔

۱۹۰۸ء میں آپ بیوڈلے کی پارلیمنٹ کے ممبر کے طور پر ہاؤس آف کامنز میں (فروری ۱۹۰۸ء سے اکتوبر ۱۹۲۲ء تک) اپنے والد کی کامیابی کے لیے کام کیا۔

۱۹۲۳ء میں پارٹی کے راہنما بونار لاء (Bonar Law) کو کینسر کی تشخیص ہوئی تو اس وقت صرف دو امیدواروں نے اسے کامیابی سے ہم کنار کیا۔ ایک سیکرٹری خزانہ، لارڈ کرزن (Lord Curzon) اور دوسرے بالڈون۔ لارڈ کرزن کئی وجوہ کی بنیاد پر وزیر اعظم کے عہدے کے لیے مناسب نہ خیال کیا گیا تھا اور بادشاہِ وقت جارج پنجم نے بالڈون کو وزیر اعظم بنانے کا ارادہ ظاہر کیا۔ اُس وقت بالڈون اعزازی چانسلر کے عہدے پر بھی فائز تھے۔ بالڈ ون کا پہلا دَورِ حکومت جُون ۱۹۳۵ء سے مئی ۱۹۳۷ء تک رہا۔

دوسری بار (۴ نومبر ۱۹۲۴ء سے ۴ جون ۱۹۲۹ء) بالڈون جب وزیر اعظم منتخب ہوئے تو اُن کی کابینہ میں جارج پنجم کے دَور کے بڑے بڑے وزرا شامل تھے جیسے آسٹن چیمبر لین (Austen Chamberlain) فارن سیکرٹری کے طور پر، لارڈ برکن ہیڈ (Lord Birkenhead) سکرٹری برائے ہندوستان، آرتھر بال فور (Aurthur Balfour) اعزازی چانسلر کے طور پر خدمات سرانجام دے رہے تھے۔

۱۹۲۵ء کے بعد کے لارڈ پریزیڈنٹ کے طور پر بالڈوِن نے عوام کی فلاح و بہبود کے لیے کئی نئے منصوبے اور کئی نئی اصلاحات کیں جن میں بے کسوں کے لیے امدادی کاروائیاں ایک قانون کے تحت کی گئیں۔ ۱۹۲۶ء کی ملک گیر ہڑتال ختم کی۔ ۱۹۲۹ء میں مخالف جماعت، لیبر پارٹی دوبارہ برسرِ اقتدار آئی تو لیبر پارٹی کے وزیر اعظم رامزے میکڈونلڈ (Ramsy Macdonlad) کے دَور میں سٹینلے بالڈوِن نے مضبوط اور باصلاحیت قائدِ حزبِ اختلاف کا کردار ادا کیا، اس دَور (جون ۱۹۲۹ء سے اگست ۱۹۳۱ء) میں انگریز حکومت روسیوں سے برسرِ پیکار تھی۔

۱۹۳۱ء میں برطانیہ میں معاشی بحران پیدا ہوا۔ پوری دنیا ہی اس وقت معاشی بحران کا شکار تھی۔ ایسے کڑے دور میں بالڈوِن اور قدامت پسندوں نے لیبر پارٹی سے اتحاد کر لیا۔ اِس اتحاد کے بعد اُس زمانے کے لیبر پارٹی کے وزیر اعظم رامزے میکڈونلڈ کو پارٹی سے نکال دیا گیا، اس کے نتیجے میں بالڈوِن نے لارڈ پریزیڈنٹ آف کونسل کی حیثیت سے وزارت عظمیٰ کی ذمہ داریاں سنبھال لیں اور ۱۹۳۵ء میں باقاعدہ وزیر اعظم بن گئے (۱۹۳۷ء۔ ۱۹۳۵ء)۔ اسی تیسری وزارت کے زمانے میں جمعیتِ اقوام (Leagne of Nations) روبہ زوال ہوئی، فُسطائی طاقتیں ابھریں اور ایڈورڈ ہشتم بادشاہی سے دست بردار ہوئے۔

جون ۱۹۴۵ء میں بیوی کی موت کے بعد بالڈوِن بھی بیماری کا شکار ہوئے اور چلنا پھرنا محال ہو گیا۔ ۱۹۴۷ء کے دسمبر میں اپنی صحت کی خرابی کی بنا پر اسّی سال کی عمر میں انگلستان کے شہر ورسیسٹر شائر (Worcester shire) میں انتقال کر گئے۔

الزبتھ ملکہ (Queen Elizabeth):

مملکتِ متحدہ اور دیگر دولتِ مشترکہ کے ممالک کی ملکہ الزبتھ الیگزنیڈرا میری (Elizabeth Alexandra Mary) ۲۱ اپریل ۱۹۲۶ء کو مے فیئر لندن (Mayfair, London) میں پیدا ہوئیں۔ شاہ جارج ششم کی پہلی اولاد تھیں۔ ابتدائی تعلیم گھر میں حاصل کی۔ دوسری جنگِ عظیم میں ملکہ نے جنگی خدمات بھی سرانجام دیں تھیں۔ ۱۹۴۷ء میں ملکہ نے فلپ (Philip) سے شادی کر لی جو کہ ڈیوک آف ایڈن برگ (Duke of Edinburgh) اور یونان (Greece) اور ڈنمارک (Denmark) کے سابق شہزادے تھے۔ ان کے چار بچے ہوئے، سب سے بڑے بیٹے چارلس (پرنس آف ویلز) ولی عہد بھی ہیں۔

۱۹۵۲ء میں بادشاہ جارج ششم کی وفات کے بعد الزبتھ تخت نشین ہو گئیں، مملکت متحدہ برطانیہ کے علاوہ سات دولتِ مشترکہ کے ممالک کی بھی ملکہ کہلائیں۔ ملکہ کے اقتدار میں آتے ہی آئین میں بڑی بڑی تبدیلیاں آئیں اور

کئی کالونی ممالک کی آزادی کا اعلان ہوا۔ اپنے دَورِ حکومت میں ملکہ نے کئی اہم ملاقاتیں اور غیر ملکی دورے کیے۔ وہ برطانیہ کی سب سے طویل عرصہ حکمران رہنے والی ملکہ بھی بن گئیں ہیں جو کہ تاحال ملکہ ہیں۔

ہربرٹ جارج ویلز(Herbert George Wells):

آپ ۲۱ ستمبر ۱۸۶۶ء کو انگلستان میں پیدا ہوئے۔ ایچ جی ویلز انگریزی زبان کے ناول نگار، افسانہ نگار، تاریخ دان اور استاد بھی تھے۔ اس کے علاوہ معاشرتی موضوعات پر طنزیہ تحریریں، سوانح عمریاں، سائنس فکشن کہانیاں اور اپنی آپ بیتی بھی یادگار چھوڑی۔ انھوں نے جنگی موضوع پر بھی دو کتابیں لکھیں۔ سائنس فکشن میں ایچ جی ویلز کا نام بہت بڑا ہے۔ ان کو سائنس فکشن کا باوا آدم کہا جاتا ہے۔ اپنی زندگی میں وہ ترقی پسند رجحان رکھتے تھے۔ بہت سے نقادوں نے ان کی تحریروں میں ترقی پسند نقطۂ نظر کا کھوج لگایا ہے۔ اس زمانے میں جب کہ سائنسی ایجادات کا دائرہ اتنا وسیع نہیں تھا، ویلز کی تحریروں میں ہمیں بہت سی ایجادات کا آئیڈیا ملتا ہے۔ وہ مستقبل بین اور خیالی سرزمین کا ذکر کرتے تھے جہاں فضائوں میں اڑنے والی مشینیں، بڑے بڑے جنگی ہتھیار، زمین سے باہر، خلائوں کا سفر، تابکار ہتھیار اور انٹرنیٹ سے ملتی جلتی چیزیں دکھائی دیتی ہیں۔ اپنی سائنس فکشن تحریروں میں انھوں نے ٹائم مشین تک کا خیال پیش کیا (۱۸۹۵ء)۔ اپنی تحریروں اور ان کے ایسی انوکھے موضوعات کی وجہ سے وہ چار بار ادب کے نوبل انعام کے لیے نامزد کیے گئے۔ ویلز کو حیاتیات میں دلچسپی تھی اور وہ ڈارون کے نظریات سے متاثر تھے۔ پہلی عالمی جنگ کے آغاز تک وہ سماجی بہتری کے خیالات کا اظہار کرتے تھے اور بہت حد تک سوشلسٹ تھے۔ بعد میں ان کے نظریات پر سیاست اثر انداز ہونے لگی۔ پیشے کے لحاظ سے ویلز ایک صحافی تھے۔

سائنس فکشن کے تاریخ کے ماہر جان کلیوٹ John Clutek کے مطابق اس سلسلے میں ایچ جی ویلز کا نام سب سے زیادہ اہمیت کا حامل ہے اور برطانیہ اور امریکہ کی تمام سائنس فکشن(Science Fiction) میں ویلز کے کام کو بنیادی اہمیت حاصل ہے۔ ۱۳ اگست ۱۹۴۶ء میں ویلز کا انتقال ہوا۔ جب کہ اس وقت ان کی عمر اناسی سال تھی۔

البرٹ آئن سٹائن(Albert Einstein):

بیسویں صدی کا عظیم ماہر طبیعات، سائنسی مفکر اور پروفیسر' البرٹ آئن سٹائن ۱۴ مارچ ۱۸۷۹ء میں جرمنی کے شہر اولم(Ulm) میں پیدا ہوا۔ اس کا خاندان جرمنی کے خوش حال یہودی خاندانوں میں سے ایک تھا۔ اسی حوالے سے آئن سٹائن کی ابتدائی تعلیم بھی مذہبی اسکول سے شروع ہوئی جہاں کے سخت ماحول سے اُن کو ناگواری محسوس ہوتی تھی۔ ۱۸۹۴ء میں سولہ سال کی عمر میں آئن سٹائن نے اپنی تعلیم کو ادھورا چھوڑا اور اپنے والدین کے پاس اٹلی چلے گئے جہاں اُن کے ماں باپ کچھ ماہ پہلے منتقل ہوئے تھے۔ پھر جب وہ اٹلی سے سوٹیزرلینڈ گئے تو انھوں نے اپنی ادھوری تعلیم مکمل کرنے کا آغاز کیا۔ یہاں کے مالک مکان کی بیٹی سے ان کی اچھی دوستی ہو گئی۔ وہ اس سے علمی موضوعات پر بات چیت کیا کرتے۔ یہی لڑکی بعد میں ان کی بیوی بھی بنی۔ کہا جاتا ہے کہ آئن سٹائن کے مشہور نظریے میں ان کی بیوی میری(Mary) کا بھی حصہ تھا۔

۱۹۰۵ء میں البرٹ نے چار مقالے تحریر کیے۔ پہلا مقالہ زیورخ کی یونی ورسٹی میں ان کا پی ایچ ڈی کا تھیسس تھا جس میں انھوں نے بتایا کہ روشنی موج کے بجائے فوٹونز(ذرّات) پر مشتمل ہے۔

تیسرا مقابلہ اس کا دنیا کو چونکانے میں کامیاب ہوا۔ اس مقابلے میں البرٹ آئن سٹائن نے اپنا اضافیت کا نظریہ پیش کیا۔ جس کی دھوم چار دانگِ عالم میں پھیل گئی اور آئن سٹائن کو دنیا کی بڑی بڑی یونی ورسٹیوں میں ملازمت کی پیش کش ہوئی۔

آئن سٹائن نے کئی یونیورسٹیوں میں وقتاً فوقتاً تدریس اور تحقیق کا کام کیا۔ ۱۹۱۴ء میں وہ واپس جرمن چلے گئے اور پروفیسر کے عہدے پر برلن یونی ورسٹی میں پڑھانے لگے۔ یہ پہلی جنگِ عظیم کا سال تھا۔ اس جنگ میں جرمنی شکست سے دوچار ہوا اور اس پر کڑی شرائط اور بھاری ہرجانہ عائد کر دیا گیا۔ یوں جرمنی میں دائیں بازو کی قوم پرست جماعتوں نے طاقت حاصل کی۔ انھوں نے آئن سٹائن کی تحقیق پر بھی شکوک کا اظہار کیا۔ ایسی باتوں سے دل برداشتہ ہو کر آئن سٹائن نے جرمنی کو چھوڑنے کا فیصلہ کر لیا حالاں کہ جرمن سائنس دان کی حیثیت سے وہ ''نوبل پرائز'' بھی حاصل کر چکے تھے۔ جب آئن سٹائن معلوماتی دَوروں پر دنیا کے مختلف ممالک کے دورے پر تھے تو ان کے گھر کی بھی سخت تلاشی لی گئی، ہٹلر کی ایسی سخت کارروائیوں نے ان کو وطن واپس ہی آنے نہ دیا۔ وہ دورے سے واپسی پر بیلجیم میں ہی رہ گئے بعد ازاں ۱۹۳۳ء میں وہ یہاں سے امریکا منتقل ہو گئے۔

۱۹۳۹ء میں آئن سٹائن امریکا کی پرنسٹن یونی ورسٹی میں پروفیسر بن گیا تھا اور اگلے ہی سال اس کو امریکی شہریت مل گئی۔ دوسری جنگِ عظیم کے واقع میں اسے جرمنی کے کردار کی وجہ سے جرمنی سے نفرت ہو گئی تھی۔

۱۹۳۹ء میں امریکی صدر فرینکلن روزویلٹ (Franklin Delano Roosevelt) کو آئن سٹائن نے خط لکھ کر ایٹم بم بنانے کی ترغیب دی اور کہا کہ ہٹلر کا بھی ایسا ہی ارادہ ہے اور طاقت کے توازن کے لیے یہ ضروری ہے لیکن اس کے فوراً بعد جب بم بن گیا اور جاپان کے دو شہر لقمہ اجل بن گئے تو آئن سٹائن نے افسوس کا اظہار کیا۔

۱۸ اپریل ۱۹۵۵ء کو امریکا کے شہر پرنسٹن میں ہی ان کی موت واقع ہوئی۔

جارج گارڈن بائرن (George Gordon Byron):

۲۲ جنوری ۱۷۸۸ء میں انگلستان کے شہر لندن میں پیدا ہوا۔ بائرن نے اسرا کے سکول میں تعلیم حاصل کی اپنی ذہانت اور کھیلوں میں مہارت کی وجہ سے سکول میں بہت مقبول رہا۔ شاہ خرچ، جوئے کا رسیا اور عاشق مزاج تھا۔ سیر وسیاحت کا شوقین تھا، مشرقی ممالک کا سفر بھی کیا۔ ۱۷۹۸ء میں موروثی خطاب "لارڈ" پایا۔ سفر سے واپس آکر یونان کی جنگ آزادی کے حق میں ایک طویل نظم لکھی۔

۱۸۰۷ء میں اس کی نظموں کی پہلی کتاب "Hours of Leisure" شائع ہوئی۔ تنقید نگاروں نے اسے اچھی نظروں سے نہیں دیکھا جس پر اس نے ایک ہجو لکھی English Poet and Scotch Critic، یہ اس کی پہلی کامیاب کتاب تھی۔

اس کی شہرت اس کی شخصیت کی دل کشی کی وجہ سے ہے۔ اس کے انقلابی جذبے کے سبب اور اس رومان کی بنا پر جو ہمیں اس کی طویل نظموں ۱۸۱۸ء-۱۸۱۲ Child Harold's pilgrimage میں ملتا ہے۔ اس کی نظم The vision of Judgement میں اس کے کلاسیکی ضبط کی کارفرمائی اور طنز کی چھبن استادانہ انداز میں نظر آتی ہے۔

اس کا باپ طبقۂ اشراف سے تعلق رکھتا تھا۔ اس کی ماں اسکاچ تھی۔ سکول میں اپنے ٹیڑھے پاؤں کی وجہ سے وہ مذاق کا نشانہ بنا۔ سکول کی چھٹیوں کے دوران وہ اپنی بڑی کزن میرے چاورتھ کے ساتھ لاحاصل چاہت میں پڑا جس کے بعد اس کی آئندہ زندگی کی رومانیت پر اس کا اثر پڑا۔

۱۸۱۲ء میں اس نے Child Harold's Pilgrimage نظم لکھی جس نے ادبی وسیاسی دنیا میں تہلکہ مچادیا۔ اس نظم میں اس نے بھی یورپ کو یونان پر ترکی قبضے کے خلاف ابھارا۔ بائرن نے اپنے دور کی سیاست کو اقبال کی طرح بہت متاثر کیا۔ 1823ء میں وہ یونان کی حمایت میں لڑی جانے والی جنگ میں شریک ہوا اور ۱۹ اپریل ۱۸۲۴ء کو مارا گیا۔

برٹرینڈ آتھر ولیم رسل (Bertrand Aethur William Russill):

بیسویں صدی میں فلسفے کی دنیا کا سب سے بڑا نام رسل کا ہی ہے۔ رسل معروف مفکّر، ریاضی دان، استاد، سائنس دان، مؤرخ اور افسانہ نگار تھے۔ برطانیہ کے علاقے "ویلز میں ۱۸ مئی ۱۸۷۲ء میں پیدا ہوا۔ رسل کے دو بہن بھائی تھے۔ رسل دو سال کا تھا جب اس کی ماں کا انتقال ہو گیا اور چار سال کی عمر میں اس کا معروف باپ بھی اس دنیا میں نہ رہا۔ دونوں بھائیوں کی مزید پرورش ان کے دادا دادی نے سرانجام دی۔ رسل کے دادا سر جان رسل ارل اور بیڈ فورڈ کے چوتھے ڈیوک تھے وہ دوبار برطانیہ کے وزیراعظم (۲۹ اکتوبر ۱۸۶۵ء سے ۲۶ جون ۱۸۶۶ء تک) بھی رہے۔

رسل نے ایک مذہبی گھرانے میں آنکھ کھولی تھی لیکن ان کے والد جان وسکاؤنٹ ایمبرلے رسل (Johm Viscount Amberley Russell) روشن خیال آدمی تھے۔ انہوں نے عورتوں کے حقوق کے حوالے سے تحریکوں سے تعاون کیا۔ ان خیالات کا اثر بعد میں رسل پر بھی پڑا جو بچپن میں مذہبی تھے اور اپنے دل کی دنیا میں ڈوبے رہتے تھے۔ پڑھائی میں اچھے تھے لیکن اداس رہا کرتے تھے، خودکشی کی طرف بھی رجحان رکھتے تھے البتہ انھوں نے کبھی خودکشی کی کوشش نہیں کی تھی۔ رسل کو مطالعے کی عادت تھی اور اسی عادت سے ابتدائی جوانی میں ان کے خیالات متاثر ہوئے۔ اٹھارہ سال کی عمر تک وہ مختلف خیالات سے گزرتے ہوئے مذہب کو ترک کر چکے تھے۔

۱۸۹۰ء میں برطانیہ کی بڑی یونی ورسٹی (کیمبرج یونی ورسٹی) سے ریاضی میں تعلیم حاصل کی اور پھر اسی یونی ورسٹی میں تدریس کے فرائض انجام دینے لگا۔ اس کے علاوہ نیشنل یونی ورسٹی آف پیکنگ (چائنہ)، یونی ورسٹی آف کیلی فورنیا اور دیگر اچھے تعلیمی اداروں میں بھی پروفیسر رہے۔

رسل نے ایلس (Alyssa Pearsall Smith) سے ۱۸۹۴ء میں محبت کی شادی کی اور ۱۹۰۱ء میں اچانک رسل کو خیال آیا کہ اس کو ایلس سے کبھی محبت تھی ہی نہیں۔ اس خیال سے دونوں کے درمیان دُوری آنے لگی اور ۱۹۲۱ء میں جب طلاق ہوئی تو رسل لیڈی اوٹولائن موریل (Lady Ottoline Morrell) کی محبت میں

گرفتار ہو چکا تھا۔اس کے بعد بھی کئی خواتین سے اس کے معاشقے منظرِ عام پر آتے رہے۔ڈورا(Dora Black) سے اس نے دوسری شادی کرلی۔ڈورا کے کسی امریکی صحافی سے تعلقات بھی تھے۔رسل نے ۱۹۳۲ء میں ڈورا کو بھی طلاق دے اور ۱۹۳۶ء میں اپنے بچوں کی آیا پیٹریشیا(Patricia Russell, Countess Russell)سے شادی کی جوان کے مرنے تک برقرار رہی۔

رسل نے جرمنی کی معاشرتی جمہوریت پر غور کرنا شروع کیا۔اس حوالے سے ان کی کتابیں ۱۸۹۶ء سے چھپنے لگی تھیں۔۱۸۹۸ء میں انھوں نے ریاضی کی بنیادوں کے بارے میں سوچنا اور تحقیق کرنا شروع کیا اور اس موضوع پر مضامین لکھے۔۱۹۰۰ء میں پیرس میں ہونے والی بین الاقوامی کانگریس آف فلاسفی میں شرکت نے اس ریاضی نے تصورات کی کایاپلٹ دی۔رسل پیراڈوکس کے نام سے ریاضی میں اس کا تصور منظر عام پر آیا۔۱۹۱۰ء سے ۱۹۱۳ء تک رسل نےPrincipia Mathematicپر کام کیا اور۱۹۰۸ء میں وہ رائل سوسائٹی کا فیلو منتخب ہوا۔ اس کام سے رسل کو ریاضی کے میدان میں عالم گیر شہرت حاصل ہوئی۔کیمبرج میں تدریس کے دوران رسل نے اپنے شاگرد کے کچھ نفسیاتی مسائل حل کرنے کی کوشش کی اور منطق اور فلسفے میں غور کرنے لگااس موضوع پر اس نے لیکچرز بھی دیے۔

جنگِ عظیم اول میں رسل ان مصدررلے چند لوگوں میں شامل تھا جنہوں نے جنگ کی مخالفت کی تھی۔وہ عدم تشدد کا قائل تھا۔جنگ کے خلاف اس طرح کے خیالات رکھنے کی وجہ سے اس کو۱۹۱۶ء میں ملازمت سے نکال دیا گیا۔

رسل نے معاشرت، جنگ، امن، جنس، قانون اور انسانی ہمدری جیسے موضوعات پر علمی اور تحقیقی مضامین، کتب اور کتابچے تحریر کیے۔رسل کے ویت نام جنگ کی بھی مخالفت کی اور امریکہ کے صاف الفاظ میں ملامت کی۔عالمی سیاست پر بھی رسل نے نظر رکھی۔سامراجی طاقتوں کے خلاف اس نے ہمیشہ اپنی آواز بلند کی۔وہ ہر طرح کے استحصال کے خلاف تھا چاہے وہ مذہبی ہو، سرمایہ دارانہ ہو یا کمیونزم کے نام پر۔۱۹۵۰ء میں رسل کو ادب کا نوبل انعام دیا گیا۔وہ واحد اعزاز تھا جو رسل نے قبول کیا۔۱۹۶۷ء میں رسل کی آپ بیتی منظر عام پر آئی اور بہت مقبول ہوئی۔رسل مقبول ترین مفکر بن گیا اور دنیا بھر میں (روس، چین، برطانیہ، یورپ، امریکا) میں نوجوانوں میں بہت پزیرائی ملی۔طویل عمر لکھنے لکھانے میں بسر کی۔آخری عمر میں افسانہ نگاری شروع کی۔۲فروری ۱۹۷۰ء میں وفات پائی۔

جارج برنارڈ شا(George Bernard Shaw):

۲۶ جولائی ۱۸۵۶ء کو آئر لینڈ کے شہر ڈبلن میں پیدا ہونے والا برنارڈ شا ڈرامہ نگار، نقاد، ناول نگار، افسانہ نگار اور سیاست دان تھا۔ اس نے ۱۸۸۰ء کے عشرے میں مغربی تھیٹر پر بہت اثر ڈالا۔ اس نے ساٹھ (۶۰) سے زیادہ ڈرامے لکھے جن میں 'مین اینڈ سپر مین (۱۹۰۲ء)' اور 'سینٹ جون (۱۹۲۳ء)' بہت مشہور ہوئے۔ برنارڈ شاہ نے اپنے ڈراموں میں زمانہ حال کے ساتھ ماضی اور تاریخ کا عکس شامل کیا، اس بات سے وہ نوجوانوں میں بہت مقبول ہوا۔

برنارڈ شاہ کا تعلق ڈبلن کے نچلے متوسط طبقے سے تھا اور وہ اپنے گھر میں بہن بھائیوں میں سب سے چھوٹا تھا۔ اس کی ماں کا ایک موسیقار اور گلوکار دوست تھا جس کی وجہ سے ابتدائی دور میں شا کو موسیقی سے کچھ دلچسپی پیدا ہو گئی تھی، جس کا بعد میں بھی شا کی زندگی پر گہرا اثر ہوا۔ ۱۸۶۲ء میں شا نے 'لی' نامی اس موسیقار کے ساتھ رہنا شروع کیا۔ شا آدم بیزار طبیعت کا حامل تھا۔ اس کو لی کے گھر میں تنہا رہنا پسند تھا۔ لی سے موسیقی کی تعلیم حاصل کرنے والے لوگ کبھی کبھی کچھ کتابیں بھی لے آتے تھے جو شا کے مطالعے میں داخل ہو جاتی تھیں یوں شا کا مطالعہ بہت وسیع ہوا اور بچپن سے ہی اس نے ادب اور موسیقی کے میدان میں اچھی شدھ بدھ پیدا کر لی۔

شا کو اسکول جانے سے نفرت تھی، ۱۸۷۱ء میں اس نے اسکول کو خیر باد کہا اور ڈبلن میں جونیئر کلرک کے عہدے پر کام کرنے لگا۔ اس کی محنت اور دیانت کو دیکھتے ہوئے جلد ہی اسے ہیڈ کیشیئر کے عہدے پر ترقی دے دی گئی۔ اسی دور میں اس نے اپنے لیے ''برناڈ شا'' کا نام پسند کیا اور جارج کا سابقہ اپنے نام میں سے خارج کر دیا۔ ۱۸۷۳ء میں شا کو واپس اپنے گھر میں آنا پڑا جہاں اس کو موسیقی کی کمی محسوس ہوتی تھی یوں اس نے پیانو بجانا شروع کیا۔ ۱۸۷۶ء میں شاہ ہمیشہ کے لیے لندن چلا گیا۔

۱۸۷۹ء میں اس نے اپنا پہلا ناول مکمل کیا جس کا نام تھا میچورٹی ''Immaturity''۔ پبلشروں نے اسے چھاپنے سے انکار کر دیا۔ یہ ناول بعد میں ۱۹۳۰ء میں چھپا۔ ۱۸۸۰ء میں اس نے مصنف بننے کا فیصلہ کیا اور ملازمت چھوڑ دی۔ اگلے چار سال تک شا نے اپنی تحریروں سے ہی پیسے کمائے۔ ۱۸۸۰ء میں شا کی ملاقات سڈنی ویب (Sidney web) سے ہوئی گو کہ اس زمانے تک شا نے نام نہیں کمایا تھا لیکن سڈنی نے اس میں صلاحتیں دیکھی لی تھیں۔

۱۸۸۴ء میں شا کی ملاقات ایک نقاد ولیم آرچر (William Archer) سے ہوئی جس کا شا کی زندگی پر اور اس کی ترقی پر گہرا اثر پڑا۔ ۱۸۸۲ء میں شا نے معیشت میں دلچسپی لینا شروع کیا اور کارل مارکس کی تحریریں پڑھنا

شروع کیااور اسی وقت تک اس سے متاثر رہا جب تک ۱۸۸۹ء تک اس نے برطانیہ کی معاشی ایسوسی ایشن کی ملاقاتوں میں شرکت نہ کرلی۔ اس کے بعد وہ سیاسی طور پر بھی سرگرم ہو گیا۔

۱۸۸۰ء کے عشرے میں شا کے دو ناول چھپے اور وہ ایک نقاد بھی بن گیا۔ اس نے موسیقی کے بارے میں ایک کتاب لکھی۔ اس زمانے میں وہ ولیم مورس(William Morris)اور جان رسکس سے متاثر تھا۔

پہلا ڈرامہ جس سے شا کو اچھی معاشی کامیابی حاصل ہوئی ۱۸۹۴ء میں لکھا جانے والا "آرمز اینڈ دامین" تھا۔ بیسویں صدی کے پہلے عشرے میں شا سٹیج ڈراموں کی مصنف کے طور پر کامیابی سے اپنا نام بنا چکا تھا۔ ۱۹۰۲ء میں "مین اینڈ سپرمین" ڈرامے کو بہت پذیرائی ملی۔ ۱۹۰۶ء میں "The Dotor s Dilemma" "سیزر اینڈ کلوپیٹرا" کامیاب ڈرامے تھے۔ اینڈروکلز اینڈ دالائن(Androcles and the lion) ۱۹۱۲ء میں موضوع کے اعتبار سے منفرد تھا۔ اس میں شا نے مذہبی رویوں پر قائدانہ نظر ڈالی۔ اس دوران وہ عملی سیاست میں بھی حصہ لیتا رہا۔ ۱۹۱۴ء میں پہلی جنگ عظیم کے دوران شا نے Common Sense About The War میں کہا کہ دونوں فریق جنگ کی تباہ کاریوں کے برابر ذمہ دار ہیں۔ اس زمانے میں شا کی یہ باتیں کسی کو پسند نہیں آئیں اور اس کے بہت سے دوست اس سے خفا ہو گئے۔ جنگ کے بعد ۱۹۱۶ء۔ ۱۹۱۷ء میں شا نے "ہارٹ بریک ہاؤس" (Heart Break House) کے نام سے ڈرامہ لکھا جو قابل ذکر ہے لیکن اس کو اس زمانے میں زیادہ پزیرائی حاصل نہ ہوئی اور نقادوں نے بھی اسے پسند نہیں کیا۔ اسی طرح ۱۹۱۸ء۔ ۱۹۲۰ء میں "بیک ٹو میتھیوسیلا" (Back to Methuselah)، ۱۹۲۰ء میں (Joan of Ark) "جان آف آرک" اور ۱۹۲۸ء میں دا ایپل کارٹ (The Apple Cart) وہ ڈرامے تھے جو شا کی فکر کے ارتقا کو ظاہر کرتے ہیں۔ گو کے اس ڈرامے کو بھی زیادہ شوق سے نہیں دیکھا گیا لیکن دوسری جنگ عظیم کے بعد ۱۹۴۴ء شا کے نو (۹) ڈرامے لندن میں دکھائے گئے اور دو ڈرامہ کمپنیوں نے پورے برطانیہ میں اس کے ڈرامے دکھائے۔ یوں شا کو ملک بھر میں مقبولیت حاصل ہوئی۔ ۱۹۴۶ء میں اس کے شہر ڈبلن کو آزادی ملی اور وہ پہلا اعزازی فری مین بنا۔ نوے برس کی عمر کو پہنچنے کے باوجود شا نے کام کرنا اور لکھنا ترک نہ کیا۔ اپنے آخری سالوں میں وہ باغبانی کرتا رہا، اس دوران ایک حادثے کا شکار ہو کر گرا اور اس کے گردے متاثر ہوئے۔ دنیائے ادب کا یہ عظیم ڈرامہ نوسیس جب مرا تو اس دن نومبر کی ۲ تاریخ تھی اور سال ۱۹۵۰ء کا تھا۔

جارج برنارڈ شا کو ۱۹۲۵ء میں ادب کا نوبل انعام ملا۔ ۱۹۳۸ء میں اکادمی انعام برائے بہترین مکالمہ نگاری ملا۔

اوتوفون بسمارک (Otto von Bismarck):

اوتو فون بسمارک جرمن تاریخ کا سب سے مشہور سیاست دان ہے جو یکم اپریل ۱۸۱۵ء کو پروشیا کے صوبے سیکسونی میں پیدا ہوا۔

بسمارک قدامت پسند خیالات کا مالک تھا۔ ۱۸۶۲ء میں قیصر جرمنی، تریڈرک ولیم اول نے بسمارک کو پروشیا کا قلم دانِ وزارتِ عظمیٰ تھمایا تو بسمارک نے اسی عہدے پر ۱۸۹۰ء تک خدمات سر انجام دی۔ اس کے زمانے میں پروشیا کی اپنے ہمسایہ ممالک ڈنمارک، آسٹریا اور فرانس سے مختصر جنگیں بھی ہوئیں۔ آسٹریا کے خلاف جنگ میں فتح کے بعد بسمارک نے جرمن کنفیڈریشن کو ختم کر دیا۔ جرمن کی اڑتیس (۳۸) ریاستوں کے اتحاد کی تحریک ۱۸۱۵ء سے چل رہی تھی۔ بسمارک نے ۱۸۶۷ء میں اس تحریک کو کامیابی سے ہم کنار کیا اور پہلی شمالی جرمن قومی ریاست قائم کی اور پہلا وفاقی چانسلر (جولائی ۱۸۶۷ء سے مارچ ۱۸۷۱ء تک) بن گیا۔ اس نے پروشیا کی شمالی ریاستوں کو بعد میں شامل کیا جب ۱۸۷۱ء میں جنوبی جرمن ریاستوں نے شمالی ریاستوں کو اپنے ساتھ ملانے کی حمایت کر دی۔ یوں بسمارک شمالی اور جنوبی جرمن ریاستوں کے اتحاد کے بعد پورے ملک کا چانسلر (مارچ ۱۸۷۱ء سے مارچ ۱۸۹۰ء تک) بن گیا اور ساتھ پروشیا کا انتظام بھی اپنے ہاتھ میں رکھا۔ اس نئے جرمن ملک میں سے آسٹریا کے لوگوں کو نکال دیا گیا۔ ان کے جانے کے بعد پروشیا کو بھی جرمن ریاستوں میں شامل کرنے میں کوئی رکاوٹ نہ رہی۔

۱۸۷۱ء میں ہی یورپ کے براعظم میں جرمنی کے استحکام اور سیاسی مضبوطی کے لیے سفارت کاری کا ماہرانہ استعمال شروع ہوا یوں جرمنی بہت سے تنازعوں اور جنگ کے امکانات کے باوجود امن سے رہا۔ سفارت کاری کی یہ شاطرانہ چالیں ۲۰ سال تک کامیابی سے چلتی رہیں۔ بسمارک نے امن و امان کی بحالی اور جنگ کے امکانات کو ختم کرنے کے لیے ہر ممکن طریقہ اختیار کیا۔ بسمارک طبعتاً امن پسند تھا۔ اس نے یورپ کی کم از کم پانچ بڑی طاقتوں فرانس، روس، برطانیہ، اٹلی اور آسٹریا سے دوستانہ سفارت کاری قائم کی اور صلح و سلامتی کی طرف گامزن رہا۔ لیکن بعد میں فرانس میں قومیت پسندی اور جرمن فوبیا نے جنگ عظیم اول کی راہ ہموار کی۔

جرمن کی بہترین حکمت عملیوں کی وجہ سے اس کو "فولادی حکمران" (Iron Chancellor) کہا جانے لگا۔ جرمن ترقی کی راہوں پر تیزی سے گامزن رہا اور اس کی واحد وجہ ان کی خارجہ پالیسی اور دوسرے ممالک سے اتحاد قائم رکھنا ہی تھی۔ بسمارک کو نوآبادیاں بنانا پسند نہیں تھا لیکن اپنے ملک کے استحکام کے لیے جب اس کو سمندر پار کالونیاں بنانی پڑی تو اس نے اپنا فیصلہ بدل لیا۔ ۱۸۷۰ء سے ۱۸۸۰ء کے دو عشروں میں بسمارک نے جرمنی میں امن

قائم رکھنے کے لیے یورپی ممالک سے بہت پیچیدہ اور الجھے ہوئے معاملات بھی مذاکرات اور کانفرنسوں کے ایک طویل سلسلے کی مدد سے ہی حل کرنے میں کامیاب رہا۔

ملک میں اپنی حکمت عملی سے امن قائم کرنے میں کامیاب رہنے والا اور ملک کو فلاحی ریاست بنانے والا پہلا جدید حکمران بسمارک ہی تھا۔ اس زمانہ میں کمیونزم اور سوشلزم کے خیالات بہت زرخیز تھے اور ان کو دنیا تیزی سے قبول کر رہی تھی۔ بسمارک نے اپنے ملک میں مزدوروں اور مالکان کے درمیان امن قائم رکھنے کے لیے محنت کش طبقے کی حمایت کی۔ ۱۸۷۰ء میں بسمارک نے آزاد خیال جماعت کے ساتھ اتحاد کر لیا اور اس کو کیتھولک چرچ کے ساتھ لڑنا پڑا جس سے اس کی ساکھ کو خاصا نقصان پہنچا ساتھ ہی وہ یہ لڑائی بھی ہار گیا کیوں کہ کیتھولک چرچ نے ایک طاقت ور پارٹی کے ساتھ اتحاد قائم کیا اور زیادہ نشستیں حاصل کر لیں۔ بسمارک نے پھر اپنے آپ کو اس صورت حال سے نکالنے کی اور اپنی کھوئی ہوئی عزت بحال کرنے کی کوشش کی۔ لبرل جماعت کے ساتھ بنا ہوا اتحاد توڑ کر سینئر پارٹی کے ساتھ ہاتھ ملا لیا اور شوشلسٹ لوگوں کے خلاف محاذ کا آغاز کیا۔ بسمارک کو جمہوریت پر اعتماد نہ تھا اس نے مضبوط بیوروکریسی قائم کی۔ ولیم اوّل کے دور میں بسمارک نے مکمل طور پر ملک کے اندرونی اور خارجی معاملات سنبھالے لیکن ۱۸۹۰ء میں جب ولیم دوم نے قیصر جرمنی کا تخت سنبھالا تو بسمارک کو ہٹا دیا اس وقت بسمارک کی عمر پچھتر سال تھی اور وہ تقریباً ۲۸ برس تک وزارت عظمیٰ کے عہدے پر فائز رہا تھا۔

بسمارک بہت پر عزم، مضبوط، نڈر اور جنگجو راہنما تھا لیکن اس کے ساتھ اس میں نرمی، دلکشی اور ظرافت و طنز کی صلاحیت بھی موجود تھی۔ اس نے نہ صرف طویل مدت کی قومی اور بین الاقوامی نقطۂ نظر کے حامل فیصلے کرتا رہا بلکہ عارضی نوعیت اور مختصر مدت کے فوری اور عمدہ فیصلوں سے بھی مملکت کے پیچیدہ معاملات کو سلجھاتا رہا۔ مورخ اس کو "انقلابی محافظیت" (Revolutionary Conservatism) بھی کہتے ہیں۔

بسمارک جرمن قوم پرستوں کے لیے ہیرو کا درجہ رکھتا تھا۔ اس نے ریخ (Reich) کے بانی ہونے کا اعزاز حاصل کیا۔

عہدے سے معزولی کے بعد اپنی عمر کے آخری سال بسمارک نے اپنے گاؤں میں گزارے۔ ۱۸۹۶ء میں اس کی صحت خراب رہنے لگی۔ اس کے پاؤں کی حالت خراب ہو گئی لیکن اس نے علاج کروانے سے انکار کر دیا۔ نتیجتاً وہ چلنے پھرنے سے معذور ہو گیا۔ یوں دو ہی سال کے بعد ۳۰ جولائی ۱۸۹۸ء میں اس کا انتقال ہو گیا۔ لیکن وہ آج بھی جرمنوں کے دلوں میں زندہ ہے اور دنیا کے حکمرانوں کے لیے قابلِ تقلید نمونہ ہے۔

رابندر ناتھ ٹیگور(Rabindranath Tagore):

۷ مئی ۱۸۶۱ء کو ہندوستان کے شہر کلکتہ میں پیدا ہوئے۔ بنگالی زبان کے نوبل انعام یافتہ شاعر، فلسفی اور افسانہ و ناول نگار رابندر ناتھ ٹیگور کا اصل نام رویندر ناتھ ٹھاکر تھا، ٹیگور دراصل ٹھاکر کا بگاڑ ہے۔ آپ کالی داس کے بعد ہندوستان میں ادب کی عظیم شخصیت ہیں۔ آپ نے ابتدائی تعلیم کلکتہ میں ہی حاصل کی۔ ان کی پہلی کتاب صرف ۱۷ برس کی عمر میں منصہ شہود پر آئی۔ پھر قانون کی تعلیم حاصل کرنے کی خاطر ۱۸۷۸ء میں انگلستان گئے، ڈیڑھ سال بعد ڈگری لیے بغیر لوٹ آئے اور اپنے طور پر پڑھنے لکھنے اور اپنی شخصیت کو پروان چڑھانے میں مصروف ہو گئے۔ اس دوران میں کئی افسانے لکھے اور شاعری کی جانب بھی توجہ دی۔ ٹیگور نے زیادہ تر چیزیں بنگالی زبان میں لکھیں۔ ۱۹۰۱ء میں بولپور بنگال کے مقام پر شانتی نکیتن کے نام سے مشرقی اور مغربی فلسفے پر ایک نئے ڈھنگ کے مدرسہ کی بنیاد ڈالی، جس نے ۱۹۲۱ء میں یونیورسٹی کی شکل اختیار کی۔ شانتی نکیتن میں اپنی بنگالی تحریروں کا انگریزی میں ترجمہ کیا، جس کے باعث ان کی مقبولیت دوسرے ملکوں میں پھیل گئی۔ یورپ، جاپان، چین، روس، امریکا کا کئی بار سفر کیا۔ ۱۹۱۳ء میں ادب کے سلسلے میں ان کی گیتوں کی کتاب گیتان جلی کے انگریزی ترجمے پر نوبل پرائز ملا۔ ۱۹۱۵ء میں برطانوی حکومت ہند کی طرف سے ''سر'' کا خطاب دیا گیا۔ لیکن برطانوی راج میں پنجاب میں عوام پر تشدد کے خلاف احتجاج کے طور پر انہوں نے ''سر'' کا خطاب واپس کر دیا۔ ٹیگور نے اپنی زندگی کے آخری حصہ میں کم و بیش پوری متمدن دنیا کا دورہ کیا اور لیکچر بھی دیے۔ ۱۹۳۰ء میں ''انسان کا مذہب'' کے عنوان سے لندن میں کئی بلند پایہ خطبات ممالک اور نیویارک میں اپنی ان تصاویر کی نمائش کی۔ جو ۶۸ برس کی عمر کے بعد بنائی تھیں۔ تین ہزار گیت مختلف دھنوں میں ترتیب دیے۔ بے شمار نظمیں لکھیں، مختصر افسانے لکھے۔ چند ڈرامے بھی لکھے۔ ہندوستان کی کئی جامعات اور آکسفورڈ یونیورسٹی نے آپ کو ڈاکٹریٹ کی ڈگری دی۔ آپ کو بنگالی زبان کا شیکسپیئر بھی کہتے ہیں۔ آپ کو علامہ اقبال سے بھی لگاؤ تھا۔

۱۹۳۴ء کے بعد ٹیگور کی صحت خراب ہو گئی اور ۱۹۴۱ء کو یہ عظیم افسانہ نگار بمقام کلکتہ انتقال کر گئے۔

جارج لانس بری(George Lansbury):

جارج لانس بری برطانوی سیاست دان تھا جو انگلستان کے شہر سفولک(Suffollc) میں ۲۱فروری ۱۸۵۹ء میں پیدا ہوا۔اس نے ۱۹۳۲ء سے ۱۹۳۵ء کے مختصر عرصے کے لیے برطانوی مزدور پارٹی کی قیادت بھی کی۔وہ معاشرتی اصلاح کار تھا۔اس کی پارٹی جب برسراقتدار آئی تو اس نے معاشرتی قوانین میں اصلاح کی مہم چلائی۔اس نے عورتوں کے حقوق کے لیے آواز اٹھائی اس کے ساتھ ساتھ معاشرتی اونچ نیچ کے خلاف سب کے لیے انصاف مہیا کرنے کی کوشش کی اور مزدوروں کے معاوضہ میں اضافے کے لیے بھی جدوجہد کی۔لانس بری ابتدا میں کٹر انتہا پسند تھا لیکن ۱۸۹۰ء کے عشرے کے ابتدائی سالوں میں وہ سوشلسٹ بن گیا۔اس نے اپنے مقامی لوگوں کی خدمت کو اپنا شعار بنا لیا۔اس کی خدمت کی بنیاد اس کے عیسائی مذہبی عقائد کی روشنی میں تھی۔وہ آخر تک اس پر قائم رہا صرف کچھ عرصے کے لیے ہی اس کے اعتماد کی دیوار لرزی تھی۔

۱۹۱۰ء میں جب وہ پارلیمنٹ کا ممبر بنا تو اس نے خواتین کے مصائب کے خلاف احتجاجی طور پر استعفیٰ دے دیا جب کہ اس کی ممبر شپ کو ابھی محض دو ہی سال کا عرصہ گزرا تھا۔وہ عسکریت پسندی کا سخت مخالف تھا۔ملک میں ہتھیاروں میں اضافے کے بھی خلاف تھا۔

۱۹۱۲ء میں لانس بری نے ایک روزنامہ اخبار جاری کیا اور اس کے لیے ایڈیٹر کے فرائض سرانجام دیتا رہا۔ جنگ عظیم اول کے پورے عرصے کے دوران یہ اخبار جنگ بندی اور امن وامان کی بحالی پر اپنے مؤقف پر قائم رہا اور پھر ۱۹۱۷ء میں روسی انقلاب کی بھی حمایت کی۔اس طرح کی مصروفیات کی وجہ سے ۱۹۱۸ء کے انتخابات میں وہ ناکام رہا۔اس کے بعد وہ مقامی سطح کی سیاسی سرگرمیوں میں ہی مصروف رہا۔ ۱۹۲۱ء میں اس نے پوپلر شہر میں ٹیکس کے خلاف احتجاجی مہم چلائی اور اپنے ساتھی کونسلروں کے ہمراہ گرفتار ہو گیا۔ ۱۹۲۹ء سے ۱۹۳۱ء کے اس کی مزدور پارٹی جیت کر برسراقتدار آئی تو وہ پہلا کمشنر آف ورک(First Commissioner of works)بن گیا۔ ۱۹۳۱ء میں آنے والے معاشی اور سیاسی بحران کے بعد لانس بری نے اپنی جماعت کے قائد اور اس وقت کے وزیر اعظم رامزے میکڈونلڈ(Ramsay MacDonald)کی پیروی کرنا چھوڑ دیا لیکن پارٹی میں بدستور موجود رہا۔ ۱۹۳۱ء کے عام انتخابات میں کامیاب ہونے والا سب سے سینئر سیاست دان ہونے کے ناتے (اپنی پارٹی کی طرف سے) لانس بری مزدور پارٹی کا سربراہ بنا لیا گیا۔بعد ازاں اس کے خیالات، اسلحہ کی مخالفت اور امن پسندی کی وجہ سے پارٹی میں اس

کے اختلافات پیدا ہو گئے اور ۱۹۳۵ء میں وہ پارٹی قیادت سے مستعفی ہو گیا۔ آخری سالوں میں اس نے امریکہ اور یورپ کی کئی ملکوں میں سفر کیا تا کہ دنیا میں امن بحال ہو اور عسکریت پسندی کو ختم کیا جا سکے۔

۷ مئی ۱۹۴۰ء میں (۸۱) اکاسی برس کی عمر میں لندن میں اس کا انتقال ہوا۔ دنیا آج بھی اس کے خیالات کی قدر کرتی ہے۔

چارلس ڈارلنگ، پہلا بیرن (جسٹس) ڈارلنگ (Charles Darling, 1st Baron Darling):

انگریز وکیل، سیاست اور ہائی کورٹ کا جج چارلس ڈارلنگ ۱۸۴۹ء میں برطانیہ میں پیدا ہوا، ابتدائی تعلیم اچھے پرائیویٹ اداروں سے حاصل کی۔ ۱۹۷۴ء میں اس نے انگریزی بار میں شمولیت اختیار کر لی۔ ۱۸۸۵ء میں اس کو ملکہ کے مشیر کے طور پر ملازمت مل گئی۔ وہ ۱۸۸۸ء سے ۱۸۹۷ء تک قدامت پسند جماعت کے طرف سے پارلیمنٹ کا رکن رہا پھر "کوئین بنچ ڈویژن" (Queen's Bench Division) میں جج بن گیا۔

جج کے طور پر جسٹس ڈارلنگ نے بہت سے اہم کیسز کی سماعت کی۔ ڈارلنگ اپنی حسِ مزاح کی وجہ سے بھی بہت مشہور تھا۔ وہ عدالت میں بھی اپنی اس افتادِ طبع کے مظاہرے کرتا رہتا تھا۔ بارہا لوگوں نے اس کو سلک کے واسکٹ میں گھوڑے پر بیٹھ کر عدالت جاتے ہوئے بھی دیکھا۔ اس کی طبیعت کی جولانی ہمیں اس کے مضامین کے مجموعے میں بھی نظر آتی ہے جو "Scintillae Juries" کے نام سے کتابی صورت میں چھپے۔

۱۹۱۷ء میں ڈارلنگ Privy Council کا رکن تھا اور اس کی جوڈیشل کمیٹی میں شامل ہوا۔ ۱۹۲۳ء میں وہ بینچ "Bench" سے ریٹائر ہوا۔ وہ ہاؤس آف لارڈز کی قانونی بحثوں میں شامل رہا اور پیچیدہ معاملات میں اپنی رائے دیتا رہا۔ اس نے ۱۹۲۹ء میں شیر خوار بچوں کی زندگی بچانے کی قانون سازی میں بھی حصہ ڈالا۔ ۱۹۳۶ء میں جسٹس ڈارلنگ کا انتقال ہوا۔

سر جوزف آسٹن چیمبر لین(Sir Joseph Austen Chamberlain):

سر جوزف آسٹن چیمبر لین (۱۶اکتوبر ۱۸۶۳ء۔۱۶مارچ ۱۹۳۷ء) برطانوی ریاست کار تھے، جس کو ''ایمپائر بلڈر(Empire builder)'' بھی کہا جاتا ہے۔آپ نے ۱۸۹۲ء میں اپنی پینتالیس سالہ پارلیمانی زندگی کا آغاز کیااور ابتدا لبرل یونینسٹ پارٹی (Liberal Unionist Party)سے کی جو ۱۹۱۲ء میں کنزرویٹو پارٹی (Conservative Party)میں ضم ہو گئی۔۱۹۲۱ء۔۱۹۲۲ء میں آپ دارالعوام کے قائدِ ایوان(Leader of the House of Commons)بنے۔

۱۹۲۵ء میں جب آپ وزیرِ خارجہ تھے تو آپ نے آئرش فری اسٹیٹ کے معاہدے کی گفت وشنید میں مدد دی یوں فرانس اور جرمنی کے درمیان متوقع جنگ کا خطرہ ٹل گیا جس کی بنیاد پر آپ کو ۱۹۲۵ء میں امن کا نوبل پرائز ملا۔

شبا پرساد چیٹر جی(Shiba Prasad Chatterjec):

آپ ۱۹۰۳ء میں پیدا ہوئے۔چیٹر جی کو بھارت میں جغرافیہ کا باباآدم کہا جاتا ہے۔چیٹر جی نے ۱۹۲۶ء میں بنارس کی ہندو یونی ورسٹی سے جغرافیہ میں ماسٹرز کی ڈگری لی اور اعلیٰ تعلیم کے لیے فرانس اور انگلستان چلے گئے۔فرانس کے مشہور معروف جغرافیہ دان کے ساتھ چیٹر جی نے اپنا تحقیقی کام مکمل کیا جس پر آپ کو ڈی لٹ کی ڈگری ملی۔بعد ازاں لندن سے ایک ٹیچرز ڈپلومہ کیااور برطانوی اور فرانسیسی نظامِ تعلیم کا موازنہ کر کے علم التعلیم میں پی ایچ ڈی کیا۔ ۱۹۶۴ء سے ۱۹۶۸ء تک آپ جغرافیہ کی بین الاقوامی یونین کے صدر رہے۔

چیٹر جی نے ۱۹۳۶ء میں ہندوستان میں جغرافیہ کی سوسائٹی قائم کی، ہندوستان کا قومی اٹلس بنایااور جغرافیائی خطوں کو واضح کرنے کے لیے تھیم کے حساب سے نقشے بنانے کا ادارہ قائم کیا(Thematic Mapping Organisitor)۔اس کے علاوہ آپ نے بین الاقوامی جغرافیہ اور ہاتھ سے نقشے بنانے کے کام میں بھی حصہ لیا۔ ۱۹۸۹ء میں آپ کا انتقال ہوا۔

سر ونسٹن لیونارڈ پنسر چرچل(Sir Winston Leonard Pencer Churchill):

برطانوی سیاست دان، فوجی افسر اور مصنف ونسٹسن چرچل ۳۰ نومبر ۱۸۷۴ء میں انگلستان کے شہر آکسفورڈ شائر میں پیدا ہوا۔ دوسری عظیم جنگ کے زمانے میں چرچل برطانیہ کا وزیر اعظم (۱۰ مئی ۱۹۴۰ء - ۲۶ جولائی ۱۹۴۵ء) تھا اور اس جنگ میں برطانیہ کی فتح چرچل کے مرہون منت ہے۔

برطانوی پارلیمنٹ میں وہ قدامت پسند جماعت کے رکن کے طور پر آیا تھا۔ لیکن بعد ازاں (۱۹۰۴ء) میں وہ آزاد خیال جماعت میں شامل ہو گیا۔ نظریاتی طور پر چرچل اقتصادی آزاد خیال اور برطانوی سامراج کا حامی تھا۔

چرچل تعلیم حاصل کرنے کے بعد فوج میں شامل ہو گیا تھا اور برطانوی ہندوستان اور برطانیہ۔ سوڈان جنگ کے معاملات دیکھے۔ ان جنگوں میں اس نے ایک جنگجو صحافی کی سی خدمات سرانجام دیں۔ اپنے تجربات کو اس نے جب لکھا تو اس کی تحریروں اور خیالات کی دھوم مچ گئی۔ ۱۹۰۰ء میں وہ پارلیمنٹ کا ممبر منتخب ہوا بعد میں وہ قدامت پسندوں کو چھوڑ کر آزاد پسندوں کی جماعت میں شامل ہوا۔ آزاد پسند جماعت جب حکومت میں آئی تو چرچل نے کئی عہدوں پر یکے بعد دیگرے کام کیا مثلاً وہ تجارتی بورڈ کا صدر رہا، وزارت داخلہ کا سیکرٹری رہا اور شاہی نیوی کا سیاسی سربراہ اور حکومت کا مشیر رہا(First Lord of the Admiralty)۔ ۱۹۰۶ء سے ۱۹۱۴ء کے دور میں چرچل نے اپنی جماعت کی طرف سے فلاح و بہبود معاشرہ کی اصلاحی مہم کی سرکردگی کی۔ پہلی جنگ عظیم (جولائی ۱۹۱۴ء۔ نومبر ۱۹۱۸ء) کے دوران اس نے گلی پولی کی مہم کی نگرانی کی اس دوران جب چرچل نے محسوس کیا کہ حالات زیادہ خراب ہو رہے ہیں تو وہ حکومت کی ملازمت چھوڑ کر بری فوج میں شامل ہو گیا اور مغربی محاذ پر مصروف پیکار ہو گیا۔ ۱۹۱۷ء میں جب وہ واپس آیا تو اسے جنگ کے اس تجربے کی بنیاد پر جنگوں کے اثرات سے نمٹنے والے معاملات کو دیکھنے کی ذمہ داری سونپی گئی۔

اس کی کوششوں سے جنگ کا معاشی بحران کسی حد تک قابو میں آیا اور ۱۹۲۵ء میں پونڈ اسٹرلنگ اس قیمت پر مستحکم ہوا جو جنگ سے پہلے تھی۔ اس واقعہ کا برطانیہ کی معشیت پر بہت اچھا اثر پڑا اور افراطِ زر میں کمی آئی۔

۱۹۳۰ء کے عشرے میں چرچل نے نازی جرمنوں کے خطرے سے نمٹنے کے لیے نئے ہتھیار بنانے کا کام شروع کیا۔ دوسری جنگ عظیم کے دوران وہ شاہی نیوی میں سیاسی لارڈ اور ان معاملات پر حکومت کا مشیر تھا جب اس وقت کے وزیر اعظم چمبر لین نے وزارت عظمیٰ سے استعفیٰ (۱۹۴۰ء) دے دیا تو چرچل کو وزیر اعظم بنا دیا گیا۔ جنگ عظیم دوم کے دوران چرچل نے اتحادیوں کی جنگی کوششوں کی نگرانی کی جس سے برطانیہ کو فتح ہوئی۔ جنگ کے دوران اس کی ان قائدانہ صلاحیتوں کی بعد ازاں بہت تعریف ہوئی۔ گو کہ اس کے بہت سے فیصلے اختلافی نوعیت کے تھے جن

کا اثر ۱۹۹۵ء کے عام انتخابات میں چرچل کی جماعت کی شکست کی صورت میں نکلا تاہم حزب اختلاف کے قائد کے طور پر چرچل نے پھر اپنے اوپر عوام کا اعتماد بحال کیا اور ۱۹۵۱ء کے عام انتخابات میں وہ پھر سے وزیر اعظم منتخب ہو گیا۔ ۱۹۵۵ء میں خرابی صحت کے باعث اس نے وزارت عظمیٰ سے استعفیٰ دے دیا۔ تاہم ۱۹۶۵ء میں اپنی وفات تک وہ پارلیمنٹ کا ممبر رہا۔ اس کو سرکاری اعزاز کے ساتھ (۱۹۶۵ء) دفن کیا گیا۔ وہ بیسویں صدی کا سب سے مشہور اور بااثر شخص تھا۔ وہ برطانیہ کے علاوہ پوری مغربی دنیا میں مشہور ہوا اور پسندیدہ رہا۔ اس کو فاشزم کو شکست دینے والے عظیم جنگی راہنما کے طور پر بھی جانا جاتا ہے۔ اس کو جہاں اور بہت سے ایوارڈ ملے وہاں ادب میں نوبل پرائز بھی دیا گیا۔

سر فرانسس ڈریک (Sir Francis Drake):

یہ وہ پہلا انگریز ہے جس نے دنیا کے گرد بحری سفر مکمل کیا۔ ۱۵۴۰ء میں برطانیہ میں پیدا ہوا۔ بحری جہاز کا کپتان ہونے کے علاوہ وہ غلاموں کی تجارت کے کاروبار سے بھی منسلک تھا۔ بحریہ کا افسر بھی تھا اور الزبتھ کے دور میں مشہور مہم جو بھی۔ اس نے ایک ہی سفر میں دنیا کے گرد چکر لگایا۔ اس کا یہ سفر ۱۵۷۷ء سے ۱۵۸۰ء کے عرصے میں مکمل ہوا۔ اس نے کیلی فورنیا کے ساحل پر اتر کر برطانیہ کے لیے کیلی فورنیا کی اہمیت واضح کی اور مغرب کی طرف سے نیا راستہ ڈھونڈ کر بحر الکاہل عبور کیا۔ اسی نے امریکہ کے ساحلوں سے اسپین کے تنازعے کا آغاز کیا تھا۔ یہ مغربی جہاز رانوں کے لیے نیا علاقہ تھا اس لیے اس علاقے پر اس نے دعویٰ کیا۔

اس کے ان خدمات سے خوش ہو کر ملکہ نے اسے شاہی بحریہ میں شامل کر لیا۔ جب وہ وائس ایڈمرل تھا تو اس نے برطانیہ کی طرف سے اسپین کے خلاف جنگ میں حصہ لیا جو ۱۵۸۸ء میں ہوئی تھی۔ اس اسپین کی پورتو ریکو کی بندرگاہ میں داخل ہو کر ان کے تینتیس (۳۳) بحری جہاز تباہ کر دیے یوں وہ اس جنگ کا ہیرو بن گیا۔ اسپین کے لیے اب وہ ایک بحری قزاق کا درجہ رکھتا تھا وہاں کے بادشاہ فلپ دوم نے اسی کی گرفتاری پر بیس ہزار ڈک (۲۰۰۰۰) کا انعام مقرر کیا جو آج کی کرنسی میں ۸ ملین امریکی ڈالر کے قریب ہے۔

اٹھارہ سال کی عمر سے اس نے سمندری سفر کا جو آغاز کیا تھا وہ اس کی عمر کے پچاس برس گزر جانے کے بعد تک جاری تھا۔ اس نے ہسپانوی امریکہ میں شکست کھائی اور وہاں کے حالات خراب کرنے کا موجب بنا۔ اس پر ہسپانوی فوجیوں کی طرف حملہ بھی ہوا جس میں وہ بچ گیا۔ آخر اس نے ۱۵۹۶ء میں اسپین پر پھر سے چڑھائی کر دی لیکن چند ہی ہفتوں میں وہ ہیضہ کی طرح کے کسی مرض کا شکار ہو کر مر گیا۔ اس کی موت کے بعد برطانیہ نے اسپین سے اپنا

بحری بیڑا واپس بلا لیا۔ مرنے سے قبل اس کی فرمائش پر اس کو مکمل جنگجوؤں والا یونیفارم پہنایا گیا۔ اس کو سمندر میں دو بحری جہازوں کے ملبے کے بیچ کے علاقے میں دفن کیا گیا لیکن بعد میں اس کی باقیات کبھی نہیں ملیں۔

اس کے مرنے کے بعد بھی اس کو یاد رکھا گیا۔ آج تک برطانیہ میں بہت سی جگہوں کے نام اس کے نام پر رکھے گئے ہیں۔

جان ڈیوی زن راکافیلر (John Davison Rockefeller):

جان ڈیوی زن راک فیلر ۸ جولائی ۱۸۳۹ء کو امریکہ کے شہر نیویارک میں پیدا ہوا۔ وہ قدرتی تیل کے کاروبار سے منسلک تھا اور امیر ترین آدمی تھا۔ وہ انسان دوست صنعت کار تھا۔ وہ ایک بڑی فیملی میں پیدا ہوا جو آخر کار امریکہ کی ریاست اوہائیو میں رہائش پذیر ہوئی۔ ۱۶ سال کی عمر میں راک فیلر نے کتب فروش کی دکان پر کام کرنے کا آغاز کیا۔ ۲۰ سال کی عمر میں اپنے بھائی کے ساتھ مل کر ایک کاروباری آدمی کے ساتھ شراکت کر لی اور کاروبار کا آغاز کیا۔ جس میں راک فیلر اور اس کے بھائی کو کامیابی ہوئی۔ اس کے بعد دونوں نے مل کر ایک اور کاروبار میں شراکت شروع کی۔ ان کی توجہ قدرتی تیل کے کاروبار پر تھی۔ اس میں انھوں نے زمین سے تیل نکالنے کے بجائے اس کو صاف کرنے کی فیکٹری لگائی (ریفائنری)، ۱۸۶۷ء میں ان کا کاروبار اس قدر ترقی یافتہ ہو چکا تھا کہ آس پاس کی ساری ریفائنریاں ان کی کمپنی کی ملکیت بن چکی تھیں۔ ۱۸۷۰ء میں راک فیلر نے اپنی الگ کمپنی بنائی جس کا نام اس نے 'اسٹینڈرڈ آئل' رکھا اور اس کمپنی میں اپنے پرانے کاروباری شراکت داروں کو بھی شریک کر لیا۔ یہ کمپنی ۱۸۹۷ء تک راک فیلر کی سربراہی میں چلتی رہی۔

اس زمانے میں بجلی نہ ہونے کی وجہ سے سب لوگ مٹی کے تیل سے روشنی حاصل کرنے کا بندوبست کرتے تھے۔ اس کے علاوہ گاڑیاں بھی ایجاد ہو گئی تھیں جس کی وجہ سے پورے ملک میں قدرتی تیل اور گیسولین کی بہت مانگ تھی۔ اس کاروبار کی اس اہمیت کی وجہ سے راک فیلر امریکہ کے ۹۰% تیل کے کاروبار پر چھا چکا تھا۔ اس کے علاوہ تیل کو ملک کے دور دراز علاقوں میں نقل و حمل ممکن بنانے کے لیے راک فیلر نے ریل روڈ میں بھی سرمایہ کاری کی جس کی وجہ سے ذرائع آمد و رفت بہتر ہوئے۔ امریکی ریاستوں میں اسٹینڈرڈ آئل ایک بڑا ٹرسٹ تھا۔ راک فیلر نے پیٹرولیم انڈسٹری میں انقلابی اقدامات کیے اور جدید خطوط پر انسان دوستی کا مظاہرہ کیا۔ اس کی کمپنی نے امریکیوں کی وبائی بیماریوں کے تدارک کے لیے فنڈز فراہم کیے، تعلیمی ادارے قائم کیے، یونی ورسٹی قائم کی یا کئی یونی ورسٹیوں میں نادار

طالب علموں کی مدد کا بندوبست کیا۔ وہ مذہبی ذہنیت رکھتا تھا اس مناسبت سے اس نے بہت سے مذہبی اداروں کی امداد کا بھی بندوبست کیا۔

پہلی جنگ عظیم کے بعد راک فیلر نے بینکنگ، شپنگ، ریل روڈز اور دیگر صنعتوں کی ترقی کے لیے اہم کردار ادا کیا۔ وہ تاریخ کا امیر ترین آدمی تھی حتیٰ کہ زمانہ حاضر کے امراء مثلاً بل گیٹس اور شام والٹن بھی اس کے برابر نہیں۔

۲۳ مئی ۱۹۳۷ء میں (۹۷) ستانوے برس کی عمر میں راک فیلر کا انتقال ہوا۔

رضا شاہ پہلوی (Reza Shah Pahlavi):

شاہ ایران، اصل نام رضا خان، سپاہی کے بیٹے تھے، ۱۸۷۷ء میں پیدا ہوئے۔ معمولی تعلیم حاصل کی۔ نوجوانی میں فوج میں بھرتی ہو گئے اور جلد ہی اعلیٰ عہدے پر فائز ہو گئے۔ ۱۹۲۱ء میں حکومت کا تختہ الٹ دیا اور ۱۹۲۳ء میں وزیراعظم کا عہدہ خود سنبھال لیا۔ انھوں نے فارس کو ایران کا نام دیا۔ ۱۹۲۵ء میں خاندان قاجار خاندان کے آخری بادشاہ احمد شاہ قاجار کو معزول کر کے خود بادشاہ بن گئے اور رضا شاہ پہلوی کا لقب اختیار کیا۔ انھوں نے فوج اور ملکی نظم و نسق میں اصلاحات کیں، بیرونی ممالک کی مراعات منسوخ کر دیں اور ایران کو خارجی اثر و رسوخ سے پاک کر دیا۔ ان کے عہد میں ٹرانس ایرانین ریلوے کا اجرا ہوا اور تہران یونیورسٹی قائم ہوئی۔ دوسری عالمی جنگ میں ایران نے جرمنی کے ساتھ دوستانہ تعلقات قائم رکھے۔ اس پر برطانوی اور روسی افواج ایران میں داخل ہو گئیں۔ انگریزوں نے رضا شاہ کو تخت چھوڑنے اور اپنے بیٹے محمد رضا شاہ پہلوی کو حکومت سونپنے پر مجبور کیا۔ ۱۹۴۱ء میں رضا شاہ جنوبی افریقہ چلے گئے اور ۱۹۴۴ء میں وہیں وفات پائی۔

سروجنی نائیڈو (Sarajini Naidu):

سروجنی نائیڈو ہندوستانی حریت پسند، سماجی راہنما اور شاعرہ تھیں۔ ۱۳ فروری ۱۹۷۹ء کو حیدر آباد دکن میں پیدا ہوئیں۔ وہ بنگالی ہندو خاندان میں پیدا ہوئیں۔ انھوں نے چھٹائی میں تعلیم حاصل کی اور اعلیٰ تعلیم کے لیے لندن اور کیمبرج چلی گئیں۔

نائیڈو نے ۱۹۰۵ء میں اپنے سیاسی سفر کا آغاز کیا، ہندوستان فوجی تحریک میں شامل ہوئیں اور تقسیم بنگال کے لیے عملی میدان میں کوششیں کیں۔

وہ سماجی کارکن اور مصلح تھیں۔ ۱۹۰۵ء سے ۱۹۱۵ء کے دوران آپ نے معاشرتی برائیوں کو ختم کرنے کی آگاہی دینے، خواتین کے حقوق کو تحفظ دینے اور ان کو مضبوط بنانے اور ہندوستانیوں میں جذبہ قومیت پیدا کرنے کے لیے پورے ہندوستان کی کئی ریاستوں میں سفر کیا اور تقاریر کیں۔

۱۹۲۵ء میں انڈین نیشنل کانگریس کے سالانہ جلسے کی صدارت کی۔ ۱۹۲۹ء میں نائیڈو نے جنوبی افریقہ میں شمالی افریکی انڈینی کانگریس کی صدارت کی۔ ہندوستان میں طاعون کے خلاف کوششوں کو سراہتے ہوئے برطانوی حکومت نے سروجنی نائیڈو کو ''قیصر ہند ایوارڈ'' دیا۔ ۱۹۳۱ء میں گاندھی جی کے ساتھ دوسری گول میز کانفرنس میں شریک ہوئیں۔ ''سالٹ مارچ'' میں بھی حصہ لیا اور گاندھی جی کے ساتھ جیل گئیں۔ سول نافرمانی کی تحریک میں بھی نائیڈو نے اہم کردار ادا کیا۔ ۱۹۴۲ء کی ہندوستان چھوڑو تحریک میں بھی نائیڈو نے بڑھ چڑھ کر حصہ لیا جس کی پاداش میں آپ کو جیل بھی جانا پڑا۔ نائیڈو کو ہندوستان کی بلبل بھی کہا جاتا ہے۔ انھوں نے ۱۲ برس کی عمر سے لکھنا شروع کیا۔ فارسی میں نائیڈو نے مہر میز ڈرامہ لکھا جس سے حیدرآباد کے نواب صاحب بہت متاثر ہوئے۔

نائیڈو تقسیم ہند کے بعد بھارت کے متحد صوبوں کی گورنر (۱۵ اگست ۱۹۹۸ء۔ ۲ مارچ ۱۹۴۹ء) بھی رہیں۔ حرکت قلب بند ہو جانے کی وجہ سے ۲ مارچ ۱۹۴۹ء میں سروجی نائیڈو چل بسیں۔

ان کے بارے میں جناب نصیرالدین ہاشمی اپنی کتاب حیدر آباد کی نسوانی دنیا میں کچھ اس طرح رقم طراز ہیں:

"بلبلِ دکن، مسز سروجنی نائیڈو کی شخصیت کسی تعارف کی محتاج نہیں ہے، مسز سروجنی نائیڈو کے والد ڈاکٹر رگھوناتھ چٹوپادیا بنگال کے باشندے تھے۔ نواب مختار الملک اول کے زمانہ یعنی ۱۸۷۷ء میں حیدرآباد آئے، حیدرآباد کالج کے پرنسپل بنے۔ اس کے بعد نظام کالج میں پروفیسر کیمیا کی حیثیت سے برسوں سرکاری خدمت پر مامور رہے۔ ڈاکٹر صاحب کو حیدرآباد کی ترقی سے خاصی دلچسپی تھی۔ بیسویں صدی کے ابتدائی عشرہ سے ہر علمی تحریک میں ڈاکٹر صاحب کا عملی حصہ ہوتا تھا۔ حیدرآباد میں مدرسہ نسواں قائم کرنے کے وہ بانی تھے۔

۱۸۷۹ء میں مسز سروجنی نائیڈو کی ولادت حیدرآباد میں ہوئی اور ابتدائی تعلیم و تربیت بھی یہاں ہی ہوئی۔ اس کے بعد یورپ گئیں اور مدینہ العلم، اکسفورڈ میں شریک ہوئیں۔ اسی مقام سے آپ کی شاعری کا آغاز ہوا۔ ۱۸۹۸ء میں آپ کی شادی مدراس کے ڈاکٹر نائیڈو سے ہوئی۔ مسز سروجنی کا تعارف دو حیثیت سے کرایا جاسکتا ہے، ادیبہ اور سیاسی رہنما۔

جیسا کہ تذکرہ کیا گیا ہے آپ کی شاعری کا آغاز انگلستان سے ہوا اور پھر آپ ایک کہنہ مشق شاعرہ بن گئیں۔ آپ کی نظموں کے تین مجموعے شائع ہو چکے ہیں، 'طلائی آستانہ'، 'طائرِ وقت' اور 'شکستہ پر'۔

ان نظموں کی خاص خصوصیت یہ ہے کہ ان کے ذریعہ مشرقی خیالات، مشرقی جذبات کا مغربی لباس اور مغربی رنگ میں اظہار ہوتا ہے۔ کبھی آپ کے مغربی مے کدہ میں شیراز کی مے دوآتشہ جھلک دیتی ہے۔ آپ کی نظموں میں حب وطنی، انسانی ہمدردی، شفقتِ مادری، اور دردِ قومی کے ایسے ایسے انمول نگینے نظر آتے ہیں جن کی درخشانی اور تابناکی دیکھنے والوں کو مستجب و متحیر کر دیتی ہے۔ ان نظموں میں ایک طرف موذن کی اذان، پجاری کی بھجن کا ترانہ گایا گیا ہے۔ تو دوسری طرف کہاروں کے گانے، پالکی بردار کے گیت، فقیر کی صدا، نترہ بیچنے والی کی آواز کو بھی لطیف اور پاکیزہ مضمون کی صورت میں بدل دیا ہے۔

شاعری کی طرح آپ کی نثر بھی فصاحت و بلاغت آمیز ہوتی ہے۔ اس کی روانی، رنگینی اور خیالات کی ندرت قابلِ داد ہوتی ہے۔

مسز سروجنی کو بحیثیت مقررہ پیش کرنا ضروری ہے۔ آپ نہ صرف ایک جادو بیان شاعرہ ہیں، بلکہ فصیح و بلیغ مقررہ بھی ہیں۔ آپ تقریر نہیں کرتیں بلکہ روانی، تسلسل اور زورِ بیان کا دریا بہادیتی ہیں۔ الفاظ کی آمد، بیان کی سلاست آواز کا ترنم ایک سیلاب ہوتا تھا جو دلوں میں طوفان برپا کر دیتا ہے۔ انگریزی خطابت کے پورے گر آپ کو معلوم ہیں آپ صرف حیدر آباد ہی کو نہیں بلکہ سارے ہندوستان کی ایسی خاتون ہیں جنھوں نے امریکہ اور انگلستان میں تقریر کر کے اہل زبان سے اپنا لوہا منوا لیا ہے۔ اس بلبل دکن کی خوش نوائی، اور جادو بیانی نے تحسین اور آفرین کے صدہا تمغے حاصل کیے ہیں۔ مسز سروجنی کی تقریر ایسی موثر اور پر اثر ہوتی ہے کہ جو اصحاب انگریزی سے واقف نہیں ہوتے ان پر بھی آپ کی روانی اور اسلوب بیان کا خاص اثر ہوتا ہے۔ آپ کبھی کبھی اردو میں بھی تقریر کرتی ہیں جو دلچسپی میں انگریزی سے کم نہیں ہوتی۔

مسز سروجنی کے سیاسی خدمات اظہر من الشمس ہیں۔ آپ کل ہند کانگریس کی رواجِ رواں ہیں، ان کی صدارت کر چکی ہیں۔ عرصہ دراز سے اس کی انتظامی کمیٹی کی رکن ہیں۔ کئی مرتبہ سیاسی قیدی کی حیثیت سے اسیرِ فرنگ ہو چکی ہیں۔ آپ کا مسلک یہ ہے کہ ہندو اور مسلم باہم اتفاق کریں اور اس اتحاد و اتفاق سے ہندوستان کی حکومت کی جائے۔

مسز سروجنی کو عورتوں کی سماجی اور معاشرتی ترقی سے بھی دلچسپی ہے، وہ نہ صرف عورتوں کو گھر کی چار

دیواری کے اندر آزاد دیکھنی کی متمنی ہیں بلکہ حکومت میں حصہ دار، سیاست میں دخیل ہونے کی آرزو رکھتی ہیں اور اسی کی تکمیل کے لیے جدوجہد کرتی ہیں۔

آپ کی سیر وسیاحت مہمان نوازی وغیرہ کا بڑا شوق ہے اور دنیا کی بڑی بڑی ہستیوں کی مہمان نوازی کا امتیاز حاصل ہے۔[481]

سقراط(Socrates):

کلاسیکی یونانی فلاسفر سقراط قریباً ۴۷۰ ق م میں یونان کے شہر ایتھنز(Athens) میں پیدا ہوا۔ سقراط کو مغربی فلسفے کا جدّ امجد مانا جاتا ہے۔ اخلاقیات کے شعبے کے تمام بنیادی نقطے سقراط کے فلسفے سے ہی نکالے گئے ہیں۔ سقراط نے اپنے خیالات کو لکھنے پر کوئی توجہ نہیں دی تھی۔ آج کی دنیا اس کے خیالات سے محض اس لیے واقف ہے کہ اس کے مرنے کے بعد اس کے ہونہار شاگردوں نے اس کے خیالات کو صفحہ قرطاس پر منتقل کیا۔ یہی وجہ ہے کہ بعض اوقات اس کے فلسفے میں تضادات بھی نظر آتے ہیں۔ اس طرح کے تضادات اور تضاد کو ''مسئلہ سقراط(Socratic Problem) کہا جاتا ہے۔

وہ محب الوطنی تھا، اس نے اپنے زمانے میں یونان کی طرف سے جنگیں بھی لڑیں۔ وہ استغراق کے عالم میں رہتا تھا۔ اس کو اپنے گھر اور خاندان سے زیادہ وابستگی نہ تھی۔ وہ شخصی لحاظ سے عمدہ انسان تھا، بلند اخلاقی خصائل، حق پرست اور انصاف پسند تھا۔ ابتدا میں اس کو فلسفہ کی مبادیات اور متداولِ فلاسفہ میں دلچسپی تھی اور طبیعی فلسفہ میں لگاؤ رکھتا تھا بعد ازاں وہ انسان کے لیے زندگی گزارنے کی بہترین روش کے سراغ میں مصروف رہا۔ سقراط نے طریقہ تعلیم میں نئی راہ نکالی۔ وہ سوالات کے ذریعے اخلاقی نتائج پیدا کرتا تھا اور طالب علم کو علم کی کھوج میں اس کے اپنے ذہن کے یہاں گوشوں کی سیر کرواتا اور تاریک گوشوں کو منور کرتا۔ اپنی بحث میں دلائل اور منطق سے کام لیتا تھا۔

سقراط کے بارے میں تاریخ میں زیادہ معلومات نہیں ملتیں تاہم یہ ضرور معلوم ہوا ہے کہ وہ بچپن سے ہی بہت ذہین تھا اور تخلیقی صلاحیتوں کا مالک تھا۔ سقراط نے ہنر، فن اور تخلیق کے موضوعات پر بحث کی۔ افلاطون نے اس کے نظریات قلم بند کیے جن سے اس کے کئی نظریات سے آگاہی ہوتی ہے۔

استغراق اور غور وفکر کی وجہ سے سقراط پر ایک غیر معمولی کیفیت طاری ہو جایا کرتی تھی جس کو اس کے شاگرد الہامی اور دیومالائی گردانتے تھے۔ لیکن اخلاقی موضوعات اور استاد کی عظمت کے موضوعات پر سوچتے سوچتے سقراط نے آخر عمر میں دیوتاؤں کے وجود سے انکار کر دیا تھا جس کی پاداش میں اس کو موت کی سزا سنائی گئی اور اس کو اس

مقصد کے لیے زہر کا پیالہ پینا پڑا۔اس کی موت کے مرحلے کو بھی اس کے شاگردوں نے اپنی تحریروں میں تفصیل سے بیان کیا ہے۔

اکہتر (۷۱) سال کی عمر میں قریباً ۳۹۹ق م میں سقراط کا انتقال ہوا لیکن آج تک دنیائے فلسفہ پر اس کے اثرات باقی ہیں۔

کاسٹ ہینرک بیکر (Cast Heinrich Becker):

سیاست دان، مشرقی علوم اور زبانوں کا ماہر بیکر ۱۲ اپریل ۱۸۷۶ء کو جرمنی میں پیدا ہوا۔ وہ پروشیا میں وزیر ثقافت کے طور پر بھی خدمات سرانجام دیتا رہا۔اس نے "معاصر مشرقِ وسطیٰ" کا مضمون متعارف کروایا اور ویمار میں اعلیٰ تعلیم کے شعبے میں اصلاحات کیں۔

وہ ایمسٹرڈیم میں پیدا ہوا تھا۔ اس نے ہائیڈل برگ، برلن اور لوسین کی یونیورسٹیوں سے تعلیم حاصل کی۔ اس نے ۱۸۹۹ء میں ڈاکٹریٹ مکمل کیا اور اس سے قبل وہ اسپین، سوڈان، یونان اور ترکی کی سیاحت کر چکا تھا۔

۱۹۰۲ء میں بیکر ہائیڈل برگ یونی ورسٹی میں فلولوجی (زبان کے زبانی اور تاریخی ماخذات کا علم) پڑھانے پر مامور ہوا۔اسی زمانے میں اس کی ملاقات میکس ویبر (Maximilian Karl Emil Weber) سے ہوئی جو جرمنی کا بڑا فلاسفر، سیاسی معشیت کا ماہر اور ماہر عمرانیات تھا۔ ۱۹۰۸ء میں بیکر پروفیسر بن گیا اور ایک نئے ادارے کلونیل انسٹی ٹیوٹ (Kolonialinstitue) میں ''مشرق کی تاریخ و ثقافت'' کا پروفیسر بن گیا اور ہیم برگ (Hamburg) میں اسی شعبے کے لیے سیمینار ڈائریکٹر بنا۔ ۱۹۱۰ء میں اس نے ''ڈیر اسلام'' (Der Islam) کے نام سے مشرقِ وسطیٰ کی تاریخ اور ثقافت پر جریدہ نکالنا شروع کیا اور اس کا پہلا صدر بنا۔ ۱۹۱۳ء میں اسے بون یونی ورسٹی کی طرف سے ''مشرقی فلولوجی'' (Oriental Philology) کے پروفیسر کی ملازمت کی پیشکش ہوئی جسے اس نے قبول کر لیا۔ پہلی جنگ عظیم (۲۸ جولائی ۱۹۱۴ء سے ۱۱ نومبر ۱۹۱۸ء) کے دوران بیکر نے پروشیا میں ثقافت کے وزیر کے طور پر کام کرنے کا آغاز کیا۔ ۱۰ فروری ۱۹۳۳ء میں برلن میں ہی بیکر کا انتقال ہوا۔اس کی تصانیف میں سے چند درج ذیل ہیں:

۱۔ *Ibn Gauzi's Manaqib Omar Ibn' Abdelaziz (Dissertation,* ۱۸۹۹ء ابن جوزی کی ''مناقب عمر بن العزیز'' پر مقالہ لکھا)

۲۔ *Christentum und Islam* (1907) ''عیسائیت اور اسلام''

۳۔ *Beitrage zur Geschichte Agyptens unter dem Islam* (2 vols., 1902- 1903)(مصر کی تاریخ میں اسلام کے دور کی شراکت)

۴۔ *Papyri Schott-Reinhardt: Veroffentlichungen aus der Heidelberger Papyrus- Sammlung*, Vol. 1 (1906)ہائیڈل برگ سے ۱۹۰۶ء میں چھپی۔

۵۔ (1906) *Der Kanzel im Kultus des alten Islam* (قدیم اسلامی ثقافت میں خطبہ گاہ/منبر)

۶۔ (1910) *L'Islam et la Colonisation de l'Afrique* (اسلام اور افریقہ کی نوآباد کاری)

۷۔ (1919) *Gedanken zur Hochschulreform* (یونی ورسٹی میں اصلاحات کے بارے میں خیال)

۸۔ (1919) *Kulturpolitische Aufgaben des Reichs* (نازی کنٹرول کے زمانے کی ثقافتی پالیسی کے اقدامات)

۹۔ (1924) *Kant und die Bildungskrise der Gegenwart* (کانٹ اور موجود تعلیمی بحران)

۱۰۔ *Islamstudien: Vom Werden und Wesen der islamischen Welt* (2 vols., 1924- 1932)(اسلام کا مطالعہ: اسلامی دنیا کا قیام اور خصوصیات)

۱۱۔ (1925) *Vom Wesen der deutschen Universitaet* (جرمنی یونی ورسٹی کی نوعیت پر)

۱۲۔(1925) *Die preussische Kunstpolitik und der Fall Schilling* (پروشیا کے آرٹ کی پالیسی اور کرنسی کا معاملہ)

۱۳۔ *Die Paedagogische Akademie im Aufbau unseres nationalen Bildungswesens* (1926)(ہمارے قومی تعلیمی نظام کی تعمیر میں ہیڈا گوجیش اکیڈمی کا کردار)

۱۴۔(1927) *Zu Beethovens 100. Todestag* (موسیقار بیتھاوفن: 1770-1827 Ludwing van Becthoven) کی سوویں (100th) برسی شاہ ایڈورڈ ہفتم (King Albert Edward VII):

برطانیہ عظمیٰ، آئر لینڈ اور ہندوستان کے بادشاہ ایڈورڈ ہفتم ۹ نومبر ۱۸۴۱ء کو لندن میں پیدا ہوئے۔ ملکہ وکٹوریہ اور پرنس البرٹ کے سب سے بڑے بیٹے تھے۔ والدین کو معلوم تھا کہ ان کے گھر میں مستقبل کا بادشاہ پیدا ہوا ہے اس لیے ان کی تعلیم کا خصوصی بندوبست کیا گیا۔ اہم مضامین پڑھانے کے لیے ملک کے قابل اساتذہ آیا کرتے تھے لیکن بچپن میں ایڈورڈ نے تعلیم میں زیادہ دلچسپی کا مظاہرہ نہیں کیا جس سے ان کے والدین کی توقعات مجروح ہوئیں تاہم بعد ازاں ایڈورڈ نے تعلیم میں عمدہ کارکردگی کا مظاہرہ کیا خاص طور پر تاریخ کے مضمون میں ان کی دلچسپی اور وسیع معلومات عمر بھر ان کے کام آئیں۔

نوجوانی کے دور میں ایڈورڈ نے معاشرتی اور سیاسی نوعیت کی سرگرمیاں شروع کر دی تھیں۔ اس حوالے سے ۱۸۶۰ء میں ان کا دورۂ امریکہ بہت مثبت اثرات کا حامل رہا۔ اس دور میں ایڈورڈ نے دنیا کے بہت سے ملکوں کے دورے کیے اور بہت سے مقتدر لوگوں سے ملاقاتیں کیں جنہوں نے اُن کی شخصیت پر گہرے نقوش چھوڑے۔

ایڈورڈ کی شادی شہزادی الیگزنڈرا آف ڈنمارک سے ۱۸۶۳ء میں ہوئی۔ اس وقت ایڈورڈ کی عمر ۲۱ سال اور الیگزنڈرا ۱۸ برس کی تھی۔ شادی سے پہلے بھی اور بعد میں بھی ایڈورڈ کی دلچسپی مختلف شعبوں سے تعلق رکھنے والی خواتین میں رہی۔ اسی طرح کے کچھ واقعات کے بعد ان کے والد شہزادہ البرٹ کا ۱۸۶۱ء میں انتقال ہوا اور ان کی ماں ملکہ وکٹوریہ اپنے بیٹے سے نالاں رہنے لگیں۔

والد کے انتقال کے بعد ایڈورڈ نے ملکی معاملات میں دلچسپی کا مظاہرہ کیا تو ملکہ نے بہت سے معاملات میں اختلاف کیا۔ تاہم ایڈورڈ نے برطانیہ کی سیاسی سرگرمیوں میں شرکت جاری رکھی۔ اس حوالے سے انہوں نے بہت سے علاقوں کا دورہ کیا ترقیاتی منصوبے شروع کروائے، دوسرے ملکوں کے سربراہوں سے ملاقات اور اطراف و جوانب کے سیاحتی دورے بھی جاری رکھے۔ ۱۸۷۶ء میں ایڈورڈ نے شہزادے اور ولی عہد کے طور پر ہندوستان کا بھی دورہ کیا۔ یہاں برطانوی عہدے داروں کا مقامی لوگوں کے ساتھ متعصبانہ اور منافرت پہ مبنی سلوک ان کو پسند نہیں آیا۔ اس پر انہوں نے سلطنت کو خط لکھ کر احتجاج بھی کیا۔ اس کامیاب دورے کے بعد ملکہ وکٹوریہ نے ملکہ ہند کا خطاب اپنایا۔

۱۹۰۱ء میں ملکہ وکٹوریہ کے انتقال کے بعد البرٹ ایڈورڈ نے تخت سنبھالا اور ایڈورڈ ہفتم کا لقب اختیار کیا۔ اپنے دس سالہ دور سلطنت میں شاہ ایڈورڈ نے عوام کی فلاح و بہبود، خارجہ پالیسی اور آئینی اصلاحات جیسے معالات میں عمدہ کارکردگی کا مظاہرہ کیا۔ انہوں نے شاہی تحریر کو جدید خطوط پر استوار کیا۔ برطانیہ کی فوج کی تنظیم نو کی، شاہی تقریبات میں عوام کی شرکت کو یقینی بنانے کے لیے عملی اقدامات اٹھائے۔ یورپ کے دیگر ممالک خصوصاً فرانس کے ساتھ بہترین سیاسی و سفارتی تعلقات قائم کیے، شاہ ایڈورڈ کی قیادت میں برطانیہ نے سائنس اور ٹیکنالوجی کے دور میں قدم رکھا۔ شاہ ایڈورڈ کا ۱۹۱۰ء میں کثرت سگریٹ نوشی سے ہونے والے امراض کے باعث انتقال ہوا۔ ان کے جنازے میں بہت بڑی تعداد میں لوگوں نے شرکت کی۔ ان کو سینٹ جارج چیپل (ونڈسر کاسل) میں دفن کیا گیا۔

جارج فیڈرک ارنسٹ البرٹ (شاہ جارج پنجم) George Frederick Ernest Albert):

شاہ جارج پنجم تین جون ۱۸٦۵ء کو لندن میں ملکہ وکٹوریہ کے دور میں پیدا ہوا جو کہ جارج پنجم کی دادی تھیں۔ وکٹوریہ کے بعد ان کا جو بیٹا بادشاہ بنا وہ جارج پنجم کا باپ تھا جس نے بادشاہ بن کر ایڈورڈ ہفتم کا لقب اختیار کیا تھا۔ جارج پنجم کا بڑا بھائی شہزادہ البرٹ وکٹر، ڈیوک آف کلارینس اینڈ ایون ڈیل ولی عہد تھا لیکن وہ بادشاہ نہ بن سکا کیوں کہ محض اٹھائیس (۲۸) برس کی عمر میں نمونیا سے ۱۸۹۲ء میں اس کا انتقال ہو گیا تھا۔ اس وقت جارج شاہی بحریہ میں خدمات سرانجام دے رہا تھا۔ ۱۸۷۷ء سے ۱۸۹۱ء تک وہ شاہی بحریہ میں رہا، لیکن بھائی کی ناگہانی موت کے بعد جب وہ ولی عہد بن گیا تو اس نے یہ ذمہ داری چھوڑ دی۔ ملکہ وکٹوریہ کی وفات کے بعد اس کا باپ ایڈورڈ ہفتم کے لقب سے بادشاہ بنا اور اس وقت جارج کو ویلز کا شہزادہ بنایا گیا۔ ۱۹۱۰ء میں ایڈورڈ ہفتم کی وفات کے بعد جارج پنجم بادشاہ بن گیا۔

جارج پنجم کا دور سیاسی لحاظ سے افراتفری کا دور تھا اور سیاسی منظر نامہ بھی اسی دور میں تیزی سے بدلا، کیوں کہ اس کے دور میں کئی سیاسی نظریات دنیا پہ چھائے ہوئے تھے مثلاً سوشلزم، کمیونزم، فاشزم وغیرہ۔ اس کے علاوہ آئرلینڈ میں جمہوری حکومت کی تحریک اور ادھر ہندوستان میں انگریزوں سے آزادی کی تحریک بھی زوروں پر تھی۔ ۱۹۱۱ء میں نئے پارلیمانی ایکٹ کے ذریعے پارلیمنٹ کے اختیارات وسیع کیے گئے۔ ۱۹۱۴ء میں پہلی جنگِ عظیم کا دور بھی جارج پنجم کے لیے آزمائش کا باعث تھا۔ اس کے کزن نکولس دوم آف رشیا (Nicholas II of Russia) اور قیصر ویلہم دوم آف جرمنی (Kaiser Wilhelm II of Germany) کو شکست کا منہ دیکھنا پڑا، جب کہ برطانوی سلطنت کو وہ وسعت نصیب ہوئی جو نہ پہلے کبھی تھی اور نہ بعد میں نصیب ہوئی۔ جنگِ عظیم اوّل کے دوران

ہی ۱۹۱۷ء میں جارج پنجم کو کئی اور خطوں اور ملکوں کے شہنشاہ کا درجہ حاصل ہوا۔ جارج کو سگریٹ نوشی کی عادت تھی جس کی وجہ سے اس کو سانس کے نظام میں خرابی کا سامنا رہتا تھا۔ یہی بیماری اس کے لیے جان لیوا ثابت ہوئی۔ ۲۰ جنوری ۱۹۳۶ء میں ستر (۷۰) سال کی عمر میں اس کا انتقال ہوا اور اسے سینٹ جارج چیپل (ونڈسر کاسل) میں دفن کیا گیا۔

البرٹ فیڈرک آرتھر جارج (شاہ جارج ششم): (Albert Frederick Arthur George):

شاہ جارج ششم کو بادشاہ بننے سے پہلے البرٹ جب کہ خاندان کے لوگ برٹی کہہ کر پکارتے تھے۔ شاہ جارج ششم وکٹوریہ کے دور میں پیدا ہوا۔ شاہ جارج پنجم کا دوسرا بیٹا ہونے کی وجہ سے اسے توقع نہ تھی کہ وہ بادشاہ بن جائے گا اور تخت کا وارث ہوگا۔ اس نے اپنی ابتدائی عمر اپنے بڑے بھائی ایڈورڈ کے زیر سایہ بسر کی۔ نوجوانی کے زمانے میں بحریہ کے کالج میں گیا اور بعد ازاں شاہی بحریہ اور شاہی فضائیہ میں جنگِ عظیم اوّل میں خدمات سرانجام دیں۔ ۱۹۲۰ء میں وہ ڈیوک آف یارک (Duke of York) بنا۔ ۱۹۲۳ء میں اس کی شادی لیڈی ایلزبتھ اینجلا مارگریٹ بوزلیون سے ہوئی۔ ان کی دو بیٹیاں ہوئیں جن کے نام ایلزبتھ اور مارگریٹ رکھے گئے تھے۔

شاہ جارج کو ہکلانے کا مرض لاحق تھا، جس کے علاج کے لیے ۱۹۲۰ء کے عشرے میں خاصی کوششیں ہوئیں لیکن کوئی کوشش کامیاب نہ رہی۔ ۱۹۳۶ء میں جب البرٹ کے والد کا انتقال ہوا تو اس کے بڑے بھائی ایڈورڈ ہشتم کے لقب سے تخت نشین ہوئے تاہم اسی سال بادشاہ وقت ایڈورڈ ہشتم کے بارے میں یہ خبر منظر عام پر آگئی کہ وہ امریکہ کی ایک طلاق یافتہ عورت سے شادی کرنا چاہتے ہیں۔

اس وقت کے برطانوی وزیراعظم سٹینلے بالڈوِن نے ان کو اس شادی سے باز رہنے اور تخت سنبھالنے کا مشورہ دیا اور سمجھایا کہ سیاسی قوانین اور مذہبی حدود و قیود ان کو ایک طلاق یافتہ امریکی عورت سے شادی کی اجازت نہیں دیتے۔ لیکن ایڈورڈ ہشتم نے والیس سمپسن (Socialite Wallis Simpson) سے شادی کی خاطر تخت و تاج کو ٹھکرا دیا اور البرٹ نے ونڈسر ہاؤس (House of Windsor) کے تیسرے بادشاہ کے طور پر تخت سنبھال لیا۔

جارج ششم کے دور میں برطانوی سلطنت کی تحلیل اور دولت مشترکہ ممالک میں نئے علاقوں کے اخراج کی رفتار بہت تیز رہی۔ جس دن وہ تخت نشیں ہوا، اسی دن ریاست کی پارلیمان نے اپنے آئین میں تبدیلی کرکے آئین سے

بادشاہ کا براہ راست تذکرہ ختم کر دیا۔ اسی سال ایک نیا آئرش آئین بنا اور ریاست کا نام آئرلینڈ قرار دے کر صدارتی دفتر قائم کر دیا گیا۔ ۱۹۳۹ء سے سلطنت اور اس کے دولت مشترکہ کے ممالک ماسوائے آئرلینڈ کے جرمن کی نازی فوج سے برسرپیکار ہوئے۔ اس میں برطانیہ اور فرانس ۱۹۴۰ء اور ۱۹۴۱ء میں شامل ہوئے گو کہ برطانیہ اور اس کے اتحادی ملکوں نے ۱۹۴۵ء میں یہ جنگ جیت لی لیکن امریکہ اور روس نئی عالمی طاقت بن کر ابھرے اور برطانیہ کی طاقت گھٹ کر رہ گئی۔ ۱۹۴۷ء میں پاک بھارت تقسیم کے بعد جارج ششم ان دونوں ملکوں کا بادشاہ تو رہا لیکن جون ۱۹۴۸ء میں شہنشاہ ہندوستان کا لقب اس سے چھن گیا۔

۱۹۴۹ء میں آئرلینڈ نے بھی الگ جمہوری ریاست ہونے کا اعلان کیا اور دولت مشترکہ سے مکمل علیحدگی اختیار کر لی۔ البتہ بھارت دولت مشترکہ میں ایک جمہوری ریاست کے طور پر شامل رہا۔ یوں جارج نے دولت مشترکہ کے سربراہ کا لقب اختیار کیا۔ جارج ششم کو کثرت سگریٹ نوشی سے سانس کے نظام کی بیماری لگ گئی۔ 6 فروری ۱۹۵۲ء میں اسی مرض سے (۵۶) چھپن برس کی عمر میں اس کا انتقال ہوا۔ وہ قریباً پندرہ (۱۵) سال تک برطانیہ اور دولت مشترکہ کا بادشاہ رہا۔ اس کی وفات کے بعد اس کی بیٹی نے ایلزبتھ دوم کے نام سے تخت سنبھالا جو کہ تاحال (۲۰۱۹ء) میں بھی برطانیہ اور دولت مشترکہ کی ملکہ ہے۔

سر شاہ محمد سلیمان (Sir shah Muhammad sulaiman):

۳ فروری ۱۸۸۶ء — ۱۲ مارچ ۱۹۴۱ء الہ ابادی ہائی کورٹ کے چیف جسٹس تھے۔ (۱۹۳۲ء سے ۱۹۳۷ء) پہلے ہندوستانی اور سب سے کم عمر تھے اس عہدے پر علی گڑھ مسلم یونی ورسٹی کے وائس چانسلر بھی رہے۔ (۱۹۳۸ء سے ۱۹۴۱ء) کی تعلیمی اداروں کے بانی تھے۔ ۱۹۲۸ء میں آل انڈیا محمڈن ایجوکیشنل کانفرنس (اجمیر) کے صدر بنے۔ ہندوستان میں خواتین کی تعلیم کو اہمیت دی اور بی اے میں اردو کا مضمون (اختیاری) متعارف کروایا۔ ۱۹۰۶ء میں آپ کو یورپ میں تعلیم حاصل کرنے کا وظیفہ ملا حکومت کی طرف سے تو آپ انگلستان چلے گئے۔ ۱۹۱۱ء میں وطن واپس آئے۔ ۱۹۲۰ء میں کم عمر میں ان کو الہ آباد بار میں نمائندگی ملی اور ۱۹۲۳ء میں ۳۴ سال کی عمر میں آپ الہ آباد ہائی کورٹ کے مستقل جج بن گئے۔ پہلے ہندوستان چیف جسٹس تھے الہ آباد ہائی کورٹ کے وکیل اور جج ہونے کے باوجود تعلیم کے شعبے سے دلچسپی تھی۔ اعزازی وائس چانسلر تھے علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے ۱۹۲۹ء میں چار سال کے لیے تین بار آپ کو یہ عہدہ ملا۔

ولیم شیکسپیئر(William Shakespeare):

ولیم شیکسپیئر شاید انگریزی زبان کا واحد شاعر ہے جسے دنیا میں سب سے زیادہ پڑھا گیا، جس کے ڈراموں کے سب سے زیادہ تراجم ہوئے، جس نے انسانوں کی نفسیات، محبت، ہمدردی، دشمنی، دکھ اور سکھ کے بارے میں سب سے زیادہ لکھا، جس کی عظمت کو دنیا کے سب ادیبوں اور شاعروں نے تسلیم کیا۔

اس کے ڈراموں پر لکھی جانے والی کتابوں کی تعداد اس کے ڈراموں سے یقیناً ہزار گنا زیادہ ہوں گی، لیکن کیسی عجیب بات ہے کہ اس کی زندگی اور اس کے حالات پر دو ڈھائی صفحات سے زیادہ مواد دستیاب نہیں ہوتا۔ شیکسپیئر کی زندگی کے حالات کے بارے میں بہت سے ابہام ہیں۔ اس کے بارے میں لکھنے والوں نے یہاں تک لکھا کہ وہ ایک زمیندار کا ہرن چراتا ہوا پکڑا گیا یا یہ کہ جب وہ لندن آیا تو پہلا کام اسے یہ ملا کہ اسے گھوڑوں کی دیکھ بھال کے لیے سائس بنا دیا گیا۔ یہ سب کچھ شاید اس لیے ہوا کہ ڈراما نگار کی حیثیت اس زمانے میں بس یہ تھی کہ وہ ڈراما لکھ کر دے دے۔ ریہرسل کے وقت موجود رہے، اداکاروں کے تلفظ کی طرف دھیان دے۔ کوئی پبلشر اس کے ڈرامے کو چھاپنے پر اس وقت تک رضامند نہیں ہوتا تھا جب تک کوئی امیر، رئیس یا پیسے والا اس ڈرامے کو سپانسر نہیں کرتا تھا۔ ڈراما نگار کی سوانح عمری چھاپنے کا تو سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ اس لیے ڈراما نگار کی زندگی کے حالات زیادہ تر اندھیرے ہی رہتے تھے۔ شیکسپیئر کو یہ دن بھی دیکھنا نصیب نہ ہوا کہ اس کے ڈرامے اس کی زندگی میں چھپ سکیں۔ شیکسپیئر کی موت کے سات سال بعد اس کے دو اداکار دوستوں ہنری کونڈل اور جان ہیمنگ نے اس کے دو ڈرامے چھپوا کر مارکیٹ میں پیش کیے۔ اور ٹھیک سو سال بعد باقاعدہ سوانح عمری چھپ کر لوگوں تک پہنچی۔

ولیم شیکسپیئر ۲۳ اپریل ۱۶۵۴ء کو جان شیکسپیئر کے گھر سٹیفورڈ میں پیدا ہوا۔ ماں کا نام میری آرڈن تھا۔ اس کی چار بہنیں اور تین بھائی اور بھی تھے۔ شیکسپیئر کو ڈرامے دیکھنے اور ڈراما لکھنے کا شوق بچپن ہی سے تھا۔ اس کے گاؤں میں جب ڈراما دکھانے نوٹنکی آتی تھی، تو وہ بہت شوق سے دیکھنے جاتا تھا۔ اداکاروں کے بولے ہوئے مکالمے تنہائی میں دہراتا۔ یہ شوق اتنا بڑھا کہ کئی بار اس نے ارادہ کیا کہ وہ گھر چھوڑ کر نوٹنکی والوں کے ساتھ بھاگ جائے۔ اس کا باپ پیشے کے لحاظ سے قصاب تھا۔ سنا ہے کہ ایک بار اس نے ایک جانور کو ذبح کرنے کی کوشش کی۔ چھری چلانے سے پہلے ایک لمبی چوڑی تقریر جھاڑ دی۔ یہ وہ مکالمے تھے، جو اس نے تھیٹر کے اداکاروں سے سنے تھے۔ جانوروں پر چھری چلانے کا شاید یہ اس کا آخری موقع تھا۔

اس نے شادی بھی کی اور ایک بیٹے اور دو بیٹیوں کا باپ بنا اور پھر بھاگ کر لندن چلا گیا۔ تھیٹر کمپنیوں میں چھوٹے موٹے کئی کام کئے۔ اداکاری کا شوق تھا۔ چھوٹے موٹے کردار کر کے ایکٹروں کی صف میں شامل ہو گیا۔ قلمی سے کام شروع کیا تھا آہستہ آہستہ اداکاروں کے گروپ کا ناظم بن گیا، پھر قلم ہاتھ میں تھاما اور ڈرامے لکھنے شروع کر دیے۔ اس کام میں اس نے بہت عذاب دیکھے، مگر ہمت نہ ہاری۔ ۱۶۰۳ء میں اپنا نام ایکٹروں کی اس فہرست میں درج کرا ہی لیا، جو بادشاہ وقت جیمز اول کے منظورِ نظر تھے۔ ڈرامانویسی جاری رکھی اور پھر وہ مشہور ڈرامانگار بن گیا۔

ولیم شیکسپیئر انگریزی زبان کا سب سے بڑا شاعر اور ڈرامانگار تسلیم کیا جاتا ہے۔ اس کی شاعری نے اس کے ڈراموں کو حسن بخشا۔ اسی شاعرانہ ڈرامے کی بدولت اسے ساری دنیا میں عظمت حاصل ہوئی۔ شیکسپیئر کے مشہور ڈراموں میں مندرجہ ذیل ڈرامے بہت اہم سمجھے جاتے ہیں: ۱۔ ہنری ہشتم (تین حصے) ۲۔ مرچنٹ آف وینس ۳۔ کنگ جان ۴۔ ٹیمنگ آف شریو ۵۔ ایز یو لائک اِٹ ۶۔ ہیملٹ ۷۔ کنگ لیئر ۸۔ جولیس سیزر ۹۔ میری وائوز آف ونڈسٹر ۱۰۔ وتھیلو ۱۱۔ رومیو اینڈ جیولٹ ۱۲۔ میکبتھ ۱۳۔ ٹویلوتھ نائٹ ۱۴۔ دی ٹمپسٹ ۱۵۔ ونٹرز ٹیل ۱۶۔ انتھونی اینڈ قلوپطرہ ۱۷۔ کامیڈی آف ایررز ۱۸۔ مچ اوڈا اباؤٹ نتھنگ ۱۹۔ لوز لیبر اسٹ ۲۰۔ اے مڈ سمر نائٹ ڈریمز۔ اپنے المیہ ڈراموں میں شیکسپیئر نے یونانیوں کے تصور المیہ کے کسی اصول کو مد نظر نہیں رکھا اور نہ ہی اس نے المیہ کے بارے میں کوئی اپنے اصول بنائے ہیں۔ یونانیوں کے تھیٹر میں ۳۰ ہزار مرد اور عورتیں ایک وقت میں ڈراما دیکھنے آتے تھے، موسیقی کے وہ فن پارے سننے آتے تھے، جو ان کی روح کو اپنے قبضے میں لے کر اس مذہبی عقیدے کی گرفت میں رہنا چاہتے تھے جو انہیں اپنا اسیر بنالے۔ وہ ٹریجڈی میں رونما ہونے والے ایکشن کے منتظر رہتے تھے، جو اُن کے دل اور روح کو جھنجھوڑ کر رکھ دے۔ ایسے شاندار لباس اور آرائش جو اُن کی آنکھوں کو چکاچوند کر دے۔ تھیٹریکل اثرات، مناظر کے علاوہ مذہب کا جذبہ بھی تھا جو انھیں بٹھائے رکھتا تھا۔ خوف، ڈر اور دہشت ان لوگوں کی تطہیر جذبات کا باعث بنتے تھے۔ یہ سب کچھ شیکسپیئر کے المیوں میں نہ تھا۔ یونانی المیہ میں پلاٹ کو بہت اہمیت حاصل تھی جب کہ شیکسپیئر کے المیہ میں سب سے زیادہ اہمیت کردار کی تھی۔

۱۵۶۴ء میں پیدا ہونے والا شیکسپیئر، ۳۰ سال کی عمر تک پہنچتے پہنچتے سب سے بڑا ڈرامانویس بن گیا۔ ۲۰ سال اس نے ڈرامے لکھے اور گھر واپس اپنے گاؤں سٹیفورڈ واپس آگیا۔ لندن رہ کر بھی گاؤں کو نہ بھولا۔ ۱۶۰۶ء میں جب ۵۲ سال کا ہوا تو فوت ہو گیا۔ شیکسپیئر لندن میں رہا تو طربیہ ڈرامے لکھتا رہا۔ وراثت اور جانشینی اور دوسرے ہلکے پھلکے موضوعات کو ڈرامے میں سموتا رہا۔ آخری سالوں میں شیکسپیئر نے ان ڈراموں کی طرف توجہ دی جو اس کے عظیم المیے

بن کر دنیا کے سامنے آئے، جن میں زندگی اور مصیبت سے نبرد آزما نظر آتی ہے، جن میں ایک وقار بھی ہے اور شان و شوکت بھی، بلند خیالی بھی ہے اور فکر کی عظمت اور گہرائی بھی۔ (احمد عقیل روبی کی کتاب " علم و دانش کے معمار" سے مقتبس)

شیلے پرسی بائشی (Shelley, Percy Bysshe):

شیلے کی مشہور نظم کوئین میب کی اشاعت کی کہانی بھی بہت دلچسپ ہے۔ انقلابی خیالات پر مبنی یہ نظم شیلے کے ان خیالات کی ترجمانی کرتی ہے جن پر اس کے فکری اور شعری نظام کی بنیاد قائم ہے۔ شیلے پورے نظام کو بدلنا چاہتا تھا۔ معاشرے میں اصلاحی نظام لانا چاہتا تھا۔ جس میں عام انسان کو سہولت مل سکے۔ وہ فطری ماحول کو واپس لانا چاہتا تھا۔ وہ اس میں ایک جگہ کہتا ہے۔ "مجھے واپس اس دھرتی ماں کی طرف جانے دو، جہاں میں اپنے ہاتھوں سے کھیتوں اور جنگلوں سے اپنی خوراک حاصل کر سکوں۔" شیلے نے اس کتاب کی اشاعت کا انتظام خود کیا۔ ۱۲۰ کاپیاں پریس سے نکلوائیں۔ ۵۰ جاننے والوں کو اس نے چوری چوری تقسیم کیں اور ۷۰ پریس میں رکھوادیں اور سختی سے منع کر دیا کہ یہ تقسیم نہ کی جائیں۔ جس دوست کے پاس یہ کاپیاں محفوظ تھیں اس کا نام ولیم کلارک تھا۔ ۱۸۲۱ء میں (شیلے کی وفات سے ایک سال پہلے) وہ یہ کتاب مارکیٹ میں لے آیا۔ بقول ایک نقاد، لوگ اس کتاب پر جھپٹ پڑے۔ شیلے نہیں چاہتا تھا کہ اس کے خیالات کی وجہ سے لندن کے لوگوں میں اس کے خلاف مزید نفرت پھیلے۔ چناں چہ اس نے ولیم کلارک کے خلاف مقدمہ کیا۔ حکومت نے ولیم کلارک کو جیل بھیج دیا۔ کتاب ضبط کر لی۔ ۱۸۳۰ء میں اس کتاب کے ۱۲ ایڈیشن چھپے۔ شیلے اپنے نظریات کی مقبولیت دیکھنے کے لیے زندہ نہ رہا۔

کہتے ہیں اتنا کچھ لکھنے کے باوجود شیلے کو اپنی شاعری سے ساری زندگی میں صرف ۴۰ پاؤنڈ کا فائدہ ہوا۔ لیکن اس کے خیالات سے پوری دنیا مستفید ہوئی اور یہاں تک مقبولیت حاصل ہوئی کہ اس کی شاعری اور اس کے بارے میں یہاں تک کہہ دیا گیا کہ "شیلے انجیل کی طرح مقدس ہے۔"

شیلے کے بارے میں نقادوں کا یہ خیال ہے کہ شیلے دراصل انسانوں کے اندر سوئے جذبوں کو جگانا چاہتا تھا۔ جو بات ٹالسٹائی نے بہت بعد میں کہی کہ انقلاب انسانوں کے اندر سے نمودار ہوتا ہے۔ شیلے اسی جذبے کو انسانوں کے اندر پیدا کرنا چاہتا تھا۔ انسان خوش گوار زندگی صرف اس وقت گزار سکتا ہے جب وہ آزاد ہو اور اسی آزادی کے لیے شیلے انسانوں کو اکساتا ہے۔ شیلے کا نظریہ تھا کہ غلامی تمام برائیوں کی جڑ ہے۔ شیلے کے بارے میں مشہور ہے کہ وہ پرندوں کو بھی پنجروں میں رکھنے کے خلاف تھا۔ پیرس سے جب وہ گدھے پر سامان رکھ کر لندن جارہا تھا تو ایک گاؤں کے قریب

اسے ایک چڑی مار ملا جو چڑیوں اور فاختاؤں کو پکڑ کر جا رہا تھا۔ شیلے نے اسے روکا اور سب پرندوں کی قیمت ادا کر کے پرندوں کو آزاد کر دیا۔

شیلے رومانوی شعرا (ورڈزورتھ، کولرج، بائرن اور کیٹس) میں سے واحد شاعر تھا جس میں غنائیت اور مٹھاس کا عنصر سب سے زیادہ تھا۔ فطرت کی خوبصورتی اور حسن کا وہ زندگی بھر عاشق رہا۔ شیلے کو ساری زندگی مشکلات کا سامنا رہا جن کا شیلے نے بڑے صبر اور جرأت سے مقابلہ کیا۔ یہ حوصلہ شیلے نے محبت سے حاصل کیا۔ اس کی محبت صرف انسانوں تک محدود نہ تھی۔ اس کے حصار میں ہر جاندار مخلوق آتی تھی۔ جن میں جانور، پرندے، درخت، پھول، بادل، ہوا سب ہی شامل تھے۔ شیلے میں کائنات سے ہم کلام ہونے کا ہنر موجود تھا۔ وہ کبھی (To A Skaylark) سے مخاطب ہوتا ہے۔ کبھی West Wind سے اور کبھی بادل (Cloud) سے...! اس کی نظم The Triumph of Life ہو یا کیٹس (Keats) پر لکھی گئی (Elegy) ڈراما The Cenci ہو یا نظم Cloud اس کی بے مثال غنائیت، تمثال اور جذبہ ہر سطر میں موجود ہوتا ہے۔ شیلے کے آخری ایام بائرن کے ساتھ اٹلی میں گزرے۔ جہاں اسکے ساتھ اس کے چند دوست بھی تھے جن میں مشہور شاعر لی ہنٹ اور ٹری لانی بھی تھا۔ سمندر اور سمندر کا پانی بچپن ہی سے شیلے کو بہت حیران کرتا تھا اور وہ کہتا تھا (Water is my Fate) اور یہ بات سچ ثابت ہوئی اور ۸ جولائی ۱۸۲۲ء کو یانی سالگرہ سے ایک ماہ قبل تیس برس کی عمر میں شیلے ایک سمندری طوفان کی نذر ہو گیا۔ وہ بائرن کی کشتی (Don Juan) لے کر اپنے دو دوستوں کے ساتھ سمندری سفر پر جانے کے لیے تیار ہوا۔ کشتی کے ایک طرف اس نے (Ariel) کا نام لکھوایا۔ بائرن کو یہ بات پسند نہ آئی اور شیلے کو (Ariel) کے حروف مٹانے کے لیے کہا۔ شیلے نے یہ بات نہ مانی اور اپنے لیے دوسری کشتی حاصل کی۔ دوستوں کو ساتھ لیا اور سمندری سفر پر روانہ ہو گیا۔ میری شیلے نے شیلے کی ۱۸۲۲ء میں لکھی نظموں پر دیباچہ لکھ کر ایک کتاب شائع کی تو اس کے دیباچے میں یہ بات لکھی کہ شیلے نے جس کشتی پر سفر شروع کیا وہ سفر کے قابل نہ تھی اسے لوگوں نے روکا مگر وہ سفر پر جانے کے لیے بضد تھا۔ شیلے کی موت کے بعد مختلف قیاس آرائیاں کی گئیں۔ کسی نے کہا شیلے ان دنوں بہت نااُمید تھا اور مرنا چاہتا تھا۔ کسی نے کہا اس کشتی کو بائرن کی کشتی سمجھ کر بحری قزاقوں نے لوٹنے کی غرض سے حملہ کیا۔ کسی نے اس کی موت کو سیاسی قتل قرار دیا۔ کیوں کہ اس پر پہلے ایک حملہ ہو چکا تھا۔ بہر حال اس کی موت کے ایک دن بعد اخبار (The Courier) میں جلی حروف میں اس کی موت کی خبر چھپی۔ ''شیلے۔ شاعر سمندر میں ڈوب کر مر گیا۔ اب اسے پتا چل گیا ہو گا کہ خدا ہے کہ نہیں۔'' 482

سر فریڈرک ہگ سائیکس(Sir Frederick Hugh Sykes):

۲۳جولائی ۱۸۷۷ء کو انگلستان میں پیدا ہوا۔ وہ برطانیہ کی فوج میں افسر تھا اور سیاست میں بھی دخل رکھتا تھا۔ سائیکس برطانیہ کی بری فوج میں جونیئر افسر تھا بعد میں اس کو فوجی ہوا بازی میں دلچسپی پیدا ہوئی چناں چہ وہ پہلا کمانڈنگ آفیسر بن گیا اور فوج کی اس حصے میں شامل ہوا جو فوجی ہوا بازی سے تعلق رکھتا تھا جنگ عظیم اول کے بعد یہ حصہ بحریہ کے فضائی شعبے سے منسلک ہو گیا تھا۔ ۱۹۱۴ء-۱۹۱۵ء میں وہ فرانس کا چیف آف اسٹاف بن گیا۔

جنگ کے زمانے میں اس نے شاہی بحریہ کی فضائی خدمات(Royal Naral Air Swrvice) میں شمولیت اختیار کی۔ اس دوران اس نے مشین گن اور افرادی قوت کی تنظیم کے شعبے میں کام کیا۔

جنگ کے بعد اس کو سول ایوی ایشن کا کنڑولر بنا دیا گیا جہاں وہ ۱۹۲۲ء تک کام کرتا رہا۔ اس کے بعد اس نے یہ ملازمت ترک کی اور عملی سیاست میں سرگرم ہو گیا۔ قدامت پسند جماعت کی طرف سے وہ ایم پی منتخب ہوا ۱۹۲۸ء میں اس نے استعفیٰ دے دیا۔

۱۹۲۸ء سے ۱۹۳۱ء تک وہ بمبئی کا گورنر رہا۔ جب وہ ہندوستان سے واپس انگلستان آیا تو اس نے کاروبار اور عام طرز کی زندگی گزارنا شروع کر دیا۔ دوسری جنگ عظیم کے دوران سائیکس ایک بار پھر ایم پی بنا ۱۹۴۵ء میں اس نے اپنی یہ نشست کھو دی۔ ۳۰ ستمبر ۱۹۵۴ء کو لندن میں اس کا انتقال ہوا۔

لارڈ جارج نیتھ نئیل کرزن(George Nathaniel Curzon):

برطانوی ریاست کار جو برطانیہ کے شہر کیڈلسٹن میں ۱۱ جنوری ۱۸۵۹ء کو پیدا ہوا۔ وہ ۱۸۸۶ء میں ہاوس آف کامنز کا رکن بنا پھر بطور سیکرٹری برائے ہندوستان (۱۸۹۱ء۔ ۱۸۹۲ء) اور امور خارجہ (۱۸۹۵ء۔ ۱۸۹۸ء) خدمات سرانجام دیں۔

۱۸۹۹ء سے ۱۹۰۵ء تک ہندوستان کا گورنر جنرل ہندوستان مالیاتی امور کو نئے سرے سے منظم کیا۔ آب پاشی اور تجارت کا نظام بہتر بنایا۔ صوبہ بنگال کو تقسیم کر دیا۔ کرزن نے لوسائے کانفرنس(۱۹۲۲ء۔ ۱۹۲۳ء) کی بھی صدارت کی۔

کرزن ایک سمجھ دار برطانوی سیاست دان تھا جو ۱۸۸۶ء میں دارالعموم کا رکن بنا۔ ۱۸۹۱ء میں نائب وزیر مقرر ہوا۔ ۱۸۹۹ء سے ۱۹۰۵ء تک ہندوستان کا وائسرائے رہا۔ ۱۹۲۴ء میں سیاست سے دست کش۔ دہلی دربار ۱۹۰۱ء

مہم تبت ۱۹۰۴ء۔ تقسیم بنگال ۱۹۰۵ءاس کے عہد کے مشہور واقعات ہیں۔ قانونِ انتقالِ اراضی پنجاب ۱۹۰۱ءاور قانونِ جامعات ۱۹۰۴ءاس کے عہد میں پاس ہوئے۔

گاندھی۔موہن داس کرم چند (Mohandas Karamchand Gandhi):

موہن داس کرم چند گاندھی گجرات ہندوستان کے مغربی ساحلی شہر پوربندر(جو اُس وقت بمبئ پریزیڈنسی، برطانوی ہندوستان کا حصّہ تھا) میں ۲ اکتوبر، ۱۸۶۹ء میں پیدا ہوئے۔ ان کے والد کرم چند گاندھی (۱۸۲۲ء-۱۸۸۵ء)ہندو مودھ فرقہ سے تھے اور ریاست پوربندر کے دیوان تھے۔ ان کی ماں کا نام پُتلی بائی تھا، جو ہندو پرنامی ویشنو فرقہ سے تعلق رکھتی تھیں۔ وہ کرم چند کی چوتھی بیوی تھیں،ان کی پہلی تین بیویاں زچگی کے وقت مر گئی تھیں۔

ان کے والد کرم چند گاندھی انگریزوں کے زیر تسلط والے بھارت کے امیواڑ ایجنسی میں ایک چھوٹی سی ریاست پوربندر صوبے کے دیوان یعنی وزیراعظم تھے۔ عقیدت کرنے والی ماں کی دیکھ بھال اور اس علاقے کی جین برادری کی وجہ سے نوجوان موہن داس پر ابتدائی اثرات جلد ہی پڑ گئے جو ان کی زندگی میں اہم کردار ادا کرنے والے تھے۔ان اثرات میں کمزوروں میں جوش کا جذبہ، سبزی خواری کی زندگی، روح کی پاکیزگی کے لیے بپوبس اور مختلف ذاتوں کے لوگوں کے درمیان میں رواداری شامل تھیں۔

مئی، ۱۸۸۳ء میں جب وہ ۱۳سال کے تھے تب ان کی شادی ۱۴سال کی کستور بائی ماکھنجی کپاڈیا سے کردی گئی۔ یہ شادی ایک منظم کم سنی کی شادی تھی جو اس وقت اس علاقے میں عام تھی۔ پوربندر میں ان کے مڈل اسکول اور راجکوٹ میں ان کے ہائی اسکول دونوں میں ہی تعلیمی سطح پر گاندھی جی ایک اوسط طالب علم رہے۔ انھوں نے اپنا میٹرک کا امتحان بداؤنگر گجرات کے سمل داس کالج سے کچھ پریشانیوں کے ساتھ پاس کیا اور جب تک وہ وہاں رہے ناخوش ہی رہے کیوں کہ ان کا خاندان انھیں بیرسٹر بنانا چاہتا تھا۔

۴ ستمبر ۱۸۸۸ء کو اپنی شادی کی انیسویں سالگرہ سے کچھ ماہ قبل، گاندھی جی قانون کی پڑھائی کرنے اور بیرسٹر بننے کے لیے لندن، برطانیہ کے یونیورسٹی کالج آف لندن گئے۔شاہی دارالحکومت لندن میں ان کے اوقات، اپنی ماں سے جین بھکشو کے سامنے بھارت چھوڑتے وقت کیے وعدے، ہندوؤں کی تہذیب کے تحت گوشت، شراب اور تنگ نظریہ سے پرہیز کرتے گزرا۔

۱۰ جون ۱۸۱۰ء میں ان کو انگلستان اور ویلز بار بلایا گیا۔ اور ۱۲ جون ۱۸۹۲ء کو لندن سے، ہندوستان لوٹ آئے جہاں انھیں اپنی والدہ کی موت کا علم ہوا۔ لیکن ممبئی میں وکالت کرنے میں انھیں کوئی خاص کامیابی نہیں ملی۔ بعد میں ایک ہائی اسکول کے استاد کے طور پر جز وقتی کام کے ساتھ ساتھ انھوں نے دعوں کے لیے مقدمے لکھنے کے لیے راجکوٹ کو ہی اپنا مقام بنالیا لیکن ایک انگریز افسر کی حمایت کی وجہ سے انھیں یہ کاروبار بھی چھوڑنا پڑا۔ اپنی آپ بیتی (My Experiments with the Truth) میں انھوں نے اس واقعہ کا بیان اپنے بڑے بھائی کی طرف سے پیروی کی ناکام کوشش کے طور پر کیا ہے۔ یہی وہ وجہ تھی جس وجہ سے انھوں نے ۱۸۹۳ء میں ایک بھارتی فرم داداعبداللہ اینڈ کمپنی کی ایک سالہ قرار پر نیٹال، جنوبی افریقا جو اس وقت سلطنت برطانیہ کا حصہ ہوتا تھا، جانا قبول کیا تھا۔

۲ اکتوبر، ۱۸۶۹ء تا ۳۰ جنوری ۱۹۴۸ء کے زمانے میں آپ بھارت کے سیاسی اور روحانی رہنما اور آزادی کی تحریک کے اہم ترین کردار رہے۔ انھوں نے ستیہ گرہ اور اہنسا (عدم تشدد) کو اپنا ہتھیار بنایا۔ ستیہ گرہ، ظلم کے خلاف عوامی سطح پر منظم سول نافرمانی ہے جو عدم تشدد پر مبنی ہے۔ یہ طریقۂ کار ہندوستان کی آزادی کی وجہ بنا اور ساری دنیا کے لیے حقوق انسانی اور آزادی کی تحاریک کے لیے روح رواں ثابت ہوئی۔ بھارت میں انھیں احترام سے مہاتما گاندھی اور باپو کہا جاتا ہے۔ انھیں بھارت سرکار کی طرف سے بابائے قوم (راشٹر پتا) کے لقب سے نوازا گیا ہے۔ گاندھی کا یوم پیدائش بھارت میں قومی تعطیل کا درجہ رکھتا ہے اور دنیا بھر میں یوم عدم تشدد کی طور پر منایا جاتا ہے۔ ۳۰ جنوری، ۱۹۴۸ء کو ایک ہندو قوم پرست نتھورام گوڈسے نے ان کا قتل کر دیا۔

جنوبی افریقا میں وکالت کے دوران میں گاندھی جی نے رہائشی ہندوستانی باشندوں کے شہری حقوق کی جدوجہد کے لیے شہری نافرمانی کا استعمال پہلی بار کیا۔ ۱۹۱۵ء میں ہندوستان واپسی کے بعد، انھوں نے کسانوں اور شہری مزدوروں کے ساتھ بے تحاشہ زمین کے محصول اور تعصب کے خلاف احتجاج کیا۔ ۱۹۲۱ء میں انڈین نیشنل کانگریس کی قیادت سنبھالنے کے بعد، گاندھی ملک سے غربت کم کرنے، خواتین کے حقوق کو بڑھانے، مذہبی اور نسلی خیر سگالی، چھوت اچھوت کے خاتمہ اور معاشی خود انحصاری کا درس بڑھانے کی مہم کی قیادت کی۔ انھوں نے بھارت کو غیر ملکی تسلّط سے آزاد کرانے کے لیے سوراج کا عزم کیا۔ گاندھی نے مشہور عدم تعاون تحریک کی قیادت کی۔ جو ۱۹۳۰ء میں مارچ سے برطانوی حکومت کی طرف سے عائد نمک محصول کی مخالفت میں ۴۰۰ کلو میٹر (۲۴۰ میل) لمبی دانڈی نمک احتجاج سے شروع ہوئی۔ اس کے بعد ۱۹۴۲ء میں انھوں نے 'ہندوستان چھوڑ دو' کے نام سے شہری

نافرمانی تحریک کا آغاز، فوری طور پر آزادی کے مطالبہ کے ساتھ کیا۔ گاندھی دونوں جگہ جنوبی افریقا اور بھارت میں کئی سال قید میں گزارے۔

عدم تشدد کے پیشوا طور پر، گاندھی نے سچ بولنے کی قسم کھائی تھی اور دوسروں سے ایسا ہی کرنے کی وکالت کرتے تھے۔ وہ سابرمتی آشرم میں رہتے اور سادہ زندگی بسر کرتے تھے۔ لباس کے طور پر روایتی ہندوستانی دھوتی اور شال کا استعمال کرتے، جو وہ خود سے چرخے پر بُنتے تھے۔ وہ سادہ اور سبز کھانا کھاتے اور روحانی پاکیزگی اور سماجی احتجاج کے لیے لمبے اُپواس (روزے) رکھا کرتے تھے۔

۳۰ جنوری ۱۹۴۸ء کو ایک عبادتی خطبے کے لیے چبوترے کی طرف جاتے وقت گاندھی کو گولی مار کر قتل کر دیا گیا۔ قاتل نتھورام گوڈسے ایک ہندو قوم پرست اور ہندو انتہا پسند تنظیم ہندو مہاسبھا سے وابستہ تھا جو گاندھی کو پاکستان کو ادایگی کے لیے مجبور کرنے اور کمزور کرنے کے لیے ذمہ دار سمجھتی تھی۔ گوڈسے اور اس کا ساتھی سازش کار نارائن آپٹے کو عدالتی کارروائی کے بعد مجرم قرار دیا گیا اور ۱۵ نومبر ۱۹۴۹ء کو ان دونوں کو پھانسی دے دی گئی۔

مارٹن لوتھر کنگ جونیئر (Martin Luther King Jr):

مارٹن لوتھر کنگ جونیئر کی پیدائش ۱۵ جنوری ۱۹۲۹ء کو امریکہ کی ریاست اٹلانٹا میں ہوئی۔ آپ ایک امریکی پادری، حقوق انسانی کے علم بردار اور افریقی-امریکی شہری حقوق کی مہم کے اہم رہنما تھے۔ آپ نے امریکا میں یکساں شہری حقوق کے لیے زبردست مہم چلائی۔ کم از کم دو مسیحی گرجاؤں نے کنگ کو شہید کا درجہ دیا۔ انھوں نے ۱۹۵۵ء کے منٹگمری بس مقاطعہ کی قیادت کی اور ۱۹۵۷ء میں جنوبی مسیحی قیادت اجلاس کے قیام میں مدد دی اور اس کے پہلے صدر بنے۔ کنگ کی کوششوں کے نتیجے میں ۱۹۶۳ء میں واشنگٹن کی جانب مارچ کیا گیا، جہاں کنگ نے اپنی شہرۂ آفاق" میرا ایک خواب ہے (I Have a Dream) "تقریر کی۔ انھوں نے شہری حقوق کی مہم کے حوالے سے عوامی شعور اجاگر کیا اور امریکا کی تاریخ کے عظیم ترین مقررین میں سے ایک کی حیثیت سے اپنی شناخت مستحکم کی۔

۱۹۶۴ء میں نسلی تفریق اور امتیاز کے خلاف شہری نافرمانی کی تحریک چلانے اور دیگر پرامن انداز احتجاج اپنانے پر لوتھر کنگ کو نوبل امن انعام سے نوازا گیا۔ آپ اس اعزاز کو حاصل کرنے والے سب سے کم عمر شخص تھے۔ ۱۹۶۸ء میں اپنے قتل سے پہلے آپ نے غربت کے خاتمے اور جنگِ ویت نام کی مخالفت کے لیے کوششیں کی

اور دونوں کے حوالے سے مذہبی نقطۂ نظر سامنے لائے۔ ۴اپریل ۱۹۶۸ء کو میمفس، ٹینیسی میں لوتھر کنگ کو قتل کر دیا گیا۔

۱۹۷۷ء میں انھیں بعداز وفات صدارتی تمغۂ آزادی اور ۲۰۰۴ء میں کانگریسی طلائی تمغا سے نوازا گیا۔ ۱۹۸۶ء میں یومِ مارٹن لوتھر کنگ جونیئر کو امریکا میں قومی تعطیل قرار دیا گیا۔ ٹائم میگزین نے ۱۹۶۳ء میں آپ کو "سال کی شخصیت" قرار دیا تھا۔

ماریہ ٹیکلا آرٹےمیشیا مونٹی سوری(Maria Tecla Artemisia Montessori):

اٹلی میں ۳۱اگست ۱۸۷۰ء کو پیدا ہونے والی ماریہ مونٹی سوری تعلیمی فلاسفر تھیں۔ اس کے والد تمبا کو کی ایک فیکٹری میں کام کرتے تھے اور ماں بھی اچھی خاصی پڑھی لکھی تھی۔ ماریہ ابتدا میں انجنیئر بننا چاہتی تھی اس لیے اس نے ٹیکنکل اسکول میں داخلہ لیا لیکن وہاں صرف لڑکے تعلیم حاصل کر رہے تھے۔ اس کو اپنے کالج میں صنفی امتیاز کا سامنا بھی کرنا پڑا۔ اس لیے اس کی توقعات اور خواہشات دم توڑ گئیں۔ پھر اس نے یہ خیال چھوڑا اور روم کے ایک میڈیکل کالج میں داخلہ لے لیا۔ وہ یہاں سے اچھے گریڈ کے ساتھ پاس ہوئی حتیٰ کہ اس کو اپنی یونی ورسٹی کے ہسپتال میں اسسٹنٹ کی ملازمت مل گئی اور اس نے خود بھی پریکٹس شروع کر دی۔

۱۸۹۶ء میں ماریہ کو ذہنی طور پر معذور بچوں کے ادارے میں ملازمت ملی۔ جہاں اس نے انسانیت کے جذبے کے تحت ان معذور بچوں کی تعلیم اور نفسیات پر تحقیق کا آغاز کیا۔ وہ دو فرانسیسی ڈاکٹروں سے بہت متاثر تھیں جن میں سے ایک ڈاکٹر ژان اتارڈ اور دوسرے ایڈوڈ میگن تھے۔ ان دونوں کی تحقیق سے بھی فائدہ اٹھاتے ہوئے ماریہ نے معذور بچوں کو تعلیم دینے کا آغاز کیا تو ان کے نتائج عام صحت مند بچوں جیسے آئے تب ماریہ نے سوچا کہ اگر اس طرح عام بچوں کو تعلیم دی جائے تو نتائج میں کتنی بہتری لائی جاسکتی ہے۔

اس خیال سے اس نے ایک نیا تعلیمی نظام ترتیب دیا اور ایک ادارے میں اس کا عملی مظاہرہ بھی کیا۔ ۱۹۰۰ء میں روم میں ایک ادارہ بنایا گیا جس میں معذور بچوں کو تعلیم دینے کے لیے اساتذہ کو ترتیب دینے کا آغاز ہوا ماریہ اس ادارے کی کو ڈائریکٹر تھیں۔ ماریہ نے بچوں کو تعلیم دینے کا جو طریقہ پیش کیا آج وہ اس نے نام سے منسوب ہے اور ''مونٹی سوری طریقہ تعلیم'' کہلاتا ہے یہ تعلیم ان اسکولوں میں دی جاسکتی ہے جہاں مونٹی سوری کی تربیت یافتہ استاد ہوں۔ اس وقت دنیا کے کئی ممالک میں یہ طریقہ مقبول ہے کیوں کہ اس میں بچوں کی ذہنی، جسمانی، معاشرتی، اخلاقی

اور دیگر ضرورتوں کو دیکھتے ہوئے تعلیم دی جاتی ہے بچوں کی آمادگی اور ان کی مرضی کو اہمیت دی جاتی ہے۔ بچے کی عمر ڈھائی سال سے پانچ چھ سال تک ہوتی ہے۔

بنی ٹو مسولینی (Benito Mussolini):

۲۹ جولائی ۱۸۸۳ء میں اطالیہ (اٹلی) کی سلطنت میں آنکھ کھولنے والا مسولینی سیاست دان اور صحافی تھا جو اٹلی کی فاشسٹ پارٹی کا قائد بھی تھا۔ اس نے اٹلی میں وزیر اعظم کے طور پر حکومت سنبھالی اس کی حکمرانی کا دور ۱۹۲۲ء سے ۱۹۴۳ء تک پھیلا ہوا ہے۔ آئینی حکمران کے طور پر ۱۹۲۵ء تک اقتدار سنبھالنے کے بعد اس نے جمہوریت ختم کر کے آمریت قائم کی۔

۱۹۱۲ء میں مسولینی نے اٹلی میں فاشزم کی بنیاد رکھی، اٹلی کی سوشلسٹ پارٹی کے قومی ڈائریکٹوریٹ میں اس نے اہم رکن کے طور پر کام کیا۔ جنگِ عظیم اول میں جب اس نے ملک میں فوجی مداخلت کی حمایت کی تو اس کو اٹلی کی سوشلسٹ پارٹی سے نکال دیا گیا۔ کیوں کہ پارٹی نے اپنے منشور میں ایسے معاملات سے الگ رہنے کی حکمت عملی اپنائی تھی اور مسولینی کا یہ اقدام اس منشور کی خلاف ورزی تھی۔ مسولینی نے جنگ کے دوران اٹلی کی شاہی بحریہ میں خدمات سرانجام دیں آخر زخمی ہونے پر ۱۹۱۷ء میں اس کو رخصت ملی۔

مسولینی نے پی ایس آئی (Italian Socialist Party) سے نکالے جانے کی مذمت کی اور کہا کہ ان کے خیالات سوشلسٹ نہیں رہے، بلکہ قوم پرستی پر مبنی ہیں۔ بعد میں جب مسولینی نے فاشزم کی تحریک کا آغاز کیا تو اس نے مساوی حقوق کے فلسفے ایگلیٹیرین ازم (Egalitarianism) کو رد کیا جس کی وجہ سے معاشرتی ابتری اور معاشی اور طبقاتی کشمکش پیدا ہوئی۔ ۱۹۲۲ء میں مسولینی نے روم کی طرف مارچ منعقد کر کے اپنی طاقت کا مظاہرہ کیا۔ جس کے نتیجے میں اٹلی کی تاریخ کا سب سے کم عمر وزیر اعظم بن گیا۔ (بعد میں یہ اعزاز ۱۹۱۴ء میں میٹیو رینزی Matteo Renzi کو حاصل ہوا)۔ مسولینی نے خفیہ پولیس اور مزدوروں کی ہڑتالوں کے ذریعے اپنے تمام مخالفین کو اپنی راہ سے ہٹا دیا۔ اس نے اپنے ساتھیوں کی مدد سے آئین اور قوانین میں ایسی تبدیلیاں کیں جن سے اطالوی قوم یک جماعتی آمریت کی بھینٹ چڑھ گئی۔ پانچ برس کے اندر اندر اس نے قانونی اور غیر قانونی ہر طرح کے وسائل کو استعمال کرتے ہوئے مکمل آمرانہ نظام قائم کیا اور اقتدار پہ مکمل گرفت حاصل کر کے ہر طرح کی مخالفت اور اختلافی رائے کا گلا گھونٹ دیا، یوں اس کو اٹلی پر مکمل کنٹرول حاصل ہو گیا۔ ۱۹۲۹ء میں مسولینی نے ویٹی کن سٹی (Vatican City) کو طویل تحریک آزادی کے بعد آزادی دے دی اور اس کی آزاد حیثیت کو قبول کر لیا۔ ۱۹۳۵ء-۱۹۳۶ء میں اٹلی

کے تعلقات افریقی ملک ایتھوپیا(Ethiopia) سے کشیدہ ہو گئے جس کے نتیجے میں دونوں کے درمیان جنگ چھڑ گئی، مغربی طاقتوں کی دخل اندازی سے یہ جنگ بند ہو گئی اور اٹلی پر معاشی پابندیاں عائد کر دی گئیں۔ ایتھوپیا کے ساتھ جنگ میں ہٹلر کی طرف سے اٹلی کی حمایت کرنے کی وجہ سے اٹلی اور جرمنی کے درمیان رابطے بڑھے اور دونوں ممالک کے درمیان اچھے تعلقات استوار ہوئے۔ ۱۹۳۶ء میں مسولینی نے آسٹریا کا اختیار واقتدار جرمنی کے سپرد کر دیا اور جرمنی کے ساتھ تعاون کا معاہدہ کیا جس میں روم، برلن محور(Rome-Berlin Axis) بنانے کی منظوری دی گئی۔ ۱۹۳۶ء سے ۱۹۳۹ء کے دوران اسپین میں ہونے والی خانہ جنگی میں مسولینی نے جنرل فرانسسکو فرانکو بہاموندے (Francisco Franco Bahamonde) کو مسلح مدد بھی فراہم کی، جس کی وجہ سے فرانس اور برطانیہ اٹلی سے دور ہو گئے۔ حالات کشیدگی کی طرف بڑھ رہے تھے لیکن مسولینی نے کوشش کی کہ یورپ میں کسی بڑی جنگ کو روکا جا سکے، تاہم جرمنی نے ۱۹۳۹ء میں پولینڈ پر حملہ کر دیا جس کے نتیجے میں فرانس اور برطانیہ نے بھی جنگ کا اعلان کر دیا، یوں دوسری عالمی جنگ کا آغاز ہو گیا۔ ۱۰ جون ۱۹۴۰ء میں فرانس کی شکست کے بعد اٹلی بھی جرمنی کی حمایت میں اس جنگ میں کود پڑا۔ گو کہ مسولینی جانتا تھا کہ اس کے پاس اتنے وسائل اور فوجی صلاحیت نہیں ہے کہ وہ برطانیہ کے ساتھ جنگ جاری رکھ سکے۔

دوسری جنگِ عظیم میں پے در پے شکستوں سے مسولینی کا اقتدار خطرے میں پڑ گیا۔ اس کے خلاف عدم اعتماد کی قرارداد منظور ہوئی جس کے نتیجے میں اطالیہ کے بادشاہ نے مسولینی کو حکومت کے سربراہ کی حیثیت سے معزول کر کے گرفتار کر لیا اور مارشل پائٹرو بیڈوگلیو کو وزیر اعظم بنا دیا۔ ۱۲ ستمبر ۱۹۴۳ء میں مسولینی کو جرمن فوج کے چھاتہ برداروں نے حکومت اطالیہ کی حراست سے نکال لیا۔ جرمنی میں ایڈولف ہٹلر سے ملاقات کے بعد مسولینی کو اطالیہ کے شمالی علاقے (Italian Social Republic) میں کٹھ پتلی حکمران بنا دیا۔ ۱۹۴۵ء میں اٹلی کی طرف سے حریت پسندوں نے شمالی علاقے کا رخ کیا اور مسولینی کی سوئٹزرلینڈ کی طرف فرار کی کوشش کو ناکام بناتے ہوئے اسے گرفتار کر لیا اور جھیل کومو (Como Lake) کے قریب ۲۸ اپریل ۱۹۴۵ء کو پھانسی دے دی۔

جان ملٹن(Milton Jonn):

انگریزی شاعر ملٹن ۱۶۷۴ء میں پیدا ہوا۔ اس کی شاعری سول اور مذہبی آزادی کا دفاع تھی۔ اس کو شیکسپیئر کے بعد عظیم ترین انگریزی شاعر سمجھا جاتا ہے۔ لندن میں پیدا ہوا۔ اس نے یکے بعد دیگرے تین شادیاں کیں۔ اپنی تحریروں میں پارلیمانی اور رائلسٹس کے درمیان سول جنگ میں پارلیمانی موقف کی حمایت کی۔ بحال ہونے پر ملٹن کو جرمانے اور مختصر قید کی سزا ہوئی۔ اس کے کام کو تین ادوار میں منقسم کیا جاتا ہے۔ تیسرا دور اس کی شاعرانہ معراج ہے جس میں اس نے پیراڈائز لاسٹ مکمل کی اور پیراڈائزری گین (۱۶۷۱ء) بھی لکھی۔

انگریزی کے چند عظیم شاعروں میں سے ہے۔ ۱۶۲۵ء-۱۶۳۲ء تک کرسٹ کالج (کیمبرج) سے ایم اے کا امتحان پاس کیا۔ وہیں اس نے لاطینی اور انگریزی میں شاعری شروع کی۔ فارغ التحصیل ہونے کے بعد ۶ برس تک والد کی جاگیر میں مطالعہ کتب میں مصروف رہا ۱۶۳۸ء میں ہالینڈ سے ۱۵ ماہ کے لیے یورپ روانہ ہوا، وہاں اٹلی کے ادبی حلقوں میں وقت گزارا۔ ۱۶۳۹ء میں جب وہ وطن واپس آیا تو وہاں خانہ جنگی چھڑ چکی تھی۔ چناں چہ اس نے شہزادوں اور جمہوریت کے حق میں نظمیں اور مضامین لکھے اصلاح مذہب اور طلاق، تعلیم اور عوام کے حقوق پر اس کے مضامین اسی دور سے تعلق رکھتے تھے۔ اس پارلیمنٹ کی حمایت کی ۱۶۶۰ء میں بدمست بادشاہت بحال ہوئی تو ملٹن کو سزا ملی اس کو خوب ذلیل کیا گیا۔ ۱۶۵۸ء میں اس نے اپنی مشہور نظمیں Paradise Lost اور ۱۶۷۱ء میں Paradise regained لکھی۔

اس کی شاعری انگریزی ادب میں پاکیزہ ترین شاعری خیال کی جاتی ہے۔ اس کو الفاظ اور تخیل کی بلندی پر عبور تھا۔ خدا اور بندے کے درمیان تعلق کو انوکھے انداز میں بیان کیا۔ جان ملٹن ایک بڑا شاعر تھا کیوں کہ اس کا مطالعہ وسیع اور عمیق تھا، اس کے ساتھ ساتھ قدرت نے اس کو دُور رس نظر سے بھی نوازا تھا۔ یہ سب وہ صلاحیتیں ہیں جو کسی موزوں طبع کو عظیم شاعر بنا سکتی ہیں۔

اس کی ۱۶۳۵ء میں شائع ہونے والی شاعری میں افلاطونیت اور مسیحیت کے عناصر کا امتزاج ملتا ہے۔ اس کی نظم ۱۶۲۵ء پر ایتھنز دور کا اثر ملتا ہے۔ سانحہ ارتحال پر "Lycidas" میں موت اور زندگی، شاعری اور شہرت جیسے موضوعات نظم ہوئے ہیں، یہ پیچیدہ نظم ہے۔ اس کا سب سے بڑا کارنامہ، "Paradise Lost" ۱۶۲۷ء ہے۔ جس میں خدا کے خلاف شیطان کی بغاوت اور آدم و حوا کا واقعہ اخراج رزمیہ انداز میں پیش کیا گیا ہے۔ یہ نظم اس کی اپنی شعوری اور لاشعوری شخصیت کو ظاہر کرتے ہیں۔ اس کا تعلق نہ صرف مذہبی تحریک سے تھا بلکہ سیاست سے بھی

متعلق تھا۔اس لیے احیاء کے تاریخی واقع کے بعد اسے عرصے تک قید وبند کی صعوبتیں برداشت کرناپڑیں۔اس طرح وہ پریس کی آزادی، عورتوں کے حقوق اور طلاق کے مسائل سے بھی دلچسپی رکھتا ہے۔ ۱۶۹۸ء میں وہ اس دنیا سے رخصت ہوا۔

مولانا محمد علی جوہر(Maolana Muhammad Ali Johar):

مولانا محمد علی جوہر (۱۸۷۸ء۔۱۹۳۱ء) نے ریاست اترپردیش کے ضلع رامپور میں مولانا عبدالعلی کے گھر میں اپنی آنکھیں کھولیں۔مولانا محمد علی جوہر کے والد محترم مولانا عبدالعلی بھی ایک عظیم مجاہد آزادی تھے۔ اور انگریزوں کے خلاف ہمیشہ سر بکف رہے۔مولانا محمد علی جوہر نے اپنی تحریروں اور تقریروں سے ہندوستانیوں کے رگوں میں حریت کا جذبہ اس قدر سرایت کردیا تھاکہ ہر آن کی تحریروں سے ہر کوئی باشعور و محب وطن ہندوستانی انگریزوں کے خلاف لازماً سر بکف نظر آتا تھا۔مولانا نے کبھی بھی اپنے اصولوں سے سمجھوتہ نہیں کیابلکہ ہمیشہ آزادئ ہند کے لیے کوشاں رہے آپ تحریک خلافت کے روح رواں اور عظیم مجاہدِ آزادی۔مولانا محمد علی جوہر کا بچپن نہایت کسمپرسی میں گزرا۔ بچپن میں ہی ان کے والد کا سایہ سر سے اٹھ گیا۔والدین کا سایہ سر پر نہ ہونے کے باوجود آپ نے دینی ودنیوی تعلیم حاصل کی۔آپ نے الہٰ آباد یونیورسٹی سے بی اے پاس کیااس کے بعد۱۸۹۸ء میں آکسفورڈ یونیورسٹی کے ایک کالج میں ماڈرن تعلیم کی غرض سے داخلہ لیااور وہاں پر اپنے مذہبی تشخص کو من و عن برقرار رکھتے ہوئے دنیاوی تعلیم حاصل کرتے رہے۔مولانا محمد علی جوہر بیک وقت بیدار مغز صحافی بھی تھے،بے مثال قلمکار بھی تھے، پُرا ثر شاعر بھی تھے، فکر جلیل رکھنے والے ادیب بھی تھے،اور ایک بہترین مقرر بھی تھے۔آکسفورڈ سے واپسی کے بعد آپ رامپور میں ایجوکیشن ڈائریکٹر کی حیثیت سے اپنی خدمات انجام دینے لگے۔اس کے کچھ دنوں بعد آپ اسٹیٹ ہائی اسکول کے پرنسپل مقرر ہوئے۔آپ کی تحریریں انگریزی اور اردو زبان میں ہندوستانی اخبارات کی زینت بنتی رہتی تھیں۔آپ نے صحافت کے میدان میں میں ایک اردو ہفت روزہ بنام ''ہمدرد''اور انگلش ہفت روزہ''کامریڈ''کا اجراء بھی کیا۔مولانا ایک عظیم صحافی تھے،آپ کی تحریریں اتنی شستہ ہوتی تھیں کہ صرف مسلمان ہی یا ہندوستانی ہی نہیں بلکہ انگریز بھی بصد شوق پڑھتے تھے اور ان پڑھنے والوں میں افسر پروفیسر، طلبہ، اسکالر سبھی طرح کے لوگ شامل ہوتے تھے اور سب آپ کی تحریریں دیکھ کر متاثر ہوئے بغیر نہ رہتے تھے۔

آپ ہندوستان کی آزادی کے لیے ہمیشہ کوشاں رہے اور انگریزوں کے خلاف جدوجہد کرتے رہے۔جدوجہد آزادی میں سرگرم حصہ لینے کے جرم میں مولانا کی زندگی کا کافی حصہ قید وبند میں بسر ہوا۔ تحریک عدم تعاون کی

پاداش میں کئی سال جیل میں رہے۔ ۱۹۱۹ء کی تحریک خلافت کے بانی آپ ہی تھے۔ جامعہ ملیہ دہلی آپ ہی کی کوششوں سے قائم ہوا۔ آپ جنوری ۱۹۳۱ء میں گول میز کانفرنس میں شرکت کی غرض سے انگلستان گئے۔آپ نے لندن میں ہونے والی گول میز کانفرنس میں کہا تھا کہ "اگر ہندوستان کو آزادی نہیں دوگے تو یہاں مجھے قبر کے لیے جگہ دے دو، میں غلام ہندوستان میں جانے سے بہتر سمجھوں گا کہ یہیں مر جاؤں ارو مجھے یہیں دفنا دیا جائے۔"

آخر کار گول میز کانفرنس ناکام ہوئی اور آپ وہیں پر داعیٔ اجل کو لبیک کہہ گئے۔آپ کے جسد خاکی کو فلسطین لے جایا گیا اور انبیاء کرامؑ کی سرزمین میں آپ کو ابدی آرام کا اعزاز ملا۔

نپولین بوناپارٹ(Napoleon Bonaparte):

نپولین بوناپارٹ ۱۵ اگست ۱۷۶۹ء کو فرانس کے ایک جزیرے "کورسیکا" میں پیدا ہوا۔ یہ جزیرہ اٹلی کا تھا جس پر اس زمانے میں فرانس کا قبضہ تھا۔ نپولین نے فرانس کے ملٹری اسکول میں تربیت پائی۔ انقلاب فرانس (۵ مئی ۱۷۸۹ء- ۹ نومبر ۱۷۹۹ء) کے دوران وہ انتہا پسند گروپ کا کارکن بھی تھا جو جمہوریت کے خواہش مند تھے۔ وہ محض چوبیس برس کا تھا جب اس کو جرنیل بنا دیا گیا۔ جمہوریہ فرانس کے خلاف ہونے والی بغاوتوں کو اس نے کامیابی سے ناکام بنایا۔ ۱۷۹۶ء میں وہ فرانس کی فوج کے ایک حصہ جس کا نام "اٹلی کی فوج" تھا، کا کمانڈر بنا۔ فرانس کی فوج کا یہ حصہ اٹلی کی سرحد کے ساتھ تعینات تھا۔ شمالی اٹلی میں اس کی جنگی حکمت عملیاں فرانس کے لیے بہت قابل قدر تھیں۔ شمالی اٹلی کے علاقے میں اس نے کامیاب محاذ آرائی کے بعد آسٹریا کو شکست دی اور وینس میں قدیم بادشاہت کا خاتمہ کر کے وہاں جمہوری حکومت قائم کی۔ نپولین نے بری فوج کو جس عمدگی سے استعمال کیا اور جس مہارت سے فوج کی قیادت کی اس بات نے اسے فرانس میں فاتح اور ہیرو کا درجہ دے دیا۔ اس کی ملک میں پسندیدگی اور طاقت تیزی سے بڑھی اس کے باوجود اس نے اقتدار پر قبضہ نہیں کیا اور مصر کے محاذ پر جانے کا اعلان کر دیا۔ یہاں اس کا سامنا انگریزوں کے بحری بیڑے سے تھا، چند چھوٹی چھوٹی کامیابیوں کے علاوہ اس کی یہ مہم ناکامی سے دوچار ہوئی۔ یہاں سے پیرس واپس پہنچا تو فرانس کی سیاسی حالت بہت خراب ہو چکی تھی۔ اس سیاسی ابتری کے دور میں نومبر ۱۷۹۹ء میں اس نے فرانسیسی حکومت کا تختہ الٹ دیا، اسمبلیاں تحلیل کر دیں اور آئین منسوخ کر دیا۔ یوں جمہوریہ کا خاتمہ کر کے خود فرانس کا بادشاہ بن گیا۔ دس سال تک وہ اقتدار پر قابض رہا اور یورپ میں جنگی سرگرمیاں جاری رکھیں، کوئی ہمسایہ ملک اس کی دست برد سے محفوظ نہ تھا۔ انگلستان محض سمندر کی وجہ سے محفوظ رہا کیوں کہ نپولین بحری جنگ سے ہچکچا رہا تھا۔

۱۸۱۲ء میں وہ روس فتح کرنے کے خیال سے پیش قدمی کرتا ہوا روس کے شہر ماسکو پہنچ گیا، اس سے پہلے ہی روسیوں نے اپنے شہر کو خالی کیا اور آگ لگادی تاکہ دشمن کے ہاتھ کچھ نہ آئے اور وہ واپس جانے پر مجبور ہو جائے۔ ہوا بھی ایسا ہی لیکن واپسی کے سفر میں نپولین کی فوج کو شدید سردی نے آگھیرا، برف باری اور جماد دینے والی سردی سے اس کی فوج کو شدید نقصان پہنچا اور تاتاری قزاقوں نے بچی کھچی فوج کو بھی تباہ کر دیا۔ بہت کم فوجی ہی واپس فرانس پہنچنے میں کامیاب ہوئے اور ان کی حالت بھی ناگفتہ بہ تھی۔ اس واقعے نے نپولین کو نفرت زدہ بنا دیا۔

اپریل ۱۸۱۴ء میں اس کو تخت سے اتار کر البا کے جزیرے (Island of Elba) میں بھیج دیا گیا۔ ایک سال سے بھی کم عرصے میں نپولین ایک چھوٹی کشتی پر اس جزیرے سے نکل بھاگا، اور ۲۶ فروری ۱۸۱۵ء کو وہ تن تنہا فرانس کے ایک ساحل پر اترا۔ فرانس کے لوگ اپنے حالیہ حکمران سے تنگ آ چکے تھے اس لیے ایک بار پھر وہ نپولین کے گرد اکٹھے ہونے لگے، حکومت نے جس رجمنٹ کو نپولین کی سرکوبی کی مہم پر بھیجا تھا وہ نپولین کے جھنڈے تلے جمع ہو گئی اور نپولین دوبارہ فاتح بن کر پیرس پہنچا، فرانس کا بوربن بادشاہ لوئس جان بچا کر بھاگ نکلا، نپولین نے اپنے پہلے اقتدار میں یورپ سے جو چھیڑ خانی کی تھی اب اس کا بدلہ لینے کا وقت تھا چناں چہ یورپ کے بہت سے ممالک فرانس پر یلغار کے لیے اٹھ کھڑے ہوئے، بالآخر واٹرلو (Waterloo) کے میدان میں اسے شکست فاش ہوئی۔ اب کی بار اسے سینٹ ہیلینا (Saint Helena) کے جزیرے میں جلاوطن کیا گیا۔ یہ جزیرہ بہت دشوار گزار اور ویران تھا۔ اس جزیرے کا گورنر بھی سفاک فطرت کا مالک تھا اس نے نپولین کے ساتھ سخت اور ناقابل برداشت سلوک روا رکھا۔ ساڑھے پانچ برس تک وہ ذلت اور اذیت برداشت کرتا رہا، بالآخر ۱۸۲۱ء میں اس کا انتقال ہو گیا۔

نطشے فریڈرک ولہلم (Nietzsche, Friedrich willelm):

فریڈرک نطشے ۱۵ اکتوبر سن ۱۸۴۴ء کو موجودہ جرمن صوبے سیکسنی کے ایک گاؤں Röcken میں ایک پادری کے ہاں پیدا ہوئے۔ چار برس کی عمر میں باپ کے سائے سے محروم ہونے کے بعد نطشے کی پرورش ایک ایسے گھرانے میں ہوئی، جہاں صرف خواتین ہی تھیں۔ یوں زیادہ تر وقت گھر سے باہر گذارنے والے نوعمر نطشے کو اپنے ارد گرد کی دُنیا پر غور و فکر کے مواقع ملتے تھے۔

وہ بارہ سال کے تھے، جب مقامی اسکول کے اساتذہ نے موسیقی اور زبان و ادب کے حوالے سے اُن کے اندر چھپی صلاحیتوں کا اندازہ لگا لیا۔ تب نطشے کو اس وقت کے ایک ممتاز تعلیمی ادارے فورٹا کے لیے وظیفہ مل گیا۔ اِسی

بورڈنگ اسکول میں ایک طرف وہ نصابی سرگرمیوں میں نمایاں کارکردگی دکھاتے رہے اور ساتھ ساتھ شاعری اور موسیقی تخلیق کرنے میں بھی مصروف رہے۔

نطشے نے گیت لکھے بھی اور اُن کی دھنیں بھی بنائیں لیکن آگے چل کر اُن کا اصل میدان فلسفے اور لسانیات پر اُن کی معرکۃ الآراء تصانیف بنیں۔ ۲۰ سال کی عمر میں وہ پروٹسٹنٹ کلیسا کے کلاسیکی علمِ لسانیات کے شعبے میں اعلیٰ تعلیم کے لیے بون آئے۔ تاہم بون یونیورسٹی میں ایک ہی سمسٹر کے بعد وہ مشرقی جرمن شہر لائپسگ منتقل ہو گئے۔ وہاں انھوں نے خود کو مکمل طور پر زبان کے کلاسیکی علم اور تاریخی پس منظر میں زبانوں کے تقابلی جائزے پر تحقیق کے لیے مخصوص کر دیا۔ ساتھ ساتھ فلسفے کی دُنیا بھی اُن کی دلچسپی کا محور و مرکز رہی۔

۲۵ سال کی عمر میں وہ بازَل یونیورسٹی میں کلاسیکی لسانیات کے پروفیسر مقرر ہوئے۔ اِسی دوران اُن کی ملاقات مایہ ناز جرمن موسیقار رچرڈ واگنرَ کے ساتھ ہوئی، جن کے اَفکار ہی کے زیرِ اثر نطشے کی کتاب The Birth of Tragedy تخلیق ہوئی۔

موسیقار واگنر کے ساتھ نطشے کی دوستی رفتہ رفتہ انتہا درجے کی دشمنی میں بدلتی چلی گئی۔ بچپن ہی سے مختلف طرح کے عارضوں میں مبتلا نطشے نے بالآخر ۳۵ سال کی عمر میں ہی قبل از وقت پنشن لے لی اور خود کو مکمل طور پر لکھنے لکھانے کے لیے وَقف کر دیا۔ مذہب بیزار نطشے نے خدا کے وجود سے انکار کیا اور اپنی کتابوں The Anti Christ اور A Genealogy of Morals میں یہودی اور مسیحی مذہبی روایات کو شدید تنقید کا نشانہ بنایا۔ وہ اِس دُنیا میں انسان کے وجود کے ایک نئے جواز اور نئے مفہوم کی تلاش میں تھے۔

۴۵ سال کی عمر میں وہ فالج کے پے در پے دَوروں کے بعد ہوش و حواس سے بیگانہ ہوتے چلے گئے۔ اپنی عمر کے آخری برس انھوں نے اپنی والدہ کے ساتھ گذارے اور والدہ کے انتقال کے تین برس بعد ۲۵ اگست ۱۹۰۰ء کو وہ خود بھی انتقال کر گئے۔ اُنہیں اُن کے آبائی گاؤں Röcken میں اُن کے خاندانی قبرستان میں سپردِ خاک کر دیا گیا۔

نطشے کے گاؤں Röcken کے نیچے اور آس پاس کوئلے کے بیش بہا ذخائر موجود ہیں۔ کوئلہ نکالنے والے امریکی ادارے Mibrag نے یہ کوئلہ نکالنے کے لیے اِس گاؤں کو کسی اور جگہ منتقل کرنے کا فیصلہ کیا تھا۔ تاہم ایک طرف اِس گاؤں کے باسیوں نے اپنے مشہورِ عالم فرزند نطشے کی قبر کا واسطہ دیا اور دوسری جانب یہ ادارہ خود بھی اِس نتیجے پر پہنچا کہ اِس گاؤں کو کہیں اور منتقل کرنے پر خرچ زیادہ آئے گا جب کہ یہاں سے برآمد شُدہ کوئلے سے اُتنی آمدنی حاصل نہیں ہو سکے گی۔ چناں چہ حال ہی میں جرمن صوبے سیکسنی آنہالٹ کے وزیرِ اقتصادیات Rainer

Haseloff نے اِس ادارے کے ساتھ کئی ہفتوں کے مذاکرات اعلان کیا کہ نطشے کے گاؤں اور نواح سے کوئلہ نکالنے کا پروگرام منسوخ کر دیا گیا ہے اور اس گاؤں کو کسی اور جگہ منتقل نہیں کیا جائے گا۔ ہر سال دُنیا بھر سے نطشے کے مداح یہ گاؤں دیکھنے کے لیے جاتے ہیں۔

نواب سالار جنگ بہادر:

نواب ابو القاسم اویسی میر یوسف علی خان سالار جنگ سوم جو سالار جنگ سوم کے طور پر مشہور تھے اور تین پیگاہ کے بعد چوتھے حاکم تھے۔ ۱۸ جون ۱۸۸۹ء میں ہندوستان کی ریاست بمبئی میں پیدا ہوئے۔ سالار جنگ کا گھرانا اس کے والد کی طرف سے پانچ نسلوں سے وزیر اعظم کی خدمات سر انجام دے رہا تھا بشمول نواب میر عالم بہادر، نواب میر علی زمان خان منیر الملک، نواب میر محمد علی خان شجاع الدولہ سالار جنگ، نواب میر تراب علی خان سالار جنگ اول، نواب میر لائق علی خان سالار جنگ دوم، شامل ہیں۔ اس کی والدہ کے خاندان کی طرف سے وہ نواب سید غلام علی خان، منصور الدولہ کا پر نواسہ تھا اور بگنا پلی کے نواب، نواب سید بہادر علی خان کرار جنگ منصور الدولہ مدر المہام کا نواسہ تھا۔ نواب میر یوسف علی خان، سالار جنگ سوم حیدر آباد ریاست کے وزیر اعظم تھے جو نواب میر عثمان علی خان ہفتم کے دور حکومت کے تھے۔ اس نے ۱۹۱۲ء میں ۲۳ سال کی عمر میں مہاراجا سر کشن پرشاد، وزیر اعظم کے طور پر کامیابی حاصل کی مگر بعد میں دو سال بعد استعفیٰ دے دیا۔ اس کی وفات پر ۲ مارچ ۱۹۴۹ء میں حیدر آباد ریاست کی حکومت نے ۱۳۵۸ء فاسلی کے سالار جنگ اسٹیٹ (ایڈمنسٹریشن) ریگولیٹر نمبر XXXIV, ایک خاص ضابطہ منظور کیا گیا اور یوسف علی خان کے سارے ملکیتی اثاثے اس ایکٹ کے تحت شامل کیے گئے۔ نواب سالار جنگ سوم، قرآن اور غیر معمولی ادبیات، فن تعمیر، قدیم چیزیں کو جمع کرنے میں دلچسپی رکھتے تھے۔ ۲ مارچ ۱۹۴۹ء میں آپ کا انتقال ہوا۔

ان کا خیال تھا کہ ۳۵ سال کی عمر، ان کے پیسے کا ایک کثیر حصہ ان کے مجموعہ پر خرچ ہوا ہے۔ یہ مجموعہ اب نئے مقام پر ان کے رہائشی دیوان، دیوان دیوڑی سالار جنگ میوزیم میں ۱۹۶۸ء میں نمائش کے لیے رکھا گیا جو ان کی رہائش گاہ کا احاطہ تھا۔ بورڈ آف ریونیو اور کمشنر نے افسران کے منظور شدہ خیال کے تحت ۱۹۸۰ء OS156 کو سول کورٹ جج حیدر آباد نے سالار جنگ سوم کے قانونی وارث اور جانشین کا اعلان کیا جس کا مرحوم نواب سید عبد اللہ اور قانونی وارثوں نے ۵۸ سال کے انتظار کیا تھا۔

ایڈولف ہٹلر(Adolf Hitler):

اڈولف ہٹلر کی پیدائش ۲۰ اپریل ۱۸۸۹ء میں آسٹریا-مجارستان کے شہر برائناؤ ایم ان کے ایک ہوٹل گاستھوف زم پومر نامی ہوٹل میں ہوئی جو سالزبر گرووَرسٹاڈ ۵ اپر واقع ہے۔ یہ شہر باواریا، جرمنی کا پڑوسی شہر ہے۔ اس کی والدہ کلارا ہٹلر الوئس ہٹلر کی تیسری بیوی تھی۔ ہٹلر کا چھ بہن بھائیوں میں چوتھا نمبر تھا۔ ان بڑے بہن بھائیوں میں گستاو ایدا اور اوٹو کا کم عمری ہی میں انتقال ہو گیا تھا۔ ہٹلر کی چھوٹی بہن پاؤلا ہٹلر بھی جوانی کی عمر کو نہ پہنچ سکی۔ جب ہٹلر تین سال کے ہوئے تو ان کا کنبہ پساؤ، جرمنی منتقل ہو گیا۔ ۱۸۹۴ء میں ان کا کنبہ لیوڈنگ (لنز کے قریب) منتقل ہو گیا اور جون ۱۸۹۵ء میں ان کی والد کی ریٹائرمنٹ کے بعد وہ ہیفلڈ (لیمبیک کے نزدیک) ایک زمین کے قطعے پر مکھیوں کی افزائش کرنے لگے۔ ہٹلر نے فشلہیم کے قریب ایک سرکاری اسکول میں تعلیم حاصل کی۔ ان کے والد کی فرانسیسی جرمن جنگ ۱۸۷۰ء-۱۸۷۱ء پر مبنی تصویری کتاب نے ان کی توجہ جنگ وجدل کی جانب لگانے میں بڑا کردار ادا کیا۔

ہیفلڈ میں اسکول کے سخت قوانین کی پاسداری نہ کرنے پر ہٹلر کا اپنے والد سے شدید تنازع رہنے لگا۔ ان کے والد کا ہیفلڈ میں کھیتی کا کام نہ چلا اور ۱۸۹۷ء میں یہ کنبہ لیمبیک کوچ کر گیا۔ آٹھ سالہ ہٹلر نے موسیقی کی تعلیم میں دلچسپی لی اور چرچ میں کوائر گائے، یہاں تک کے انھوں نے پادری بننے کا بھی سوچا۔ ۱۸۹ میں یہ کنبہ مستقل طور پر لیوڈنگ واپس آ گیا۔ ۱۹۰۰ء میں ان کے چھوٹے بھائی ایڈمنڈ کی خسرہ سے موت نے ان پر گہرا اثر چھوڑا۔ اب ہٹلر ایک خوداعتماد اور غیور طالب علم سے ایک خاموش اور اداس شخصیت بن گئے تھے جن کی بات بات پر اپنے والد اور اساتذہ سے نوک جھونک ہوتی رہتی تھی۔

اس دوران الوئس نے کسٹم بیورو میں ایک کامیاب ذریعہ معاش تلاش کر لیا تھا اور اپنے بیٹے کو اپنے نقش قدم پر چلانا چاہتا تھا۔ ہٹلر اس دوران کا ایک واقعہ رقم کرتے ہیں جس میں ان کے والد انھیں کسٹم آفس گھمانے لے گئے مگر وہاں ہونے والے اختلاف نے باپ بیٹے کے درمیان ایک کبھی نہ ختم ہونے والا خلاء پیدا کر دیا۔ اپنے بیٹے کے مصور بننے کی خواہش کے خلاف ستمبر ۱۹۰۰ء میں ہٹلر کو ریئل شول، لنز بھیج دیا گیا۔ اپنی کتاب مین کیمپ میں لکھتے ہیں کہ اس فیصلہ سے بغاوت کرتے ہوئے انھوں نے جان بوجھ کر تعلیم پر یہ سوچ کر توجہ نہیں دی کہ شاید ان کی بری کارکردگی دیکھ کر ان کو اپنا خواب پورا کرنے کا موقع مل جائے۔

دیگر آسٹرین جرمن نژاد افراد کی طرح کم سنی میں ہی ان میں جرمن قوم پرستی کے جذبات موجود تھے۔ وہ اپنے دوستوں کے ساتھ ملتے وقت جرمن خیر مقدم ''ہیل'' اور آسٹرین امپیریل ترانہ کی جگہ ''دشلیند لید'' گاتے تھے۔

۳ جنوری ۱۹۰۳ء میں والد کے انتقال کے بعد ہٹلر کی تعلیمی کارکردگی میں مزید خرابی کے بعد ان کی والدہ نے انھیں اپنی مرضی کی تعلیم حاصل کرنے کی اجازت دے دی جس کے بعد ستمبر ۱۹۰۴ء میں ہٹلر نے ریئلشول، اسٹیر میں داخلہ لے لیا۔ ۱۹۰۵ء میں تعلیمی سفر مکمل کرنے کے بعد کسی مزید تعلیمی یا معاشی سفر کا منصوبہ بنائے بغیر ہٹلر نے اسکول چھوڑ دیا۔

۱۹۱۳ء میں ہٹلر جرمنی چلے آئے جہاں پہلی جنگ عظیم میں جرمنی کی طرف سے ایک عام سپاہی کی حیثیت سے لڑے اور فوج میں اس لیے ترقی حاصل نہ کر سکے کہ افسران کے نزدیک اس میں قائدانہ صلاحیتوں کی کمی تھی۔ ۱۹۱۹ء میں ہٹلر جرمنی کی ورکرز پارٹی کے رکن بنے جو ۱۹۲۰ء میں نیشنل سوشلسٹ جرمن ورکرز پارٹی (نازی) کہلائی۔ ۱۹۲۱ء میں وہ پارٹی کے چیئرمین منتخب ہوئے۔ ۱۹۳۰ء میں منعقد ہونے والے انتخابات میں نازی پارٹی جرمنی کی دوسری بڑی پارٹی بن گئی۔ ۱۹۳۳ء کے انتخابات میں نازی پارٹی اکثریت حاصل نہ کر سکی مگر سب سے بڑی پارٹی کی حیثیت سے پریزیڈنٹ نے ہٹلر کو حکومت بنانے کی دعوت دی اور ہٹلر ملک کے سب سے اعلی عہدے چانسلر تک پہنچ گئے۔ چانسلر بننے کے بعد ہٹلر نے جو سب سے پہلا کام کیا، وہ نازی پارٹی کا فروغ تھا۔ اس مقصد کے لیے انھوں نے اپنے مخالفین کو دبانے کا ہر حربہ آزمایا۔ اس دوران اس نے ملک میں بے روزگاری کے خاتمے اور دوسرے متعدد ترقیاتی اقدامات کے ذریعے سے جہاں جرمنوں کی اکثریت کو اپنا گرویدہ بنایا وہاں انھیں یہ بھی بتایا کہ وہ دنیا کی عظیم ترین اور فاتح قوم ہیں۔ ۱۹۳۹ء میں ہٹلر کی جانب سے پولینڈ پر جارحیت دوسری جنگ عظیم کے آغاز کا باعث بنی۔

دوسری جنگ عظیم کے آخری ایام میں ۳۰ اپریل ۱۹۴۵ء کو ہٹلر نے برلن میں اپنی زیر زمین پناہ گاہ میں اپنی نئی نویلی دلہن ایوان براؤن کے ساتھ خودکشی کر لی۔

ان کے دور حکومت میں نازی جرمنی یورپ کے بیشتر حصے پر قابض رہا جب کہ ان پر ۱۱ ملین یعنی ایک کروڑ ۱۰ لاکھ افراد کے قتل عام کا الزام بھی لگایا جاتا ہے جن میں مبینہ طور پر ۶۰ لاکھ یہودی بھی شامل تھے۔ یہودی ہٹلر کے ہاتھوں اس قتل عام کو ہولوکاسٹ کے نام سے یاد کرتے ہیں۔ ان کا تحریک نازیت میں اہم قردار تھا۔

مورخین کے مطابق ہٹلر ایک نہایت ذہین شاطر عیار ظالم اذیت پسند خصوصیات کا حامل شخص تھا، اس کی شخصیت کو کرشماتی شخصیت کہا جاتا ہے، جب وہ لاکھوں کے مجمع کے سامنے تقریر کے لیے کھڑا ہوتا تھا تو گویا پورے مجمع پر جادو کر دیتا تھا، الفاظ ہٹلر کے لیے کھلونا تھے اور انداز بیان اتنا دلچسپ کا مجمع محصور ہو کر رہ جاتا تھا۔ ہٹلر کی مقبولیت کی بنیاد اس کی پارٹی کے نظریات تھے اور آئندہ چل کر انھیں نظریات کی بنا پر نہ صرف جرمنی کے دو ٹکرے ہوئے بلکہ تاریخ انسانی کی بدترین شخصیتوں میں ہٹلر کا شمار ہوا، آج بھی جس طرح مسلمانوں میں یزید کا نام ایک لعنت سمجھا جاتا ہے مغربی اقوام کے لیے ہٹلر کا نام اسی طرح لعنت تسلیم کیا جاتا ہے، ۱۹۴۵ء میں ہٹلر کے خاتمہ کے بعد شاید کسی ماں نے اپنے بچہ کا نام ہٹلر نہیں رکھا ہو۔

ہٹلر کے نازی نظریات جن کے سامنے پوری جرمنی کی قوم آمنا صدقنا زندہ باد کے نعرہ لگاتی تھی ان نظریات کا کفارہ یہ قوم اب تک ادا کر رہی ہے اور آج کی جرمنی کی نسل اپنے اجداد کی غلطی پر آج تک شرمندہ اور اقوام عالم کے سامنے طلب گار معافی بنی ہوئی ہے۔ ہٹلر کی شخصیت کا ایک پہلو اور ہے جس سے عام لوگ بہت کم واقف ہیں۔ ہٹلر جہاں ایک ذہین اور فطین سیاست دان تھا وہیں اس کی معاشی اصلاحات نے اس کے اقتدار کے اولین سالوں میں ہی جرمنی کو معاشی طاقت اور اہل جرمن کو خوشحال بنا دیا تھا، یہ معاشی ترقی بھی ہٹلر کی مقبولیت کی بڑی وجہ بنی۔

تعلیقات (مقامات)

ایڈنبرا(Edinburgh):

ایڈنبرا اسکاٹ لینڈ کا دارالحکومت ہے۔اس کی آبادی تقریباً ۵لاکھ نفوس پر مشتمل ہے۔اور برطانیہ کا بلحاظ آبادی ساتواں بڑا شہر ہے۔یہ ثقافتی اور تاریخی شہر ہے۔ہر سال لاکھوں سیاح یہاں آتے ہیں۔اس شہر کے ۸۵۰۰ق م تک کے قدیم آثار دریافت ہوئے ہیں۔یکم مئی ۱۷۰۷ء میں ایک ایکٹ کے ذریعے اسکاٹ لینڈ کی پارلیمنٹ کو برطانوی پارلیمنٹ میں ضم کرکے برطانیہ عظمیٰ کی پارلیمنٹ کی بنیاد رکھی گئی۔آج یہ لندن کے بعد برطانیہ کا دوسرا بڑا معاشی اور انتظامی شہر ہے۔۱۹۹۸ء میں "اسکاٹ لینڈ "ایکٹ کے تحت اسکاٹ لینڈ کی پارلیمنٹ کو خود مختاری دی گئی۔اور اب یہ پارلیمنٹ دفاع، خارجہ امور اور ٹیکس کے امور کے علاوہ باقی شعبوں میں خود مختار ہے۔

اسکاچستان/اسکاٹ لینڈ(Scotland):

اسکاٹ لینڈ سلطنت برطانیہ کا حصہ ہے۔اور جزائر برطانیہ کے شمال میں واقع ہے۔ اس کی سرحد جنوب کی طرف انگلستان، مشرق میں شمالی سمندر، جب کہ مغرب اور شمال میں نارتھ چینل اور آئرش سمندر سے ملتی ہے۔ اصل سرزمین کے علاوہ ۷۹۰ چھوٹے جزائر بھی اسکاٹ لینڈ کا حصہ ہیں۔اس کا دارالحکومت ایڈنبرا ہے۔اور سرکاری زبان انگریزی ہے۔ اس کے علاوہ یہاں پر اسکاٹش گیلک بھی بولی جاتی ہے۔اکثریت کا مذہب عیسائیت ہے۔اسکاٹ لینڈ تیل کی دولت سے مالا مال ہے۔۱۷۰۷ء میں اسکاٹ لینڈ اور برطانیہ کا الحاق ہوگیا تھا تاہم اس الحاق کے خلاف شدید مظاہرے ہوئے۔آج بھی اسکاٹ لینڈ کا عدالتی اور قانونی نظام اور جرم وسزا برطانیہ اور آئرلینڈ سے مختلف ہیں۔تاریخ دانوں کے مطابق اسکاٹ لینڈ میں تقریباً ۹۵۰۰ سال قبل انسانوں کی باقاعدہ آبادکاری کا آغاز ہوا۔پہلی صدی عیسوی میں اس پر رومیوں کا قبضہ ہوگیا۔یکم مئی ۱۷۰۶ء کو انگلستان اور اسکاٹ لینڈ ایک معاہدے کے تحت آپس میں ضم ہوگئے اور برطانیہ عظمیٰ کی بنیاد رکھی۔اٹھارہویں صدی عیسوی میں اسکاٹ لینڈ صنعتی انقلاب کی بدولت تجارت اور صنعت کا مرکز بن گیا۔

اسکاٹ لینڈ نے پہلی عالمی جنگ میں بھرپور حصہ لیا۔۱۹۱۱ء کی اڑتالیس لاکھ کی کل آبادی میں سے تقریباً سات لاکھ لوگوں نے جنگ میں حصہ لیا۔دوسری عالمی جنگ میں اسکاٹ لینڈ کا بڑا حصہ تباہ ہوگیا۔

اسکاٹ لینڈ میں جہاز سازی، فولاد کی تیاری اور تیل سے وابستہ صنعت بہت ترقی کر رہی ہے اس کے علاوہ وہسکی، الیکٹرانکس وغیرہ کا بھی برآمدات میں بڑا حصہ ہے۔ اسکاٹ لینڈ تعلیم اور صحت کے معاملے میں بہت آگے ہے۔

اطالیہ/اٹلی(Italy):

یہ جنوبی یورپ میں واقع ہے۔ اس کی سرحدیں آسٹریا، سوئٹزر لینڈ اور فرانس کے ساتھ ملتی ہیں۔ اس میں سان مرینو اور ویٹی کن سٹی کے دو خود مختار ملک پائے جاتے ہیں۔ اس کا صدر مقام روم ہے۔ اس کا کل رقبہ تین لاکھ مربع کلو میٹر سے زائد ہے۔ اور آبادی قریباً چھے کروڑ ہے۔ اس کا نظام حکومت پارلیمانی ہے۔ اور یہ ۲ جون ۱۹۴۶ء میں جمہوریہ بنا۔ یہ دنیا کے پہلے دس امیر ترین ملکوں میں شمار کیا جاتا ہے۔ رومن کیتھولک یہاں کا سب سے بڑا مذہب ہے۔ مسلمانوں کی آبادی تقریباً ۲ فیصد ہے۔ اٹلی ایک تاریخی ملک ہے، اور اس کی تاریخ کئی ہزار سال پرانی ہے۔ ایک اطالوی قبیلے "لاطن" نے آٹھویں صدی قبل مسیح میں رومی سلطنت قائم کی جس نے گردونواح کے علاقوں کو فتح کر کے ایک جمہوریہ کی بنیاد رکھی۔ پہلی صدی عیسوی میں رومی سلطنت ایک عالمی طاقت کے طور پر اُبھری۔ اس پر بازنطینی سلطنت، عربوں، نارمنوں اور ہسپانیہ نے مختلف ادوار میں قبضہ کیا۔

یورپ میں پہلے پہل نشاۃ ثانیہ کا آغاز اٹلی سے ہوا، اور یہاں سے یہ سارے یورپ میں پھیل گئی۔ اس دور میں اٹلی میں سائنس، فنونِ لطیفہ اور سیاحت کا آغاز ہوا اور اٹلی کی ثقافت کو عروج نصیب ہوا۔ یہاں مائیکل انجیلو، لیونارڈو ڈی وینسی، نکولو مکیاویلی، مارکو پولو، کرسٹوفر کولمبس اور گلیلیو جیسے نام پیدا ہوئے جنھوں نے تاریخ کا دھارا موڑ دیا۔

پہلی عالمی جنگ میں جیت کے باوجود اٹلی میں اقتصادی بدحالی پھیل چکی تھی۔ جس کی وجہ سے ۱۹۲۲ء میں فاشسٹ آمریت قائم ہوئی۔ دوسری عالمی جنگ میں اٹلی نے محوری قوتوں کا ساتھ دیا اور شکست کھائی جس سے اٹلی میں خانہ جنگی اور اقتصادی بدحالی کا آغاز ہوا۔

اٹلی کی آزادی کے بعد اس میں جمہوریت قائم ہوئی۔ اور آج اٹلی ایک اقتصادی سپر پاور ہے۔

افغانستان (Afghanistan):

اسلامی جمہوریہ افغانستان ایشیا میں واقع ہے۔اس کے شمال مشرق میں چین، جنوب اور مشرق میں پاکستان، مغرب میں ایران، شمال میں ترکمانستان، ازبکستان اور تاجکستان واقع ہیں۔ یہاں کی غالب اکثریت مسلمان ہے۔

اپنی جغرافیائی اہمیت کی وجہ سے یہ ہمیشہ بیرونی حملہ آوروں کے نشانے پر رہا ہے۔اور یہ ایرانیوں، یونانیوں، ترکوں، عربوں، منگولوں، برطانیہ، سوویت یونین اور اب امریکہ کے قبضے میں ہے۔ تاہم اس کے لوگ جنگجو ہیں اور بیرونی قبضہ کے خلاف ہمیشہ مزاحمت کرتے رہے ہیں، اس کا زیادہ تر حصہ پتھریلے پہاڑی علاقہ پر مشتمل ہے اس لیے بیرونی طاقتیں زیادہ عرصے تک یہاں قابض نہیں رہ سکیں۔ افغانستان کی تاریخ ہزاروں سال پرانی ہے۔ تقریباً ۲۰۰۰ ق م میں آریاؤں نے اس کو تاراج کیا۔ ۳۲۹ ق م میں اس پر سکندر اعظم نے قبضہ کیا۔ بعد کے مشہور حکمرانوں میں محمود غزنوی ۹۹۸ء، چنگیز خان ۱۲۱۹ء، نادر شاہ ۱۷۲۹ء اور احمد شاہ ابدالی ۱۷۴۷ء شامل ہیں۔ ۱۹۷۹ء میں سوویت یونین نے افغانستان میں اپنی فوجیں داخل کیں۔ افغان مجاہدین نے پاکستان اور امریکہ کی مدد سے سوویت یونین کی سپر طاقت کو شکست سے دوچار کیا۔ جس کے نتیجہ میں سوویت یونین کو ۱۹۸۹ء میں مکمل طور پر افغانستان سے نکلنا پڑا۔ ۱۱ ستمبر ۲۰۰۱ء میں ورلڈ ٹریڈ سینٹر واقعہ کے بعد امریکہ نے افغانستان پر حملہ کر کے اس پر قبضہ کر لیا۔ آج کل افغان طالبان اسی غیر ملکی قبضے کے خلاف نبرد آزما ہیں۔

افغانستان چاروں طرف سے خشکی میں گھرا ہوا ملک ہے۔اس لیے اسکی سمندری تجارت پاکستان کے راستے ہوتی ہے۔ افغانستان قدرتی وسائل سے مالا مال ملک ہے۔ مگر یہ وسائل جنگی حالات کی وجہ سے استعمال نہیں ہو پائے۔ افغانستان کی کرنسی افغانی ہے۔ افغانستان کے ۳۴ صوبے (ولایت) ہیں۔ افغانستان میں زیادہ تر لوگ پشتو اور دری زبان بولتے ہیں۔ اسکے علاوہ ازبک، بلوچی، ترکمانی اور اردو بھی بولی جاتی ہے۔

ریاست ہائے متحدہ امریکہ (United states of America):

ریاست ہائے متحدہ امریکہ کو مختصراً امریکہ یا یونائیٹڈ اسٹیٹس بھی کہا جاتا ہے۔امریکہ میں ۵۰ ریاستیں ہیں۔ایک وفاقی ضلع ہے اور پانچ بڑے خود مختار خطے ہیں۔اس کا تقریباً ۳.۷ ملین مربع میل رقبہ ہے اور رقبے کے لحاظ سے دنیا کا تیسرا بڑا ملک ہے۔اس کی آبادی تقریباً ۳۲۵ ملین نفوس پر مشتمل ہے۔اس کا دارالحکومت واشنگٹن ڈی سی ہے اور آبادی کے لحاظ سے اس کا سب سے بڑا شہر نیویارک ہے۔امریکہ کی شمالی سرحد کینیڈا کے ساتھ ملتی ہے، جبکہ اس کے جنوب میں میکسیکو، مشرق میں بحر اوقیانوس اور مغرب میں بحر الکاہل واقع ہیں۔جغرافیہ، آب وہوا اور جنگلی حیات میں بہت تنوع پایا جاتا ہے۔اور یہ دنیا کے چند بڑے متنوع ممالک میں شامل ہے۔

۱۲ اکتوبر ۱۴۹۲ء کو کرسٹوفر کولمبس امریکا کے ساحلوں پر اُترا، اور یہ خطۂ زمین یورپی ممالک کی نو آبادی بن گیا۔ برطانیہ نے رفتہ رفتہ نو آبادیوں پر ٹیکسوں کی بھر مار کر دی جس سے بغاوت پیدا ہونے لگی۔۱۷۸۲ء میں امریکیوں کی طویل جدوجہد اور قربانیوں کے بعد برطانیہ نے امریکا کی خود مختاری کو تسلیم کر لیا۔۱۷۸۹ء تا ۱۷۹۶ء جارج واشنگٹن امریکا کے پہلے صدر رہے۔

امریکا بنیادی طور کئی ریاستوں سے مل کر بنا ہے۔۴۸ ریاستیں مل کر ریاست ہائے متحدہ امریکہ کہلاتی ہیں۔الاسکا اور ہوائی بعد میں اس اتحاد میں شامل ہوئیں۔امریکا کا معاشی نظام مخلوط سرمایہ دارانہ طرز کا ہے۔اس کے علاوہ ٹیکنالوجی، صنعت اور زراعت سے بھی ملکی معیشت کی مضبوطی میں اضافہ ہوا ہے۔قدرتی ذرائع اور معدنیات کی کثرت ہے۔یہاں فی کس آمدنی دنیا میں سب سے زیادہ ہے۔تعلیمی لحاظ سے امریکا بہت آگے ہے۔یہی وجہ ہے کہ یہاں کے لوگ طبقاتی کشمکش سے باہر آچکے ہیں۔البتہ امیر اور غریب علاقوں کی تعلیم اور معیار میں کافی فرق پایا جاتا ہے۔امریکا ذرائع نقل وحمل میں بھی پوری دنیا سے آگے ہے۔یہاں بڑی بڑی سڑکوں کا جال بچھا ہوا ہے۔اس کے علاوہ ریلوے نیٹ ورک کو پورے ملک تک پھیلانے کے لیے بہت محنت کی گئی ہے۔ہوائی اڈے بھی تمام بڑے شہروں میں موجود ہیں۔لوگ زیادہ تر فضائی سفر اختیار کرتے ہیں۔یہاں کے ہوائی اڈے دنیا کے مصروف ترین ہوائی اڈے ہیں۔بندرگاہیں بھی دنیا کی مصروف اور بڑی بندرگاہوں میں شمار ہوتی ہیں، کیلی فورنیا، لانگ بیچ، نیویارک اور نیوجرسی کی بندرگاہیں سب سے زیادہ مشہور ہیں۔

کھیلوں کے میدان میں بھی امریکا نمایاں مقام رکھتا ہے۔بیس بال کو وہاں قومی کھیل کا درجہ حاصل ہے۔اس کے علاوہ فٹ بال اور باسکٹ بال کو بھی مقبولیت حاصل ہے۔دنیا بھر میں کھلاڑیوں کو سب سے زیادہ معاوضہ امریکا میں

ملتا ہے۔اولمپک مقابلوں میں امریکا نے بہت سے تمغے جیتے ہیں۔امریکا سرمائی کھیلوں میں ۲۱۸ تمغے لے کر تیسرے نمبر پر جبکہ گرمائی کھیلوں میں ۲۳۲۱ تمغے لے کر پہلے نمبر پر ہے۔ ماحولیات کے تحفظ اور معدومیت کے خطرے سے دوچار جانوروں اور پودوں کو بچانے میں بھی امریکا نے سب سے پہلے عملی اقدامات کا آغاز کیا۔دنیا کا سب سے پہلا نیشنل پارک امریکا میں YellowStone کے نام سے بنایا گیا۔اس کے علاوہ یہاں ۲۸٪ رقبہ جنگلات اور جنگلی حیات کے لیے مختص ہے۔

امریکا میں دنیا کی سب سے بڑی اور طاقتور فوج ہے۔چودہ لاکھ فوجیوں کے علاوہ کئی نیشنل گارڈ اور ریزرو فوجی بھی موجود ہیں۔امریکا کا فوجی بجٹ اپنے بعد آنے والے چودہ ممالک کے فوجی بجٹ سے بھی زیادہ ہے۔لیکن یہ اس کی آمدنی کا چار فی صد ہے۔دنیا کے تمام براعظموں میں امریکی فوجی مراکز موجود ہیں۔

انگلستان(England):

انگلستان متحدہ سطلنت برطانیہ کا حصہ ہے۔اس کی سرحدیں شمال میں اسکاٹ لینڈ اور مغرب میں ویلز سے ملتی ہیں۔اس کے شمال مغرب میں آئرش سمندر، جنوب مغرب میں سیلٹک سمندر اور جنوب میں انگلش چینل ہیں۔یوں یہ ملک یورپ سے الگ جزیرہ ہے۔جس کی سرحدیں خشکی پہ صرف برطانیہ کے دوسرے دو حصوں اسکاٹ لینڈ اور ویلز سے ہی ملتی ہیں۔اس کے علاوہ انگلستان میں ۱۰۰ سے زیادہ چھوٹے چھوٹے جزائر بھی شامل ہیں۔

انگلستان کی تاریخ بہت پرانی ہے۔ پتھر کے زمانے سے یہاں انسانی آبادی کے آثار پائے گئے ہیں۔ ۹۲۷ عیسوی میں انگلستان ایک متحدہ ریاست بن گیا تھا۔پندرہویں صدی کی ابتدا میں دریافتوں کا دور شروع ہوا تو دنیا بھر میں انگلستان کو ثقافت اور قانون کے لحاظ سے مرکزی حیثیت حاصل ہوگئی، یہاں کے پارلیمانی جمہوری نظام کو بھی دنیا کے بہت سے ملکوں نے اپنایا۔ اٹھارہویں صدی میں صنعتی انقلاب کی ابتداء بھی انگلستان سے ہوئی۔ انگلستان کی رائل سوسائٹی نے تجرباتی سائنس کی بنیاد رکھی۔

انگلستان نے ملک میں امن وامان کی بحالی اور ترقی کے لیے زیادہ تر حکومتی اختیارات بادشاہ سے پارلیمان کو منتقل کیے اس کے پس منظر میں فسادات اور خانہ جنگی بھی ہوئی۔ جس میں بادشاہ وقت چارلس اول کو موت کے گھاٹ اتار دیا گیا۔تاہم ۱۶۶۰ء میں چارلس دوم کو دوبارہ بادشاہ بننے کی دعوت دی گئی اور آئین کے تحت بادشاہ کے اختیارات محدود کر دیے گئے۔۱۶۸۹ء میں پارلیمان کو قانون سازی کی اجازت دے کر بادشاہ کو آئین میں مداخلت سے روک دیا

گیا، یوں بادشاہ کے اختیارات محدود تر ہو گئے اب وہ نہ فوج بنا سکتا ہے۔ نہ قانون بنا سکتا ہے اور نہ کوئی ٹیکس لگا سکتا ہے۔

اُنیسویں صدی تیز رفتار سائنسی ایجادات کی صدی ہے جس کی ابتداء انگلستان سے ہوئی۔ ۱۸۲۵ء میں بھاپ سے چلنے والا سب سے پہلا ریلوے انجن لگا کر گاڑی بنائی گئی اور عوام کے لیے چلادی گئی۔ صنعتی انقلاب نے شہری زندگی کا آغاز کیا۔ وکٹورین دور میں لندن آبادی کے لحاظ سے دنیا کا سب سے بڑا شہر بن گیا۔ سیاسی اور شہری زندگی میں اصلاحات اور ترقی ہونے لگی۔ افواج نے ترقی کی، سرحدیں مضبوط ہوئیں اور کمزور ممالک کو نوآبادیوں میں تبدیل کیا جانے لگا۔

عظیم جنگوں کے زمانے میں انگلستان کو بھی قربانیاں دینی پڑیں۔ اس کے ہاتھ سے کئی نوآبادیاں نکل گئیں۔ داخلی لحاظ سے انگلستان میں خواتین نے ترقی کی۔ عوام کی صحت کی ضروریات پوری کرنے کے لیے قومی صحت کا ادارہ بنایا گیا۔ انگلستان میں دنیا کے بہترین تعلیمی ادارے اور یونیورسٹیاں قائم ہیں۔ دنیا بھر سے سیاح، ملازمین اور طالبعلم انگلستان کا رخ کرتے ہیں۔

ایران (Iran):

اسلامی جمہوریہ ایران جس کا پرانا نام فارس ہے۔ جنوب مغربی ایشیا کا اسلامی ملک ہے۔ اس کے شمال میں آذربائیجان، آرمینیا اور ترکمانستان، مشرق میں پاکستان اور افغانستان، اور مغرب میں ترکی اور عراق واقع ہیں۔ اس کے جنوب میں خلیج فارس ہے۔ ایران کی تہذیب دنیا کی قدیم ترین تہذیبوں میں شمار کی جاتی ہے۔ حضرت عیسیٰؑ کی پیدائش سے چار ہزار سال سے پہلے کے دور میں بھی یہاں انسانی آبادی کا سراغ ملتا ہے۔ مختلف قبائل نے ایران میں مل کر رہنے کا آغاز سات سو قبل مسیح میں کر دیا تھا۔ اور اگلی ہی صدی میں ان کی حکومت بہت بڑے خطۂ ارضی پر پھیل گئی۔ اس کے پھیلاؤ میں مشرقی یورپ سے وادیٔ سندھ تک کا علاقہ شامل تھا۔ یہ رقبے کے لحاظ سے تاریخ کی بڑی حکومت تھی، ۳۳۴ ق م میں اسکندر اعظم کے حملے نے اس کو سات ٹکڑوں میں تقسیم کر دیا۔ ساتویں صدی عیسوی میں حضرت سعد بن ابی وقاص نے ایران کو فتح کیا اور یہاں اسلامی حکومت قائم کی۔ اسلامی حکومت کے دورِ زریں (۶۲۲ء-۷۵۰ء) میں ایران نے بھی بہت خدمات سرانجام دیں۔ شاہ اسماعیل اول نے سولہویں صدی میں یہاں شیعہ فرقہ کو فروغ دیا۔ اور آج ایران دنیا کا واحد ملک ہے جو سرکاری طور پر شیعہ فرقہ سے وابستہ ہے۔ اسی وجہ سے ایران کی سُنی عثمانی سلطنت سے کئی بار جنگ ہوئی۔ خلافت کے حق دار کے تنازعے نے بعد میں بھی ایران کی سیاست پر گہرے اثرات مرتب کیے۔

ایران کی روس کے ساتھ (۱۸۰۴ء-۱۸۱۳ء) اور (۱۸۲۶ء-۱۸۲۸ء) کے دوران جنگیں ہوئیں۔ جس کے نتیجے میں ایران کو اپنے کچھ علاقوں سے ہاتھ دھونا پڑے۔ آج بھی شمالی قفقاز پر اس کا دعویٰ ہے۔ جبکہ جنوبی قفقاز کا کچھ حصہ ایران کے پاس ہے۔

ایران میں خانہ جنگی، قحط، احتجاج اور انارکی کے طویل دور کے بعد آخر کار ۱۹۰۵ء میں آئینی انقلاب آیا، اور پہلا آئین بنا۔ ۱۹۰۶ء میں پہلی پارلیمنٹ وجود میں آئی۔ پہلی جنگِ عظیم کے دوران برطانیہ نے مغربی ایران کے بیشتر علاقہ پر قبضہ کر لیا۔ ۱۹۲۱ء میں برطانیہ مکمل طور پر ایرانی علاقوں سے دستبردار ہو گیا۔ دوسری جنگِ عظیم میں گو کہ ایران نے غیر جانب دار رہنے کا اعلان کیا، اس کے باوجود جرمنی، روس اور اتحادی ممالک کی مداخلت اور کارروائیوں کا نشانہ بنا۔ اتحادی ممالک نے بادشاہِ وقت رضا شاہ کو تخت چھوڑنے پر مجبور کیا اور ان کے بیٹے محمد رضا شاہ پہلوی کو اقتدار کا مالک بنا دیا۔ تا کہ اتحادی ممالک جرمنی کے خلاف اپنی جنگ میں ایران کا راستہ بطور راہداری استعمال کر سکیں۔ ۱۹۷۳ء میں تیل کے بحران نے ایرانی معیشت پر برے اثرات مرتب کیے، ایران غیر ملکی کرنسی کی وجہ سے افراطِ زر کا شکار ہو گیا۔ اور اس کا معاشی ڈھانچہ ٹوٹ پھوٹ کا شکار ہو گیا۔ ۱۹۷۵ء اور ۱۹۷۶ء میں بد عنوانی اور بے روزگاری عروج پر تھی اور رضا شاہ پہلوی کے خلاف احتجاج ہونے لگے۔

۱۹۷۹ء میں ایران میں انقلاب برپا ہوا جسے بعد میں "اسلامی انقلاب" کا نام دیا گیا۔ ۱۹۷۹ء میں ہی وہ آئین بنا جو آج بھی ایران میں نافذ ہے۔ ایران کے آئین میں اسلامی تعلیمات کو راہنما بنایا گیا ہے اور ان تعلیمات کو سیاست سے لے کر سماج تک ہر مرحلہ پر بنیادی حیثیت حاصل ہے۔

ایسٹ بورن(Eastbourne):

ایسٹ بورن برطانیہ کا قصبہ ہے۔ یہاں سمندری ساحل اور سیر گاہ ہے۔ برطانیہ کی سب سے بلند، چاک کی سمندری چٹانیں بھی ایسٹ بورن میں ہیں۔ یہ انگلستان کے جنوب مشرقی حصے میں واقع ہے۔ اس قصبے کا رقبہ ساڑھے سترہ مربع میل ہے اور ۲۰۱۷ء میں اس کی آبادی کا تخمینہ ایک لاکھ تیس ہزار نفوس تک لگایا گیا ہے۔ انگلستان کی تاریخ بہت پرانی ہے اسی لحاظ سے ایسٹ بورن کا علاقہ بھی پتھر کے زمانے یعنی قریباً ۵۰۰ قبل از مسیح سے انسانی آبادی کا علاقہ ہے، ابھی تک یہاں رومیوں کی لاشیں اور ان کے دور کے آثار ملتے رہتے ہیں۔ انیسویں صدی کے وسط میں یہ قصبہ دو آدمیوں کی ملکیت تھا اور طویل عرصے تک غیر آباد رہا۔ ۱۸۴۹ء میں برطانوی ریلوے کی آمد سے اس میں زندگی اور

رونق بحال ہوئی۔ برطانیہ کے سب سے بڑے کتاب بازار کے علاوہ دیگر کاروباری اور ترقیاتی سرگرمیاں یہاں کے لوگوں کی دلچسپی کا مرکز بنتی ہیں۔

آسٹریلیا(Australia):

دولت مشترکہ آسٹریلیا Commonwealth of Australia چھ کالونیوں پر مشتمل ایک فیڈریشن ہے، دنیا کے سب سے چھوٹے براعظم میں واقع ہے اور جنوب کی سمت میں ہے۔اس کے ساتھ کئی چھوٹے چھوٹے جزائر بھی اس کا حصہ ہیں۔ دولت مشترکہ آسٹریلیا کم وبیش پورے براعظم کو اپنے اندر لیے ہوئے ہے۔اس کے شمال میں مشرقی تیمور، انڈونیشیا، شمال مشرق میں سولومن جزائر، وانواتو اور جنوب مشرق میں نیوزی لینڈ واقع ہے۔

آسٹریلیا میں آج بھی بیالیس ہزار سال پرانی نسل آباد ہے۔ ۱۷۷۰ء میں آسٹریلیا کے مشرقی حصے پر برطانیہ نے دعویٰ کیا اور پھر ۱۷۸۸ء میں نیو ساؤتھ ویلز کی کالونی میں شامل کر لیا۔انیسویں صدی کی آمد تک آسٹریلیا کے علاقے میں برطانیہ کی پانچ مزید کالونیاں بن چکی تھیں۔

براعظم آسٹریلیا میں ستر ہزار سال قبل تک کے انسانی آبادی کے آثار ملتے ہیں۔ مختلف ادوار میں دوسرے علاقوں کے باشندے یہاں سمندر پار کر کے آتے رہے اور جن علاقوں میں سمندر زیادہ پھیلا ہوا نہیں۔ وہاں سے بھی انسانی آبادی نے اس جزیرہ نما براعظم پر اپنے قدم رکھے۔ آسٹریلیا میں داخل ہونے والے ابتدائی لوگ زیادہ تر شکاری تھے۔ان کی رہائش اور کھانے پینے کا دارومدار جنگل پر تھا۔ ۱۶۰۶ء میں پہلا ڈچ یورپیَن آسٹریلیا پہنچا۔ ڈچ بحری جہاز کے ملاحوں، مچھیروں اور کاروباری لوگوں نے آسٹریلیا کے مغربی اور شمالی ساحلی علاقوں کو اپنے تصرّف میں لے لیا۔ اور اس کا نام نیو ہالینڈ رکھا۔ ۱۷۷۰ء میں جیمز کُک نے شمال مغربی ساحلی علاقوں کا دورہ کیا اور نقشہ بنایا، ساتھ ہی اس کو نیو ساؤتھ ویلز کا علاقہ کہہ کر برطانوی ملکیت کا دعویٰ کر دیا۔ ۱۷۸۳ء میں برطانیہ نے اپنے مجرموں کو ملک بدر کرنے کے لیے جس علاقے کا انتخاب کیا وہ آسٹریلیا ہے اور ۲۶ جنوری کو اس علاقے میں اس مقصد کے لیے پہلا کیمپ قائم کیا گیا اور پرچم لہرایا گیا۔اسی مناسبت سے ۲۶ جنوری جسے یوم آسٹریلیا بھی کہا جاتا ہے پورے ملک میں قومی دن کے طور پر منایا جاتا ہے۔

آسٹریلیس کے لفظ سے اس کا نام بنا۔لاطینی زبان کے اس لفظ کا مطلب ہے "جنوب کی طرف"۔آسٹریلیا آج ایک خوش حال اور ترقی یافتہ ملک ہے۔ دنیا کی سب سے بڑی مونگے کی چٹان آسٹریلیا کے شمال مشرقی ساحل کے ساتھ ہے اور دو ہزار کلومیٹر پر پھیلی ہوئی ہے۔ آسٹریلیا کی زمین زیادہ تر نیم بنجر اور صحرائی ہے۔اس کی مٹی بھی بہت کم زرخیز ہے،

یہاں پر جنگلات بھی ہیں اور آسٹریلیا کی زمین کی انفرادیت، موسم اور آب وہوا کی وجہ سے یہاں کی جنگلی حیات خاص طور پر حشرات دنیا کے کسی اور ملک میں دکھائی نہیں دیتے۔ آسٹریلیا میں معدومیت کے خطرے سے دوچار حیوانات اور نباتات کے تحفظ کے لیے سرکاری سطح پر کوششیں کی جارہی ہیں۔

آکسن ہل۔ مرگ لینڈ۔ امریکہ۔ یوایس (Oxon Hill- Margland- America- (U. S.):

آکسن ہل ریاست ہائے متحدہ امریکہ میں جنوبی پرنس جارج کاؤنٹی میں میری لینڈ میں واقع ہے۔ اس کا شمار واشنگٹن کے مضافات میں ہوتا ہے۔ پوٹومیک دریا(Potomac River) کے کنارے موجود قومی ہاربر ڈویلپ مینٹ(National Harbor Development) کا ۳۰۰ایکڑ رقبہ بھی اسی علاقے میں شامل ہے۔ ۲۰۱۰ء میں اس علاقے کو گلاس مینور(Glassmanor) سے الگ کیا گیا تھا،اس وقت آکسن ہل کی آبادی ۱۷۸۰۰ کے لگ بھگ تھی۔ ۱۹۲۹ء میں اس علاقے میں ایک نیو۔ جارجین(neo-Georgian) مکان تھا جو انچاس کمروں پر مشتمل تھا، اسی میں جارج کاؤنٹی کا شہزادہ قیام کرتا تھا، اس مکان کا نام "آکسن ہل مینور(Oxon Hill Manor)" تھا۔ اس محل کے نام پر بعد میں اس علاقے کا بھی یہی نام پڑ گیا۔

اب اس علاقے میں سے مصروف شاہراہ گزرنے سے آبادی میں کافی اضافہ ہو گیا ہے۔ ۲۰۰۸ء میں جب اس کا پُل بنا اور ہائی وے اور انٹر چینج کی تعمیر نو ہوئی تو کئی دہائیوں کے بعد یہاں ٹریفک کا بہاؤ رواں ہوا، جس سے اس کی معیشت میں استحکام پیدا ہوا۔

یہاں کے رہائشی بڑے بڑے گھروں میں رہتے تھے گھروں کے ساتھ باغیچے اگانا بھی پسند کرتے تھے۔ لیکن ۱۹۹۰ء کے بعد یہاں باہر سے آنے والے لوگ بھی آباد ہوئے۔ یہاں ترقی کے کئی منصوبے کام کررہے تھے جس کی وجہ سے بہت سے سائنس دان یہاں آکر رہنے لگے۔ ساتھ ساتھ یہاں بازار، دکانیں، پارک اور ساحل سمندر کے کنارے ترقی کرتے گئے۔ یہاں کا موسم اور آب وہوا بھی معتدل ہے۔ یہی وجہ ہے کہ سیاحوں کے لیے یہ مقام پرکشش بن گیا۔ قومی ہاربر کے اثرات کے باوجود تفریحی اور سیاحتی سرگرمیاں قائم ہوئیں، تعلیمی نظام نے ترقی کی، عوام کے لیے کتب خانے بھی قائم ہیں بلکہ یہ امریکہ کی سب سے بڑی کتابوں کی منڈی ہے۔

یہاں قریب کے سمندر میں امریکہ کی سب سے بلند چاک کی چٹان بھی ہے جس کو دیکھنے کے لیے سیاح یہاں آتے ہیں۔

برطانیہ عظمیٰ۔ مملکت متحدہ برطانیہ عظمیٰ و شمالی آئرستان

:(Great Britain- United Kingdom and Northern Ireland)

مملکت متحدہ برطانیہ شمال مغربی یورپ کا ایک ملک ہے۔ یہ جزیرہ برطانیہ اور شمالی آئرلینڈ کے علاوہ آس پاس کے مختلف جزیروں کو بھی اپنے اندر سموئے ہوئے ہے۔ برطانیہ کے سیاسی اتحاد میں انگلستان، اسکاچستان، ویلز اور شمالی آئرستان شامل ہیں۔ اس کے علاوہ برطانیہ کے مقبوضہ علاقے بھی اس میں شمار کیے جاتے ہیں۔ برطانیہ ایک ترقی یافتہ ملک ہے۔ دنیا کی پانچویں اور یورپ کی دوسری بڑی معیشت ہے۔ آبادی کے لحاظ سے یہ یورپی دنیا کا تیسرا بڑا ملک ہے۔ برطانیہ یورپ کا مشہور ملک ہے۔ یورپ کے دیگر خطوں سے ہجرت کر کے آباد ہونے والے برٹن قبیلے کی وجہ سے اس کا نام برطانیہ پڑا۔ حضرت عیسیٰؑ کی پیدائش کے قریباً ۱۵۰ سال بعد یہاں کے لوگوں نے بھی عیسائیت قبول کر لی۔ اس کی وجہ رومی حکومتوں کا اثر ورسوخ تھا۔ رومیوں کی حکومت برطانیہ اور دوسری یورپی اقوام پر حملوں سے علاقائی حکومتوں کے قیام کی راہ ہموار ہوئی اور برطانیہ چھوٹے چھوٹے خود مختار علاقوں میں بٹ گیا۔ آٹھویں صدی عیسوی میں ڈنمارک کے ڈین قبائل کے حملے شروع ہوئے اور تاریخ میں اپنی سفاکی کے لیے مشہور قوم وائی کنگ نے برطانیہ پہ قبضہ کا خواب دیکھا اور تعبیر پانے کے لیے جنگ چھیڑ دی۔ اس زمانے میں برطانیہ کے بہادر بادشاہ الفریڈ نے برطانیہ کا دفاع مضبوط کیا۔ الفریڈ نے ہی برطانیہ کی حدود متعین کیں اور وائی کنگ کے ساتھ امن معاہدہ کیا۔ ۱۰۴۲ء میں الفریڈ کا انتقال ہوا اور رفتہ رفتہ حکومت نارمنوں کے ہاتھ میں چلی گئی۔

سولہویں صدی کے آغاز میں برطانیہ میں آزاد ریاستوں کی تعداد گھٹتے گھٹتے ۲ ہو چکی تھی۔ برطانوی شہنشاہیت اور اسکاچستان "قانون اتحاد" کے بعد ۱۸۰۰ء میں برطانیہ میں آئرستان کی شمولیت ہوئی۔ اور رفتہ رفتہ آئرستان انگریزوں کے کنٹرول میں آ گیا۔ اور یوں ۱۸۰۱ء میں برطانیہ "برطانیہ عظمیٰ" اور آئرستان بن گیا۔ بیسوی صدی میں ویلز اور اسکاچ عوام میں قومی شعور بیدار ہوا تو مسائل کو حل کرنے کے لیے پارلیمنٹ میں شمالی آئرلینڈ، اسکاچستان اور ویلز کے لیے بھی اسمبلیاں بنائی گئیں۔

برطانیہ میں اب تک آئینی بادشاہت قائم ہے۔ ملکہ ایلزبتھ دوم پندرہ دیگر مشترکہ ریاستوں کے علاوہ برطانیہ عظمیٰ کی ملکہ ہیں۔ ان کو مشورہ دینے حوصلہ دینے اور تنبیہ کرنے کا حق حاصل ہے۔ برطانیہ دنیا کے ان چار ممالک میں شامل ہے جن کا کوئی باقاعدہ تدوین شدہ آئین نہیں ہے بلکہ الگ الگ تحریری دستاویزات ہیں۔ برطانیہ کا نظام حکومت پوری دنیا کے لیے مشعل راہ ثابت ہوا، اور بہت سے ممالک نے اس کی تقلید کی۔ برطانیہ میں ویسٹ منسٹرز نظام کی پا

رلیمانی حکومت ہے۔ جس کے دوایوان ہیں۔ایک منتخب ایوان زیریں House of Commons اور دوسرا مقررہ ایوان بالا House of Lords۔ برطانوی حکومت کا سربراہ وزیراعظم ہوتا ہے۔ جو پارلیمان کا رکن ہوتا ہے اور ایوان زیریں کی اکثریتی رائے سے منتخب ہوتا ہے۔

برطانیہ ترقی یافتہ ملکوں کی صف میں شامل ہے اور شہری سہولیات ذرائع نقل وحمل، ذرائع ابلاغ، کاشت کاری، صنعتیں، موسیقی، فنون لطیفہ، سینما، ادب، ثقافت، کھیل، صحت، اور سائنس و ٹیکنالوجی کے لحاظ سے کافی آگے ہے۔اور تیزی سے ترقی کی منزلیں طے کر رہا ہے۔

برلن (Berlin):

یہ جرمنی کا دارالحکومت اور ملک کا سب سے بڑا شہر ہے جب کہ یورپ کا دوسرا بڑا شہر ہے۔۲۰۱۷ء کی مردم شماری کے مطابق برلن کی آبادی سینتیس (۳۷) لاکھ سے زائد ہے اور اس شہر کا رقبہ ۳۴۴٫۳ مربع میل ہے۔اس شہر میں بہت سے دریا، نہریں اور ندی نالے اور باغات ہیں۔

تیرہویں صدی عیسوی سے اس کا تاریخ میں ذکر ملتا ہے۔ برلن شہر سلطنت پروشیا (۱۷۰۱ء سے) سلطنتِ جرمنی (۱۸۷۱ء سے ۱۹۱۸ء) جمہوریہ ویمار (۱۹۱۹ء سے ۱۹۳۲ء) اور نازی جرمنی (۱۹۳۳ء سے ۱۹۴۵ء) کا دارالحکومت رہا۔ دوسری جنگِ عظیم میں شکست کے بعد اس شہر کو اتحادی افواج نے دو حصوں میں تقسیم کر کے آپس میں بانٹ لیا۔ مشرقی برلن کو مشرقی جرمنی کا دارالحکومت بنا دیا گیا۔ ۱۹۹۰ء میں جب مشرقی اور مغربی جرمنی کے درمیان دیوارِ برلن کو گرا کر دوبارہ متحد کیا گیا تو (متحدہ) جرمنی کا دارالحکومت برلن کو بنایا گیا۔ برلن سیاحت اور ہائی ٹیک (Hi-Tech) انڈسٹری کے حوالے سے بہت مشہور ہے۔اس کے حیاتیاتی باغات تعلیمی اغراض و مقاصد کے لیے یورپ میں سب سے زیادہ مشہور ہیں۔اس کے علاوہ برلن مصوری، فنونِ لطیفہ، سینما انڈسٹری اور فنِ تعمیر کے میدان میں بیسویں صدی کے آغاز سے زبردست ترقی کر رہا تھا لیکن دوسری عالمی جنگ میں برلن کو اتحادی حملوں کی وجہ سے شدید نقصان اٹھانا پڑا۔

۲۰۰۶ء میں برلن میں فیفا ورلڈ کپ فٹبال (FIFA World Cup) کا فائنل بھی منعقد ہوا۔ برلن سیر و سیاحت کا بہت بڑا مرکز ہے اور ایک اندازے کے مطابق یہاں تقریباً ۱۸۰ ملکوں کے باشندے رہتے ہیں۔

ممبئی/سابق نام: بمبئی(Mumbai):

بھارت کی ریاست مہاراشٹر کا دارالحکومت ہے۔ تقریباً ایک کروڑ ۴۲ لاکھ کی آبادی کا حامل یہ شہر آبادی کے لحاظ سے دنیا کا دوسرا سب سے بڑا شہر ہے۔ اپنے مضافاتی علاقوں 'نوی ممبئی' اور 'تھانے' کو ملا کر یہ دنیا کا چوتھا سب سے بڑا شہری علاقہ بنتا ہے جس کی آبادی تقریباً ایک کروڑ ۹۰ لاکھ بنتی ہے۔ ممبئی بھارت کے مغربی ساحل پر واقع ہے اور یہاں ایک گہری قدرتی بندرگاہ یموجود ہے۔ بھارت کی نصف سے زائد بحری تجارت ممبئی کی بندرگاہ سے ہوتی ہے۔

یہ شہر تیسری صدی قبل مسیح میں سلطنت موریہ نے سات جزائر پر ہندو و بدھ ثقافت کے مرکز کی حیثیت سے قائم کیا۔ بعدازاں یہ جزائر مختلف سلطنتوں کا حصہ رہے اور بالآخر سلطنت برطانیہ کی ایسٹ انڈیا کمپنی کے زیرِ نگیں آئے جس نے ان سب کو ملا کر بمبئی کا نام دیا۔ اٹھارویں صدی کے وسط میں یہ ایک اہم تجارتی قصبے کی حیثیت سے ابھرا۔ انیسویں صدی میں اقتصادی و تعلیمی سرگرمیوں نے شہر کو شناخت بخشی۔ بیسویں صدی کے دوران یہ بھارت کی آزادی کی تحریک کا ایک اہم مرکز رہا اور ستیا گرہ تحریک اور بحریہ کی بغاوت یہیں سے سے پھوٹیں۔ ۱۹۴۷ء میں ہندوستان کی آزادی کے بعد شہر کر ریاستِ بمبئی کا حصہ بنایا گیا تھا۔ ۱۹۶۰ء میں ایک تحریک کے بعد مہاراشٹر کی نئی ریاست تشکیل دی گئی اور بمبئی کو اس کا دارالحکومت بنایا گیا ۱۹۹۶ء میں شہر کا نام بدل کر ممبئی کر دیا گیا۔

ممبئی، بھارت کی معیشت میں ریڑھ کی ہڈی کی حیثیت رکھتا ہے۔ شہر میں ہندی فلموں اور ٹیلی وژن صنعت کا مرکز بھی واقع ہے جو " بالی ووڈ " کہلاتا ہے۔ ممبئی میں کاروبار کے وسیع امکانات اور بہتر طرز رہائش کے مواقع ہیں جو اسے بھارت بھر کے لیے لوگوں کے لیے پر کشش بناتے ہیں اور یوں یہ شہر مختلف طبقات اور ثقافتوں کا مرکز بن چکا ہے۔

بنارس/وارانسی (Varanasi):

اسے وارانسی (Varanasi) اور کاشی بھی کہا جاتا ہے۔ یہ اترپردیش کا تاریخی شہر ہے اور گنگا کے بائیں کنارے پر آباد ہے۔ اس کا اصل نام وارانسی ہے جو بگڑ کر بنارس ہو گیا۔ ہندوؤں کے نزدیک یہ بہت متبرک شہر ہے۔ اسے مندروں کا شہر بھی کہا جاتا ہے۔ اس شہر کا رقبہ تقریباً ۱۳۱۳مربع کلومیٹر ہے اور اس کی آبادی تقریباً بارہ لاکھ افراد پر مشتمل ہے۔

بنارس صدیوں سے مذہبی اور ثقافتی سرگرمیوں کا مرکز ہے۔ بھارت کے بہت سے مشہور شاعر، فلسفی اور مصنفین کا تعلق بنارس سے رہا ہے ان میں کبیر، رامانند، گوسوامی، منشی پریم چند، تلسی داس، جیشکر پرشاد، رام چندر شکلا، پنڈت روی شنکر، استاد بسم اللہ خان، پنڈت ہری پرساد چورسیا کچھ اہم نام ہیں یہاں بھوج پوری بولی جاتی ہے۔

بنارس ایک نہایت قدیم شہر ہے۔ ہندوؤں کی مذہبی کتابوں کے مطابق ''شیو'' نے تقریباً پانچ ہزار سال قبل کاشی شہر کی تعمیر کی۔ ہزاروں سال پہلے آریاؤں نے یہاں کے مقامی افراد کو شکست دے کر یہاں پر قبضہ کیا۔

"مہابھارت" (جو ہندوستان کی قدیم اور طویل ترین منظوم داستان ہے جسے ہندومت کے مذہبی صحائف میں معتبر حیثیت حاصل ہے) میں پانڈوں اور کوروؤں کی لڑائی کے سلسلے میں بھی کاشی شہر کا تذکرہ ہے۔

بابا گرونانک نے سولہویں صدی کے اوائل میں اس شہر کا دورہ کیا۔ اکبر بادشاہ کے دَور میں اس شہر کو خاصی ترقی ملی اور بہت سے مندر بنائے گئے۔ شیر شاہ سوری نے اس کو پشاور اور کلکتہ کے ساتھ بذریعہ سڑک ملا دیا۔ بھارت کا اہم دریا گنگا بھی یہاں بہتا ہے جس سے کئی نہریں نکال کر علاقے کو سیراب کیا گیا ہے۔ گرمیوں میں شدید گرمی اور سردیوں میں درجہ حرارت نقطہ انجماد تک پہنچ جاتا ہے۔

بنارس کی ریشمی ساڑھیاں دنیا بھر میں مشہور ہیں اس کے علاوہ ٹیکسٹائل اور سیاحت ایک اہم انڈسٹری ہے۔

بنگال (Bangal):

مغربی بنگال بھارت کی ایک ریاست ہے۔ اس کے مشرق میں بنگلہ دیش، شمال مشرق میں بھوٹان اور آسام، شمال میں سکّم، جنوب مغرب میں اڑیسہ اور شمال مغرب میں نیپال، مغرب میں بہار اور جھارکھنڈ واقع ہیں۔ یہ خلیج بنگال پر واقع ہے جو دنیا کی سب سے بڑی خلیج ہے۔ اس کا رقبہ تقریباً ۸۸۷۵۲ مربع کلومیٹر اور آبادی نو کروڑ سے زائد ہے۔ اس کا دارالحکومت کلکتہ ہے۔ سندربن کے جنگلات اور گنگا کا ڈیلٹا بھی مغربی بنگال میں شامل ہیں۔ اکثریت کی زبان بنگالی ہے جب کہ اردو، ہندی، انگریزی کے علاوہ دیگر مقامی زبانیں بھی بولی جاتی ہیں۔

اس کی تاریخ بہت پرانی ہے۔ دو صدی قبل مسیح میں اس علاقے کو اشوک بادشاہ نے فتح کیا تھا۔ چھٹی صدی عیسوی میں چندر گپت موریا نے اسے اپنی ریاست میں شامل کر لیا۔ ۱۷۵۷ء میں پلاسی کی لڑائی میں نواب سراج الدولہ کو شکست دے کر انگریزوں نے اس علاقے پر قبضہ جمالیا۔ انگریزوں کے قبضہ میں رہ کر بنگال میں جدید تعلیم و ٹیکنالوجی کو فروغ ملا۔ ۱۹۴۷ء میں جب بنگال تقسیم ہوا تو مشرقی بنگال پاکستان کے حصے میں آیا اور مغربی بنگال بھارت کے۔

مغربی بنگال بھارت کی چھٹی امیر ترین ریاست ہے۔ مغربی بنگال کو ایک ثقافتی شہر کا درجہ بھی حاصل ہے مشہور نوبل انعام یافتہ ادیب و شاعر رابندر ناتھ ٹیگور کا تعلق اسی علاقے سے تھا۔ مغربی بنگال بھارت میں کھیلوں خاص طور پر کرکٹ اور فٹ بال کے حوالے سے بھی جانا جاتا ہے۔ یہاں پر دنیا کے سب سے بڑے (مینگرو و mangrove اور سندر بَن) جنگلات بھی ہیں۔ یہاں پر جنگلی حیات کی بہتات ہے۔ بنگالی شیر (Tigers) دنیا میں بنگال کی پہچان ہے۔

بیلجیم (Belgiam):

شمال مغرب یورپ میں واقع بیلجیم کے شمال کی طرف نیدر لینڈ، مشرق میں جرمنی، جنوب میں لیگسم برگ اور مغرب میں فرانس اور بحرہ شمالی واقع ہے۔ اس ملک کا کل رقبہ ۳۰۵۲۸ مربع کلو میٹر ہے اور یہ ملک اپنے رقبہ کے اعتبار سے دنیا میں ۱۳۷ویں نمبر پر ہے۔ اس کی آبادی ایک کروڑ ۱۴ لاکھ ۳ ہزار ۱۸۷ افراد تھی۔ اس ملک کا آبادی کے حوالے سے دنیا بھر میں ۷۸واں نمبر تھا۔ ایک سو قبل مسیح میں گالیا بلجیکہ رومی سلطنت کا حصہ ہوا کرتا تھا، اس دور میں بلیجم کی سرزمین پر انسانوں کی آبادکاری شروع ہوئی تھی۔ 'گالیا بلجیہ' لاطینی زبان کا لفظ ہے جس کے معنی 'فرانس بلیجیم' کے ہیں۔ رومی سلطنت کا یہ صوبہ آج بیلجیم، نیدر لینڈ، جرمنی، فرانس اور لیگسم برگ کے درمیان تقسیم کیا جا چکا ہے۔ اس سرزمین پر پہلے پہل آباد ہونے والوں میں بیلگائی، آبرون اور ترویلی قبیلوں کے لوگ تھے۔ بیلجیم اور اس کے گردونواح میں رومی سلطنت کا خاتمہ ۵۰۰ عیسوی میں اس وقت ہوا تھا جب فرانک لوگوں کی جانب سے سلطنت فرانسی کی بنیاد رکھی گئی تھی۔ برسل شہر بیلجیم کا دارلحکومت اور سب سے بڑا شہر ہے۔ یہ شہر ۱۶۱ مربع کلو میٹر رقبے پر پھیلا ہوا ہے۔ اس شہر کی آبادی ۱۱ لاکھ ۷۵ ہزار افراد کے قریب ہے۔ بیلجیم کا سب سے مقبول کھیل فٹ بال ہے۔ اس ملک کی زیادہ آبادی زراعت سے وابستہ ہے۔

پونے(Pune):

پونے (یعنی نیک لوگوں کا شہر) جس کا پرانا نام 'پونہ' تھا بھارت کی ریاست مہاراشٹر کا ثقافتی دارالحکومت بھی کہا جاتا ہے اور چوں کہ اس میں بہت مشہور یونی ورسٹیاں موجود ہیں اس لیے اسے ''مشرق کا آکسفورڈ'' بھی کہا جاتا ہے یہاں پر مینو فیکچرنگ اور آٹو موبائل انڈسٹری بہت تیزی سے پھل پھول رہی ہے۔ تاریخ میں اس شہر کا سب کا پرانا تذکرہ ۹۳۷عیسوی میں آیا ہے جس میں اس شہر کو ''پونیاوشایا'' یعنی ''اچھی خبر'' کے نام سے موسوم کیا گیا ہے۔ تیرہویں صدی کے اوائل میں یہ شہر عادل شاہی سلطنت کے ہاتھوں تباہی کا شکار ہوا مگر جلد ہی اسے دوبارہ تعمیر اور منظّم کر دیا گیا۔ ۱۷۰۳ء سے ۱۷۰۵ء میں مغلوں کے ساتھ جنگ کے بعد اورنگ زیب عالم گیر نے اس شہر پر قبضہ کر لیا اور شہر کا نام ''محی آباد'' رکھ دیا گیا لیکن دو سال کے بعد ہی مراٹھوں کے مغلوں کو شکست دے کر شہر پر دوبارہ قبضہ کر لیا۔ ۱۸۱۷ء میں انگریزوں نے اس پر قبضہ کر لیا اور یہاں ایک بہت بڑی چھاؤنی قائم کی جو اَب انڈین آرمی استعمال کر رہی ہے۔ برطانوی نو آباد یاتی دَور میں پونا شہر گوکھلے (Gokhale) اور ''بال گنگا دھیر تلک (Bal Gangadhar Tilak)'' کی احتجاجی تحریکوں کا مرکز رہا۔

آزادی کے بعد پونے شہر نے بہت ترقی کی۔ تعلیمی میدان اور انجینیر نگ میں یہ شہر بہت آگے ہے۔ ۲۰۰۸ء میں یہاں دولتِ مشترکہ کی ''یوتھ گیمز'' منعقد ہوئیں۔ یہاں کا ٹرانسپورٹ سسٹم بھارت کے بہترین ٹرانسپورٹ سسٹمز میں شمار ہوتا ہے۔

پیرس (Paris) :

شمال وسطی فرانس میں دریائے سین کے کنارے واقع ایک شہر ہے جو بلحاظ آبادی ملک فرانس کا سب سے بڑا شہر اور دارالحکومت ہے۔ شہر کے علاقے کی کل آبادی ایک کروڑ اکیس لاکھ کے لگ بھگ (جنوری ۲۰۰۸ء) ہے اور اس طرح یہ یورپ کے بڑے شہروں میں سے ایک ہے۔

گزشتہ دو ہزار سالوں سے قائم یہ اہم شہر آج دنیا کا اہم کاروباری اور ثقافتی مرکز ہے اور عالمی سیاسیات، تعلیم، تفریح، ابلاغ، فیشن، علوم اور فنون پر اس کے گہرے اثرات ہیں اور جو اسے بڑے عالمی شہروں میں سے ایک بناتے ہیں۔ یہ سیاحت کے لحاظ سے دنیا کے معروف ترین علاقوں میں سے ایک ہے اور سالانہ ۴ کروڑ ۵۰ لاکھ افراد پیرس خطے کی سیر کرتے ہیں جن میں سے ۶۰ فی صد غیر ملکی ہوتے ہیں۔ یہاں کی شان دار و تاریخی عمارات، عالمی سطح پر معروف ادارے اور مشہور باغات دیکھنے کے لیے دنیا بھر سے سیاح کھنچے چلے آتے ہیں۔ عالمی تجارتی و سیاحتی مرکز ہونے کے

باعث پیرس کا نقل وحمل کا نظام دنیا کے بہترین نظاموں میں سے ایک ہے بلکہ مزید جدید بنایا جارہا ہے۔ پیرس دو بین الاقوامی ہوائی اڈوں، تیز رفتار ریل اور سڑکوں کے جال کے ذریعے دنیا بھر سے منسلک ہے۔ پیرس کے دو اہم ترین ہوائی اڈے، اورلی اور چارلس ڈی گال، ہیں جن میں سے آخر الذکر دنیا کے مصروف ترین ہوائی اڈوں میں سے ایک ہے۔ ایک تیسرا اور نسبتاً چھوٹا ہوائی اڈا بیووے شہر سے ۷۰ کلومیٹر شمال میں واقع ہے اور اسے چارٹر اور چھوٹے فضائی ادارے استعمال کرتے ہیں۔ لی بورگے ہوائی اڈا صرف کاروباری جہاز، فضائی نمائش اور عجائب گھر کے لیے استعمال ہوتا ہے۔

پیرس تعلیم کے لحاظ سے بھی نمایاں مقام رکھتا ہے جہاں شعبہ تعلیم سے تین لاکھ ۳۰ہزار افراد وابستہ ہیں جن میں سے ایک لاکھ ۷۰ ہزار اساتذہ اور پروفیسرز ہیں جو ۹ہزار بنیادی، ثانوی اور اعلیٰ تعلیم کے اسکول اور اداروں میں تقریباً ۲.۹ ملین بچوں اور طلبہ کو تعلیم دیتے ہیں۔ جامعہ پیرس یہاں کی مشہور ترین جامعہ ہے۔

ترکی (Turkey) :

جمہوریہ ترکی، یوریشیا میں واقع ہے یعنی اس کا کچھ حصہ ایشیائی اور کچھ یورپ میں واقع ہے۔ ترکی کی سرحدیں شمال مشرق میں جارجیا (گرجستان)، مشرق میں آرمینیا، ایران اور آذر بائی جان، جنوب مشرق میں عراق اور شام، مغرب میں یونان اور شمال مغرب میں بلغاریہ سے ملتی ہیں، اس کے علاوہ شمال میں بحیرہ اسود (Black Sea)، مغرب میں بحیرہ ایجی این (Aegean Sea) اور بحیرہ مرمرہ (Marmara Sea) اور جنوب کی طرف سے بحیرہ روم (Mediterranean Sea) وغیرہ سے بھی ملتی ہیں۔ ترکی کا رقبہ آٹھ لاکھ ۱۴ہزار کلومیٹر سے زائد ہے۔ اس کا دارالحکومت استنبول اور آبادی سات کروڑ سے زائد ہے۔

ترکی کی تہذیب بہت پرانی ہے۔ جزیرہ نما اناطولیہ (جس پر ترکی کا بیشتر حصہ مشتمل ہے) کا ذکر قریباً ستائیس ہزار سال پہلے کی تحریروں میں ملتا ہے۔ تقریباً ۲۵۰۰ق م میں اناطولیہ کے علاقوں پر چینیوں کی حکومت تھی، اس کے بعد آشوریوں (قریباً دو ہزار سال قبل) کی حکومت قائم ہوئی تو اس کے کچھ علاقے یونان کے زیر اثر ہے اور بعض عراق کے۔ ۳۳۴ق م میں ترکی کے بعض علاقوں کو سکندرِ اعظم نے فتح کیا اور اس کے بعد رومیوں (۲۷ق م) نے اسے فتح کیا۔ حضرت عیسیٰ کے زمانے کے بعد بہت سے عیسائیوں نے ترکی کو اپنا مسکن بنایا۔

چوتھی صدی عیسوی میں رومی بادشاہ قسطنطین (۳۰۶ء-۳۳۷ء) نے یہاں پر عظیم شہر قسطنطنیہ کو بسانے کا آغاز کیا اس کا موجودہ نام استنبول ہے۔

ساتویں صدی میں مسلمانوں نے یہاں پر یلغار کی اور بہت سے علاقے فتح کر لیے۔ ۱۱ویں صدی عیسوی میں یہاں سلجوقی سلطنت (شاہ الپ ارسلان ۱۰۲۹ء-۱۰۷۲ء) قائم ہوئی جس کے زوال کے بعد عثمانی سلطنت (۱۲۹۹ء-۱۹۱۴ء) کا دور آیا۔ سلطنتِ عثمانیہ پہلی عالمی جنگ تک قائم رہی جس میں ترکی کو شکست ہوئی اور اتحادی افواج نے ترکی کو مختلف ٹکڑوں میں تقسیم کر دیا۔

جدید ترکی کی تشکیل پہلی عالمی جنگ کے بعد مصطفیٰ کمال اتاترک نے کی جن کی قیادت میں ترکی نے تمام غیر ملکی افواج کو نکال باہر کیا اور خلافت کا خاتمہ کر دیا۔ ۱۹۲۳ء میں جمہوریہ ترکی کو بین الاقوامی برادری نے تسلیم کیا۔

دوسری جنگِ عظیم میں ترکی عموماً غیر جانب دار رہا لیکن رسمی طور پر اتحادیوں کی حمایت کی۔ ۱۹۵۲ء میں نیٹو (NATO-The North Atlantic Treaty Organisation) میں شمولیت اختیار کی۔ ۲۰۱۴ء میں ترکی میں اسلام پسند رجب طیب اردوغان حکمران بنے جو ۲۰۱۸ء کے عام انتخابات میں دوبارہ حکمران منتخب ہوئے۔

جاپان (Japan):

جاپان مشرقی ایشیا کا ایک ملک ہے اور اس کو 'ابھرتے ہوئے سورج کی سرزمین' بھی کہا جاتا ہے کیوں کہ اس کے شہر 'نپون' میں سورج سب سے پہلے اپنی کرنیں بکھیرتا ہے۔ جاپان میں ساڑھے چھے ہزار سے زائد جزائر ہیں۔ اس کی آبادی ۱۳ کروڑ کے قریب ہے جاپان کا دارالحکومت ٹوکیو ہے جس کا شمار دنیا کے گنجان آباد ترین شہروں میں ہوتا ہے۔

جاپان میں غالب اکثریت جاپانی افراد کی ہے، اس کے علاوہ یہاں پر چینی اور کوریائی نسل کے افراد بھی رہتے ہیں۔ یہاں کا اکثریتی مذہب شنسوازم ہے، اس کے بعد بدھ ازم ہے۔ عیسائی بھی قابل لحاظ تعداد میں پائے جاتے ہیں۔ جاپان میں پارلیمانی نظامِ حکومت ہے، اس کے باوجود وہاں پر شہنشاہ کو بہت زیادہ مقام حاصل ہے۔ جاپان کے بادشاہ کا نام 'اکی ہیٹو' ہے۔ جاپان کا کل رقبہ تین لاکھ ستر ہزار کلومیٹر ہے اور اس کی آبادی بارہ کروڑ کے لگ بھگ ہے۔ جاپان اٹھارویں صدی تک دنیا سے الگ تھلگ رہا۔ بیسویں صدی کے آغاز میں جاپان نے چین کے ساتھ جنگ لڑی اور پہلی جنگِ عظیم میں حصہ لیا جس کے نتیجے میں جاپان کی سلطنت کافی پھیل گئی۔ دوسری جنگِ عظیم میں جاپان نے محوری طاقتوں کا ساتھ دیا۔ ۱۹۹۳ء میں امریکہ نے جاپان کے دو شہروں پر جوہری حملہ کر دیا جس کے نتیجے میں دوسری عالمی جنگ کا خاتمہ ہوا اس حملے کے نتیجے میں لاکھوں جاپانی مارے گئے۔ آج جاپان کا شمار دنیا کی تیسری بڑی معاشی طاقت کے

طور پر ہوتا ہے اور تعلیمی طور پر اس کا شمار دنیا کے سب سے زیادہ تعلیم یافتہ اقوام میں ہوتا ہے۔ یہاں کے رہنے والوں کی اوسط عمر اور متوقع زندگی دنیا میں سب سے زیادہ ہے۔ اسی طرح بچوں کی شرح اموات بھی دنیا میں سب سے کم ہے۔

جاپانی سائنس اور ٹیکنالوجی کے میدان میں دنیا میں سب سے آگے ہے۔ جاپان کی اہم برآمدات میں الیکٹرونکس، کیمیکلز، انڈسٹریل سازو سامان، گاڑیاں اور روبوٹ وغیرہ شامل ہیں۔ ۲۰ سے زائد جاپانی اب تک نوبل انعام کے حق دار قرار پائے ہیں۔ جاپان کا زیادہ تر علاقہ جنگلوں، پہاڑوں دریائوں پر مشتمل ہے اس لیے رہائشی علاقوں میں آبادی کی گنجائی بہت زیادہ ہے۔

جاوا(Java):

جاوا انڈونیشیا کا ایک جزیرہ ہے۔ تقریباً چودہ کروڑ افراد کی آبادی کے ساتھ جاوا دنیا کا سب سے بڑا جزیرہ ہے۔ اس کا رقبہ تقریباً ایک لاکھ اڑتیس ہزار (۱۳۸،۷۹۳.۶) مربع کلو میٹر ہے۔ رقبے کے لحاظ سے یہ دنیا کا تیرہواں بڑا جزیرہ ہے۔ چوں کہ یہ جزیرہ آتش فشانی چٹانوں سے گھرا ہوا ہے اس لیے یہاں آئے روز زلزلے آتے رہتے ہیں جن میں سے کچھ بہت ہولناک ثابت ہوتے ہیں۔ جاوا کی اکثریت مسلمان ہے اور یہاں زیادہ تر جاوی زبان بولی جاتی ہے۔

جاوا ایک قدیم شہر ہے اور اس کا ذکر بطلیموس (Ptolemy) نے اپنی جغرافیہ دانی کی کتاب (۱۵۰ء) میں کیا تھا۔ جاوا کا جزیرہ سماٹرا(Sumatra) اور بالی(Bali) کے درمیان میں ہے۔ اس کے شمال میں بحیرہ جاوا جب کہ جنوب میں بحرِ ہند ہے۔ یہاں کی خاص پیداوار میں چاول اور کافی مشہور ہیں۔ سولو دریا(Solo River) یہاں کا سب سے بڑا دریا ہے۔

یہاں کا درجہ حرارت عموماً پچیس اور تیس ڈگری سینٹی گریڈ کے آس پاس رہتا ہے۔ شمالی علاقے نسبتاً زیادہ گرم ہیں، یہاں نمی کا تناسب بہت زیادہ ہوتا ہے۔ جاوا کے کچھ علاقوں میں چار ہزار ملی میٹر (۱۶۰ انچ) تک سالانہ بارش ہوتی ہے جب کہ کچھ علاقوں میں صرف نو سو ملی میٹر تک بارش ہوتی ہے۔ یہاں پر مینگرو و (Mangrove) کے جنگلات اور سوانا (Savona) کے علاقے پائے جاتے ہیں۔ جاوا کے جنگلات میں پرندوں کی چار سو پچاس (۴۵۰) سے زائد اقسام پائی جاتی ہیں۔ انڈونشیا میں مسلمانوں کی اکثریت ہے، ہندو، بدھ اور عیسائیوں کی بھی خاصی آبادی ہے۔

جرمنی(Germany) :

وسطی یورپ میں واقع ایک ملک کا نام ہے۔اس کا سرکاری نام وفاقی جمہوریہ جرمنی ہے۔اس کی قومی زبان جرمن ہے۔اس میں ۱۶ ریاستیں ہیں۔اس کے شمال میں بحر شمالی، ڈیمارک اور بحر بالٹک واقع ہیں، مشرق میں پولینڈ اور چیک جمہوریہ، جنوب میں آسٹریا اور سوائٹزرلینڈ اور مغرب میں فرانس، لگزمبرگ، بیلجیم اور نیدرلینڈ واقع ہیں۔

جرمنی اقوام متحدہ، نیٹو اور جی۔ایٹ کا رکن ہے۔یہ یورپی یونین کا تاسیسی رکن اور یورپ کا سب سے زیادہ آبادی والا اور سب سے طاقت ور ملک ہے۔یہ دنیا کی تیسری بڑی معیشت رکھنے والا ملک ہے۔

انتظامی طور پر جرمنی کو سولہ ریاستوں میں تقسیم کیا گیا ہے۔ان میں سے تین ریاستیں صرف ایک شہر اور اس سے ملحق علاقے پر مشتمل ہیں۔اس کا کل رقبہ ۳۵۷،۰۲۱ ۳۸۶ مربع کلومیٹر (۱۳۷،۹۸۸ مربع میل) ہے اور آب و ہوا کے لحاظ سے یہاں موسم گرما میں بہت زیادہ درجہ حرارت رہتا ہے۔میں بڑے پیمانے پر موسم گرما کا درجہ حرارت ہے۔روس کے بعد یہ یورپ کا دوسرا سب سے زیادہ آبادی والا ملک ہے۔ جرمنی ایک بہت مہذب ملک ہے۔اس کا دارالحکومت اور سب سے بڑا شہر برلن ہے، جب کہ فرینک فرٹ اس کے مالیاتی دارالحکومت کے طور پر کام کرتا ہے اور ملک کا سب سے بڑا ہوائی اڈہ بھی یہیں ہے۔ جرمنی کا سب سے بڑا شہری علاقہ راؤر ہے۔ملک کا دوسرے بڑے شہروں میں ہیم برگ، میونخ، کولن، اسٹٹگارت، داسل دور، لیپزگ، ڈریس ڈن، بر من، ہنوور، اور نیورم برگ شامل ہیں۔

دسویں صدی کی شروعات میں جرمن علاقوں میں مقدس رومن سلطنت کا ایک مرکزی حصہ بنایا گیا۔ سولہویں صدی کے دوران شمالی جرمن علاقے پروٹسٹنٹ اصلاحات کا مرکز بن گئے۔ مقدس رومن سلطنت کے خاتمے کے بعد، جرمن کنفیڈریشن ۱۸۱۵ء میں قائم کیا گیا۔ ۱۸۴۸ء اور ۱۸۴۹ء میں کے جرمنی میں آنے والے انقلابوں کے نتیجے میں فرینکفرٹ پارلیمنٹ کے لیے بڑے جمہوری حقوق کی تشکیل عمل میں آئی۔ ۱۸۷۱ء میں، جرمنی کی زیادہ تر ریاستیں (سوئٹزرلینڈ اور آسٹریا کو چھوڑ کر) جرمن سلطنت میں متحد ہو گئیں۔ ۱۹۳۳ء میں نازی اقتدار نے دوسری عالمی جنگ، اور ہالوکاسٹ کے واقعات کو جنم دیا۔

یورپ میں دوسری عالمی جنگ کے اختتام کے بعد، آسٹریا ایک آزاد ملک کے طور پر دوبارہ قائم کیا گیا اور جرمنی دو حصوں میں تقسیم ہوا: مغرب جرمنی (امریکی، برطانوی، اور فرانسیسی قبضے کے علاقے) اور مشرق جرمنی

(سوویت قبضے کے علاقے)۔۱۹۸۹ء کے انقلابوں کے بعد اس میں کمونیسٹ حکمرانی کا خاتمہ ہوا۔ ملک ۳ اکتوبر ۱۹۹۰ء کو دوبارہ منظور کیا گیا۔

آج، جرمنی کا خود مختار اور مضبوط معیشت کے ساتھ ایک زبردست طاقت ہے۔ مختلف صنعتی اور تکنیکی شعبوں میں یہ عالمی رہنما کے طور پر سامنے آیا ہے۔ جرمنی میں عالمی ثقافتی ورثہ بھی ہے اور یہ دنیا میں سیاحت کے لحاظ سے بھی سب سے آگے جا رہا ہے۔

جنوبی افریقا(South Africa):

جمہوریہ جنوبی افریقا، برِ اعظم افریقا کے انتہائی جنوب میں واقع ہے۔ اس کے ارد گرد جنوب میں بحرہ اوقیانوس، بحرہ ہند، لیبیا، بوٹسوانہ اور زمبابوے کے علاقے ہیں اور شمال میں موزمبیق اور سوازی لینڈ (Swazi Land) ہیں۔ یہ دنیا کا رقبہ کے لحاظ سے پچیسواں بڑا ملک ہے۔ یہاں مختلف نسل کی قومیں آباد ہیں جن میں زیادہ قابلِ ذکر حبشی (اسّی فی صد)، یورپی (آٹھ فی صد سے زیادہ) اور ایشیائی (دو فی صد سے زیادہ) شامل ہیں۔

جنوبی افریقا کا دارالحکومت پریٹوریا(Pretoria) ہے۔ جوہانس برگ(Johannesburg) یہاں کا سب سے بڑا شہر ہے۔ اس کا کل رقبہ تقریباً بارہ لاکھ اکیس ہزار مربع کلومیٹر ہے جب کہ آبادی ساڑھے پانچ کروڑ سے زائد ہے۔ یہاں کی زیادہ تر آبادی عیسائی ہے، اس کے علاوہ ہندو اور مسلمان بھی کافی تعداد میں موجود ہیں۔ یہاں زیادہ تر انگریزی، افریکان(Afrikaans) زولو(Zulu) زبانیں بولی جاتی ہیں۔

جنوبی افریقا کی تاریخ بہت پرانی ہے۔ ماہرین نے یہاں سے نہایت قدیمی فوسلز(Fossil) دریافت کیے۔ یہاں کے صوبے کوٹنگ کو "گہوارہ نوع انسانی" بھی کہا جاتا ہے۔ یہاں سے تقریباً تیس لاکھ پرانے ابتدائی انسان کی باقیات بھی ملی ہیں۔ پندرھویں صدی (۱۴۸۰ء) کے اواخر میں یہاں پر پرتگالیوں کی آمد و رفت شروع ہوئی۔ اٹھارویں صدی کے اواخر (۱۷۹۵ء) میں برطانیہ نے یہاں اپنے مقبوضات بنانے شروع کیے۔

۱۸۵۲ء میں جے ایچ ڈیوس نے سب سے پہلے یہاں سونا دریافت کیا (جب کہ ہیرے ۱۸۶۷ء میں دریافت ہوئے) سونے اور ہیروں کی دریافت نے یہاں ترقی کے ایک نئے دور کا آغاز کیا۔ ان ذخائر پر قبضے کے لیے برطانیہ اور مقامی افراد میں لڑائیاں ہوئیں جس میں آخر کار برطانوی افواج فتح یاب ہوئیں اگرچہ ان کو بہت زیادہ جانی و مالی نقصانات اٹھانے پڑے۔ ۱۹۰۹ء میں برطانوی پارلیمنٹ نے ایک بل کے ذریعے جنوبی افریقا کو محدود آزادی دی۔ ۱۹۱۳ء میں ایک

قانون کے ذریعے کالے افراد پر زمین کی ملکیت کے حقوق ختم کر دیے گئے۔ ۱۹۳۴ء میں جنوبی افریقا کو برطانوی حکومت سے مکمل خود مختاری مل گئی۔

۱۹۴۸ء میں نیشنل پارٹی بر سرِ اقتدار آئی اور اس نے نسل پرست حکومت قائم کی۔ گورے جن کی تعداد ۲۰ فی صد سے بھی کم تھی، کالوں کی اکثریت کے اوپر کنٹرول حاصل کر لیا اور زندگی کے ہر شعبے میں نسل پرستانہ رویہ رکھا گیا۔ ۳۱ اکتوبر ۱۹۶۱ء میں جنوبی افریقا جمہوریہ بنا لیکن نسل پرستانہ حکومت کا خاتمہ نہ ہو سکا جس پر شدید ہنگامے اور احتجاج ہوا۔ اس نسل پرستانہ حکومت کے خلاف بین الاقوامی پابندیاں عائد کر دی گئیں۔

۱۹۴۳ء سے نیلسن منڈیلا (۱۹۱۸ء۔ ۲۰۱۳ء) نسل پرست حکومت کے خلاف ایک انقلابی سیاسی راہنما کی صورت میں سامنے آئے۔ ۱۹۹۴ء میں الیکشن ہوئے اور نیلسن منڈیلا کی جماعت، افریقن نیشنل کانگریس نے کامیابی حاصل کی، وہ ۱۹۹۹ء تک وہاں کے صدر رہے۔

جنوبی افریقا کے بعض علاقوں میں درجہ حرارت پچاس ڈگری سینٹی گریڈ سے بھی اوپر چلا جاتا ہے اور بعض علاقوں میں پندرہ ڈگری تک گر جاتا ہے۔ یہاں جانوروں اور پودوں کی کئی انواع پائی جاتی ہیں اور اس سلسلے میں جنوبی افریقا تنوّع کے اعتبار سے دنیا میں چھٹے نمبر پر ہے۔

چین/عوامی جمہوریہ چین (People Republic of China):

عوامی جمہوریہ چین وہ ملک ہے جس کو ہم آج چین کے نام سے جانتے ہیں جب کہ جمہوریہ چین سے مراد تائیوان اور اس سے ملحقہ علاقے ہیں۔ چین ایشیا کے مشرق میں واقع ایک ثقافتی ملک ہے۔ اس کی تہذیب بھی بہت قدیم ہے جس کو دنیا کی سب سے پرانی تہذیبوں میں شمار کیا جا سکتا ہے۔ اس کی ثقافت چھ ہزار سال پرانی ہے جو آج ایک کامیاب ریاست کے روپ میں موجود ہیں۔

چین میں جنگِ عظیم دوم کے بعد ہونے والی خانہ جنگی نے اس کو دو ممالک میں تقسیم کر دیا تھا: ایک کا نام "عوامی جمہوریہ چین" اور دوسرے کا نام "جمہوریہ چین" رکھا گیا۔ عوامی جمہوریہ چین کے کنٹرول میں مین لینڈ، ہانگ کانگ اور میکاؤ کے علاقے، جب کہ جمہوریہ چین کا کنٹرول تائیوان اور اس کے ملحقہ علاقوں پر تھا۔

چین کی تہذیب دنیا کی ان چند ایک تہذیبوں میں سے ایک ہے جو بیرونی مداخلت سے تقریباً محفوظ رہیں اور اسی وقت سے اس کی زبان تحریری شکل میں موجود ہے۔ چین کی کامیابی کی تاریخ کوئی چھ ہزار سال قبل تک پہنچتی ہے۔ صدیوں تک چین دنیا کی سب سے زیادہ ترقی یافتہ قوم اور مشرقی ایشیا کا تہذیبی مرکز رہا جس کے اثرات آج تک نمایاں

ہیں۔ اسی طرح چین کی سرزمین پر بہت ساری نئی ایجادات ہوئی ہیں جن میں چار مشہور چیزیں یعنی کاغذ، قطب نما، بارود اور چھاپہ خانہ شامل ہیں۔

چینی لکھائی ابھی تک چینیوں اور جاپانیوں کے زیر استعمال ہے اور کسی حد تک کورین اور ویت نامی بھی اسے استعمال کرتے ہیں۔ چینی لکھائی واحد تحریر تاحال استعمال میں ہے جس میں ایک حرف پورے لفظ یا جملے کو ظاہر کر سکتا ہے۔

۱۹۷۰ء کی دہائی کے اختتام پر عوامی جمہوریہ چین نے اپنے زیر انتظام علاقوں یعنی تائیوان، تائی پی، کاوہسیونگ اور فیوجیان کے دور دراز کے جزائر پر مکمل، کثیر الجماعتی، نمائندہ جمہوریت کو رواج دینا شروع کیا۔ آج آر او سی میں تمام شعبہ ہائے زندگی سے متحرک سیاسی نمائندگی ہو رہی ہے۔ آر او سی کی سیاست میں اہم موڑ چین کے ساتھ اتحاد اور چین کی رسمی آزادی کے ساتھ جڑا ہے۔

چین کی کل آبادی ایک اعشاریہ تین ارب یعنی ایک ارب تیس کروڑ کے لگ بھگ ہے جو دنیا کی کل آبادی کا پانچواں حصہ ہے۔ چین میں سو سے زائد لسانی گروہ موجود ہیں لیکن عوامی جمہوریہ چین کی حکومت ان میں سے صرف چھپن کو مانتی ہے۔ اب تک کا سب سے بڑا لسانی گروہ 'ہن' ہے۔

ثقافتی انقلاب کے بعد اور دیگر پالیسیوں کے بعد، عوامی جمہوریہ چین کے مین لینڈ کے انسٹھ فی صد حصے یعنی سات سو سر سٹھ فی صد آبادی خود کو لادین کہتے ہیں۔ تاہم مذاہب اور رسومات ابھی بھی عوامی جمہوریہ چین کے شب و روز میں اہم کردار ادا کرتے ہیں، خصوصا بدھ ازم، کنفیوشس ازم اور تاؤازم پر روایتی اعتقاد شامل ہیں۔ چین میں دور بادشاہت کے دوران کنفیوشزم کے فلسفہ کو کو سرکاری سرپرستی حاصل رہی تھی اور اس پر عبور حاصل کیے بغیر کوئی بھی شاہی ملازمت حاصل نہیں کر سکتا تھا۔ اسی طرح خطاطی کو ڈرامانویسی یا مصوری سے زیادہ اہم سمجھا جاتا تھا۔

چاول کو چینی ثقافت میں بہت اہم مقام حاصل ہے۔ نہ صرف یہ خوراک کا اہم جزو ہے بلکہ اس سے بہت سے چینی قصے کہانیاں وابستہ ہیں۔ چاول چین کی سب سے اہم اور بڑی فصل ہے اور اسے زیادہ تر دریائے ینگتز کی وادی میں جنوبی چین میں اور یونن گوئی زاؤ کی سطح مرتفع میں اگایا جاتا ہے۔ چین میں دنیا کے دیگر ممالک کی نسبت سب سے زیادہ چاول اگایا اور کھایا جاتا ہے۔ کچھ تاریخ دان یہ کہتے ہیں کہ چاول کی کاشت کی ابتدا چین سے ہی ہوئی۔

چین میں فلسفی، لکھاری اور شاعروں کو بہت زیادہ عزت دی جاتی تھی، نھوں نے چین کی ثقافت کو بچانے اور ترویج دینے میں بہت اہم کردار ادا کیا ہے۔

ایک ہزار عیسوی میں چین میں فٹ بال کی طرح کا ایک کھیل کھیلا جاتا تھا۔ کئی تاریخ دان یہ سمجھتے ہیں کہ فٹ بال کی ابتدا چین سے ہوئی۔ چین میں پروفیشنل فٹ بال ابھی تک اپنی ترقی کے مراحل طے کر رہا ہے۔ اس کے علاوہ مارشل آرٹس، ٹیبل ٹینس، بیڈمنٹن اور حال ہی میں گولف بھی مشہور ہو رہے ہیں۔ باسکٹ بال کو بھی شہری نوجوانوں میں مقبولیت حاصل ہو رہی ہے۔ چین اس وقت ایشیا اور دنیا میں ایک سپورٹس کی طاقت مانا جاتا ہے۔ ۱۹۸۲ء سے اب تک چین ہر ایشیائی کھیل میں تمغوں کی دوڑ میں سب سے آگے رہا ہے۔ اور ۱۹۹۲ء سے اب تک ہر گرمائی اولمپکس میں پہلی چار نمبروں میں رہا ہے۔ جسمانی طور پر چاق و چوبند ہونے کو بہت اہمیت دی جاتی ہے۔ صبح کی ورزشیوں کو باقاعدہ شغل مانا جاتا ہے اور پارکوں میں لوگ ورزش کرتے دیکھے جا سکتے ہیں۔

بورڈ گیمز جیسا کہ بین الاقوامی شطرنج، گو اور زیانگ جی یعنی چینی شطرنج بھی عام ہیں اور ان کے باقاعدہ مقابلے منعقد کیے جاتے ہیں۔

ڈنمارک (Denmark):

سرکاری نام جمہوریہ ڈنمارک شمالی یورپ میں واقع ہے۔ اس کے شمال میں سویڈن اور ناروے اور جنوب میں جرمنی، مشرق میں بحیرہ بالٹک اور مغرب میں بحیرہ شمالی واقع ہے۔

ڈنمارک کی تاریخ کا پتا ہمیں ان پتھروں سے ملتا ہے جن پر پرانے زمانے کے لوگوں نے کئی تصویریں بنائی ہیں۔ اور یہ پتھر ڈنمارک کے شہر جیلنگ (Jelling) میں موجود ہیں۔ اور یہ اس ملک کی سب سے پرانی لکھی ہوئی تاریخ ہے۔ ڈنمارک کا نام یہیں پہلی بار لیا گیا تھا۔ سب سے پرانا پتھر تقریباً ۹۰۰ صدی عیسوی کے دور کا ہے۔ اس زمانے کی پتھروں پر بنی ہوئی تصویریں ہمیں یہ بتاتی ہیں کہ بادشاہ ہیرلڈ (Harald) نے پورے ڈنمارک اور ناروے پر حکومت کی۔ ۱۳۰۰ء کے آخر میں ملکہ مارگریٹ نے ڈنمارک، سویڈن اور ناروے پر حکومت کی۔ اس کے تینوں ملکوں کا اپنے دور میں کئی بار دورہ کیا۔

ڈنمارک کا مجموعی رقبہ ۴۲،۹۲۴ کلومیٹر (۱۶،۵۷۳ مربع میٹر) ہے، ۴۲،۳۹۴ کلومیٹر (۱۶،۳۶۸ مربع میٹر) کے علاقہ علاقے، اور گرین لینڈ اور فارو جزائر سمیت مجموعی علاقے ۲،۲۱۰،۵۷۹ کلومیٹر (۸۵۳،۵۰۹ مربع میٹر) ہے، اور آبادی ۵۔۸ ملین (۲۰۱۸ء) کی۔

ڈنمارک کا آئین ۵ جون ۱۸۴۹ء کو بنا جس نے ۱۶۶۰ء سے قائم شاہی سلطنت کا خاتمہ کیا۔ اب اس منظم آئین شاہی نے ایک پارلیمانی جمہوری ملک کو وجود بخشا ہے۔ کوپن ہیگن ملک کا دارالحکومت، سب سے بڑا شہر اور مرکزی

تجارتی مرکز ہے۔ اقتصادی اور سماجی ترقی کے لحاظ سے ڈنمارک کا مقام دیگر ملکوں میں خاصا بلند ہے۔ ڈینز یعنی یہاں کے باشندے ایک اعلیٰ معیار کی زندگی سے لطف اندوز ہوتے ہیں۔ یہ ملک سماجی لحاظ سے بھی پر امن حیثیت میں مثالی گردانا جاتا ہے یہاں فی کس آمدن بھی اچھی خاصی ہے اور آمدنی کی مساوات کا نظام بھی عمدہ انداز میں کام کر رہا ہے۔ اس کو دنیا کے خوش رہنے والے ملکوں میں اول نمبر پر شمار کیا جاتا ہے۔

روس (Russia):

رقبے کے لحاظ سے دنیا کا سب سے بڑا ملک ہے۔ ایک اندازے کے مطابق روس دنیا کے کل رقبے کا تقریباً ۸/۱اویں حصے پر مشتمل ہے۔ روس کی سرحدیں دنیا کے کئی ممالک سے ملتی ہیں جن میں ناروے، فن لینڈ، اسٹونیا، لٹویا، لیتھونیا، پولینڈ، بیلے روس، یوکرائن، جارجیا، آزربائیجان، قازقستان، منگولیا، چین اور شمالی کوریا شامل ہیں۔ اس کی سمندری حدود امریکہ اور جاپان کے ساتھ ملتی ہیں۔

اس کی آبادی ساڑھے چودہ کروڑ سے زائد ہے، دنیا میں آبادی کے لحاظ سے یہ نویں نمبر پر شمار کیا جاتا ہے۔ اس کے بڑے شہروں میں ماسکو، سینٹ پیٹرزبرگ، نووسی برسک اور کازان وغیرہ شامل ہیں۔ روس میں مقامی افراد کے علاوہ تاتاریوں، یوکرینی، آرسینیائی افراد بھی قابلِ لحاظ تعداد میں بستے ہیں۔

روس کا کل رقبہ ایک کروڑ ستر لاکھ مربع کلومیٹر کے قریب ہے۔ روس کی کرنسی روبل ہے۔ روس کی وسعت کا اندازہ آپ اس سے کر سکتے ہیں کہ یہ ۱۱ ٹائم زون میں منقسم ہے۔

سوئٹزرلینڈ (Switzerland):

یہ ایک یورپی ملک ہے جو جغرافیائی اعتبار سے ایک طرف کوہِ الپس کی خوبصورت وادیوں اور دوسری طرف ایورہ کی اونچی نیچی پہاڑیوں میں واقع ہے۔ یہ ملک ۴۱ ہزار ۲۶۵ مربع کلومیٹر یا ۱۵ ہزار ۹۴۰ مربع میل رقبے پر محیط ہے۔ زیادہ تر علاقہ الپس (ALPS) کے خوش منظر پہاڑوں میں گھرا ہے۔ ملک کی مجموعی آبادی ۲۰۱۵ء کو ایک اندازے کے مطابق تقریباً ۸ ملین ہے۔ آبادی کا بیشتر حصہ سطح مرتفع پر قائم بڑے شہروں میں سکونت پزیر ہے۔ ملک کا قومی دن ہر سال یکم اگست کو منایا جاتا ہے جو روایتی طور پر ریاست کے قیام کا دن سمجھا جاتا ہے یعنی سوئس کنفیڈریشن کا قیام یکم اگست ۱۲۹۱ء کو عمل میں آیا چناں چہ یکم اگست ملک کا قومی دن قرار پایا۔

مجموعی ملکی پیداوار کے لحاظ سے سوئٹزرلینڈ دنیا کے امیر ترین ممالک میں شمار کیا جاتا ہے۔ زیورخ اور جنیوا جیسے بین الاقوامی شہرت کے حامل شہروں کو ملکی معیشت میں نہایت اہم مقام حاصل ہے۔ سوئٹزرلینڈ ۲۰ویں صدی عیسوی میں سب سے بڑا برآمد کنندہ اور ۱۸ویں صدی عیسوی میں سب سے بڑا درآمد کنندہ ملک رہا ہے۔ سوئٹزرلینڈ فی کس آمدنی کے لحاظ سے دنیا کے خوشحال ممالک میں شمار کیا جاتا ہے۔

سوئٹزرلینڈ میں جرمن، فرانسیسی اور اطالوی زبانیں رائج ہیں تاہم رومانیّن بولنے والے بھی کم نہیں۔ اِن مختلف لسانی اور ثقافتی اکائیوں کے باوجود سوئس قوم کے اتحاد کی بڑی وجہ ایک مشترک عظیم الشان تاریخی پس منظر ہے۔

سیام/تھائی لینڈ(Thailand):

تھائی لینڈ کا پرانا نام سیام ہے تھائی لینڈ جنوب مشرقی ایشیائی کا ملک ہے۔ اس کا رقبہ تقریباً ۲لاکھ مربع میل ہے اور آبادی ۷ کروڑ افراد پر مشتمل ہے۔ اس کی سرحدیں مشرق میں لائوس اور کمبوڈیا کے ساتھ ملتی ہیں۔ مغرب میں انڈیمان سمندر لگتا ہے، شمال میں میانمار اور لائوس سے سرحدیں ملتی ہیں جب کہ جنوب میں اس کی سرحد ملائیشیا اور خلیج تھائی لینڈ سے ملتی ہیں۔ رقبے کے لحاظ سے یہ دنیا کا پچاسواں بڑا ملک ہے۔ ۱۹۳۲ء میں سیام کا نام بدل کر تھائی لینڈ رکھ دیا گیا۔ تھائی لینڈ میں آسیان تنظیم کے بانی اراکان میں سے ایک ہے۔ تھائی لینڈ کی تاریخ بیس ہزار سال سے بھی پرانی ہے تھائی لینڈ جنوب مشرقی ایشیا کا واحد ملک ہے۔

دوسری عالمی جنگ میں تھائی لینڈ پہلے غیر جانبدار تھا مگر جاپان نے اس پر حملہ کر دیا۔ کچھ عرصے بعد دونوں میں ایک خفیہ معاہدہ ہو گیا۔ جس کے تحت تھائی لینڈ نے جاپان نے تھائی لینڈ کے علاقوں کے خلاف مدد کی جس کے بدلے جاپان نے تھائی لینڈ کے علاقوں سے برطانوی اور فرانسیسی فوجوں کا قبضہ چھڑانے میں مدد کی تھائی لینڈ ایک ترقی کرتا ہوا ملک ہے۔ اس کے برآمدات ۱۰۰ ارب ڈالر سے زائد ہیں جن میں کمپیوٹر کے متعلق آلات گاڑیاں، جیولری، ربڑ، ٹیکسٹائل وغیرہ شامل ہیں۔ تھائی لینڈ کی آمدنی میں سیاحت کا حصہ ۵ فیصد سے زائد ہے۔ یہ دنیا کے ان ممالک میں سے ہے جہاں سیاحوں کی بہت بڑی تعداد ہر سال جاتی ہے۔

شام/سوریہ(Syria):

سوریہ یا شام مشرق وسطیٰ کا ایک نہایت تاریخی اہمیت کا حامل ملک ہے شام کو دنیا کے قدیم ترین ممالک میں سے ہے۔ اس کی سرحدیں مغرب میں فلسطین، لبنان اور اسرائیل کے ساتھ، مشرق میں عراق، شمال میں ترکی اور جنوب میں اردن کے ساتھ ملتی ہیں۔ شام کی سرکاری زبان عربی ہے اور اس کا دارالحکومت دمشق ہے کہا جاتا ہے کہ دمشق دنیا کا قدیم ترین شہر ہے جو اب تک آباد ہے۔

یہ ایک متنوع الانوع ملک ہے جس میں زرخیز میدان بھی ہیں اور بلند و بالا پہاڑی سلسلے بھی صحرا بھی ہیں اور نخلستان بھی اسی طرح یہ مختلف اقوام کا مسکن بھی ہے یہاں عرب، یونانیوں، آرمینین انشیوریوں، کردوں اور ترک بھی آباد ہیں۔ یہاں کی آبادی مختلف مذاہب کا مرکب ہے جن میں سنی، شعیہ، عیسائی، اسماعیلی، یہودی، سلفی، یزیدی وغیرہ شامل ہیں۔ اس کے چودہ انتظامی حصے یا صوبے ہیں۔ دمشق اموی سلطنت کا دارالخلافہ تھا۔ موجودہ شام سلطنت عثمانیہ سے علیحدہ ہونے والا سب سے بڑا ملک ہے۔ شام اقوام متحدہ کے بانی اراکان میں بھی شامل تھا۔ ۱۹۴۶ء سے ۱۹۶۳ء تک شام مختلف سیاسی بحرانوں کا شکار رہا۔ حافظ الاسد کے دور میں کچھ استحکام آیا۔ ۲۰۰۰ء میں حافظ الاسد کے مرنے کے بعد اس کا بیٹا بشار الاسد برسراقتدار میں آیا۔ ۲۰۱۱ء سے اب تک شام میں مختلف علاقائی اور عالمی طاقتوں کے درمیان کشمکش اور خانہ جنگی کی صورت حال ہے۔ جس سے شام کے لوگوں کی حالت انتہائی دگرگوں ہے اور لاکھوں افراد مارے جا چکے ہیں۔

شام کی تاریخ کے آثار پتھر کے دور کے آخری زمانے تک پائے جاتے ہیں۔ قریباً ۱۰۰۰۰ سال ق م کے زمانے میں یہاں زراعت اور شکار کرنے کے آثار ملے ہیں۔ تاریخ کے مختلف ادوار میں شام کے ساتھ بابلیوں، رومیوں، بازنطینیوں، یونانیوں (موجود عراق) حستیوں، مصریوں کی لڑائیاں ہوتی رہی تھیں۔ سوریا کے رہنے والوں نے اپنی عظمت کے زمانے میں آرالی زبان کو بام عروج پر پہنچایا۔ عربوں میں بولی جانے والی مختلف زبانوں میں آرامی زبانوں کے بہت سے الفاظ شامل ہیں۔ سوریا ۶۴۰ عیسوی میں خالد بن ولید کے ہاتھوں اسلامی مملکت میں شامل ہوا۔ شام کا کل رقبہ تقریباً ۷۱ ہزار مربع میل ہے اور آبادی تقریباً ایک کروڑ پچاس لاکھ ہے۔ اس کی اکانومی کا زبان پر انحصار خدمات، تیل اور ایران سے امداد پر ہے۔

شمالی آئر لینڈ (Northern Ireland) :

یورپ میں واقع ایک جزیرہ ہے جس کا دو ہزار کلو میٹر کا ساحلی علاقہ ہے۔اس نے طویل جد و جہد کے بعد برطانیہ سے آزادی حاصل کی۔ڈبلن اس کا بڑا شہر اور دارالحکومت ہے۔ شمالی آئر لینڈ کے شمال مشرق میں برطانیہ کا ایک حصہ ہے جب کہ اس کے جنوب اور مغرب کی طرف آئر لینڈ سے اس کی سرحدیں ملتی ہیں۔اس کی جغرافیائی تنہائی اس کی منفرد ثقافت کو جنم دیتی ہے۔۲۰۱۱ء میں، اس کی آبادی ۱،۸۱۰،۸۶۳ تھی۔اس کا رقبہ ستر ہزار دو سو تہتر مربع کلو میٹر ہے۔ یہاں مردوں اور عورتوں میں خواندگی کی شرح سو فی صد ہے۔

شمالی آئر لینڈ ۱۹۲۱ء میں وجود میں آیا جب آئر لینڈ کو "آئر لینڈ ایکٹ ۱۹۲۰ء" کے تحت کی شمالی آئر لینڈ اور جنوبی آئر لینڈ میں تقسیم کیا گیا۔

شمالی آئر لینڈ تاریخی لحاظ سے آئر لینڈ کے سب سے زیادہ صنعتی علاقے پر مشتمل ہے۔اس علاقے میں سیاسی مشکلات اور سماجی خرابی کا طویل دور ۱۹۹۰ء کی دہائی کے آخر تک ختم ہوا تو اس کی معیشت کی اہمیت میں اضافہ ہوا۔ملک میں امن کی بحالی کی وجہ سے تجارت میں بہتری آئی اس کے علاوہ سیاحت اور بڑے پیمانے پر سرمایہ کاری سے بھی اس کی معیشت میں ترقی ہوئی اور بے روزگاری میں بھی خاطر خواہ کمی آئی۔

شمالی آئر لینڈ سے تعلق رکھنے والے مشہور فن کاروں اور کھلاڑیوں میں وان موریسن، روری میکریرو، جوی ڈونلوپ، وین میکولو اور جورج بیسٹ شامل ہیں۔ شمالی آئر لینڈ کے کچھ لوگ اپنی شناخت آئرش کے نام سے کروانا پسند کرتے ہیں جب کہ بہت سے آئرش لوگ خود کو برطانوی بھی کہتے ہیں اس کی وجہ یہ ہے کہ یہ علاقہ پہلے برطانیہ اور آئر لینڈ کا ہی حصہ تھا، ابھی بھی اس کی ثقافت میں ہمیں آئر لینڈ اور برطانیہ کا اثر نظر آتا ہے۔ بہت سے کھیلوں میں، آئر لینڈ کے جزیرے سے بھی ایک ٹیم شامل ہوتی ہے البتہ فٹ بال ایسوسی ایشن میں شمالی آئر لینڈ شامل نہیں۔ شمالی آئر لینڈ کے کھلاڑی اولمپک گیمز میں عظیم برطانیہ یا آئر لینڈ کے خلاف کھیل سکتے ہیں۔

عراق (Iraq):

یہ ایشیا کا ایک اہم عرب اور مسلمان ملک ہے۔ تیل کے ذخائر میں دنیا میں دوسرے نمبر پر ہے۔اس کے جنوب میں کویت اور سعودی عرب، مغرب میں اردن، شمال مغرب میں شام، شمال میں ترکی اور مشرق میں ایران ہے۔ عراق دنیا کے قدیم ترین ممالک میں شامل ہے جس نے کئی تہذیبوں کو جنم دیا ہے۔ فلسطین کی طرح اسے انبیا کی سرزمین کہا جاتا ہے۔ حضرت نوح علیہ السلام، حضرت ابراھیم علیہ السلام اور حضرت خضر علیہ السلام کا تعلق اسی علاقے سے تھا اور حضرت آدم علیہ السلام نے بھی اس کے شہر قرنہ کو اپنا وطن بنایا تھا۔ عراق قدیم ترین انسانوں کی رہائش گاہ تھی۔ طوفانِ نوح یہیں پر آیا تھا۔ عراق سے ملنے والے آثارِ قدیمہ ثابت کرتے ہیں کہ زمانہ قبل از تاریخ میں بھی یہاں کے لوگ باقاعدہ زبان، ثقافت اور مذہب رکھتے تھے۔ عراق کے شمال مشرق میں شانیدر کے غاروں سے ملنے والے نیاندر تھالا انسان کے ڈھانچوں سے، جو پچاس سے ساٹھ ہزار سال پرانے ہیں، یہ پتہ چلتا ہے کہ وہ بولنے کی صلاحیت رکھتے تھے اور رسومات ادا کیا کرتے تھے مثلاً اپنے مردے پھولوں کے ساتھ دفناتے تھے۔

عراق کو پہلی انسانی تہذیب کی آماجگاہ سمجھا جاتا ہے۔ عراق کا قدیم نام میسوپوٹیمیا ہے۔ مگر یہ وہ نام ہے جو یونانیوں نے انھیں دیا تھا جس کا مطلب یونانی زبان میں 'دریاوں کے درمیان' کے ہیں چوں کہ یہ تہذیب دریائے دجلہ اور دریائے فرات کے درمیان میں پروان چڑھی۔ اسے ہم تہذیب مابین النہرین یا بلاد الرافدین کہتے ہیں۔ یہ علاقہ سمیریا، اکادی، اسیریائی، کلدانی، ساسانی اور بابل کی تہذیبوں کا مرکز تھا جو پانچ ہزار سال قبل از مسیح باقی دنیا میں بھی نفوذ کر گیا۔ انھوں نے دینا کو لکھنا سکھایا اور ابتدائی ریاضیات، فلسفہ اور سائنسی علوم کے اصول دیے۔ اکادی سلطنت لبنان کے ساحلوں تک پھیلی ہوئی تھی۔ اکادیوں کے بعد سمیریوں اور اس کے بعد بابل کی تہذیب نے فروغ پایا۔ چھٹی صدی قبل مسیح میں یہ علاقہ اگلے چار سو سال کے لیے سائرس اعظم کی سلطنتِ فارس کا حصہ بن گیا۔ جس کے بعد سکندر اعظم نے یہ علاقہ فتح کیا جو دو سو سال کے لیے یونانی سلطنت کے زیرِ نگیں رہا۔ سکندر کے بعد ایرانیوں نے ساتویں صدی عیسوی تک راج کیا۔

مسلمانوں نے ساتویں صدی عیسوی میں یہ علاقہ فتح کیا۔ مسلمانوں کے خلیفہ حضرت علی کرم اللہ وجہہ نے اس کے شہر کوفہ کو اپنا دار الخلافہ بنایا۔ اس کے بعد عربوں نے اموی اور عباسی سلطنت کی صورت میں عراق پر حکومت کی۔ عباسیوں نے بغداد کو پہلی دفعہ دارالحکومت بنایا۔ ۱۲۵۸ عیسوی میں منگولوں نے ہلاکو

خان کی قیادت میں بغداد کو تاراج کیا۔اس کے بعد یہ ۱۶ویں صدی عیسوی میں عثمانی سلطنت کا حصہ بنا جس کی یہ حیثیت جنگِ عظیم اول تک برقرار رہی۔

جنگِ عظیم اول کے دوران میں برطانیہ نے اس پر قبضہ کر لیا۔ بعد میں فرانس اور برطانیہ نے بندر بانٹ کر کے مشرق وسطی کے حصے بخرے کیے۔ ۱۹۳۲ء میں انگریزوں نے اسے آزادی دی اور ترکوں کے خلاف جنگ لڑنے کے معاوضے کے طور پر حکومت شریف مکہ کے بھائی امیر فیصل کو دی۔ مگر عراق میں برطانیہ کے فوجی اڈے برقرار رہے اور اصل طاقت اسی کے پاس تھی۔ جنگِ عظیم دوم کے بعد امریکا کا اثر اس خطے میں بڑھنا شروع ہو گی۔

آج کل عراق میں ایک برائے نام حکومت قائم ہے جو ۳۰ جنوری ۲۰۰۵ء کے انتخابات کے نتیجے میں قائم ہوئی تھی مگر امریکی قبضہ جاری ہے اور اصل طاقت اسی کے پاس ہے۔ تیل کی عراقی دولت کو برطانیہ اور امریکا دونوں ہاتھوں سے لوٹ رہے ہیں۔ یہ دور ایک خون آلود دور کے طور پر یاد کیا جائے گا کیوں کہ ان چند سالوں میں اتنی عراقی عوام قتل ہوئی ہے جو پچھلے پچاس سال میں نہیں ہوئی۔ عراق کے سابق صدر صدام حسین کو امریکی کی زیرِ نگیں حکومت نے پھانسی دے دی ہے جس سے فرقہ وارانہ فساد میں اضافہ ہوا ہے۔ استعماری طاقتیں سنی، شیعہ اور کرد مسلمانوں میں اختلافات کو ہوا دے رہے ہیں جس کا منطقی نتیجہ عراق کی تقسیم کی صورت میں نکل سکتا ہے۔اس سے مشرقِ وسطیٰ کا نقشہ ایک بار پھر بدلنے کا امکان ہے۔

اس کی غالب اکثریت مسلمانوں پر مشتمل ہے لیکن کافی تعداد میں مسیحی بھی ہیں۔ اس کا دار الحکومت بغداد ہے جو اس کا سب سے بڑا شہر ہے۔اس کے علاوہ نجف، کوفہ، بصرہ، کربلا، سامرا، موصل اور کرکوک اس کے مشہور شہر ہیں۔ دریائے دجلہ اور فرات اس کے مشہور دریا ہیں۔ ان کے درمیان میں کی وادی انتہائی زرخیز ہے اور اس میں سات سے نو ہزار سال سے بھی پرانے آثار ملتے ہیں۔

عراق کا کل رقبہ ۱۶۸،۷۴۳ مربع میل (۴۳۷،۰۷۲ مربع کلومیٹر) ہے۔اس کا زیادہ تر علاقہ صحرائی ہے مگر دریائے دجلہ اور دریائے فرات کے درمیان میں کا علاقہ انتہائی زرخیز ہے۔ زیادہ تر شہر ان ہی دو دریاؤں کے کناروں پر آباد ہیں۔ عراق کا ساحلِ سمندر خلیج فارس کے ساتھ بہت تھوڑا ہے جو ام قصر کہلاتا ہے اور بصرہ کے پاس ہے۔ عراق عرب کی آخری سرزمین کہلائی جاسکتی ہے،اس کے بعد ایران اور پاکستان کے ممالک ہیں۔ عراق

کے ایک طرف کویت ہے جو کسی زمانے میں عراق ہی کا حصہ تھا۔ایک طرف شام ہے اور ایک طرف سعودی عرب۔ عراق کو اپنے تیل کے ذخائر کی وجہ سے بہت اہمیت حاصل ہے جو دنیا میں دوسرے نمبر پر ہیں۔

عراق میں خشک گرمیوں کا موسم آتا ہے جس میں بادل تک نہیں آتے مگر سردیوں میں کچھ بارش ہوتی ہے۔ عراق کے شمال میں کچھ پہاڑی علاقے بھی ہیں۔

عراق کی آبادی ڈھائی کروڑ سے زیادہ ہے۔ (جولائی ۲۰۰۵ء میں ۲۶،۰۷۴،۹۰۶)۔ان میں سے ۸۰ فی صد عرب ہیں اور باقی کرد (پندرہ فی صد کے قریب) اور دوسری نسلوں (ترک، اسیریائی وغیرہ) سے تعلق رکھتے ہیں۔ مسلمان ۹۷ فی صد ہیں جن میں سے ساٹھ فی صد کے قریب شیعہ مسلمان ہیں۔ اہلِ سنت کی اکثریت شافعی مسلک سے تعلق رکھتی ہے۔ تین فی صد افراد دوسرے مذاہب س تعلق رکھتی ہے جن میں زیادہ مسیحی ہیں۔اور کچھ یہودی، بہائی وغیرہ ہیں۔ عراق کی زندہ آبادی کی اوسط عمر ۷۔۱۹ سال ہے۔اور متوقع عمر ۶۷ سال کے قریب ہے۔ ۲۵ سے ۳۰ فی صد افراد بے روزگار ہیں اور یہ شرح بڑھ رہی ہے۔

فرانس(France):

جمہوریہ فرانس ایک خود مختار ریاست ہے جس کی عمل داری میں مغربی یورپ کا میٹروپولیٹن فرانس اور سمندر پار واقع متعدد علاقے اور عمل داریاں شامل ہیں۔ فرانس کا میٹروپولیٹن خطہ بحیرہ روم سے رودبار انگلستان اور بحیرہ شمال تک نیز دریائے رائن سے بحر اوقیانوس تک پھیلا ہوا ہے، جب کہ سمندر پار علاقوں میں جنوبی امریکا کا فرانسیسی گیانا اور بحر الکاہل و بحر ہند میں واقع متعدد جزائر شامل ہیں۔ ملک کے ۱۸ خطوں (جن میں سے پانچ سمندر پار واقع ہیں) کا مکمل رقبہ ۶۴۳،۸۰۱ مربع کلو میٹر (۲۴۸،۵۷۳ مربع میل) ہے جس کی مجموعی آبادی (جون ۲۰۱۸ء کے مطابق) ۶۷ء۲۶ ملین (چھ کروڑ اکہتر لاکھ چھیاسی ہزار چھ سو اڑتیس) نفوس پر مشتمل ہے۔فرانس ایک وحدانی نیم صدارتی جمہوریہ ہے جس کا دارالحکومت پیرس ہے۔ یہ فرانس کا سب سے بڑا شہر اور ملک کا اہم ترین ثقافتی و اقتصادی مرکز ہے۔ دیگر اہم شہروں میں مارسئی، لیون، لیل، نیس، تولوز اور بورڈو قابل ذکر ہیں۔

وہ خطہ جو اس وقت میٹروپولیٹن فرانس کہلاتا ہے، آہنی دور میں اس جگہ سیلٹک قوم سے تعلق رکھنے والے گال آباد تھے۔ روم نے ۵۱ ق م میں اس خطہ پر قبضہ کیا جو ۴۷۶ء تک برقرار رہا۔ بعد ازاں جرمانی فرانک یہاں آئے اور انھوں نے مملکت فرانس کی بنیاد رکھی۔ عہد وسطیٰ کے اواخر میں فرانس نے جنگ صد

سالہ (۱۳۳۷ء تا ۱۴۵۳ء) میں فتح حاصل کی جس کے بعد فرانس ایک بڑی یورپی طاقت بن کر ابھرا۔ نشاۃ ثانیہ کے وقت فرانسیسی ثقافت پروان چڑھی اور ایک عالمی استعماری سلطنت کی ابتدا ہوئی جو بیسویں صدی عیسوی تک دنیا کی دوسری عظیم ترین سلطنت سمجھی جاتی تھی۔ سولھویں صدی عیسوی میں کاتھولک اور پروٹسٹنٹ کے درمیان مذہبی جنگیں عروج پر تھیں اور یہ پوری صدی انہی جنگوں کے نام رہی، تاہم لوئی چودہ کے زیر اقتدار فرانس یورپ کی غالب تمدنی، سیاسی اور فوجی طاقت بن گیا۔ اٹھارویں صدی عیسوی کے اواخر میں عظیم الشان انقلاب فرانس رونما ہوا جس نے مطلق العنان شہنشاہی کا خاتمہ کرکے عہد جدید کے اولین جمہوریہ کی بنیاد رکھی اور حقوق انسانی کے اعلامیہ کا مسودہ پیش کیا جو بعد میں اقوام متحدہ کے حقوق انسانی کے منشور کا محرک بنا۔

انیسویں صدی عیسوی میں نپولین نے مسند اقتدار سنبھالنے کے بعد فرانسیسی سلطنت اول قائم کی۔ نپولین کے عہد میں لڑی جانے والی جنگوں نے پورے براعظم یورپ کو خاصا متاثر کیا۔ اس سلطنت کے زوال کے بعد فرانس سخت بدنظمی اور انتشار کا شکار رہا، بالآخر سنہ ۱۸۷۰ء میں فرانسیسی جمہوریہ سوم کی بنیاد پڑی۔ فرانس پہلی جنگ عظیم میں شامل تھا جس میں اسے معاہدہ ورسائے کی شکل میں فتح نصیب ہوئی، نیز وہ دوسری جنگ عظیم میں بھی متحدہ طاقتوں کے ساتھ تھا لیکن ۱۹۴۰ء میں محوری طاقتوں نے اس پر قبضہ کر لیا جس سے سنہ ۱۹۴۴ء میں فرانس کو آزادی ملی اور فرانسیسی جمہوریہ چہارم کا قیام عمل میں آیا لیکن یہ جنگ الجزائر کی وقت تحلیل ہو گیا۔ سنہ ۱۹۵۸ء میں چارلس ڈیگال نے فرانسیسی جمہوریہ پنجم کی بنیاد رکھی جو اب تک موجود ہے۔ سنہ ۱۹۶۰ء کی دہائی میں الجزائر اور تقریباً تمام نو آبادیاں فرانسیسی استعمار سے آزاد ہوئیں لیکن فرانس سے ان کے اقتصادی اور فوجی روابط اب بھی خاصے مستحکم ہیں۔

فرانس سینکڑوں برس سے فلسفہ، طبیعی علوم اور فنون لطیفہ کا عالمی مرکز رہا ہے۔ وہاں یونیسکو کے عالمی ثقافتی ورثہ مقامات بکثرت موجود ہیں جنہیں دیکھنے کے لیے ہر سال تقریباً ۸۳ ملین غیر ملکی سیاح آتے ہیں۔ فرانس ایک ترقی یافتہ ملک ہے جو خام ملکی پیداوار کے لحاظ سے دنیا کی ساتویں اور مساوی قوت خرید کے لحاظ سے نویں بڑی معیشت سمجھا جاتا ہے۔ مجموعی خانگی دولت کے حساب سے فرانس دنیا کا چوتھا مالدار ترین ملک ہے۔ نیز تعلیم، نگہداشت صحت، متوقع زندگی اور انسانی ترقی کے میدانوں میں بھی فرانس کو نمایاں مقام حاصل ہے۔ اقوام متحدہ کی سیکوریٹی کونسل میں حق استرداد حاصل ہونے کی بنا پر اسے دنیا کی عظیم طاقت اور باضابطہ جوہری قوت کا

حامل ملک سمجھا جاتا ہے۔ ساتھ ہی یوروزون اور یورپی اتحاد کے سربرآوردہ ممالک میں اس کا شمار ہے۔ نیز وہ نیٹو، انجمن اقتصادی تعاون وترقی، عالمی تجارتی ادارہ اور فرانسیسی بین الاقوامی تنظیم کا بھی رکن رکین ہے۔

کینیڈا (Canada):

کینیڈا براعظم شمالی امریکا کے شمالی بڑے حصے پر مشتمل ہے۔ جنوب میں اس کی سرحد امریکا سے ملتی ہے اور شمال مغرب میں امریکی ریاست الاسکا واقع ہے۔ مشرق میں بحر منجمد شمالی سے لے کر مغرب میں بحر الکاہل تک کینیڈا پھیلا ہوا ہے۔ اس کے شمال میں بحر منجمد شمالی موجود ہے۔ ۱۹۲۵ء سے لے کر اب تک قطب شمالی کا ۶۰ ڈگری سے لے کر ۱۴۱ ڈگری طول بلد کی ملکیت کا یک طرفہ دعویٰ کینیڈا کرتا ہے اگرچہ اسے عالمی طور پر مانا نہیں جاتا۔ روس کے بعد کینیڈا دنیا کا رقبے کے لحاظ سے دوسرا بڑا ملک ہے۔

کینیڈا وفاقی، آئینی، شاہی اور پارلیمانی جمہوریت کا مجموعہ ہے اور دس صوبہ جات اور تین ریاستوں پر مشتمل ہے۔ کینیڈا کو سرکاری طور پر دو زبانوں والا کہتے ہیں۔ انگریزی اور فرانسیسی زبانوں کو سرکاری زبانوں کا درجہ حاصل ہے۔ کینیڈا ٹیکنالوجی کے لحاظ سے ترقی یافتہ اور صنعتی قوم ہے۔ اس کی معیشت کا زیادہ تر انحصار اس کے قدرتی وسائل اور تجارت بالخصوص امریکا کے ساتھ تجارت پر ہے جس کے ساتھ کینیڈا کی طویل المدتی شراکت ہے۔ کھالوں کی تجارت کینیڈا کی تاریخ میں اٹھارویں صدی تک اہم ترین درجہ رکھتی تھی۔

آثارِ قدیمہ کی تحقیقات کے مطابق شمالی علاقے یوکون میں انسانی موجودگی ۲۶،۰۰۰ سال پہلے تھی اور جنوبی علاقے اونٹاریو میں ۹،۵۰۰ سال پہلے انسانی آبادی کے آثار ملے ہیں۔ جب وائکنگ یعنی بحری قزاق یہاں کر کا کے مقام پر ۱۰۰۰ عیسوی میں باقاعدہ آباد ہوئے تو یورپی اقوام یہاں پہلی بار آئیں۔ اس کے بعد آنے والے یورپی یہاں کینیڈا کے ساحل جو بحر اوقیانوس کے کنارے واقع تھے، کی مہم جوئی کی غرض سے آئے۔ پہلی باقاعدہ یورپی آبادکاری کا آغاز فرانسیسیوں نے پورٹ رائل میں ۱۶۰۵ء میں اور کیوبیک سٹی میں ۱۶۰۸ء میں کیا۔ برطانوی آبادکاری کا آغاز نیو فاؤنڈ لینڈ میں ۱۶۱۰ء میں ہوا۔ برطانیہ اور آئرلینڈ سے ۱۸۱۵ء میں کینیڈا میں بڑے پیمانے پر امیگریشن ہوئی۔ کئی معاہدوں کے نتیجے میں امریکا اور کینیڈا کے درمیان طویل المدتی امن قائم ہوا۔

کینیڈا کے سو سال مکمل ہونے پر ۱۹۶۷ء میں جنگ کے بعد مختلف یورپی ممالک سے امیگریشن کا تانتا بندھ گیا۔ اس سے کینیڈا کی جمہوری شکل تبدیل ہوئی۔ اس کے ساتھ ساتھ ویت نام کی جنگ کے دوران امریکا سے جنگ کے

باغی بھی کینیڈا کے مختلف حصوں میں آکر آباد ہوئے۔ بڑھتی ہوئی امیگریشن، شرح پیدائش میں اضافہ اور مضبوط معیشت کی وجہ سے ۱۹۶۰ء کے عشرے کے دوران کینیڈا کا شمار امریکا کے برابر ہونے لگا۔ کینیڈا میں ملکہ الزبتھ کے ساتھ آئینی بادشاہت کا نظام قائم ہے جو کینیڈا کے سربراہ مملکت کا کام سرانجام دیتی ہیں اور وفاقی طرز کی پارلیمانی جمہوریت کا نظام بھی ہے اور اس کی سیاسی روایات بہت مضبوط ہیں۔

کینیڈا کا آئین ملک کے قانونی ڈھانچے کی روح ہے اور یہ تحاریر اور غیر تحریری روایات اور رسموں پر مشتمل ہے۔ آئین میں کینیڈا کا آزادی اور حقوق کا چارٹر شامل ہے جو کینیڈا کے باشندوں کو بنیادی انسانی حقوق اور آزادی دیتا ہے اور اس کو کوئی بھی حکومت کسی بھی قانون کے تحت ختم نہیں کر سکتی۔ تاہم اس میں ایک ایسی ناقابل قبول شق شامل ہے جس سے وفاقی پارلیمان اور صوبائی قانون ساز اسمبلیوں کو اجازت دی گئی ہے کہ وہ اس چارٹر کے کچھ حصوں کو عارضی طور پر زیادہ سے زیادہ پانچ سال تک کے لیے ختم کر سکتے ہیں۔

وزیرِاعظم کی حیثیت کینیڈا کے حکومت سربراہ کی ہے اور یہ عموماً حکمران سیاسی پارٹی کا رہنما ہوتا ہے جو اعتماد کا ووٹ لینے میں کامیاب ہو۔ وزیراعظم اور اس کی کابینہ کو گورنر جنرل، جو ملکہ کا نمائندہ ہوتا ہے، کی طرف سے باقاعدہ مقرر کیا جاتا ہے۔ تاہم وزیراعظم کابینہ کو خود سے منتخب کرتا ہے اور روایات کے مطابق گورنر جنرل کو وزیراعظم کے انتخاب کو قبول کرنا ہوتا ہے۔

کینیڈا کی آبادی کی اوسط تین اعشاریہ پانچ افراد فی مربع کلو میٹر ہے جو دنیا بھر میں سب سے کم گنجان آباد علاقوں میں شمار ہوتا ہے۔ کیوبیک سے لے کر ونڈسر کی پٹی تک (جو گریٹ لیک کے کنارے اور دریائے سینٹ لارنس تک ہے) کینیڈا کے گنجان آباد علاقے شمار ہوتے ہیں۔ اسی طرح کینیڈا میں جتنی جھیلیں اور دریا ہیں، وہ دنیا بھر کے کسی اور ملک کے پاس نہیں ہیں۔ اسی طرح کینیڈا کے پاس میٹھے پانی کے ذخائر دنیا بھر میں سب سے زیادہ ہیں۔ شمالی کینیڈا کی نباتات کونیفر یس جنگلات پر مشتمل ہیں جو قطب شمالی کے بنجر میدانوں تک پھیلے ہیں۔ کینیڈا میں زیادہ سے زیادہ اور کم سے کم اوسط درجہ حرارت جگہ کے لحاظ سے بہت فرق ہیں۔ ملک کے بعض علاقوں جیسے پرنس ایڈورڈ آئی لینڈ صوبے میں روزانہ کا اوسط درجہ حرارت منفی پانچ ڈگری سینٹی گریڈ رہتا ہے اور کم سے کم درجہ حرارت سخت تیز ہوا اور شدید برفانی ٹھنڈ کے باعث منفی چالیس ڈگری سینٹی گریڈ بھی ہو سکتا ہے۔ مگر ساحلی برٹش کولمبیا ایک استثنیٰ ہے۔ یہاں ہلکی سردی اور بارشیں موسم کو خوشگوار بناتی ہیں۔

اسی طرح گرمیوں کے بلند درجہ حرارت بھی جگہ کے لحاظ سے بہت فرق ہو سکتے ہیں۔ مشرق اور مغرب کے سواحل میں درجہ حرارت بیس ڈگری سینٹی گریڈ ہو سکتا ہے جب کہ درمیانی علاقہ عموماً پچیس سے تیس اور کبھی کبھار چالیس ڈگری سینٹی گریڈ بھی ہو سکتا ہے۔

گزشتہ صدی میں تیزی سے ہونے والی مینوفیکچرنگ، کان کنی اور خدمات کے شعبے میں ترقی نے اس قوم کو شہری اور صنعتی قوم بنا دیا ہے۔ دنیا کی دوسری ترقی یافتہ اقوام کی مانند، کینیڈا کی معیشت کا بڑا حصہ خدمات سے متعلق ہے اور کینیڈا کے تین چوتھائی باشندے اس سے متعلق ہیں۔ تاہم کینیڈا اس لحاظ سے فرق ہے کہ کینیڈا کی معیشت میں لکڑی اور تیل کی صنعتیں بنیادی اہمیت رکھتی ہیں۔

کینیڈا ان چند ترقی یافتہ ممالک سے ایک ہے جو توانائی برآمد کرتے ہیں۔ کینیڈا میں قدرتی گیس کے وسیع ذخائر مشرقی ساحل پر موجود ہیں۔ کینیڈا زرعی پیداوار کے حوالے سے بھی دنیا کا ایک اہم ملک ہے۔ کینیڈا کی چراگاہیں گندم اور دیگر غلہ جات پیدا کرنے کے لیے مشہور ہیں۔ کینیڈا جست اور یورینیم کے علاوہ دیگر معدنیات جیسا کہ سونا، کانسی، المونیم اور سیسہ کے لیے بھی بہت مشہور ہے۔ اونٹاریو کے جنوب میں واقع صنعتی علاقہ خاص طور پر گاڑیوں کی پیداوار کے لیے مشہور ہے۔ کینیڈا کی تجارت کا بنیادی دارومدار بین الاقوامی تجارت بالخصوص امریکا کے ساتھ ہے۔

کینیڈا کی آبادی کا ۷۷۔ ۱فی صد حصہ مسیحی ہے جس میں سے کل آبادی کا ۴۳۔۶ فی صد حصہ کیتھولک ہیں اور باقی پروٹسٹنٹ ہیں۔ ۱۷ فی صد نے کسی مذہب سے تعلق ظاہر نہیں کیا۔ باقی ۶۔۳ فی صد میں سے اکثریت مسلم ہیں۔

غیر سرکاری زبانیں بھی اہمیت رکھتی ہیں اور ان کے بولنے والے پانچ ملین (۵،۲۴۵،۲۰۲) سے زائد ہیں۔ ان میں چینی، اطالوی، جرمن اور پنجابی زبانیں شامل ہیں۔

لندن (London):

برطانیہ کا دارالحکومت اور سب سے بڑا شہر ہے۔ جس کی آبادی تقریباً دو ہزار سال پرانی ہے۔ اس شہر کے تاریخی مطالعے سے معلوم ہوتا ہے کہ اس کی بنیاد قدیم رومیوں نے رکھی تھی۔ اس آبادی کے قیام سے آج تک لندن بہت سے تحریکوں اور عالمگیر واقعات کا مظہر رہا ہے، جس میں انگریزوں کا ارتقا، صنعتی انقلاب اور قدیم رومیوں کا احیاء بھی شامل ہیں۔ مرکزِ شہر اب بھی وہی قدیم شہرِ لندن ہے، جس میں اب بھی قرونِ وسطٰی کی حدود نظر آتی ہیں، تاہم کم از کم اُنیسویں صدی میں یہ شہر اپنے اطراف و اکناف میں بسے علاقوں تک پھیل گیا۔ آج لندن دنیا کے ممتاز تجارتی، معاشی اور ثقافتی مراکز میں سے ایک ہے اور دنیا بھر

کی سیاسی، تعلیمی، تفریحی، صحافتی، فیشن اور فنون لطیفہ کی سرگرمیوں پر اس کے گہرے اثرات موجود ہیں جو اس کے بین الاقوامی شہر ہونے کے شاہد ہیں۔لندن میں یونیسکو عالمی ثقافتی ورثہ کی حامل چار عمارتیں ہیں: ویسٹ منسٹر محل اور کلیسائے ویسٹ منسٹر، کلیسائے سینٹ مارگریٹ، لندن بُرج، گرینچ کی تاریخی آبادی اور شاہی نباتاتی باغیچہ، کیو۔ یہ شہر اندرون ملک و بیرون ملک سے آنے والے سیاحوں کا سب سے بڑا مرکز ہے۔

لندن مختلف قسم کے لوگوں، مذاہب اور ثقافتوں کا گہوارہ ہے،اس شہر میں تین سو سے زائد زبانیں بولی جاتی ہیں۔ ۲۰۰۶ء کے سرکاری اعداد و شمار کے مطابق یہاں کی آبادی ۷۵،۱۲،۴۰۰ ہے جو مرکزی لندن کی حدود میں ہے۔ یہ آبادی کے لحاظ سے یورپی اتحاد کا سب سے بڑا شہر ہے۔

انگریزوں کا دعوی ہے کہ قدیم رومی دور میں بھی لندن ایک سر گرم مرکز تھا۔یہ چھوٹا سا گاؤں دریائے تھیمز کے کنارے اس طرح آباد کیا گیا کہ ایک طرف سے دریا اس کی حفاظت کرتا تھا۔تاریخ بتاتی ہے کہ جن دنوں عرب مسلمانوں کی تہذیب ہسپانیہ یعنی اسپین میں عظمت کی بلندیوں کو چھو رہی تھی ان دنوں لندن ایک چھوٹے سے گاؤں کی حیثیت رکھتا تھا جہاں کی دلدلی اور بنجر زمین پر چند جھونپڑی نما مکانات اور کچی سڑکیں تھیں اور لوگ بھی زیادہ تر وحشی اور غاروں کے باسی تھے چناں چہ جب انگریزوں کی فوج رچرڈ شیر دل کی قیادت میں صلاح الدین ایوبی سے صلیبی جنگوں میں مقابلہ کرنے گئی تو اس کی اکثریت کھالوں میں ملبوس تھی اور مسلمان فوج کے لباس اور ہتھیار دیکھ کر رچرڈ کے فوجی دنگ رہ گئے۔ ۱۲۵۸ءکے سقوطِ بغداد کے عظیم المیے کے بعد جب تہذیب کا سورج مغرب میں طلوع ہوا تو یورپی اقوام نے اپنے شہر منظم کرنا شروع کیا۔ یورپ میں شہر بسانے کے لیے پہلے کوئی یادگار مثلاً فوارا یا گھنٹا گھر قسم کی چیز تعمیر کر کے اس کے گرد ایک بہت بڑا گول چوراہا بنایا جاتا تھا جس سے کچھ فاصلے پر اردگرد گولائی میں مکانات بننا شروع ہو جاتے تھے اور یوں شہر وجود میں آجاتا تھا۔اس کے برعکس مشرق میں پہلے ایک سیدھا طویل بلکہ مستطیل بازار تعمیر کیا جاتا ہے جس کے اردگرد مکانات تعمیر کیے جاتے ہیں۔انگریزوں نے برصغیر میں جو شہر آباد کیے ان میں بھی اپنا یہی انداز اپنایا چناں چہ لائل پور (موجودہ فیصل آباد) اور گوجرانوالہ اسی طرح کے گول شہر ہیں۔

اصل لندن بھی ایک فوارے کے گردا گرد آباد ہے جس کا نام پکاڈلی سرکس ہے۔اس فوارے، پکاڈلی سرکس کے چاروں طرف چھ بازار نکلتے ہیں جو آدھے آدھے میل لمبے ہیں،اصل شہر لندن کی بس یہی حدود ہیں یعنی ایک میل لمبا اور ایک میل چوڑا۔انگریزوں کی کالونیاں ہونے کی وجہ سے جب دور دور کی دولت سمٹ کر لندن پہنچی تو

چند ہزار کی آبادی والا یہ شہر لاکھوں کا شہر بن گیا اور لندن کے گرد مضافاتی بستیاں بنائی گئیں اور انھیں مکمل شہروں کے اختیارات دیے گئے چناں چہ لندن شہر سے کہیں بڑے بارہ شہر لندن کے گرد ۱۹۴۰ء میں آباد کیے گئے اور ان شہروں کو 'ہوم کاؤنٹی' کا نام دیا گیا۔

ایک محتاط اندازے کے مطابق روزانہ گیارہ سے بارہ لاکھ افراد لندن میں داخل ہوتے، گھومتے پھرتے ہیں اور شام کو واپس جاتے ہیں اور ٹرانسپورٹ کے بہترین نظام سے فائدہ اٹھاتے ہیں جو ہائی ویز سے لے کر ریل کے جدید نظام تک پھیلا ہوا ہے۔ لندن کے بین الاقوامی ہوائی اڈے ہیتھرو پر قریباً ساڑے چار کروڑ مسافر سالانہ سفر کرتے ہیں۔ دنیا کی سب سے پہلی زیر زمین ریل گاڑی ۱۸۶۳ء میں لندن میں چلائی گئی۔ دوسری جنگ عظیم میں زیر زمین ریل گاڑی کے نظام کو کافی نقصان پہنچا تھا۔ اب اس کی پٹریوں کی کل لمبائی ۲۵۴ میل ہے، لندن کا کوئی مقام ایسا نہیں جو اس کی دسترس سے باہر ہو۔

مراکش (Morocco):

مراکش شمالی مغربی افریقہ کا ایک ملک ہے اس کا رقبہ تقریباً سات (۷) لاکھ مربع کلومیٹر ہے۔ اس کا دارالحکومت رباط ہے۔ اس کی آبادی ساڑھے تین کروڑ سے زائد ہے اور کرنسی مراکشی درہم ہے۔ یہاں پر عربی، بربری، فرانسیسی اور ہسپانوی زبان کثرت سے بولی اور سمجھی جانے والی زبانیں ہیں۔ اس کے مشرق میں الجیریا، مغرب میں بحریہ اٹلانٹک، شمال میں بحیرہ روم اور جنوب میں موریطانیہ واقع ہے۔

مراکش میں بادشاہت قائم ہے۔ بادشاہ لامحدود اختیارات کا مالک ہے۔ مراکش کا لفظی مطلب ''خدا کی زمین'' ہے۔ مراکش کی تاریخ دو لاکھ قبل مسیح تک پھیلی ہوئی ہے۔ مراکش میں اسلام ساتویں صدی عیسوی میں اموی دور میں پھیلا۔ گیارہویں صدی میں بربری قبائل کو عروج حاصل ہوا۔ سولھویں صدی میں مراکش میں شدید قحط سالی پھیل گئی جس کی وجہ سے اس کی ایک تہائی سے زائد آبادی موت کے منہ میں چلی گئی۔ مراکش پہلا ملک تھا جس نے ریاست ہائے متحدہ امریکہ کو تسلیم کیا۔ بیسویں صدی میں مراکش پر سپین اور فرانس کا اثر بہت زیادہ بڑھ چکا تھا۔ بیسویں صدی کی دوسری دھائی میں مراکش میں قابض افواج کے خلاف بغاوت ہوئی جس کے نتیجے میں سپین کو بھاری جانی نقصان اٹھانا پڑا مگر آخر کار یہ بغاوت فرد کر دی گئی۔

مارچ ۱۹۵۶ء میں مراکش کو فرانس سے آزادی حاصل ہوئی۔ ۱۹۷۵ء میں ساڑھے تین لاکھ سے زائد مراکش باشندوں نے صحارا کے علاقے سے ہسپانوی قبضہ چھڑوانے کے لیے ''سبز مارچ'' کیا جس پر مجبور ہو کر مغربی صحارا کا

علاقہ خالی کر دیااور مراکش افواج نے اس پر قبضہ کر لیا۔ مراکش کی آب و ہوا متنوع ہے۔ یہاں پر صحرائی علاقے بھی شامل ہیں اور پہاڑی علاقے بھی اس کے علاوہ سر سبز و شاداب علاقے بھی پائے جاتے ہیں۔ مراکش بارہ انتظامی علاقوں میں تقسیم کیا گیا ہے جسے مزید ۶۲ صوبوں میں تقسیم کیا گیا ہے۔

مراکش کی آمدی کا ایک اچھا ذریعہ سیاحت ہے یہاں ہر سال لاکھوں سیاح آتے ہیں اس کے علاوہ زراعت نہایت اہم شعبہ ہے جس سے ۴۰ فی صد تک لوگ منسلک ہیں یہاں کی اہم کھیل فٹ بال ہے۔

مصر(Egpt):

عرب جمہوریہ مصر یا مصر براعظم افریقا کے شمال مغرب اور براعظم ایشیا کے سنائی جزیرہ نما میں واقع ایک ملک ہے۔ مصر کا رقبہ ۱,۰۰۱,۴۵۰ مربع کلو میٹر ہے۔ مصر کی سرحدوں کو دیکھا جائے تو مغرب میں لیبیا، جنوب میں سوڈان، مشرق میں بحیرہ احمر، شمال مشرق میں فلسطین شمال میں بحیرہ روم ہیں۔

مصری سلطنت شمالی افریقہ کی ایک قدیم تہذیب ہے جو دریائے نیل کے کنارے واقع ہے جہاں آج کا مصر آباد ہے۔ قدیم مصر ۳۵۰۰ قبل مسیح کا ایک معاشرہ تھا جو ۲۰ ق م تک اس وقت تک قائم رہا جب اس پر رومی سلطنت نے قبضہ کر لیا۔

آج کا مصر آبادی کے حساب سے دنیا کا پندرہواں اور افریقہ کا دوسرا سب سے بڑا ملک ہے۔ مصر کے ۷ کروڑ ۸۸ لاکھ لوگوں کی اکثریت دریائے نیل کے قریب رہتی ہے۔ اس ہی علاقے میں مصر کی قابل کاشت زمین بھی پائی جاتی ہے۔

متحدہ عرب جمہوریہ مصر ۱۹۵۸ء میں مصر اور شام کے اتحاد سے طے پانے والی ریاست تھی۔ یہ ۱۹۶۱ء میں شام کے علیحدہ ہونے تک قائم رہی تاہم مصر ۱۹۷۱ء تک اس نام کو استعمال کرتا رہا۔

۱۹۵۶ء میں سوئز بحران کے بعد مصر کے صدر جمال عبدالناصر کی مقبولیت اور عرب قوم پرستی کے خیالات سے متاثر ہو شام کے سیاسی و عسکری رہنماؤں کے ایک گروہ نے دونوں ممالک کے اتحاد کی تجویز پیش کی جس پر یکم فروری ۱۹۵۸ء کو عمل درآمد کیا گیا۔

دونوں ممالک کے صدور جمال عبدالناصر اور شکری القوتلی نے مصر و شام میں ریفرنڈم کے بعد ۲۲ فروری ۱۹۵۸ء کو اتحاد کے معاہدے پر دستخط کیے۔ صدر ناصر کو اس نئی جمہوریہ کا صدر منتخب کیا گیا جبکہ قاہرہ دار الحکومت قرار پایا۔ ایک نیا وفاقی آئین بھی تشکیل دیا گیا۔

عرب جمہوریہ کا پرچم پر دو ستارے دونوں ریاستوں کی نمائندگی کرتے رہے۔ یہ پرچم آج بھی شام استعمال کرتا ہے جب کہ عراق میں اسی قسم کا پرچم استعمال کیا جاتا ہے تاہم اس میں تین ستارے ہیں۔

ہالینڈ/نیدرلینڈز(Netherlands / Holland):

نیدرلینڈز یا نیدرلانت یا جسے ہالینڈ (Holland) بھی کہا جاتا ہے مملکت نیدرلینڈز کا جزو ملک ہے جو براعظم یورپ میں واقع ہے۔ مملکت ہالینڈ، نپولین کی قائم کردہ کٹھ پتلی ریاست تھی جو نیدرلینڈ کو بہتر کنٹرول کرنے کے لیے بنائی گئی تھی۔ اس کی سرکاری زبان ولندیزی ہے۔ ۲۰۱۳ء میں اس کی آبادی ایک کروڑ اکہتر ہزار سات سو پندرہ (۱۷۱۰۰۷۱۵) افراد پر مشتمل تھی۔ یہاں آئینی بادشاہت قائم ہے اور آج کل ولیم الیکسانڈر یہاں کے حکمران ہیں۔ اس کی سرحدیں فرانس، جرمنی، بیلجیئم اور وینزویلا سے ملتی ہیں۔ یورو کو یہاں کرنسی کے طور پر استعمال کیا جاتا ہے۔ یہ ملک اپنی پھولوں کی کاشت کی وجہ سے دنیا میں مشہور ہے۔ اس کے ٹیولپ کے کھیت بہت دلچسپ نظارہ پیش کرتے ہیں۔ فلم ساز یہاں عکس بندی کے لیے جاتے ہیں اور سیاحت کا بھی بہت رجحان ہے۔

اس کا دارالحکومت شہر ایمسٹرڈیم ہے۔ اس کا یہ نام 'ایمسٹل ڈیم' سے اخز کیا گیا ہے جو اس شہر کی ابتدا کی طرف اشارہ کرتا ہے۔ ایمسٹرڈیم دراصل ایمسٹل دریا کے کنارے بنائے جانے والے ایک بند (ڈیم) کے قریب بسنا شروع ہوا تھا۔ ایمسٹرڈیم اپنی ایک تاریخی بندرگاہ کی وجہ سے بھی شہرت رکھتا ہے جس کا نام ریکس میوزیم ہے۔ ایمسٹرڈیم کے بازار حسن، کیفے اور نہریں بھی اس کی شہرت کا سبب ہیں۔ بالخصوص یہاں کی نہروں کی وجہ سے ایمسٹرڈیم کو شمال کا وینس بھی کہا گیا۔ اپنے سنہری دور میں ایمسٹرڈیم دنیا کے اہم ترین بندرگاہوں میں سے ایک کا درجہ رکھتا تھا۔ اس زمانے میں کاروبار میں جدت نے ایمسٹرڈیم کو فنانس اور ہیروں کے کاروبار کا مرکز بنا دیا تھا۔ ۱۲ویں صدی میں ایمسٹرڈیم ایک مچھیروں کی بستی تھی جو بڑی ہوتے ہوتے نیدرلینڈز کا سب سے بڑا شہر بن گئی۔ یہاں پر ۱۷۲ قوموں کے تقریباً'' ساڑھے سات لاکھ افراد رہتے ہیں۔ نواحی علاقوں کو شامل کر لیا جائے تو یہاں کی آبادی ۲۲ لاکھ ہو جاتی ہے۔

ہائیڈل برگ(Heidelburg):

ہائیڈل برگ جرمنی کے صوبے بادن-وور تمبرک کا پانچواں بڑا شہر ہے- یہ نیکر دریا کے کنارے آباد ہے۔ یہ ایک مشہور سیاحتی مقام ہے۔ اس کا قلعہ اور یونیورسٹی بہت مشہور ہے۔

علامہ اقبال نے اسی شہر میں جرمن زبان سیکھی اور ان کی نظم ''دریائے نیکر کے کنارے'' اسی پس منظر میں لکھی گئی ہے۔

ہائیڈل برگ یونیورسٹی جرمنی کی قدیم ترین جامعہ ہے جو ۱۳۸۶ء میں قائم ہوئی۔ یونیورسٹی کے ساؤتھ ایشین انسٹیٹیوٹ میں اقبال چیئر قائم کی گئی لیکن اب یہ چیئر ۲۰۱۴ء میں پروفیسر سید وقار علی شاہ کے چلے جانے کے بعد سے خالی ہے۔ پہاڑوں کے درمیان دریا اور اس کے دونوں طرف پھیلی ہوئی خوبصورت وادی بہت حسین منظر پیش کرتی ہے۔ ہائیڈل برگ کی فضا بہت صاف ہے اور غالباً یہ جرمنی کا واحد شہر ہے جہاں صنعتیں نہیں۔ اس لیے فضائی آلودگی کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔

ہائیڈل برگ کا پرانا شہر ایک چھوٹا سا اور پیارا شہر ہے جہاں ہر وقت سیاحوں کا ہجوم ہوتا ہے۔ ہائیڈل برگ کا قلعہ قابل دید ہے اور یہاں تک پہنچنے کے لیے ایک خصوصی ٹرین سے آنا پڑتا ہے۔ قلعے سے شہر کا دلفریب نظارہ ہوتا ہے۔ اس قلعے کے اندر ادویہ کے بارے میں میوزیم قائم ہے جو سیاحوں کی دلچسپی کا اہم مرکز ہے۔

ویلز (Wales):

ویلز برطانیہ کے ۴ آئینی ممالک میں سے ایک ہے جو انگلستان، اسکاچستان (اسکاٹ لینڈ)، ویلز اور شمالی آئرلینڈ (شمالی آئرستان) پر مشتمل ہے۔ یہ برطانیہ عظمیٰ کے جنوب مغرب میں واقع ہے اور اس کی سرحدیں مشرق میں انگلستان کی کاؤنٹی چیشائر، شروپشائر، ہیرفورڈ شائر اور گلوسسٹر شائر سے، جنوب مغرب میں رود باد سینٹ جارج اور شمال اور مغرب میں بحیرہ آئرش سے ملتی ہیں۔

ویلز ۲۰،۷۷۹ مربع کلومیٹر (۸،۰۲۲ مربع میل) پر پھیلا ہوا ہے جب کہ ۲۰۱۱ء کے اندازوں کے مطابق اس کی آبادی ۳،۰۶۳،۵۰۰ ہے۔

ویلز کا دارالحکومت کارڈف ہے اور یہاں ویلش اور انگریزی قومی زبانیں ہیں۔

یونان (Greece):

یونان یا جمہوریہ ہیلینیہ جنوب مشرقی یورپ میں جزیرہ نما بلقان کے نشیب میں واقع ملک ہے۔ اس کی سرحدیں شمال میں البانیا، مقدونیہ اور بلغاریہ اور مشرق میں ترکی سے ملتی ہیں۔ مغرب میں بحیرہ ایونی اور جنوب میں بحیرہ ایجین واقع ہے۔

یونان کو فنون لطیفہ کی ماں بھی کہا گیا ہے۔ یہاں سنگ مر مر افراط سے ملتا تھا لہذا فن تعمیر میں غیر معمولی ترقی کی۔

جمہوریت کا تصور سب سے پہلے یونان میں قائم ہوا اور وہاں سے یہ طرز حکومت دنیا کے دوسرے ملکوں تک پہنچا۔ یونان میں ہر نوجوان کو اٹھارہ سال کی عمر میں ایتھنز کی دیوی کے حضور میں وفاداری احلف اٹھانا پڑتا تھا۔

ایتھنز (athens) یونان کادارالحکومت اور سب سے بڑا شہر اور جمہوریت کی جائے پیدائش ہے۔ شہر کا نام یونانی دیومالا میں ایتھنے (آتھینا) دیوی کے نام پر رکھا گیا ہے۔ ۳.۷ملین کی آبادی کا حامل یہ شہر شمال اور مشرق کی جانب مزید وسعت پارہا ہے اور یونان کا اقتصادی، تجارتی، صنعتی، ثقافتی اور سیاسی قلب سمجھا جاتا ہے۔ یہ شہر یورپ کا ابھرتا ہوا کاروباری مرکز ہے۔

قدیم ایتھنز (آتھینا) ایک طاقتور ریاست اور افلاطون اور ارسطو کے تعلیمی اداروں کے باعث علم کا معروف مرکز تھا۔ اسے چوتھی اور پانچویں صدی قبل مسیح میں اس وقت تک دریافت شدہ یورپ پر چھوڑے گئے گہرے ثقافتی و سیاسی اثرات کے باعث مغربی تہذیب کی گہوارہ سمجھا جاتا ہے۔ شہر پار تھینون، ایکروپولس (بلند شہر)، کیلی کریٹس اور فیڈیاس جیسے معروف تعمیراتی شاہکاروں کے علاوہ کئی قدیم یادگار اور فن تعمیر کے نادر نمونوں کا حامل ہے۔ ان میں سے کئی ثقافتی یادگاروں کی ۲۰۰۴ء اولمپک گیمز سے قبل تزئین و آرائش کی گئی۔

پہلے ہزاریہ قبل مسیح میں یونانی تہذیب کے زریں دور میں ایتھنز یونان کا ابھرتا ہوا شہر تھا۔ یونان کے سنہرے دور (۵۰۰ قبل مسیح تا ۳۲۳ قبل مسیح) میں یہ دنیا کا ثقافتی و تعلیمی مرکز تھا۔ ۴۳۱ قبل مسیح میں ایتھنز (آتھینا) ایک اور شہری ریاست اسپارٹا سے جنگ میں شکست کھا گیا اور تباہی کا شکار ہوا۔

۵۲۹ء میں مسیحی بازنطینی سلطنت نے فلسفے کی درس گاہوں کو بند کر دیا اور ایتھنز اپنی (آتھینا) تعلیمی حیثیت کھو بیٹھا۔

۱۱ اور ۱۲ صدی عیسوی کے دوران بازنطینی شہر کی حیثیت سے ایتھنز (آتھینا) ایک مرتبہ پھر عالمی افق پر ابھرا اور ایتھنز (آتھینا) کے گرد قائم تمام اہم بازنطینی گرجے انہی دو صدیوں کے دوران تعمیر ہوئے۔

۱۳ اور ۱۵ ویں صدی میں شہر کو اس وقت زبردست نقصان پہنچا جب یونانی بازنطینیوں اور فرانسیسی و اطالوی صلیبیوں کے درمیان شہر میں جنگ لڑی گئی۔ ۱۴۵۸ء میں عثمانی فرمانروا سلطان محمد فاتح نے شہر کو فتح کر لیا۔ شہر میں

داخلے کے بعد سلطان اس کی خوبصورتی سے انتہائی متاثر ہوا اور فرمان جاری کیا کہ شہر کی کسی تاریخی عمارت یا مقام کو کوئی نقصان نہ پہنچایا جائے۔ فتح ایتھنز (آتھینا) کے بعد پار تھینون کو مسجد میں تبدیل کر دیا گیا۔

۱۸۲۱ء سے ۱۸۳۱ء کے دوران یونانی جنگ آزادی میں عثمانیوں کا ایتھنز (آتھینا) پر اثر ور سوخ ختم ہونے لگا اور جب ۲۹ ستمبر ۱۸۳۴ء کو ایتھنز (آتھینا) کو آزاد یونان کا دارالحکومت قرار دیا گیا تو اس کی آبادی صرف ۵ ہزار تھی۔ اگلی چند دہائیوں میں شہر کی جدید بنیاد پر از سر نو تعمیر کی گئی۔ ۱۸۹۶ء میں اسی شہر نے پہلے گرمائی اولمپک گیمز کی میزبانی کی۔ شہر میں دوسری بڑی توسیع ۱۹۲۰ء کی دہائی میں اس وقت کی گئی جب ایشیائے کوچک کے یونانی مہاجرین کے لیے آبادیاں قائم کی گئیں۔ دوسری جنگ عظیم کے دوران جرمنی نے ایتھنز (آتھینا) پر قبضہ کر لیا اور اسے جنگ کی بھاری قیمت چکانی پڑی۔

دوسری جنگ عظیم کے بعد ۱۹۸۰ء تک شہر کی آبادی میں کئی گنا اضافہ ہوا جس سے بڑھتی ہوئی آبادی اور ٹریفک کے مسائل پیدا ہوئے۔ ۱۹۸۱ء میں یونان کی یورپی یونین میں شمولیت کے بعد گنجان صنعتی علاقوں اور فضائی آلودگی جیسے مسائل پر قابو پانے کے لیے بڑے پیمانے پر سرمایہ کاری کی گئی۔ شہر کے منتظمین نے آلودگی اور ٹریفک کے مسائل پر بڑی حد تک قابو پا لیا ہے اور آج ایتھنز جدید ڈھانچے، یادگار قدیم تعمیرات اور عجائب گھروں، جیتی جاگتی زندگی اور عالمی معیار کے خریداری مراکز کا حامل ایک جدید شہر ہے۔

قدیم یونان ایک تہذیب ہے جو یونانی تاریخ سے متعلق ہے جس کی مدت تاریخ آٹھویں صدی سے چھٹی صدی قبل از مسیح سے ۱۴۶ قبل مسیح تک اور رومیوں کی جنگ کورنتھ میں یونان پر فتح تک محیط ہے۔ اس مدت کا درمیانی دور یونان کا کلاسیکی دور ہے جو پانچویں تا چوتھی صدی قبل مسیح کے دوران پھلا پھولا۔

مملکت یونان (Kingdom of Greece) لندن کنونشن میں بڑی طاقتوں (برطانیہ، فرانس اور سلطنت روس) کی طرف سے ۱۸۳۲ء میں قائم کردہ ایک ریاست ہے۔

یورپ (Europe):

یورپ (europe) دنیا کے سات روایتی براعظموں میں سے ایک ہے تاہم جغرافیہ دان اسے حقیقی براعظم نہیں سمجھتے اور اسے یوریشیا کا مغربی جزیرہ نما قرار دیتے ہیں۔ اصطلاحی طور پر کوہ یورال کے مغرب میں واقع یوریشیا کا تمام علاقہ یورپ کہلاتا ہے۔

یورپ کے شمال میں بحر منجمد شمالی، مغرب میں بحر اوقیانوس، جنوب میں بحیرہ روم اور جنوب مشرق میں بحیرہ روم اور بحیرہ اسود کو ملانے والے آبی راستے اور کوہ قفقاز ہیں۔ مشرق میں کوہ یورال اور بحیرہ قزوین یورپ اور ایشیا کو تقسیم کرتے ہیں۔

یورپ رقبے کے لحاظ سے آسٹریلیا کو چھوڑ کر دنیا کا سب سے چھوٹا براعظم ہے جس کا رقبہ ایک کروڑ چالیس لاکھ مربع کلومیٹر ہے جو زمین کے کل رقبے کا صرف دو فیصد بنتا ہے۔ یورپ سے بھی چھوٹا واحد براعظم آسٹریلیا ہے۔ آبادی کے لحاظ سے یہ تیسرا سب سے بڑا براعظم ہے جس کی آبادی ۷۱ کروڑ ہے جو دنیا کی کل آبادی کا 11 فیصد بنتا ہے۔ اس کا رقبہ ۱۰،۱۸۰،۰۰۰ مربع کلومیٹر اور ۳،۹۳۰،۰۰۰ مربع میل ہے، اس لحاظ سے یہ دنیا کا چھٹا بڑا براعظم ہے۔ ۲۰۱۳ء میں یہاں کی کل آبادی چوہتر کروڑ چوبیس لاکھ باون ہزار (۷۴۲،۴۵۲،۰۰۰) افراد پر مشتمل تھی، آبادی میں اس براعظم کو تیسرے نمبر پر شمار کیا جاتا ہے جب کہ فی مربع کلومیٹر (۷۲.۹ /sq km اور ۱۸۸/sq mi) کے حساب سے یہ دوسرا کثیف حصہ ہے۔

یہاں کل پچاس ممالک ہیں جن میں سے پانچ ملکوں کا مکمل آزادی حاصل نہیں۔ یہاں بہت سی زبانیں بولی جاتی ہیں، ماہرین نے دو سو پچیس کے قریب زبانیں شمار کی ہیں۔ براعظم یورپ میں واقع (۵۰) ممالک کے نام یہ ہیں:

آئرلینڈ، آئس لینڈ، آرمینیا، اسپین، آسٹریا، اسٹونیا، البانیا، انڈورا، اٹلی، برطانیہ، بلجئیم، بلغاریہ، بوسنیا و ہرزیگووینا، بیلارس، پرتگال، پولینڈ، جارجیا، جرمنی، چیکیا، روس، رومانیہ، سان مارینو، سربیا، سلوواکیہ، سلووینیا، سوئٹزرلینڈ، سویڈن، قبرص، فرانس، جزائر فارو، فن لینڈ، قازقستان، کرویئشا، جبرالٹر، لتھووینیا، لکسمبرگ، لٹویا، لیخ تینستائن، مالٹا، مالڈووا، مقدونیہ، مناکو، مونٹی نیگرو، ناروے، نیدرلینڈز، ڈنمارک، ہنگری، یوکرین اور یونان۔

تعلیقات (ادارے اور اصطلاحات)

اشتراکیت: (Socialism)

اشتراکیت کی تعریف اور مفہوم اس سے زیادہ کچھ نہیں کہ ،اشتراکیت اور کیمونزم استحصال سے پاک معاشرے کا قائم ہے جہاں انسان کی مانگ کا خاتمہ ہوگا۔مارکسزم ایک سماجی سائنس ہے جس طرح زندگی کی بائیولوجی، مادے کی فزکس، کیمیکل کی کیمسٹری ہے جو معاشرے میں انسان کو اوّل حثیت دے کر اس کی تمام ضروریات کی باز یابی کی مکمل ضمانت ہے طبقاتی اور غیر مساویانہ سماج کے خلاف ٹھوس اور مادی جدوجہد کے قوانین کی آگاہی دیتی ہے انسان کو اپنا مقدر خود بنانے کی ترغیب اور تمام سماجی ذریعے پیداوار کو بھرپور استعمال کر کے انسانی سماج سے استحصال بھوک ننگ افلاس کا مکمل خاتمہ کر کے روٹی کمانے کی ذلت آمیز مزدوری سے نجات اور اس محنت کو تخلیق اور تسخیر کائنات کے لیے کارآمد بنانا ہے نہ کہ ساری زندگی انسانوں کی ایک بڑی اکثریت چند لوگوں کی مراعات اور عیاشیوں کے لیے مزدوری اور غلامی کرتی رہے۔اس لیے سوشلزم کا بھی تمام مذاہب سے وہی تعلق ہے جو دوسری سائنسی مضامین کا مذاہب سے ہے۔

اشتمالیت یا کیمونزم: (Communism)

اشتمالیت یا کیمونزم ایک انقلابی سماجی تحریک ہے جس کے ذریعہ درجہ بندی اور ملک سے بالاتر سماجی نظام کی تخلیق مقصود ہے۔اشتمالی نظام میں ذرائعِ پیداوار مشترکہ ملکیت میں ہوتے ہیں۔یہ اشتراکیت کی ایک شاخ ہے۔

انجمنِ ہلالِ احمر: (International Red Cross and Red Crescent Movement)

بین الاقوامی انجمن صلیب احمر و ہلال احمر ایک فلاحی ادارہ جس کی شاخیں دنیا کے ہر ملک میں ہیں۔یہ ادارہ سب سے پہلے سوئٹزرلینڈ میں قائم ہوا۔اس کا مقصد جنگ میں زخمی ہونے والے سپاہوں کی دیکھ بھال اور جنگی قیدیوں کی امداد اور خبر گیری کرنا تھا بعد میں اس کے مقاصد کو وسعت دے دی گئی اور زمانہ امن میں بھی اسے عوام کی خدمت کا ذریعہ بنا دیا گیا۔ چناں چہ اب یہ ادارہ ہنگامی حوادث سے متاثر ہونے والوں کی بھی امداد کرتا ہے۔ ۱۹۴۰ء میں بین الاقوامی ریڈ کراس سوسائٹی نے بچوں کے تحفظ اور امداد کی غرض سے ایک الگ شعبہ قائم کر دیا۔ ریڈ کراس اس سوسائٹی کے قیام و تنظیم کی ضرورت کا احساس عام کرنے کا سہرا سوئٹزرلینڈ کے ایک شہری ڈوننٹ کے سر ہے جس نے

ایک کتابچے میں جنگ کی تباہ کاریوں کا ذکر کرتے ہوئے ان سپاہیوں کی حالتِ زار خاص طور پر بیان کی تھی جو جنگ میں زخمی ہوئے تھے لیکن طبّی امداد سے محرومی کے باعث سسک سسک کر مر گئے۔ڈونٹ نے دنیا بھر کے ملکوں سے اپیل کی کہ وہ جنگ میں زخمی ہونے والوں کی خبر گیری اور علاج معالجے کا کوئی موثر انتظام کریں۔۱۶۳ اقوام نے متعلقہ مسائل پر غور و خوص کے لیے ایک کانفرنس بلائی۔کانفرنس میں طے ہوا کہ جنگ میں مجروح ہونے والوں اور دوسرے مصیبت زدوں کی امداد کے لیے جو لوگ کام کریں ان کی حفاظت کی جائے گی اور انھیں اپنے فرائض کی انجام دہی میں ہر ممکن سہولتیں فراہم کی جائیں گی۔ یہ کارکن ایک ایسا علامتی نشان استعمال کریں جس سے کسی کارکن کے وطن کی تخصیص کا پہلو نہ نکلتا ہو۔چوں کہ ریڈ کراس سوسائٹی کی ابتدا سوئٹزرلینڈ سے ہوئی اس لیے اس کے جھنڈے کا رنگ بدل کر سوسائٹی نے اسے اپنا نشان بنا لیا۔سوئٹزرلینڈ کے جھنڈے میں سرخ زمین پر سفید صلیب ہے۔ریڈ کراس کا علامتی نشان سفید زمین پر سرخ صلیب ہے۔اس مناسبت سے اسے صلیب احمر یا ریڈ کراس کہا جانے لگا۔

جینوا کنونشن کے اصولوں اور مقاصد پر ۱۹۰۴ء میں نظرثانی کی گئی۔اور ۱۹۰۶ء سے ان پر عمل درآمد شروع ہوا۔انگلستان میں ریڈ کراس سوسائٹی ۱۸۷۰ء میں قائم ہوئی۔برصغیر میں اس کی داغ بیل پہلی جنگ عظیم کے دوران پڑی۔۱۹۲۰ء میں ایک خاص قانون کے تحت ہندوستانی ریڈ کراس سوسائٹی وجود میں آئی۔قیام پاکستان کے بعد یہ ادارہ بھی تقسیم ہو گیا۔بعض اسلامی ممالک میں اس ادارے کو ہلال احمر یعنی سرخ ہلال کہتے ہیں۔پاکستان اور مسلم ممالک میں اس کے جھنڈے پر صلیب کی بجائے ہلال یعنی چاند بنا ہوتا ہے۔صلیب مسیحیت کا مذہبی نشان ہے اس لیے اسے ہلال سے تبدیل کیا گیا۔۶ مارچ ۱۹۷۴ء کو پاکستان میں بھی اس ادارے کا نام بدل کر ہلال احمر رکھ دیا گیا۔ریڈ کراس کا صدر دفتر جینوا میں ہے۔

آزادیٔ نسواں:(Women's Liberation)

ایک صحت مند معاشرے کی تشکیل کے لیے ضروری ہے کہ خواتین کو تعلیم سے آراستہ کیا جائے۔بچے اپنی ابتدائی تعلیم کا آغاز ماں کی گود سے کرتے ہیں اور بچپن میں اپنا زیادہ تر وقت اپنی ماں کے ساتھ صرف کرتے ہیں۔اس لیے بچوں کی بہتر تعلیم و تربیت کے لیے عورتوں کا تعلیم یافتہ ہونا بے حد ضروری ہو جاتا ہے۔ماں دنیا کی واحد ایک ایسی شخصیت ہے جو اپنے بچوں کی بہتر طریقے سے تربیت کر کے ایک مہذب اور خوش حال خاندان کی تشکیل کرتی ہے۔اسی مہذب خاندان سے ایک مہذب معاشرہ وجود میں آتا ہے۔اس مہذب معاشرے سے نکلنے والے بچے ہی ملک کے بہترین شہری بنتے ہیں۔کسی بھی ملک یا سماج کا مستقبل کیسا ہو گا یہ اس بات پر منحصر ہے کہ اس ملک یا سماج کی عورتیں

کتنی تعلیم یافتہ ہیں۔ چوں کہ ادب سماج کا آئینہ دار ہوتا ہے، ادیب اسی سماج کا ایک لازمی عنصر ہے۔ اس لیے وہ سماج میں ہونے والے واقعات و حادثات کو اپنے تجربات و مشاہدات کی بنیاد پر کسی فن پارے کی تخلیق کرتا ہے۔ ادب سماج میں انسانی زندگی کے رنگا رنگ مظاہر اور معنی خیز انسانی جذبات کا مرقع ہے۔ اس لیے اس کی ایک حیثیت سماجی دستاویز کی بھی ہے۔

آکسفورڈ یونی ورسٹی: University of Oxford

اوکسفورڈ دریائے آکس کے کنارے، انگلستان کا ایک شہر ہے۔ اس کے معنی (دریائے آکس کا گھاٹ) کے ہیں۔ اس جگہ انگلستان کا مشہور اور قدیم دار العلوم واقع ہے۔ اس کی بنیاد قدیم زمانے میں رکھی گئی تھی۔ لیکن منظم تدریس کا آغاز ۱۱۳۳ء سے ہوا جب پیرس کے رابرٹ پولین نے یہاں تدریس کا سلسلہ شروع کیا۔ اس نے یونیورسٹی کی صورت ۱۱۶۳ء میں اختیار کی۔ اس میں اٹھائیس کالج ہیں جن کی اقامت گاہیں بھی ہیں لیکن تدریس کا تمام کالجوں کے مشترکہ لیکچروں کی صورت میں ہوتی ہے۔ اور کالجوں کے ٹیوٹر اپنی اپنی اقامت گاہوں پر بھی تعلیمی رہنمائی کرتے ہیں۔ اوکسفرڈ یونیورسٹی کی شہرہ آفاق بوڈلین لائبریری دنیا بھر کی سب سے بڑی لائبریری ہے۔ اس کی مزید توسیع ۱۹۴۶ء میں جدید بوڈلین لائبریری کی شکل میں ہوئی۔

اوکسفرڈ یونیورسٹی اور کیمبرج کے دروازے ۱۸۵۴ء تک ان لوگوں کے لیے بند تھے جو پرائسٹنٹ مذہب یعنی چرچ آف انگلینڈ کے ۳۹ اصولوں پر ایمان نہ لاتے ہوں۔ ۱۸۷۱ء تک ان دونوں یونیورسٹیوں میں کسی ایسے شخص کو کسی قسم کا امتیاز یا وظیفہ تعلیم بھی نہیں مل سکتا تھا۔ لیکن اب دنیا بھر کے طالب علم یہاں بلا امتیاز تعلیم حاصل کرتے ہیں۔

بالشویزم: (Bolshevism)

بالشوازم، کمیونزم کی وہ قسم جس کے اصول انتہا پسندی پر مبنی ہوں، اخلاق و قوانین کی پابندیوں سے آزاد ہونا۔ اس سے مراد ایک فرقہ جس کا نعرہ ہے بندہ میں ممنوعہ امور سے بچنے اور معروف امور کو کرنے کی قدرت نہیں ہے نیز وہ انفرادی ملکیت کا انکار کرتا ہے اور تمام لوگوں کو دولت وغیرہ میں برابر کا شریک مانتا ہے۔

پارسی:(Parsis)

پارسی زرتشت کے پیروکاروں کو کہتے ہیں۔ عربوں نے ایران فتح کیا تو ان میں سے کچھ مسلمان بن گئے، کچھ نے جزیہ دینا قبول کیا اور باقی (آٹھویں، دسویں صدی عیسوی) ترک وطن کر کے ہندوستان آ گئے۔

ان کا دعوی ہے کہ ان کے مذہبی رہنما کے پاس اوستا کا وہ قدیم نسخہ موجود ہے جو ان کے پیغمبر زردشت یا زرتشت پر نازل ہوا تھا۔ پارسی اپنے مردوں کو جلانے یا دفنانے کی بجائے ایک کھلی عمارت میں رکھ دیتے ہیں تا کہ اسے گدھ وغیرہ کھا جائیں۔ اس خاص عمارت کو دخمہ " مینار خاموشی " کہا جاتا ہے۔ دخمہ ایسے شہروں میں تعمیر کیا جاتا ہے جہاں پارسیوں کی معتد بہ تعداد آباد ہو، مثلاً بمبئی، کراچی۔ جہاں دخمہ نہیں ہوتا وہاں ان کے قبرستان ہوتے ہیں جن میں مردوں کو بہ امر مجبوری دفن کیا جاتا ہے۔ لاہور میں پارسی قبرستان اس کی مثال ہے۔

جسمانی طہارت اور کھلی فضا میں رہائش پارسیوں کے مذہبی فرائض میں داخل ہے۔ پاکیزگی کی مقدس علامت کے طور پر، ان کے معابد اور مکانات میں، ہر وقت آگ روشن رہتی ہے خواہ وہ چراغ ہی ہو۔ ہندو "سناتن دھرم" اور یہودیوں کی طرح، پارسی مذہب بھی غیر تبلیغی ہے۔ یہ لوگ نہ دوسرے مذاہب کے لوگوں کو اپنے مذہب میں داخل کرتے ہیں اور نہ ان کے ہاں شادی کرتے ہیں۔ ان کڑی پابندیوں کے باعث ابھی تک دوسرے طاقت ور مذاہب " اسلام، ہندومت، مسیحیت " کے ثقافتی اثرات سے محفوظ ہیں۔ حصول علم ان کا جزو ایمان ہے۔ ہر پارسی معبد میں ایک اسکول ہوتا ہے۔ دنیا میں پارسیوں کی کل تعداد لاکھوں میں ہے اور اس میں بھی ان لوگوں میں شادی کے رجحان کے کم ہونے سے مزید کمی واقع ہو رہی ہے۔

پراٹسٹنٹ: (Protestant)

پروٹسٹنٹ، مسیحیت کا ایک بڑا فرقہ ہے۔ یہ مسیحیت کا ترقی پزیر فرقہ ہے۔ پروٹسٹنٹ کلیسیا ان مسیحی گروہان کا اتحاد ہے جو زمانہ اصلاحِ کلیسیا میں رومی کاتھولک کلیسیا کے خلاف کھڑے ہوئے۔

صلیبی جنگوں میں اور اس کے بعد مسیحیت میں مذہبی پیشواؤں کے جبر کے رد عمل کے طور پر کئی فرقوں نے جنم لیا۔ صلیبی جنگوں میں مسیحیوں کو زبردستی بھرتی کیا جاتا تھا۔ پوپ اربن دوم نے اعلان کیا کے اگر کوئی خود جنگ میں نہیں جا سکتا تو اپنی جگہ کسی دوسرے کو بھیج دے جسے اسے معافی نامی دیا جائے گا۔ اس معافی نامے سے نجات یقینی ہے۔ بعد ازاں پوپ لیو دہم (۱۴۷۵ء-۱۵۲۱ء) تک صورت حال یہ ہو گئی کہ گناہوں کے معافی نامے ایجنسیوں پر فروخت ہونے لگے۔ جس شخص کا جی چاہتا زنا، قتل، چوری، ڈاکہ، عصمت دری اور کتنے ہی صغیرہ اور کبیرہ گناہوں کا

ارتکاب کر کے اپنے لیے معافی نامہ خرید لیتا۔ نہ صرف اپنے لیے بلکہ اپنے وفات شدہ عزیزوں کے لیے بھی معافی نامے خریدے جاسکتے تھے، جس کے بعد نجات یقینی سمجھی جاتی۔ اس صورت حال سے مسیحی دنیا میں اخلاقی انحطاط پیدا ہو گیا جس کی سرپرستی مسیحی مذہبی علما کر رہے تھے۔ کلیسیا کے مظالم کے خلاف کئی لوگوں نے آوازیں بھی بلند کی۔ اُن میں مشہور پیٹر والڈو (۱۱۴۰ء۔۱۲۱۸ء) ، جان ٹولر (۱۲۹۰ء۔۱۳۶۱ء) اور جان وائی کلف (۱۳۲۰ء۔۱۳۸۴ء) ہیں۔ ان لوگوں کو بھی اگرچہ سخت سزائیں دی گئی اور کفر کے فتوے صادر کیے گئے مگر اس سارے رویے نے مارٹن لوتھر (۱۴۸۳ء۔۱۵۴۶ء) کے لیے راہ ہموار کی۔

سولہویں صدی میں مارٹن لوتھر کی قیادت میں لوگوں نے کاتھولک فرقے کے طریقہ کار میں تبدیلی کے لیے تحریک چلائی۔ اس تحریک کو پروٹسٹنٹ اصلاحِ کلیسیا کہا جاتا ہے۔ مارٹن لوتھر ایک جرمن راہب تھا۔ مروجہ مسیحیت پر اس کی تنقید عقلی دلائل کی بنا پر تھی۔ اس کے علاوہ علمی مظالم اس طرح کیے جا رہے تھے کہ جو شخص مذہبی احکامات کی تشریح سائنس سے کرتا یا پوپ کے احکامات کی خلاف ورزی کرتا اسے سخت سزائیں دی جاتی تھیں۔

پروٹسٹنٹ پاپائیت اور خدا اور انسان کے مابین کسی بھی واسطے کے خلاف ہیں، ان کا ماننا ہے کہ گرجا گھر کو انسان کو بخشنے کا کوئی حق حاصل نہیں ہے۔ اور نہ ہی انسان کو راہب بننا چاہیے۔ پروٹسٹنٹ بائبل کی بعض کتابوں کو جعلی قرار دیتے ہیں۔

تثلیث:(Trinity)

تثلیث، مسیحیت کا ایک لازمی جز ہے۔ لفظ تثلیث بائبل میں استعمال نہیں ہوا ہے۔ تثلیث کا مطلب ہے "ایک میں تین" یا "تین میں ایک"۔ مسیحی خدا کو ایک ہی مانتے ہیں مگر ایک میں تین ہستیوں کو شامل کرتے ہیں۔ اس عقیدے کو ایک لفظ میں سمونے کے لیے مسیحیت کے اولین علما نے لفظ تثلیث استعمال کیا۔ جن تین ہستیوں کو اس ایک میں شامل کیا جاتا ہے وہ اس طرح ہیں۔

خدا باپ یعنی خدا، خدا بیٹا یعنی حضرت عیسیٰؑ اور خدائے روح یعنی حضرت جبرئیلؑ۔ ان تینوں کو ایک اور ایک کو تین ثابت کرنے کے لیے مسیحی علما جو حوالے دیتے ہیں اس میں بائبل کے بہت سی آیتیں شامل ہیں۔

جامعہ سوبورن، پیرس:

پین تھیون- سوربون یونیورسٹی پیرس فرانس میں مختلف مضامین کی تحقیقی یونیورسٹی ہے۔ یہاں انسانیات، قانون، سیاسی سائنس، سماجی سائنس، معاشیات اور فنانس کے مضامین پڑھائے جاتے ہیں۔ یہ دنیا کے دوسرے قدیم

ترین تعلیمی اداروں میں سے ایک ہے۔اس کا نام ۱۹۷۱ء میں پیرس یونیورسٹی رکھ دیا گیا تھا۔ یہاں تین بنیادی ڈومینز ہیں: اقتصادی اور مینجمنٹ سائنسز، انسانی سائنس،اور قانونی اور سیاسی سائنس۔ان میں مزید کئی مضامین شامل ہیں جیسے: معاشیات، قانون، فلسفہ، جغرافیہ، انسانیات، سنیما، پلاسٹک آرٹس، آرٹ کی تاریخ، سیاسی سائنس، ریاضی، مینجمنٹ،اور سوشل سائنسز۔

مجموعی طور پر،اس کے پیرس کیمپس میں ۲۵ سے زائد عمارتیں شامل ہیں۔۲۰۱۸ء میں یہ یونی ورسٹی عالمی سطح پر QSورلڈ یونیورسٹی رینکنگز کی طرف سے ۲۹۹ویں نمبر پر شمار کی گئی تھی۔ یہ ۲۰۱۹ءQSورلڈ یونیورسٹی کی درجہ بندی کی طرف سے آرکیالوجی، تاریخ، قانون، فلسفہ، جغرافیائی، انتھالوجی،اور اقتصادیات میں فرانس کی سب سے اچھی یونی ورسٹی ہے۔

جامعہ ملّیہ:

جامعہ ملیہ نئی دہلی ہندوستان میں واقع ایک مرکزی جامعہ ہے۔یہ ۱۹۲۰ء میں علی گڑھ میں قائم ہوئی تھی۔ ۱۹۸۸ء میں ہندوستانی پارلیمنٹ کے ایک ایکٹ کے تحت اسے مرکزی جامعہ کا درجہ حاصل ہوا۔

یہ یونیورسٹی ۱۹۲۰ء میں مسلمان رہنماؤں نے قائم کی تھی۔اس کے بانیوں میں اہم کردار علی برادران،یعنی مولانا محمد علی جوہر اور مولانا شوکت علی کا تھا۔ڈاکٹر ذاکر حسین دہلی منتقلی کے بعد اس کے پہلے وائس چانسلر مقرر ہوئے تھے۔انتقال کے بعد جامعہ میں ہی ان کی تدفین عمل میں آئی تھی۔

جنگِ بلقان:

بلقان جنوب مشرقی یورپ کے خطے کا تاریخی و جغرافیائی نام ہے۔اس علاقے کا رقبہ ۵ لاکھ ۵۰ ہزار مربع کلومیٹر اور آبادی تقریباً ۵۵ ملین ہے۔اس خطے کو یہ نام کوہ بلقان کے پہاڑی سلسلے پر دیا گیا جو بلغاریہ کے وسط سے مشرقی سربیا تک جاتا ہے۔

اسے اکثر جزیرہ نما بلقان بھی کہتے ہیں کیوں کہ اس کے تین جانب سمندر ہے جن میں مشرق میں بحیرہ اسود اور جنوب اور مغرب میں بحیرہ روم کی شاخیں (بحیرہ ایڈریاٹک، بحیرہ آیونین، بحیرہ ایجیئن اور بحیرہ مرمرہ) ہیں۔

جنوب مشرقی یورپ بحیرہ ہائے ایجین، ایڈریاٹک اور اسود کے ساحلوں سے شروع ہو کر وسطی یورپ تک پھیلا ہوا علاقہ ہے۔

اس کی جنگ کا پس منظر یہ ہے کہ نوجوانان ترک کے انقلاب کے دوران سلطنت عثمانیہ کی داخلی صورت حال کا فائدہ اٹھاتے ہوئے ۱۹۰۸ء میں آسٹریا-ہنگری نے مقبوضہ بوسنیاوہرزیگووینا کا باضابطہ الحاق کر دیا۔ آسٹریا-ہنگری نے ۱۸۷۷ء کی روس ترک جنگ اور برلن کانگریس (۱۸۷۸ء) کے بعد اس پر قبضہ کیا تھا۔ اطالیہ ترک جنگوں کے دوران سربیا، مونٹی نیگرو، یونان اور بلغاریہ پر مشتمل بلقان لیگ نے سلطنت عثمانیہ کے خلاف اعلان جنگ کر دیا جس کے نتیجے میں سلطنت عثمانیہ کو بلقان جنگ (۱۹۱۲ء-۱۹۱۳ء) کا سامنا کرنا پڑا اور اسے جزیرہ نما بلقان کے کئی علاقوں سے ہاتھ دھونا پڑے۔ لیبیا اور جزیرہ نما بلقان میں جنگیں اتحاد و ترقی جمعیتی کا پہلا بڑا امتحان تھیں۔ اطالیہ ترک جنگوں میں سلطنت کو لیبیا سے بھی ہاتھ دھونا پڑے۔ یہ پہلی جنگ تھی جس میں دنیا میں پہلی بار میدان جنگ میں ہوائی جہازوں کا استعمال بھی کیا گیا۔ ۱۹ ویں صدی کے آخر میں قائم ہونے والی بلقان ریاستیں نسلی و قومی بنیادوں پر البانیہ، مقدونیہ اور تھریس (تراقیا) کے عثمانی صوبوں سے بھی اضافی علاقوں کے حصول کی خواہش مند تھیں۔ ابتدائی طور پر مارچ ۱۹۱۲ء میں سربیا اور بلغاریہ اور مئی ۱۹۱۲ء میں یونان اور بلغاریہ کے درمیان معاہدے طے پائے جس میں روس نے ثالث کا کردار ادا کیا۔ سرب-بلغاری معاہدے میں مقدونیہ کی تقسیم کا مطالبہ کیا گیا تھا جو پہلی بلقان جنگ کا سب سے اہم سبب بنا۔ دوسری بلقان جنگ کے آغاز کا اہم سبب سابق بلقان اتحادیوں میں نئے حاصل کردہ علاقوں کی تقسیم پر پیدا ہونے والے تنازعات تھے جس سے سلطنت عثمانیہ نے بھرپور فائدہ اٹھایا اور تھریس میں کئی علاقے دوبارہ فتح کر لیے۔ بلقان جنگ کے سیاسی نتائج ۱۹۱۳ء کے تاخت اور تین پاشاؤں کی حکومت کا سبب بنے۔

جین مت:(Jainism)

جین مت کے آغاز کی صحیح تاریخ یا دور کے متعلق معلومات موجود نہیں ہیں۔ تاہم پانچویں اور چھٹی صدی ق م کے درمیان وردھمان مہاویر جین مت کی انتہائی موثر شخصیت اور معلم رہے ہیں۔ مہاویر جو جین مت میں اپنے دور کے آخری عظیم تر مفکر ہونے کی وجہ سے انتہائی قابل تعظیم سمجھے جاتے ہیں، غالب گمان یہی ہے کہ وہ جین مت کے بانی نہیں ہیں۔

پارشوناتھ جو مہاویر کے پیشرو کہلاتے ہیں، وہ پہلے جین مت کی شخصیت ہے جن کی تاریخی شہادت میسر ہے۔ پارشوناتھ نویں سے ساتویں صدی ق م کے درمیان کسی زمانہ میں تھے۔ پارشو کے پیروکاروں کا ذکر گرنتھوں میں ملتا ہے۔

جین مت خدا کی ہستی کو تسلیم نہیں کرتا۔ ان کا کہنا ہے کہ جو بڑا ہے وہی انسان کی روح میں پائی جانے والی طاقت خدا ہے۔ دنیا میں ہر چیز جاودانی ہے۔ روحیں جسم بدل بدل کر آتی ہیں مگر اپنی الگ ہستی کا احساس باقی رہتا ہے۔ نروان یعنی روح کی مادے اور جسم سے رہائی نویں جنم کے بعد ممکن ہو سکتی ہے۔ جین مت کے عقائد سات کلیوں کی شکل میں بیان کیے جاتے ہیں، جن کو جین مت کی اصطلاح میں سات تتو یا سات حقائق کہا جاتا ہے۔ یہ کائنات اور زندگی کے بنیادی مسئلہ اور اس کے حل کے بارے میں سات نظریات ہیں۔ جن میں جین مت کا بنیادی فلسفہ بخوبی سمٹ کر آگیا ہے۔

۱۔ جیو: روح ایک حقیقت ہے۔

۲۔ جیو: غیر ذی روح بھی ایک حقیقت ہے، جس کی ایک قسم مادہ ہے۔

۳۔ سرو: روح میں مادہ کی ملاوٹ ہو جاتی ہے۔

۴۔ بندھ: روح میں مادہ کی ملاوٹ سے روح مادہ کی قیدی بن جاتی ہے۔

۵۔ سمورا: روح میں مادہ کی ملاوٹ کو روکا جاسکتا ہے۔

۶۔ نرجرا: روح میں پہلے سے موجود مادہ کو زائل کیا جاسکتا ہے۔

۷۔ موکش: روح کی مادہ سے مکمل دوری کے بعد نجات حاصل ہو سکتی ہے۔

ان کے نزدیک جانوروں کو ہلاک کرنا، درخت کاٹنا حتیٰ کہ پتھروں کو توڑنا بھی گناہ ہے۔ سادھو بارہ برس کے بعد نروان حاصل کر سکتا ہے۔ ان کے مقدس مقامات میں ساتا کا پہاڑ جہاں مہاویر کا انتقال ہوا تھا، کوہ آبو راجستھان، شراون بیلا گولہ اور گومتھیشور کرناٹک مجسمہ ہے۔

جین مت جو جین شاسن اور جین دھرم کے ناموں سے بھی معروف ہے، ایک غیر توحیدی بھارتی مذہب ہے جو تمام ذی روح اور ذی حیات اجسام کے حق میں اہنسا (عدم تشدد) کی تعلیم دیتا ہے، نیز جملہ مظاہر زندگی میں مساوات اور روحانی آزادی کا حامی ہے۔ جین مت کے پیروکاروں کا عقیدہ ہے کہ عدم تشدد اور ضبط نفس کے ذریعہ نجات (موکش) حاصل کر سکتے ہیں۔

اس وقت جین مت دو بڑے فرقوں میں تقسیم ہے، شویتامبر اور دگمبر۔ لفظ جین مت سنسکرت کے ایک لفظ 'جِن' سے لیا گیا ہے، جس کے معنی ہے فاتح۔ جین مت کے بھکشوؤں میں جذبات اور جسمانی آسائشوں کے حصول

کے درمیان جو معرکہ جاری رہتا ہے، یہ لفظ دراصل اس کے جانب اشارہ کرتا ہے۔ جس شخص نے اپنے جذبات اور نفس پر فتح حاصل کر لی وہ فاتح سمجھا جاتا ہے۔

جین مت کا شمار دنیا کے قدیم ترین مذاہب میں کیا جاتا ہے۔اس کی بنیاد کب، کس نے، کہاں پر رکھی اس بارے میں ماہرین آج تک کسی نتیجے پر نہیں پائے۔ جین گرنتھوں کے مطابق ۵۲۷ ق م سے قبل وردھمان مہاویر (۵۹۹-۵۲۷ ق-م) نے نروان حاصل کیا تھا۔روایتی طور پر جین مت کے پیروکار اپنے مذہب کی ابتدا ان چوبیس تیر تھنکروں کے سلسلہ کو قرار دیتے ہیں جن میں پہلا تیر تھنکر رشبھ دیو اور آخری مہاویر تھے۔ جین مت کے پیروکار یہ یقین رکھتے ہیں کہ جین مت ابدی اور لافانی ہے۔ یہ اسی وقت سے ہے، جب سے دنیا بنی ہے۔اور تب تک رہے گا، جب تک دنیا باقی ہے۔ جین مت کے لوگ مہاویر کو آخری اوتار یا دیوتا مانتے ہیں۔

ہندوستان میں ایک طویل عرصہ تک جین مت ہندوستانی ریاستوں اور مملکتوں کا سرکاری مذہب رہا ہے، نیز برصغیر ہند میں اس مذہب کی کافی اشاعت ہوئی تھی۔ آٹھویں صدی عیسوی سے جین مت کی شہرت اور اشاعت میں کمی آنے لگی، جس میں اس خطہ کے سیاسی ماحول نے بھی اثر ڈالا تھا۔

جین مت کے پیروکار بھارت میں ۴ء۲ ملین ہیں، نیز دنیا کے دیگر ممالک بیلجیئم، کینیڈا، ہانگ کانگ، جاپان، سنگاپور اور ریاستہائے متحدہ امریکا میں مختصر تعداد میں موجود ہیں۔ بھارت میں جین مت کے ماننے والوں میں شرح خواندگی دیگر مذاہب کے پیروکاروں کے مقابلہ میں سب سے زیادہ (۹۴ء ۱فیصد) ہے۔ بھارت میں مخطوطات کا قدیم ترین کتب خانہ جین مت کا ہی ہے۔ عالمی سطح پر جین مت کے پیروکاروں کی تعداد ۶ء ۱ ملین ہے۔

سرمایہ داری کا نظام:(Capitalism)

سرمایہ دارانہ نظام، معاشی و معاشرتی نظام ہے جس میں سرمایہ بطور عامل پیدائش نجی شعبہ کے اختیار میں ہوتا ہے۔ یعنی دوسرے الفاظ میں کرنسی چھاپنے کا اختیار حکومت کی بجائے کسی پرائیوٹ بینک کے اختیار میں ہوتا ہے۔ اشتراکی نظام کے برعکس سرمایہ دارانہ نظام میں نجی شعبہ کی ترقی معکوس نہیں ہوتی بلکہ سرمایہ داروں کی ملکیت میں سرمایہ کا ارتکاز ہوتا ہے اور امیر امیر تر ہوتا چلا جاتا ہے۔اس میں منڈی آزاد ہوتی ہے اس لیے اسے آزاد منڈی کا نظام بھی کہا جاتا ہے۔ اگرچہ آج کل کہیں بھی منڈی مکمل طور پر آزاد نہیں ہوتی مگر نظریاتی طور پر ایک سرمایہ دارانہ نظام میں منڈی مکمل طور پر آزاد ہو گی۔ جملہ حقوق، منافع خوری اور نجی ملکیت اس نظام کی وہ خصوصیات ہیں جس سے سرمایہ دارانہ نظام کے مخالفین کے مطابق غریبوں کا خون چوسا جاتا ہے۔ جدید دانشوروں کے مطابق آج سرمایہ دارانہ نظام

اپنے اختتام کی طرف بڑھ رہا ہے اور ایک متبادل نظام کی آوازیں شدت سے اٹھنا شروع ہو گئیں ہیں۔ مختصراً سرمایہ دارانہ نظام یہ کہتا ہے کہ ذاتی منافع کے لیے اور ذاتی دولت و جائیداد اور پیداواری وسائل رکھنے میں ہر شخص مکمل طور پر آزاد ہے، حکومت کی طرف سے اس پر کوئی پابندی نہیں ہونی چاہیے۔ تاہم دنیا میں سو فیصد (۱۰۰%) سرمایہ دارانہ نظام کسی بھی جگہ ممکن نہیں، کیوں کہ حکومت کو کسی نہ کسی طرح لوگوں کے کاروبار میں مداخلت کرنی پڑتی ہے۔ امریکا، برطانیہ، فرانس، اٹلی وغیرہ میں سرمایہ دارانہ نظام ہیں۔ سرمایہ دارانہ نظام کی بنیاد ایڈم سمتھ (۱۷۲۳ء- ۱۷۹۰ء Adam Smith) نے رکھی جو ایک برطانوی فلسفی اور ماہر اقتصادیات تھا۔ اس نظام کی اہم خصوصیات میں کہا جا سکتا ہے کہ نجی ملکیت بغیر حدود و قیود کے ہوتی ہے۔ منڈی مکمل طور پر آزاد ہوتی ہے۔ سرمایہ کی ترسیل اور نقل و حرکت آزاد ہوتی ہے۔ منافع کی مقدار کو حکومت یا کسی ادارہ کے اختیار میں نہیں لاتا جاتا۔ قیمتیں طلب و رسد کے توازن سے متعین ہوتی ہیں چاہے طلب مصنوعی ہو یا چاہے رسد کو سرمایہ دار قیمت بڑھانے کے لیے مصنوعی طور پر کم کریں۔ منڈی کی قوتیں خود کو درست کرنے کی طاقت رکھتی ہیں چنانچہ سرمایہ دارانہ نظام میں حکومت یا کسی ادارہ کی منڈی میں مداخلت کا تصور حقیقی سرمایہ دارانہ نظام کی روح کے خلاف ہے۔

سُنّی:

اہلِ سنت والجماعت مسلمانوں میں پیدا ہو جانے والے دو بڑے گروہوں میں سے ایک ہے اور اس کو عام الفاظ میں 'سنی' بھی کہا جاتا ہے۔ مسلمانوں کی اکثریت اسی تفرقے سے تعلق رکھتی ہے۔ اہل سنت وہ لوگ ہیں جو خدا اور اس کے رسول کی اطاعت پر ایمان رکھتے ہیں۔ تمام صحابہ کرام کو احترام اور عزت کی نگاہ سے دیکھتے ہیں۔ ان کے نزدیک سب صحابی بالخصوص خلفائے راشدین برحق ہیں۔ اور ان کا زمانہ ملت اسلامیہ کا بہترین اور درخشاں دور ہے۔ ان کے نزدیک خلافت پر ہر مومن فائز ہو سکتا ہے بشرطیکہ وہ اس کا اہل ہو۔ ان کے نزدیک خلیفہ جمہور کی رائے سے منتخب ہونا چاہیے۔ وہ خدا کی طرف سے مامور نہیں ہوتا، وہ خلافت کے موروثی نظریے کو بھی تسلیم نہیں کرتے۔ ان کے نزدیک ابو بکر صدیق صحابہ میں فضیلت کا درجہ رکھتے ہیں۔ اور پھر خلافت کی ترتیب سے حضرت عمر فاروق حضرت عثمان اور حضرت علی بن ابی طالب۔ خاندان اہل بیت کو بھی سنی بڑی احترام و عقیدت کی نگاہ سے دیکھتے ہیں۔ سنی عقیدہ کے مطابق سوائے پیغمبروں کے کوئی انسان معصوم نہیں۔ یہ اسلامی فرقہ مذہب میں اعتدال اور میانہ روی پر زور دیتا ہے۔ سنی چار فقہوں میں بٹے ہوئے ہیں جیسے؛ شافعی، مالکی، حنفی اور حنبلی۔

شیعہ:

اہل تشیع یا شیعیت اسلام کا دوسرا بڑا فرقہ ہے۔اہل تشیع رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے بعد فقط حضرت علی بن ابی طالب کی امامت کے قائل ہیں اور صرف انہیں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا جانشین اور پہلا معصوم امام مانتے ہیں۔ شیعہ یا اہل تشیع نظریہ خلافت کو تسلیم نہیں کرتے۔ ان کا عقیدہ ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے دعوت ذوالعشیرہ اور خطبہ حجۃ الوداع کے موقع پر علی بن ابی طالب کو اپنا جانشین مقرر کر دیا تھا۔ دعوت ذوالعشیرہ کے موقع پر حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا تھا کہ "جو میری مدد کرے گا وہ میرا وزیر، میرا وصی اور خلیفہ ہو گا۔"تینوں دفعہ علی بن ابی طالب کھڑے ہوئے اور کہا کہ "اگرچہ میں چھوٹا ہوں اور میری ٹانگیں کمزور ہیں مگر میں آپ کی مدد کروں گا۔"تو حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا کہ "اے علی تم دنیا اور آخرت میں میرے وزیر اور وصی ہو۔"اس کے علاوہ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے حجۃ الوداع کے بعد غدیر خم کے علاقے میں ایک خطبہ میں فرمایا کہ "جس کا میں مولا ہوں اس کے علی مولا ہیں۔"

شیعہ کی آبادی کل مسلم آبادی کا ۱۰۔۱۳% فیصد ہے۔ مسلمانوں بالخصوص اہل تشیع کی آبادی کے بارے میں کوئی یقینی اعداد و شمار میسر نہیں ہے۔ مذکورہ اعداد و شمار موجودہ اکثر منابع کے مطابق ہیں جبکہ اس کے مقابلے میں بعض دیگر اعداد و شمار اہل تشیع کی آباد کو مسلم آبادی کا ۲۳ فیصد تک بتاتے ہیں۔

عربی زبان میں شیعہ کا لفظ دو معنی رکھتا ہے۔پہلا کسی بات پر متفق ہونا اور دوسرا کسی شخص کا ساتھ دینا یا اس کی پیروی کرنا۔ قرآن میں کئی جگوں پر یہ لفظ اس طرح سے آیا ہے جیسے سورہ قصص کی آیت ۱۵ میں حضرت موسی کے پیروان کو شیعہ موسی کہا گیا ہے اور شیعہ فرعون کے بارے میں بھی آیا ہے اور دو اور جگھوں پر ابراہیم کو شیعہ نوح کہا گیا ہے۔

اسلام کی تاریخ میں شیعہ کا لفظ کسی شخص کے پیروان کے لیے استعمال ہوتا ہے۔ جیسا کہ حضرت امام علی علیہ السلام اور حضرت امیر معاویہ کے اختلافات کے زمانے میں ان کے حامیوں کو بالترتیب شیعان علی ابن ابو طالب علیہ السلام اور شیعان معاویہ بن ابو سفیان کہا جاتا تھا۔ صرف لفظ شیعہ اگر بغیر تخصیص کے استعمال کیا جائے تو مراد شیعانِ علی ابن ابو طالب ہوتی ہے، وہ گروہ جو ہر اختلاف میں حضرت علی ابن ابی طالب کا حامی تھا اور جو ان کی امامت بلافصل کا عقیدہ رکھتا ہے۔

علی گڑھ کالج:

سر سید احمد خان نے ۱۸۷۵ء میں ''محمڈن اینگلو اورینٹل کالج'' کی داغ بیل ڈالی جسے ۱۹۲۰ء میں یونیورسٹی کا درجہ ملا اور آج اسے علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کی حیثیت سے عالمی شہرت حاصل ہے۔انھوں نے کہا :

"میں ہندوستانیوں کی ایسی تعلیم چاہتا ہوں کہ اس کے ذریعہ ان کو اپنے حقوق حاصل ہونے کی قدرت ہو جائے، اگر گورنمنٹ نے ہمارے کچھ حقوق اب تک نہیں دیے ہیں جن کی ہم کو شکایت ہو تو بھی ہائی ایجوکیشن وہ چیز ہے کہ خواہ مخواہ طوعاً و کرہاً ہم کو دلا دے گی۔"

عیسائی:(Christian)

مسیحی وہ شخص جو ابراہیمی، توحیدی اور یسوع مسیح کی زندگی اور تعلیمات پر مبنی مذہب کی پیروی کرتا ہے۔لفظ "مسیحی" یسوع کے مکمل نام یسوع مسیح کے" مسیح "سے ماخوذ ہے اور یہ مسیح +ی کا مرکب ہے۔ مسیحیوں کو اہلِ اسلام یسوع کے اسلامی نام عیسیٰ کی نسبت "عیسائی" پکارتے ہیں۔ مگر مسیحی خود کو عیسائی کہلانا معیوب سمجھتے ہیں۔ مسیحی یسوع کو تثلیث کا ایک لازمی جز قرار دیتے ہیں اور مسیحیت میں ان کی تعظیم خدا کے روحانی بیٹے کے طور پر کی جاتی ہے اور مسیحیت میں یسوع کو خدائی درجہ حاصل ہے۔ کاتھولک مسیحی اور راسخ العقیدہ مسیحی دونوں کا یہ عقیدہ ہے کہ وہ خدا کے بیٹے ہیں مگر دونوں میں ایک اختلاف ہے، کاتھولک مسیحی کہتے ہیں کہ باپ اور بیٹے کو ایک ہی درجہ حاصل ہے جبکہ راسخ العقیدہ مسیحی بیٹے کو باپ سے کم درجہ دیتے ہیں۔

مارکسزم:(Marxism)

کارل مارکس (۱۸۸۳ء-۱۸۱۸ء) کے نظریات کے مجموعے کو مارکس ازم یا مارکسیت کہا جاتا ہے جسے مارکس نے اپنے ساتھی فریڈرک اینگلز کے ساتھ مل کر ترتیب دیا۔ دنیا بھر کے ممالک میں محنت کشوں کی تحریک کے نظریات اور پروگرام ہیں۔ مارکسزم نہ کوئی مفروضہ ہے اور نہ ہی خیالی پلاؤ بلکہ دیگر سائنسی علوم کی طرح انسانی سماج کے ارتقا کا علم ہے۔ جو تجزیہ کے بعد سرمایہ داری نظام کے خاتمہ اور سوشلزم کمیونزم کے قیام کو نوید دیتا ہے۔ جس طرح سائنس علوم میں آئے دن تبدیلیوں کے باعث بنیادی سائنسی سچائیاں ختم نہیں ہو جاتیں۔ اس طرح انسانی سماج میں تمام تر تبدیلیوں کے باوجود سماجی ارتقا کے متعلق بتائے گئے مارکسی سائنسی اصول ختم نہیں ہو سکتے۔ جس طرح کرہ ارض پر بے شمار تبدیلیاں ہونے کے باوجود زمین کے گول ہونے کی حقیقت نہیں بدل سکتی۔ جس طرح زمین کے اپنے

محور کے گرد گردش کے باعث دن اور رات کو سچائی تبدیل نہیں ہو سکتی۔ جس طرح فزکس علم ثبات اور نفی کے بغیر پیش قدمی نہیں کر سکتا اور اسی طرح انسانی سماج کے دریافت شدہ مارکسی قواعد کسی کی خواہش کے مطابق تبدیلی نہیں ہو سکتے۔ مارکس نے اپنے رفیق ویدمیئر کو ۵ مارچ ۱۸۵۲ء کو لکھے گئے خط میں بیان کیا کہ اس کی تھیوری یعنی "مارکسزم" کیا ہے۔ مارکس نے لکھا کہ:

"جدید معاشرے میں طبقوں یا ان طبقوں کے درمیان کشمکش کی موجودگی کی دریافت کا سہرا میرے سر نہیں جاتا۔ مجھ سے بہت پہلے سرمایہ دارانہ تاریخ دان اس طبقاتی کشمکش کے تاریخی ارتقا کو اور سرمایہ دارانہ معیشت دان طبقاتی معیشت کو تفصیل سے بیان کر چکے تھے۔ جو نئی بات میں نے کی ہے وہ یہ ثابت کرنا ہے کہ

- طبقوں کا وجود پیداوار کی ترقی میں مخصوص تاریخی مرحلے سے مشروط ہے۔
- طبقاتی جدوجہد لازمی طور پر "پرولتاریہ (مزدور طبقے) کی آمریت" کی جانب لے جاتی ہے۔
- کہ یہ آمریت بذات خود طبقوں کے خاتمے اور غیر طبقاتی سماج کی جانب منتقلی پر مشتمل ہے۔

کمیونسٹ مینی فیسٹو میں مارکس اور اینگلز کا نعرہ تھا: "دنیا کے مزدورو متحد ہو جاؤ !"

کارل مارکس سمجھتے تھے کہ سرمایہ دارانہ نظام کے اپنے اندر یہ خامی موجود ہے کہ یہ مسلسل بڑے پیمانے پر معاشی اتار چڑھاؤ پیدا کرتا ہے اور آخر کار اپنے آپ ہی کو ختم کر لے گا۔ اِس عظیم فلسفی، معیشت دان اور انقلابی کے مطابق سرمایہ دارانہ نظام شدید طور پر ایک غیر مستحکم نظام ہے۔ غلامی کا نظام اور جاگیر دارانہ معاشرے کئی صدیوں تک قائم رہے۔ اِن کے مقابلے میں سرمایہ دارانہ نظام جس چیز کو چھوتا ہے اسے بدل دیتا ہے۔ سرمایہ دارانہ نظام میں صرف برانڈ ہی تیزی سے تبدیل نہیں ہوتے بلکہ کمپنیاں اور صنعتیں بھی تخلیقی اور اچھوتے عمل کے نتیجے میں بنتی اور ختم ہوتی ہیں جب کہ انسانی رشتے بھی تحلیل اور نئی شکل میں دوبارہ بنتے ہیں۔ انہیں اس بات پر اعتماد تھا کہ ایک عوامی انقلاب آ کر رہے گا اور جس کے نتیجے میں کمیونسٹ نظام آ جائے گا جو زیادہ پیداوار کرنے والا اور زیادہ انسان دوست نظام ہے۔

تاہم چند نقاد کے مطابق مارکسیت اور اس سے رونما ہونے والی سوشلزم کی منصوبہ بند سوسائٹی ایک متصورہ خواہش ہے جہاں مساوات پر زور دیا گیا تھا۔ اس کے مقابلے میں سرمایہ داری کے تحت تشکیل شدہ طبقاتی نظام ایک عمرانی و تجرباتی حقیقت ہے۔

مانٹسوری تعلیم:

مونٹیسوری ایک نظام تعلیم ہے۔جو اس نظام تعلیم کی بانی "ماریامونٹیسوری "کے نام سے منسوب ہے۔ مونٹیسوری تعلیم ہمیشہ ان سکولوں میں دی جاتی ہے جہاں مونٹیسوری ٹرینڈ سٹاف موجود ہو اس وقت دنیا کے کئی ممالک میں مونٹیسوری طریقہ تعلیم کو بہت اہمیت حاصل ہے، کیوں کہ اس میں بچوں کی ذہنی، جسمانی، اخلاقی، معاشرتی اور سماجی ضرورتوں کو مد نظر رکھتے ہوئے سرگرمیاں ترتیب دی جاتی ہیں یہاں پر کتاب کو ایک رہنمایانہ خط کے طور پر لیا جاتا ہے اور بچوں سے ان کی مرضی کے مطابق کام لینا ایک ضروری امر سمجھا جاتا ہے۔اس میں بنیادی توجہ کا مرکز بچہ ہوتا ہے یہ عام تعلیم سے ہٹ کر تعلیم میں جدیدیت، تحقیق، تجربات اور تجسس پر بات کرتی ہے اور یوں عام طور پر اس طریقہ تعلیم کا رائج کرنا ایک بہت بڑا چیلنج ہے مونٹیسوری ایجوکیشن سسٹم بچوں کی عمر ڈھائی سال سے پانچ یا چھ سال تک ہوتی ہے۔

مسئلہ اضافیت:(Theory of Relativity)

البرٹ آئن سٹائن کا نظریہ اضافیت یا صرف اضافیت آسان انداز میں کچھ اس طرح بیان کیا جا سکتا ہے کہ بیسویں صدی کے آغاز تک تمام بڑے بڑے سائنس دان، مفکر اور فلسفی یہی کہتے رہے کی مادہ ایک ایسی شے ہے جسے نہ تو پیدا کیا جا سکتا ہے اور نہ ہی تباہ کیا جا سکتا ہے مادہ بے شک اپنی شکل تبدیل کر لیتا ہے، جسے قانون بقائے مادہ یعنی law of conservation of matter بھی کہتے ہیں۔

مادہ اپنی شکل تبدیل کر سکتا ہے جیسے پانی برف کی صورت بھی اختیار کر لیتا ہے اور بھاپ کی بھی۔ لیکن اس کے وجود کو ختم نہیں کیا جا سکتا۔ لیکن ۱۹۰۵ء میں آئن سٹائن نے اپنے شہرہ آفاق نظریہ، نظریۂ اضافیت (Theory of relativity) پیش کیا تو صدیوں پرانے سائنسی اصول ریت کی دیوار کی طرح ڈھے گئے۔ آئن سٹائن چونکہ اعلیٰ پائے کا ریاضی دان تھا اس لیے اس نے مادے اور توانائی کے تعلق کو ایک کلیے

E = m c 2 {\displaystyle E=mc^{2}}

سے ظاہر کیا۔ آئن سٹائن کا یہ کلیہ اس کی ذہنی کاوشوں کا نچوڑ تھا۔ آئن سٹائن کے نظریۂ اضافیت میں زمین و مکاں کی اس قدر پیچیدگیاں ہیں کی کسی زمانے میں یہ کہا جاتا تھا کہ وہ اسے خود کے سوا اور سائنس دان پورے طور پر سمجھ نہیں پایا۔ روشنی کی رفتار ۳۰۰۰۰۰ کلو میٹر فی سیکنڈ ہے۔ آئن سٹائن کہتا ہے کہ کوئی مادی شے اس سے زیادہ رفتار اختیار نہیں کر سکتی۔

کسی جسم کی توانائی میں اضافہ ہمیشہ اس کی کمیت یعنی ماس Mass میں اضافے کا سبب بنتا ہے یا یوں سمجھ لیجئے کی چلتی ہوئی گاڑی کی کمیت روکی ہوئی گاڑی کی کمیت یا ماس سے زیادہ ہے۔ تیز رفتاری کی صورت میں متحرک جسم Body کچھ چپٹا ہو جاتا ہے یعنی اس کی لمبائی میں کمی ہو جاتی ہے۔ لمبائی کی یہ کمی اس سمت میں واقع ہوتی ہے جس سمت میں یہ جسم حرکت کر رہا ہوتا ہے۔

کوئی نہیں جان سکا کہ وقت کیا ہے۔ وقت یا زمانے کی اہمیت سے انکار نہیں کیا جا سکتا۔ قوموں کی ترقی اور تنزلی میں اس کی بڑی اہمیت ہے۔ وقت کی مدد سے ان چیزوں کا اندازہ کیا جا سکتا ہے۔ لیکن وقت کی درست ماہیت کو ابھی تک کوئی نہیں جان سکا۔ آئن سٹائن کے نظریۂ اضافیت کے بارے میں یہ کہا جا سکتا ہے کہ وقت پر تیز رفتاری کا غیر معمولی اثر پڑتا ہے۔ ہر شخص وقت کے متعلق ایک حد تک اپنا معیار رکھتا ہے۔ اس کے نقطۂ نظر سے دیکھا جائے تو وہ کسی کو سست کہے گا اور کسی کو تیز۔ جب کہ ہر دوسرا شخص جو پہلے شخص سے مختلف رفتار سے حرکت کرتا ہو، اس سے مختلف سوچے گا۔

آئن سٹائن ذاتی زندگی میں بڑا لاابالی تھا۔ وہ اکثر سوچ وبچار میں ڈوبا رہتا تھا۔ امریکا میں ایک دفعہ بس میں سفر کے دوران کنڈکٹر نے اسے یہاں تک کہا تھا کہ او! بڑے میاں، اگر حساب نہیں آتا تو گھر سے مت نکلا کرو۔

معاہدہ سیورے:

جنگ عظیم اول کے بعد ۱۰ اگست ۱۹۲۰ء کو اتحادی قوتوں اور سلطنت عثمانیہ کے درمیان طے پانے والا امن معاہدہ تھا۔ اس معاہدے پر عثمانی سلطنت نے دستخط کر دیے تھے لیکن اسے ترکی کی جمہوری تحریک نے مسترد کر دیا اور اس معاہدے پر عملدرآمد نہ ہو سکا۔ مصطفیٰ کمال اتاترک کی زیر قیادت اس تحریک نے معاہدے کے بعد ترکی کی جنگ آزادی کا اعلان کر دیا اور قسطنطنیہ (موجودہ استنبول) میں بادشاہت کو ختم کر کے ترکی کو جمہوریہ بنا دیا۔

اس معاہدے کو سلطنت عثمانیہ کی ایک عظیم شکست سمجھا جاتا ہے جو اپریل ۱۹۲۰ء میں اتحادیوں کے درمیان سان ریمو کانفرنس کے بعد طے پانے والے معاہدوں کی ایک کڑی تھا۔ اس معاہدے کے تحت حجاز (موجودہ سعودی عرب کا صوبہ) اور آرمینیا آزاد ممالک قرار دیے گئے۔ معاہدے کے سیکشن III کے آرٹیکل ۶۲ تا ۶۴ کے مطابق کردستان کو بھی آزادی ملنی تھی اور کرد ولایت موصل بھی آزاد کردستان میں شمولیت اختیار کر سکتی تھی۔ دوران جنگ سائیکس پیکوٹ معاہدے کے تحت بین النہرین یعنی میسوپوٹیمیا (موجودہ عراق) اور فلسطین برطانیہ اور لبنان اور شام کا علاقہ فرانس کے انتظام میں دے دیا گیا۔ اس کے علاوہ بحیرہ روم میں جزائر ڈوڈ کینیز اور رہوڈز (جو ۱۹۱۱ء

سے ہی اٹلی کے قبضے میں تھے) کے علاوہ شمالی اناطولیہ اٹلی کو دے دیا گیا جب کہ تھریس اور مغربی اناطولیہ یونان کا حصہ قرار دیا گیا جس میں سمرنا (موجودہ ازمیر) کی اہم ترین بندرگاہ بھی شامل تھی۔۔ باسفورس، درہ دانیال اور بحیرہ مرمرہ کو غیر فوجی اور بین الاقوامی علاقہ قرار دیا گیا اور عثمانی افواج کی تعداد کو ۵۰ ہزار تک محدود کر دیا گیا۔

انقرہ میں ترکی کی قومی اسمبلی نے معاہدے کو مسترد کرتے ہوئے مغربی اناطولیہ میں یونانی افواج کی بڑھتی ہوئی پیش قدمی کو روکا۔ مارچ ۱۹۲۱ء میں مصطفیٰ کمال کے حامیوں نے سوویت روس کی بالشویک حکومت سے دوستی کا معاہدہ کر لیا جس کے نتیجے میں کمالیوں نے ستمبر ۱۹۲۲ء تک یونان کو شکست دے کر اس کی افواج کی اناطولیہ سے نکال باہر کیا۔ اس زبردست فتح کے بعد جنگ عظیم اول کے اتحادی مذاکرات کی میز پر آنے پر مجبور ہو گئے اور ۱۹۲۳ء میں سوئٹزرلینڈ کے شہر لوزان میں معاہدہ سیورے کو ترکی کے حق میں منسوخ کر دیا گیا۔ معاہدہ لوزان ترکی کی عظیم فتح سمجھا جاتا ہے۔

نازی تحریک:(Nazi Movement)

نازی جرمنی ۱۹۳۳ء سے ۱۹۴۵ء کے دوران کے جرمنی کو کہا جاتا ہے جس کی قیادت ایڈولف ہٹلر اور قومی اشتراکی جرمن مزدور جماعت (NSDAP) کر رہے تھے۔ اس ریاست کے لیے تیسری رائخ Third (Reich) بھی کہا جاتا ہے جو قرون وسطیٰ کی مقدس رومی سلطنت اور ۱۸۷۱ء سے ۱۹۱۸ء تک قائم جرمن سلطنت کی جانشیں تیسری ریاست سمجھی جاتی تھی۔ جرمنی میں ریاست کے لیے ۱۹۴۳ء تک ڈوئچیس رائخ (جرمن رائخ) کی اصطلاح استعمال کی جاتی تھی، بعد ازاں باضابطہ نام عظیم تر جرمن رائخ (Großdeutsches Reich) اختیار کیا گیا۔

۳۰ جنوری ۱۹۳۳ء کو ایڈولف ہٹلر کو جرمنی کا چانسلر مقرر کیا گیا۔ حالاں کہ ابتدائی طور پر وہ ایک اتحادی حکومت کی قیادت کر رہے تھے تاہم انہوں نے جلد اپنے حکومتی شراکت داروں کو خارج کر دیا۔ اس وقت جرمنی کی سرحدیں بدستور معاہدۂ ورسائے کے مطابق متعین تھیں، جو پہلی جنگ عظیم کے اختتام پر برطانیہ، فرانس، امریکہ، اطالیہ اور جاپان کی اتحادیوں کے درمیان طے پانے والا معاہدہ تھا۔

نازی جرمنی شمال میں بحیرۂ شمال، ڈنمارک اور بحیرۂ بالٹک سے ملتا تھا، مشرق میں اس کا منقسم حصہ لتھوونیا، پولینڈ اور چیکوسلواکیہ سے منسلک تھا، جنوب میں اس کی سرحدیں آسٹریا اور سوئٹزرلینڈ سے جبکہ مغرب میں فرانس، لکسمبرگ، بیلجیئم، نیدرلینڈ، رائن لینڈ اور سارلینڈ سے ملتی تھیں۔ جب جرمنی نے رائن لینڈ، سارلینڈ اور

میمل لینڈ پر تسلط حاصل کیااور آسٹریا، سودیتن لینڈ اور بوہیمیا اور موراویا پر قبضہ کیاتو یہ سرحدیں تبدیل ہو گئیں۔ دوسری جنگ عظیم کے بعد جرمنی عظیم تر جرمنی میں تبدیل ہو گیا، جس کا آغاز ۱۹۳۹ء میں جرمنی کی پولینڈ پر جارحیت سے ہوا تھا، جس کے نتیجے میں برطانیہ اور فرانس نے جرمنی کے خلاف جنگ کا اعلان کر دیا۔

دوسری جنگ عظیم کے دوران جرمنی نے یورپ اور شمالی افریقہ کا بڑا حصہ فتح کر لیا۔ اسی دوران لاکھوں یہودیوں اور اقلیتوں سے تعلق رکھنے والے افراد کو قید خانوں میں ڈال دیا گیا یا موت کے گھاٹ اتار دیا گیا، اس قتل عام کو مرگ انبوہ(Holocaust) کہا جاتا ہے۔ تاہم دیگر اقوام، خصوصاً اطالیہ اور جاپان کے ساتھ، اتحاد کے باوجود جرمنی جنگ ہار گیا اور نازی جرمنی کا خاتمہ ہو گیا۔ جنگ کے بعد سوویت اتحاد، برطانیہ، امریکہ اور فرانس کی فاتح اتحادی قوتوں نے اس پر قبضہ کر لیا۔

ہندو:(Hindu)

ہندومت یا ہندو دھرم جنوبی ایشیا اور بالخصوص بھارت اور نیپال میں غالب اکثریت کا ایک مذہب ہے جس کی بنیاد ہندوستان میں رکھی گئی، یہ اس ملک کا قدیم ترین مذہب ہے۔ ہندومت کے پیروکار اِس کو سناتن دھرم کہتے ہیں جو سنسکرت کے الفاظ ہیں، ان کا مطلب ہے "لازوال قانون"۔ ہندومت قدیم ترین مذاہب میں سے ایک ہے۔ اِس کی جڑیں قدیم ہندوستان کی تاریخی ویدی مذہب سے ملتی ہیں۔ مختلف عقائد اور روایات سے بھرپور مذہب ہندومت کے کئی بانی ہیں۔ اِس کے ذیلی روایات و عقائد اور فرقوں کو اگر ایک سمجھا جائے تو ہندومت مسیحیت اور اسلام کے بعد دُنیا کا تیسرا بڑا مذہب ہے۔ تقریباً ایک اَرب پیروکاروں میں سے ۹۰۵ ملین بھارت اور نیپال میں رہتے ہیں۔ ہندومت کے پیروکار کو ہندو کہا جاتا ہے۔

تمام ہندو متون دو قسموں پر مشتمل ہے، شروتی (مسموع) اور سمرتی (محفوظ)۔ ان متون میں دیگر مضامین کے ساتھ ساتھ الٰہیات، فلسفہ، اساطیر، ویدک یجنا، یوگا اور مندروں کی تعمیر جیسے موضوعات پر گفتگو کی گئی ہے۔ ہندومت کی اہم کتابوں میں چار وید، اپنشد، بھگوت گیتا اور آگم شامل ہیں۔

ہندومت کسی ایک مذہب کا نام نہیں ہے، بلکہ یہ مختلف و متضاد عقائد و رسوم، رجحانات، تصورات اور توہمات کے مجموعہ کا نام ہے۔ یہ کسی ایک شخص کا قائم کردہ یا لایا ہوا نہیں ہے، بلکہ مختلف جماعتوں کے مختلف نظریات کا ایک ایسا مرکب ہے، جو صدیوں میں جا کر تیار ہوا ہے۔ اس کی وسعت کا یہ عالم ہے کہ الحاد سے لے کر عقیدہ وحدۃ الوجود

تک بلا قباحت اس میں ضم کر لیے گئے ہیں۔ دہریت، بت پرستی، شجر پرستی، حیوان پرستی اور خدا پرستی سب اس میں شامل ہیں۔

مندر میں جانے والا بھی ہندو ہے اور وہ بھی ہندو ہے جس کے جانے سے مندر ناپاک ہو جاتا ہے۔ وید کا سننے والا بھی ہندو ہے اور وہ بھی ہندو ہے جس کے متعلق حکم ہے کہ اگر وید سن لے تو اس کے کانوں میں پگلا ہوا سیسہ ڈالا جائے۔ غرض ہندو مت ایک مذہب نہیں ہے بلکہ ایک نظام ہے، جس کے اندر عقائد رسوم اور تصورات کی بہتات ہے۔ اسے ویدی مذہب کی ترقی یافتہ، توسیع یافتہ اور تبدیل شدہ شکل بھی کہا جاسکتا ہے، کیوں کہ وہ مقام جہاں سے یہ پھیلا ہے وہ بہر حال ویدی مذہب ہی ہے۔

ہم نے ویدی مذاہب میں بتایا ہے کہ آریا یہاں آنے کے بعد وہ چند صدیوں میں اپنی زبان بھول گئے اور ساتھ ہی ساتھ اپنی خصوصیات کھوتے چلے گئے۔ انہوں نے یہاں کی مختلف قوموں کے تمدنی اثرات، عقائد اور رسوم کو قبول کر لیا اور ان دیوتاؤں کو بھی جن کی پرستش غیر آریا کرتے تھے، اپنے دیوتاؤں میں شامل کر لیا۔ مگر وہ اپنی انفرادیت اور نسلی برتری کو کھونے کے لیے تیار نہ تھے۔ چنانچہ انہوں نے ایک طرف ہر اس جماعت اور مذہب سے ٹکر لینے کی ٹھانی جس نے ان کی عظمت سے انکار کر دیا اور دوسری طرف اور اپنی ذاتوں کی بندش کو سخت کر کے عقائد و رسوم کا جال ایسا پھیلا دیا، کہ لوگوں کے لیے اس سے نکلنا ممکن نہیں تھا۔ انہوں نے ویدی عہد کی مذہبی کتابوں اور دیوتاؤں کو احترام کے دائرے میں محدود کر دیا اور نئی کتابوں کی تصنیف اور نئے دیوتاؤں کی شمولیت سے مذہبی نظام قائم کیا اور اس پر نئی کتابوں میں اس نظام کی بنیاد رکھی گئی۔ دھرم شاشتر اور پران میں کو سب سے اہمیت حاصل ہوئی۔ خرافات، ضمیات، عقائد اور رسوم کے لیے پران نے ان کو مواد فراہم کیا اور عملی زندگی کے مطالبات کو دھرم شاشتر نے پورا کیا۔ برھما، شیو اور وشنو کو تسلیم کر لیا گیا اور الوہیت کی ان تینوں شکلوں کو تری مورتی کے نام سے موسوم کیا گیا۔ برھما کو پہلے افضل مانا گیا اور سرسوتی کو جس کی سواری مور ہے اس کی بیوی بتایا گیا، نیز اسے علم اور دانائی کی دیوی بتایا گیا۔ پھر برھما کی عظمت کم کر کے اس کی پرستش روک دی گئی اور وشنو اور شیو کو اس پر فوقیت دے کر اس کی کمتری کا اعلان کر دیا گیا۔

نیپال دنیا کا واحد معاصر ہندو ملک تھا، تاہم نیپال کی جمہوری تحریک کے بعد نافذ کیے جانے والے عبوری آئین میں کسی بھی مذہب کو بطور قومی مذہب اعلان نہیں کیا گیا ہے۔

وہابی جماعت:

وہابیت یا وہابی تحریک ایک سلفی اسلامی تحریک ہے جو محمد بن عبد الوہاب سے منسوب کی جاتی ہے۔ دعوے کے مطابق وہ بدعتوں کو ختم کرنے والے اور اسلام کو اس کی اصل صورت میں جیسے کہ یہ پیغمبر اسلام کے دور میں تھی، بحال کرنے والے ہیں جب کہ دیگر تمام مسلمان انہیں شدت پسند سمجھتے ہیں۔ یہ خیال کیا جاتا ہے کہ یہ سنی مسلک سے ہیں۔ وہابی خود کو وہابی کہلانا پسند نہیں کرتے بلکہ خود کو اہل حدیث، سلفی اور موحد پکارتے ہیں۔ یہ دنیا میں اور خاص طور پر سعودی عرب میں کسی اور مذہب حتی کہ اسلام ہی کے دوسرے مسالک کے وجود کے قائل نہیں۔ مذہبی طور پر شروع ہونے والی یہ تحریک بہت جلد سیاسی اور پھر شاہی رنگ اختیار کر گئی۔ جامعہ ازہر کے ایک عالم نے اسے شیطانی تحریک قرار دیا ہے۔

عبد الوہاب اٹھارہویں صدی میں سعودی عرب کے ایک دور دراز علاقے، نجد کا رہنے والا تھا۔ جو اپنے علاقے میں مزارات پر دی جانے والی حاضری، بزرگان دین صوفیا اسلام سے توسل کے خلاف تبلیغ کیا کرتا۔ اس کے نزدیک یہ تمام چیزیں اسلام کے خلاف تھیں اور وہ انہیں شرک وبدعت (نئی چیز) قرار دیا کرتا۔ اسی دوران انھیں ایک مقامی رہنما محمد بن سعود کی حمایت حاصل ہوئی۔ دعوے کے مطابق یہ تحریک توحید اور خدا کی وحدانیت کے گرد گھومتی ہے۔ عقائد کے اعتبار سے یہ تحریک قرون وسطی کے عالم ابن تیمیہ اور فقہ کے لیے امام احمد بن حنبل کے تعلیمات پر بھی زیادہ زور دیتی ہے۔

ابن وہاب اور آل سعود کی رشتہ داری دیر تک اور اس تحریک کے لیے مفید ثابت ہوئی۔ آل سعود نے اس تحریک سے سیاسی اور مذہبی ناتا برقرار رکھا جس نے اگلے ۱۵۰ سال تک سعودی عرب میں اس تحریک کی آبیاری کی اور آج بھی وہ اس کی تبلیغ میں حصہ لیتے ہیں۔ ایک اندازے کے مطابق خلیج فارس سے ملحق علاقوں میں وہابیوں کی تعداد ۵۰ لاکھ کے لگ بھگ ہے۔

تیل کی دولت سے حاصل رقم سے جو ۱۹۷۰ء میں شروع ہوئی وہابیت کی دنیا بھر میں تبلیغ کی جاتی ہے اور اس نے اس کے ماننے والوں کی تعداد میں بہت زیادہ اضافہ کیا ہے۔

وہابیت پر اکثر "دہشت گردی کا منبع" ہونے کا الزام بھی تواتر کے ساتھ لگایا جاتا ہے اور یہ بھی کہا جاتا ہے کہ داعش کے عراق میں ریاست کے تخلیق بھی اسی تحریک سے متاثر تھی۔ بہت سے مسلمان وغیر مسلم وہابیوں سے اسلامی/غیر اسلامی بزرگان کے مزارات اور یادگاروں کی تباہی کا گلہ کرتے ہیں۔

یہودی:

یہودی، یہودیت کے پیروکاروں کو کہتے ہیں جو قدیم بنی اسرائیل کی اولاد ہیں۔ دنیا بھر میں یہودیوں کی موجودہ تعداد کا مکمل اندازہ تو نہیں لگایا جاسکتا تاہم ان کی تعداد ۱۲ سے ۱۴ ملین کے لگ بھگ ہے جن کی اکثریت امریکا اور اسرائیل میں رہائش پزیر ہے۔

ابراہیم کے دو بیٹے تھے، اسماعیل اور اسحاق۔ اسحاق کے بھی دو بیٹے تھے ایک یعقوب اور ایک عیسو۔ عیسو پیغمبر نہیں تھے جب کہ یعقوب پیغمبر تھے۔ یعقوب کے بارہ بیٹے تھے جن میں سے ایک کا نام" یہوداہ "تھا۔"یہودی" کا لفظ اسی سے ہے۔ یعقوب کا لقب تھا" اسرائیل "۔ اسرائیل کا مطلب ہے اللہ کا بندہ۔ یہی بنی اسرائیل یعنی اسرائیل کی اولاد "یہودی" کہلائے۔ آدم سے لے کر ملاکی تک جتنے بھی انبیا گزرے ہیں یہودی ان سب کو انبیا مانتے ہیں۔ یہودی ملاکی کو آخری بائبلی نبی سمجھتے ہیں۔ اور ملاکی کے بعد جتنے بھی نبی آئے انہیں یہودی نہیں مانتے۔ اور ابھی تک مشیاخ (مسیح) کے انتظار میں ہیں، ان کے نزدیک مسیح ہی آخری پیغمبر ہو گا۔ اس طرح یہودی توریت کو اللہ کی طرف سے نازل شدہ مانتے ہیں لیکن انجیل اور قرآن کو نہیں مانتے۔

حالیہ اعداد و شمار کے مطابق دنیا میں ۱ کروڑ چوالیس لاکھ ۳۵ ہزار نو سو یہودی ہیں۔ اسرائیل میں ۳۰ لاکھ، روس میں ۲۶ لاکھ بیس ہزار اور امریکا میں ۵۸،۷۰،۰۰۰ آباد ہیں۔ دنیا میں سب سے زیادہ یہودی نیو یارک شہر میں جہاں ان کی تعداد ۱۸،۳۰،۰۰۰ ہے۔ یہودی کی اصطلاح اپنے اندر کثیر مذہبی وظائف اور عقائد کو سمیٹے ہوئے ہے۔ دنیا بھر کے یہودی اپنے وظائف اور عقائد کے لحاظ سے متعدد حصوں میں منقسم ہیں۔ ایک تحقیق کے مطابق یہودیوں کی اکثریت خدا میں یقین نہیں رکھتی اور وہ زیادہ تر ملحد ہیں۔

یورپ کے تاثرات کے متن کی فرہنگ

نمبر شمار	الفاظ	معنی
۱	اتالیق	معلم، استاد۔ (ترکی) مذکر
۲	اتباع	پیروی کرنا، تقلید کرنا۔ (عربی) جمع ہے تابع کی۔ مذکر
۳	اتصال	ملنا، سہل ملاپ، نزدیکی۔ (عربی) مذکر مصدر۔
۴	اتہامات	تہمت دینا، الزام لگانا۔ (عربی) اتہام کی جمع۔ مذکر
۵	اچھوت	اچھوتا۔ بن چھوا، کنوارا، مراد ہے نیچ ذات کے لوگ۔ (ہندی) مذکر، اسم صفت
۶	احتساب	حساب لینا، جانچنا۔ (عربی) مذکر
۷	احتمال	شک وشبہ، گمان۔ (عربی) مذکر
۸	احتیاج	ضرورت، حاجت ہونا، غرض۔ (عربی)، اسم، مؤنث
۹	اختراعات	نئی چیز کی دریافت، ایجاد، جدّت، من گھڑت۔ (عربی) اختراع کی جمع۔ مذکر و مؤنث
۱۰	اختلاط	میل جول، ربط ضبط، محبت کرنا، چھیڑ چھاڑ کرنا، بے تکلفی۔ (عربی) مذکر
۱۱	ادارات	محکمہ، دفتر، تنظیم، چوکس، جمہوری مقصد کے لیے قائم ہو، انجمن۔

		(عربی)ادارہ کی جمع، مذکر
۱۲	ادبار	بد نصیبی، نحوست، پستی، افلاس، مفلسی۔ (عربی)، مذکر
۱۳	ارتسام	نقش کرنا، مہر لگانا، نشان (عربی)مذکر
۱۴	ارزاں	سستا، کم قیمت۔ (فارسی) گراں کا متضاد، صفت
۱۵	ازالہ	زائل کرنا، مٹانا، بے عزتی کرنا، رسوائی۔ (عربی)مذکر
۱۶	ازمنہ وسطیٰ	یورپ کی روایتی تاریخ کا درمیانی عہد ازمنہ یعنی ادوار، قرون، صدیاں، زمانے۔ وسطیٰ یعنی اوسط درجے کا، درمیان کا، متوسط، بیچ کا، نہ بڑا نہ چھوٹا۔ (عربی)مذکر
۱۷	استدعا	درخواست، خواہش، التجا۔ (عربی)مؤنث
۱۸	استری	زوجہ، بیوی، جورو۔ (ہندی)مؤنث
۱۹	استفسار	سوال کرنا، دریافت کرنا، پوچھنا۔ (عربی)مذکر
۲۰	اسفل	سب سے نیچا، انتہائی ذلیل۔ (عربی)مذکر
۲۱	اسلاف	پچھلے بزرگ۔ اگلے وقتوں کے لوگ۔ (عربی)سلف کی جمع، مذکر

۲۲	اصابت	ٹھیک بات کہنا، صحیح نتیجے پر پہنچنا، مضبوطی، پختگی۔ (عربی)مؤنث
۲۳	اصلاحات	درستیاں۔ ترمیمیں۔ (عربی)اصلاح کی جمع، مؤنث
۲۴	اصلاحی تعلیم	اصلاح سے منسوب تعلیم۔
۲۵	بانی مبانی	اصل باعث، وجہ، سبب، اصل ذمہ دار۔ (اردو)مذکر
۲۶	بٹلر	باورچی، کھانا پکانے والا ملازم (انگریزی)مذکر
۲۷	بجز	استثنائی، سوائے، بِن، علاوہ۔ (فارسی)
۲۸	بداعتدالی	اعتدال سے باہر، برابر نہ ہونا، غیر متناسب، کمی یا زیادتی ہونا۔ (عربی)مذکر
۲۹	بدرجہ اتم	مکمل طور پر، جس میں کسی قسم کی کمی نہ ہو، حد درجے کا، کامل تر۔ (فارسی)صفت
۳۰	بذلہ سنجی	خوش طبعی، ظرافت، نفیس باتیں کہنا، لطیفہ گوئی۔ (عربی، فارسی)مؤنث
۳۱	برپیمانہ کبیر	بڑے پیمانے پر۔ (فارسی)
۳۲	برانگیختہ	غصہ اور طیش میں بھرا ہوا، مشتعل، بھڑکا ہوا۔ (فارسی)صفت
۳۳	برجستہ	موزوں، برمحل، بے ساختہ، مناسب، ٹھیک۔ (فارسی)صفت

۳۴	برضاورغبت	اپنی مرضی سے۔
۳۵	برہم	پریشان، پراگندہ، ناراض، خفا۔ (فارسی)صفت
۳۶	برہنہ	ننگا، عریاں، بغیر کپڑوں کے۔ (فارسی)صفت
۳۷	بشمول	مِلا کر، شامل کر کے۔ (فارسی)
۳۸	بُعدِ زمانی و مکانی	وقت اور جگہ کی دُوری اور فاصلہ، دُور اور علاقے کا فاصلہ۔ (عربی)مذکر
۳۹	بعینہ	ہو بہو، جوں کا توں۔ (عربی)تابع فعل۔
۴۰	بفرضِ محال	جس کا ہونا مشکل معلوم ہو، جس کے بارے میں صرف سوچا جاسکتا ہو۔
۴۱	بلدیہ	عوام کے انتخاب کردہ ارکان پر مشتمل وہ ادارہ جو شہر کی صفائی اور روشنی وغیرہ کا انتظام کرتا ہے۔(عربی)مؤنث
۴۲	بمنزلہ	جائے، بطور، درجہ میں جگہ پر، بالعوض۔ (فارسی)تابع فعل۔
۴۳	بنجارہ	سوداگر، بیوپاری۔ (ہندی)اسم، مذکر
۴۴	بہیمت	بربریت، وحشی پن، ظلم و تشدد۔ (عربی)صفت
۴۵	بوالہوس	لالچ کا باپ، مراد نہایت طامع، بڑا حریص، نفسانی خواہشات کا مرید۔ (عربی)اسم صفت
۴۶	بے راہ روی	آوارگی

		(اردو)مؤنث
۴۷	بیدار مغز	عالی دماغ، ہوشیار۔ (فارسی)صفت
۴۸	بیمہ	ٹھیکا، ضمانت، انشورنس(Insurance) (فارسی)مذکر
۴۹	بین	درمیان، وسط۔ (فارسی)صفت
۵۰	پالکی	ایک قسم کی خم دار ڈنڈوں والی ڈولی، محافہ۔ (ہندی)مؤنث
۵۱	پُر گو	بہت کہنے والا، زود گو۔ (فارسی)مجہول۔
۵۲	پروپیگنڈا	مشتہری، پھیلانا، مشہور کرنا، کسی کام کی تعریف یا کسی کے برخلاف کوئی معاملہ باقاعدہ طور پر مشہور کرنے کی کوشش۔ (انگریزی)مذکر
۵۳	پس ماندہ	پیچھے رہا ہوا۔بچا ہوا، وارث، بقایا، بچت (فارسی)صفت
۵۴	پمفلٹ	رسالہ، چھوٹی کتاب، کتابچہ۔ (انگریزی)مذکر
۵۵	پیکار	لڑائی، جنگ۔ (فارسی)مذکر
۵۶	تابع	مطیع، فرماں بردار، ماتحت، پابند۔ (عربی)صفت
۵۷	تاراج	لوٹ مار، غارت، دستبرد، لوٹ کھسوٹ۔

		(فارسی) مذکر
۵۸	تالیف	دو چیزوں کو باہم ملانا، جمع کرنا، دوستی پیدا کرنا، مختلف کتابوں سے مضامین چن کر نئے پیرائے میں کتاب ترتیب دینا۔ مختلف کتابوں سے مضامین لے کر ترتیب دی گئی کتاب۔ (عربی) مؤنث
۵۹	تائید	مدد، حمایت، رعایت، طرف داری، استحکام، دعویٰ کی دستاویز۔ (عربی) مؤنث
۶۰	تثلیث	ایک میں تین یا تین میں ایک، تین حصوں میں تقسیم کرنا، تین خدا ماننا یا ربوبیت کے تین حصے سمجھنے کا عقیدہ۔ (عربی) مؤنث
۶۱	تجریدی	کپڑے اتارنا، عریانی، ایک چیز کو دوسری چیز سے جدا کرنا، تنہائی، علیحدگی، خلوت، عزلت۔ علمِ بیان کی ایک صفت جس میں زوایہ کو دُور کر کے صرف ایک معنی سے غرض رکھی جاتی ہے، مجرد رہنا، شادی نہ کرنا۔ (عربی) مؤنث
۶۲	تحتانی تعلیم	نیچے کی تعلیم، زیریں درجے کی تعلیم، پرائمری تعلیم (عربی) صفت
۶۳	تحتانیہ	ابتدائی دَور، بچپن کا دور، پرائمری تعلیم کا عرصہ (عربی) صفت
۶۴	تحدید	حد لگانا، محدود کرنا، حد بندی۔ (عربی) مؤنث
۶۵	تحریص	لالچ دلانا، حرص دلانا، رغبت دلانا، اغوا کرنا، ترغیب، اغوا۔ (عربی) اسم مؤنث و مصدر
۶۶	تخریب	خراب کرنا، بگاڑنا، خرابی، بربادی، تباہی، ویرانی۔

		(عربی)مؤنث
۶۷	ترویج	رواج، شہرت، اشاعت کرنا، جاری کرنا۔ (عربی)مؤنث
۶۸	تعددِازواج	بیک وقت ایک سے زیادہ بیویاں رکھنا یا ایک سے زیادہ خاوند رکھنا۔ (عربی)مؤنث
۶۹	تنقیح	کھولنا، کشادگی، کسی شخص، تنظیم، نظام، کارروائیوں یا منصوبہ کی جانچ پڑتال کرنا۔ (عربی)مؤنث۔
۷۰	تفویض	سپردگی، حوالگی، تحویل۔ (عربی)مؤنث
۷۱	تکیہ کرنا	بھروسہ کرنا، اعتماد کرنا، امید رکھنا، آس رکھنا، کسی چیز کے سہارے سے بیٹھنا۔ (اردو)محاورہ۔
۷۲	تموّل	مال دار ہونا۔ دولت مندی۔ (عربی)مذکر
۷۳	توجیہہ	وجہ بیان کرنا، دلیل دینا۔ (عربی)مؤنث
۷۴	توسّط	بیچ میں پڑنا، میانہ روی، اعتدال، ذریعہ، وسیلہ۔ (عربی)مذکر
۷۵	توضیح	وضاحت کرنا، کھول کر کہنا، تشریح، مال گزاری کا نقشہ۔ (عربی)مؤنث
۷۶	توطن پذیری	توطن اختیار کرنا۔ مستقل طور پر کسی جگہ کو اپنا وطن بنانے کا عمل۔ (عربی)مذکر

۷۷	ٹٹی	بانس یا سرکنڈوں کا بنا ہوا چھوٹا چھپر، پردہ، اوٹ، بانس وغیرہ کا وہ ڈھانچہ جس پر بیل چڑھاتے ہیں، شکار کھیلنے کی آڑ۔ (ہندی) مؤنث
۷۸	جاگزیں	جگہ پکڑنے والا، ٹھہرنے والا۔ (فارسی) صفت
۷۹	جسدِ قومی	قوم کا جسم یا بدن۔ (فارسی) مذکر
۸۰	جملہ	تمام، سب، کل۔ (عربی) صفت، مذکر
۸۱	جمود	بے حسی، بے حرکتی۔ تعطّل۔ (عربی) مذکر
۸۲	جنبش	حرکت، گردش، ہلنا۔ (فارسی) مؤنث
۸۳	جنسی ترغیبات	عورتوں اور مردوں کے ایک دوسرے کی طرف جنسی لحاظ سے متوجہ کرنے والے عوامل۔ (فارسی) مؤنث
۸۴	جوکھم	کوئی مشکل کام، خطرہ، اندیشہ، خوف، ڈر، نقصان، گھاٹا، مصیبت۔ (ہندی) مؤنث
۸۵	چٹیکار	
۸۶	چکلے	شہر کا وہ حصہ جہاں رنڈیاں رہیں۔ (ہندی)
۸۷	چہ میگوئیاں	قیاس آرائی، رائے زنی، گپ شپ۔ (فارسی، اردو) مؤنث

۸۸	حرم سرا	زنان خانہ، زنانہ محلات، زنانہ مکان۔ (فارسی)مذکر
۸۹	حریت	غلامی کے بعد آزادی، آزادی۔ (عربی)مؤنث
۹۰	حزب	گتھہ، گروہ، جماعت۔ (عربی)مؤنث
۹۱	حق بجانب	سزاوار، لائق، حق پر۔ (فارسی)صفت
۹۲	حمال	بوجھ اٹھانے والا، مزدور، قلی۔ (عربی)مذکر
۹۳	حیاسوز	بے شرمی، حجاب اور شرم کے خلاف۔ (فارسی)صفت
۹۴	خازن	جمع کرنے والا، نگہبان، خزانچی۔ (عربی)صفت
۹۵	خاکسار	خاک کی مانند، عاجز، حقیر۔ (فارسی)صفت
۹۶	خانگی	گھریلو، گھر کا، نجی، ذاتی۔ (فارسی)صفت
۹۷	خدمتِ عامہ	عام لوگوں کے لیے فلاحی کام (فارسی)صفت
۹۸	خدمتِ جلیلہ	بہت بڑا کام، عظیم کارنامہ۔ (فارسی)صفت
۹۹	خرد	عقل، سوجھ بوجھ، دانش، دانائی، فہم۔

		(فارسی)صفت
۱۰۰	خفت	سُبکی، ہلکاپن، اوچھاپن، ذلّت، شرم، ندامت۔ (عربی)مؤنث
۱۰۱	خفیف	ہلکا، سبک، تھوڑا، کم، شرمندہ، نادم۔ (عربی)صفت
۱۰۲	خندہ پیشانی	ہنس مکھ، خوش مزاج، شگفتہ رُو۔ (فارسی)صفت
۱۰۳	خوابیدہ	سویاہوا، خمارآلود۔ (فارسی)صفت
۱۰۴	خواہاں	چاہنے والا، خواہش مند، طلب گار۔ (فارسی)صفت
۱۰۵	خوش طبعی	دل لگی، ظرافت، مذاق، ہنسی، ٹھٹھا۔ (فارسی)مؤنث
۱۰۶	دُشنام	گالی گلوچ، برابھلا کہنا (فارسی)مؤنث
۱۰۷	داغ بیل ڈالنا	کسی کام کو شروع کرنا، کسی کام کی بنیادرکھنا کام کاآغاز کرنا۔ (اردو)محاورہ
۱۰۸	درآن حالی	اس صورت میں اس حال میں۔ (فارسی)
۱۰۹	دُخت رز۔	انگور کی شراب (فارسی)
۱۱۰	دریوزہ گر	مانگنے والا، بھکاری، گداگر، غریب۔ (فارسی)صفت

۱۱۱	دست برداد(ہونا)	ہاتھ اٹھانا، چھوڑدینا، ترک کرنا، بازآنا (اردو)فعل
۱۱۲	دست نگر	ہاتھ تکنے والا، محتاج، مفلس، تنگدست، مدد کا محتاج۔ (فارسی)صفت
۱۱۳	دستبرد	غبن، خیانت، لوٹ، غارت۔ (فارسی)مؤنث
۱۱۴	دستگیری	مدد، معاونت، حمایت۔ (فارسی)مؤنث
۱۱۵	دقیقہ اٹھانہ رکھنا	باقی نہ چھوڑنا، فروگزاشت نہ کرنا۔ کسرنہ چھوڑنا، پوری کوشش کرنا۔ (اردو)محاورہ
۱۱۶	دلدادہ	عاشق، فریفتہ۔ (فارسی)صفت
۱۱۷	دلدہی	سرگرمی، پُرشوق۔ (فارسی)صفت
۱۱۸	دیوالیہ	مفلس، کوڑی کوڑی کا محتاج، کاروبار میں اصل سرمائے سے زیادہ نقصان اٹھانا۔ (ہندی)مذکر
۱۱۹	دھرم شاستر	مذہبی قوانین کا مجموعہ، منو کی کتاب قوانین۔ (ہندی)اسم
۱۲۰	ذی ثروت	دولت مند، بااختیار، حاکم۔ (فارسی)صفت
۱۲۱	راز ہائے سربستہ	سخت خفیہ بھید، چھپے ہوئے کئی راز۔ (فارسی)مذکر

۱۲۲	راسخ	پکا، مضبوط، اٹل۔ (عربی)صفت
۱۲۳	راسخ الاعتقادی	پکا بھروسا، کامل یقین، مضبوط (عربی)
۱۲۴	ربط	تعلق، واسطہ، میل جول۔ (عربی)مذکر
۱۲۵	رتی برابر	رتی بھر۔ قدرے قلیل، ذرا سا۔ (اردو)
۱۲۶	رعونیت	رعونت۔ تکبر، غرور، فخر، گھمنڈ، خود بینی۔ (عربی)مؤنث
۱۲۷	رفاہی	رفاہ۔ آرام کی زندگی، آرام، تن آسانی، بھلائی، بہبو (عربی)مؤنث
۱۲۸	رقص و سرود	ناچنا، گانا۔ (فارسی)مذکر
۱۲۹	رنگروٹ	نیا فوجی، زیر تربیت فوجی، (Recruit) (اردو)مذکر
۱۳۰	رؤسا	سردار، فرماں بردار، دولت مند، راجا، نواب۔ باعزت آدمی۔ (عربی)رئیس کی جمع۔ مذکر
۱۳۱	رین بسیرا	رات رہنا۔ پرندوں کا رات کو درختوں وغیرہ پر رہنا۔ (ہندی)مذکر
۱۳۲	زن مرید	جورو کا مطیع، بیوی کا کہا ماننے والا۔ (فارسی)صفت
۱۳۳	زنجیرِ پا	پاؤں کی زنجیر۔ پاؤں کی بیڑی۔

		(فارسی)مؤنث
۱۳۴	سابقہ پڑنا	کام پڑنا، واسطہ پڑنا، واقفیت ہونا۔ جان پہچان ہونا۔ (اردو)محاورہ۔
۱۳۵	سبک دوش	جس کے پاس کچھ بوجھ نہ ہو، ہلکا پھلکا، بری الذمہ، فارغ، ذمہ داری پوری کرنا۔ (فارسی)صفت
۱۳۶	سپوت	فرماں بردار بیٹا۔ فرزندِ رشید۔ (ہندی)مذکر
۱۳۷	ستائش	تعریف، حمد و ثنا، شکر، سپاس، توصیف۔ (فارسی)مؤنث
۱۳۸	ستر پوش	وہ چیز یا کپڑا جس سے ستر چھپایا جائے، باپردہ۔ (عربی، فارسی)صفت
۱۳۹	سجادہ نشین	پیر یا مرشد کی گدی پر بیٹھنے ولا، خلیفہ، قائم مقام۔ (عربی، فارسی)صفت
۱۴۰	سرِ راہ مزاحم	راستے کی رکاوٹ یا مزاحمت۔ راستے کی روک۔ (عربی، فارسی)صفت
۱۴۱	سدِ باب	کسی بات کی قطعی ممانعت۔ (عربی)مذکر
۱۴۲	سر برآوردہ	بڑا بزرگ، معزز، نمایاں، سردار، افسر۔ (فارسی)صفت
۱۴۳	سرِ دست	ابھی، اس وقت، فی الحال، بالفعل، فوراً۔ (فارسی)مذکر
۱۴۴	سرتابی	سرکشی، نافرمانی، حکم عدولی۔

		(فارسی)مؤنث
۱۴۵	سرد مہری	بے التفاتی، بے پرواہی، بے وفائی۔ (فارسی)مؤنث
۱۴۶	سررشتہ	تدبیر۔ چارہ کار۔ معاملہ، مطلب، مقصود۔ محکمہ، دفتر، کچہری، دستور، رواج۔ (فارسی)مذکر
۱۴۷	سرمست	تیزی، جلدی، چالاکی، پھرتی۔ (عربی)مؤنث۔
۱۴۸	سرکردگی	سربراہی، رہنمائی۔ (فارسی)صفت
۱۴۹	سطوَت	قہر، دبدبہ، رعب، شان وشوکت، سخت پکڑنا۔ (عربی)مؤنث
۱۵۰	سل	ایک بیماری جس سے پھیپھڑوں میں زخم پڑ جاتے ہیں اور منہ سے خون آنے لگتا ہے۔ (عربی)مؤنث
۱۵۱	سن رسیدہ	بوڑھا، زیادہ عمر کا۔ (عربی،فارسی)صفت
۱۵۲	سنَس کار	روایت، طور طریقہ، عادت، رسم ورواج، نظم وضبط۔ (سنسکرت)مذکر
۱۵۳	سوانگ بھرنا	فریب دینا، بھیس بدلنا۔ (اردو)محاورہ۔
۱۵۴	ستیاناس	تباہ حالی، بربادی، غرت گری (ہندی)مذکر

۱۵۵	ششدر رہ جانا	حیران و پریشان، ہکا بکا رہ جانا (فارسی، اردو) محاورہ
۱۵۶	شق	پھٹا ہوا، شگاف دار، کھلا ہوا۔ (عربی) صفت
۱۵۷	شکست خوردگی	ٹوٹ پھوٹ کا شکار ہونا، زک پہنچنا، ہار، کمی، نقصان، گھاٹا۔ (فارسی) مؤنث
۱۵۸	شیون	نوحہ، نالہ و آہ، ماتم و فریاد، رنج، دُکھ، صدمہ۔ (فارسی) مذکر
۱۵۹	صادر	نکلنے والا، کسی جگہ سے باہر آنے والا، واپس پھرنے والا، نافذ ہونے والا، جاری ہونے والا۔ (عربی) فعل۔
۱۶۰	صدرالمہام	سربراہ، کُرسی نشین (عربی) مذکر
۱۶۱	صدر نشین	مسند نشیں، میرِ مجلس۔ (عربی) صفت
۱۶۲	صلح و آشتی	صلح صفائی، میل ملاپ، دوستی، امن و امان۔ (عربی، فارسی) مؤنث
۱۶۳	صوم و صلوٰۃ	روزہ نماز، عبادت کے رسوم۔ (عربی) مؤنث
۱۶۴	ضبطِ تولید	ایسی تدابیر اختیار کرنا جن سے بچے پیدا نہ ہوں یا حسب منشا پیدا ہوں (Birth Control)۔ (عربی) مذکر ترکیب فارسی۔
۱۶۵	طہارت	پاکیزگی، صفائی، ستھرائی۔ (عربی) مؤنث
۱۶۶	طبائع	طبیعتیں۔ خصلتیں، عادتیں، طینت، خاصیت، مزاج، خصوصیت، فطرت۔

		(عربی)طبیعت کی جمع۔ مؤنث
۱۶۷	طرزِ ماند و بود	رہنے سہنے کا طریقہ۔ طرز بود و باش، رہائش کا انداز۔ (فارسی)مؤنث
۱۶۸	طُرفہ	نیا، انوکھا، عجیب، نادر، عجیب بات، حیران کن۔ (عربی)صفت
۱۶۹	طیلسانی	سند یافتہ، اعلیٰ تعلیم یافتہ، جس نے چودہ سال کی رسمی تعلیم مکمل کر کے اس کی سند حاصل کی ہو، گریجویٹ۔ (عربی)مذکر
۱۷۰	ظلم و تعدی	ظلم، جبر، ناحق، ناروا برتاؤ کرنا۔ (فارسی)مؤنث
۱۷۱	عامۃُ النّاس	کل لوگ، تمام، عام لوگوں میں سے کوئی ایک۔ (عربی)مؤنث
۱۷۲	عبود	عبودیت، اطاعت، بندگی، غلامی۔ (عربی)مؤنث
۱۷۳	عُسرت	تنگی، دشواری، غربت، افلاس۔ (عربی)مؤنث
۱۷۴	عصرانہ	سہ پہر کا کھانا، تیسرے پہر کی چائے۔ (عربی، فارسی)مذکر
۱۷۵	عصمت باختہ	بے عصمت، بدکردار، بدچلن، آوارہ، گناہ گار (جنسی لحاظ سے)۔ (عربی)مؤنث۔
۱۷۶	عصمت فروشی	جنسی کاروبار، آبرو بیچنا، بدچلنی۔ (عربی، فارسی)صفت
۱۷۷	عصمت مآب	پاکیزہ، طاہر، باکردار، باحیا، نگاہ جھکا کے رکھنے والا۔

		(عربی، فارسی)صفت
۱۷۸	عملی جامہ پہنانا	کسی کام کا وقوع میں لانا، کام کرنا۔ (اردو)محاورہ۔
۱۷۹	عمومیت	عموم، عام ہونا۔ (عربی)مذکر
۱۸۰	غائر	نشیب، گہرا، وسیع۔ (عربی)صفت
۱۸۱	غور وخوض	بہت توجہ سے، سوچ سمجھ کر، دھیان سے، اچھی طرح دیکھ بھال کر۔ (فارسی)صفت
۱۸۲	فرسودہ	گیا گزرا، گھسا ہوا، پرانا، متعملہ، کہنہ۔ (فارسی)صفت
۱۸۳	فطری میلان	قدرتی لگاؤ، فطری پسندیدگی، رجحان۔ (فارسی)صفت
۱۸۴	فی الواقع	فی الحقیقت، دراصل، واقعی، بے شک، حقیقتاً۔ (عربی)مذکر
۱۸۵	فوق الانسان	انسانیت سے اونچا، انسان پر سبقت لے جانے والا، برتر، فرشتہ۔ (عربی)مذکر
۱۸۶	فیصان	
۱۸۷	قاضی الحاجات	حاجت روا کرنے والا، خدا تعالی، مجاز اًروپیا پیسا۔ (عربی)صفت
۱۸۸	قدامت	قدیم ہونا، کہنہ ہونا، پرانا ہونا، پرانا پن، ہمیشگی۔ (فارسی)صفت
۱۸۹	قسمت آزمائی	مقدر آزمانا، تقدیر کے بھروسے پر کوئی کام کرنا۔

		(فارسی)صفت
۱۹۰	قطعاً	یقیناً، ضرور، ہرگز، مکمل طور پر، قطعی۔ (عربی)مذکر
۱۹۱	قُلی	مزدور، وہ شخص جو بوجھ اٹھانے کی مزدوری کرے۔ (ہندی)اسم۔
۱۹۲	قویٰ	طاقت۔زور، مردانگی، صلاحیتیں سلطنت۔ (عربی)قوت کی جمع۔مؤنث
۱۹۳	کُجا	کہاں، کس جگہ، نفی کے لیے بھی آتا ہے۔ (فارسی)
۱۹۴	کھرنچہ	اینٹ یا پتھر کا فرش، کھڑی اینٹوں کا فرش، راستہ، فٹ پاتھ۔ (ہندی)مذکر
۱۹۵	کس و ناکس	ادنیٰ واعلیٰ۔خاص وعام۔ہر شخص۔ (فارسی)مذکر
۱۹۶	کسب	کمانا، حاصل کرنا، کام دھندا، پیشہ، ہنر، فن۔ (عربی)مذکر
۱۹۷	کس مپرسی۔	حال پوچھنے والا کوئی نہ ہونا، مفلوک الحالی، غربت، مفلسی، بے چارگی، تباہ حالی۔ (فارسی)مؤنث
۱۹۸	کسوٹی	وہ پتھر جس پر سونے کا معیار دیکھتے ہیں، پرکھ، جانچ، امتحان۔ (اردو)مؤنث
۱۹۹	کشاکش	کھینچا تانی، دھکم دھکا، تکرار، جھڑپ، چھینا چھپٹی۔ (فارسی)مؤنث
۲۰۰	کشت و خون	خونخواری، مارکٹائی، جنگ وجدال، قتل وغارت گری۔

		(فارسی)مذکر
۲۰۱	کشمکش	کھینچا تانی، لڑائی جھگڑا، کشید گی، رکاوٹ، بھیڑ، جس میں سے نکلنا مشکل ہو، دقّت، دشواری۔(فارسی)مؤنث
۲۰۲	کل پرزہ	آلات، حصّہ، اہم ٹکڑا۔ (اردو)محاورہ
۲۰۳	کوتوالی	کوتوال کا صدر مقام، بڑا پولیس اسٹیشن۔ (اردو)مؤنث
۲۰۴	گردانا	تسلیم کیا، سمجھا، جان لیا، (اردو)فعل
۲۰۵	گرم اختلاط	گہرا دوست، از حد تکلف، نہایت ربط ضبط رکھنے والا۔ (فارسی)صفت
۲۰۶	گرینوں	کارخانے کی مشینیں، ملیں۔ (ہندی)مؤنث
۲۰۷	گم کردہ راہ	بھٹکا ہوا، راستہ بھولا ہوا، کھویا ہوا۔ (فارسی)صفت
۲۰۸	گنجفہ	ایک کھیل کا نام جو تاش کی طرح کھیلا جاتا ہے اس میں چھیانوے پتے اور آٹھ رنگ ہوتے ہیں اور تین کھلاڑی ہوتے ہیں۔ (فارسی)مذکر
۲۰۹	گہوارہ	پنڈولا، بچوں کو سہلانے کا جھولا، وہ چار پائی جس پر محراب نما لکڑیاں لگا کر عورتوں کا جنازہ لے جاتے ہیں۔ (فارسی)مذکر
۲۱۰	گھمنڈ	تکبر، غرور، نمود، خود بینی، شیخی۔ (اردو)مذکر

۲۱۱	لامتناہی	بے انتہا، جس کی کوئی حد نہ ہو، بے شمار۔ (فارسی)مذکر
۲۱۲	لاینحل	جس کا کوئی حل نہ ہو، غیر حل شدہ، جو کھل نہ سکے (گرہ وغیرہ)۔ (عربی)صفت
۲۱۳	لغزش	پھسلن، پھسلاہٹ، لرزش، جُنبش، کپکپی، خطا، سہو، غلطی، بُھول چُوک، گمراہی۔ (فارسی)صفت
۲۱۴	لہوولعب	کھیل کود، سیر تماشا، عیش، تفریح، ہنسی مذاق۔ (عربی)مذکر
۲۱۵	مآل	جائے بازگشت، واپس آنے کی جگہ، مرجّع، انجام، خاتمہ، نتیجہ۔ (عربی)مذکر
۲۱۶	مبادا	ایسا نہ ہو (کلمہ دعائیہ)، خدا نہ کرے، خدانخواستہ۔ (فارسی)
۲۱۷	مبالغہ آمیز	حد سے بڑھ کر تعریف یا لڑائی کرنا، زیادہ گوئی، حد سے بڑھ کر بولنا، بڑھا چڑھا کر۔ (عربی)مذکر
۲۱۸	مترادف	ہم ردیف، دو ایسے لفظ جن کے معنی ایک ہوں۔ (عربی)صفت
۲۱۹	متشرع	پابندِ شریعت، پارسا، پرہیزگار، پکا دین دار۔ (عربی)صفت
۲۲۰	متصوّر	تصور میں لایا ہوا، خیال کیا ہوا، سوچا ہوا۔ (عربی)صفت
۲۲۱	متعہ	چندروزہ نکاح، کسی عورت سے کچھ مدّت کے لیے نکاح

		(عربی)مذکر
۲۲۲	متنفس	سانس لینے والا، جان دار (انسان، حیوان اور پودے)، آدمی۔ (عربی)صفت
۲۲۳	محسن	احسان کرنے والا، بھلائی کرنے والا، سخی، فیّاض، مددگار، معاون، سرپرست، مربی۔ (عربی)مذکر
۲۲۴	محمول	لادا گیا، اٹھایا گیا، قیاس، گمان، ظن کیا گیا۔ (عربی)معفول
۲۲۵	مخدوش	پُرخطر، وسوسہ کیا ہوا، خدشہ سے اسم معفول۔ (اردو)صفت
۲۲۶	مخربِ اخلاق	اخلاق کو خراب کرنے والا، عادات میں بگاڑ پیدا کرنے والا۔ (عربی)۔صفت فاعلی
۲۲۷	مخلوط	ملا ہوا، ملا جلا، گڈمڈ، مراد ہے عورتوں اور مردوں کا ایک جگہ موجود ہونا یا اکٹھا ہونا۔ (عربی)صفت
۲۲۸	مدافعت	دفع کرنا، روکنا، روک، تردید، بچاؤ۔ (عربی)مؤنث
۲۲۹	مذمّت	برائی، ہجو، ذم کرنا، ناپسند کرنا۔ (عربی)صفت
۲۳۰	مراجعت	واپسی، واپس ہونا، رجوع کرنا، پلٹنا۔ (عربی)مؤنث
۲۳۱	مرتبت	مرتبہ، درجہ، رتبہ۔ (عربی)، مؤنث

۲۳۲	مرقع	تصویروں کی کتاب، لفظی تصویر۔خاکہ۔ (عربی)مذکر
۲۳۳	مسرف	فضول خرچ، بہت خرچ کرنے والا،ضائع کرنے والا۔ (عربی)صفت
۲۳۴	مسکن	رہنے کی جگہ /مقام،گھر،مکان،ٹھکانا۔ (عربی)مذکر
۲۳۵	مسلّمہ	مانی ہوئی باتیں، تسلیم شدہ امور (عربی)صفت
۲۳۶	مسمار	گرایاہوا، تباہ و برباد، منہدم۔ (عربی)مؤنث
۲۳۷	مشاہیر	مشہور کی جمع، شہرت کیا گیا، نامور، معروف۔ (عربی)مذکر
۲۳۸	مصلحان	اصلاح کرنے والے، صورتِ حال کو درست کرنے والے۔ (عربی)
۲۳۹	مضر	ضرر پہنچانے والا۔ نقصان رساں۔ (عربی)صفت
۲۴۰	مضرت رساں	نقصان پہنچانے والا۔زیاں کار، نقصان دِہ۔ (عربی،فارسی)صفت
۲۴۱	مضمر	پوشیدہ، مخفی،دل میں رکھا گیا، چھپا ہوا۔ (عربی)صفت
۲۴۲	مطمعِ نظر	مرکزِ نگاہ، مقصدِ اصلی۔ (عربی)مذکر ترکیب فارسی
۲۴۳	معائب	عیب دار، نقص والا۔

		(عربی)عیب کی جمع۔مذکر
۲۴۴	معتمد	اعتبار کیا گیا، بھروسہ کیا گیا، قابلِ اعتبار، مراد ہے سیکرٹری۔ (عربی)،صفت
۲۴۵	معصیّت	گناہ، خطا، نافرمانی، پاپ۔ (عربی)مؤنث
۲۴۶	مغالطہ	دھوکا، فریب، دغا، مکر، جھانسا، بھول چوک۔ (عربی)مذکر
۲۴۷	مغائر	مخالف، ناموافق، غیر (عربی)صفت
۲۴۸	مفقود	کھویا ہوا، غائب، ناپید، ندارد۔ (عربی)صفت
۲۴۹	مفلوج	وہ شخص جسے فالج کی بیماری ہو، فالج کا مارا ہوا۔فالج کا مریض۔(فالج: جسم کا سست اور بے کار ہونا)۔ (عربی)۔صفت
۲۵۰	مفلوک الحال	تباہ حال، خستہ حال۔ (عربی،فارسی)صفت
۲۵۱	مِن جُملہ	کل میں سے۔تمام میں سے، سب میں سے۔ (عربی)
۲۵۲	منافرت	نفرت، گھن، پرہیز۔ (عربی)مؤنث
۲۵۳	مناقشہ	جھگڑا، قضیہ، نزاع۔ (عربی)۔مذکر
۲۵۴	مہلک	ہلاک کرنے والا، مار ڈالنے والا، قاتل، ضرر رساں۔

		(عربی)مؤنث
۲۵۵	موٹران	موٹر یعنی گاڑی چلانے والا،ڈرائیور۔ (اردو)مذکر
۲۵۶	موجِ مضطر	بے چین لہر،طوفانی موج،مشکل وقت،آزمائش کی گھڑی (فارسی)مؤنث
۲۵۷	میقات	وقت،مقررہ مدت (عربی)مذکر
۲۵۸	میلان	توجہ،التفات،رجحان،خواہش۔ (عربی)مذکر
۲۵۹	ناساز	برعکس،مخالف،برخلاف،بیمار،علیل،مریض،ناتندرست۔ (فارسی)،صفت
۲۶۰	نافِ علم	علم کا مرکز،علم کا منبع (عربی،فارسی)
۲۶۱	ناکتخدا	بن بیاہا،کنوارا،جس کی شادی نہ ہوئی ہو۔ (فارسی)صفت
۲۶۲	ناگزیر	مجبور،لازم،ضرور،واجب،جس کے بغیر گزارہ نہ ہو۔ (فارسی)صفت
۲۶۳	ناگفتہ بہ	ناقابلِ بیان،جو کہا نہ جا سکے۔ (فارسی)
۲۶۴	نام نہاد	موسوم،نامزد،ترکیب ہے جو ایسے ناموں سے پہلے آتی ہے جس کے نام ان کی اصلیت کے خلاف ہوتے ہیں۔ (فارسی)صفت
۲۶۵	نراجیت	بدنظمی،لاقانونیت،انتشار،سیاسی افراتفری،طوائف الملوکی۔

		(سنسکرت)مؤنث
۲۶۶	نسلی تفوّق	دوسرے انسانوں سے خود کو نسل کی بنیاد پر برتر سمجھنا، نسل پرستی، نسل، خاندان اور قوم کی بنیاد پر عصبیت۔ (عربی)مذکر
۲۶۷	نشاۃ جدیدہ	دوسری جنگِ عظیم کے بعد یورپ اور اس کے اتحادی ملکوں کا جنگ میں فتح کے بعد دیگر ملکوں پر تسلط اور اس کے نتیجے میں ان کے ملکوں میں ترقی اور خوش حالی کا نیا دَور۔ (عربی)مؤنث
۲۶۸	نصب العین	اصل منشا اور مقصد، اصل مدِ نظر، منظور خاطر، زندگی کا مقصد۔ (عربی)مذکر
۲۶۹	نفاذ	جاری ہونا، ایک چیز کا دوسری چیز سے نکلنا، عائد ہونا، لاگو ہونا۔ (عربی)مذکر
۲۷۰	نکبت	خواری، ذلّت، رنج۔ (عربی)مؤنث
۲۷۱	نوخیز	نوجوان، نیا اگا ہوا، نیا نیا، نیا پن۔ (فارسی)مذکر
۲۷۲	نوع	وہ کل جس میں یکساں حقیقت کے افراد شامل ہوں، جنس، وضع، طور، ڈھنگ، ذات، شکل صورت۔ (عربی)مؤنث
۲۷۳	ہدف	تیر کا نشانہ، زد، مار۔ (عربی)مذکر
۲۷۴	ہریجن	کم تر ذات کے ہندو۔ (ہندی)مذکر

۲۷۵	ہسپانوی	ہسپانیہ یعنی سپین کے رہنے والے لوگ
۲۷۶	ہم پلہ	برابر کی ٹکر کا، برابر برابر، جوڑ کا، برابر کی مار کا، ہم مرتبہ۔ (فارسی)صفت
۲۷۷	ہم تعلیمی	لڑکیوں اور لڑکوں کا مل کر ایک ہی ادارے اور ایک جماعت میں ساتھ تعلیم حاصل کرنا، مخلوط تعلیم(CoEducation)۔ (فارسی)مؤنث
۲۷۸	ہوش ربا	ہوش لے جانے والا۔ (فارسی)صفت
۲۷۹	وحدت ازواج	ایک وقت میں ایک شادی کرنا، ایک بیوی یا ایک شوہر کے ساتھ زندگی گزارنا۔ (عربی، فارسی)مؤنث
۲۸۰	وسیع النظر	جس کی نظر وسیع ہو، بلند خیال، کھلے دل دماغ کا حامل۔ (عربی، فارسی)صفت
۲۸۱	وضع قوانین	قانون بنانا، قانون سازی کرنا۔ (عربی)مذکر
۲۸۲	وطن مالوف	پیارا وطن، وہ جگہ جہاں کے رہنے کی عادت ہو۔ (عربی، فارسی)مذکر
۲۸۳	یاس مشرب	مایوس، ناامید، بے دل۔ (عربی)مذکر
۲۸۴	یک لخت	ایک دم، جھٹ، بالکل، سارا، تمام، فوراً۔ (فارسی)صفت

حواشی وحوالہ جات برائے مقدمہ

[1]مولوی محمد حسین،سفر نامہ ابن بطوطہ، ترجمہ مع حواشی و تعلیقات (دہلی(بھارت): عاکف بک ڈپو، ۲۰۰۰ء)ص ۴۹۱۔

[2] BBC NEWS"*East India Company returns after 135-years absence*"،۱۳ اگست ۲۰۱۰ء۔

[3]خواجہ محمد اکرام الدین،اردو سفرناموں میں ہندوستانی تہذیب و ثقافت(نئی دہلی(بھارت): قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان،۲۰۱۳ء)مقدمہ: ص xi۔

[4]پروفیسر علی احمد فاطمی ''سفر نامہ کی ادبی اہمیت''مشمولہ"اردو سفرناموں میں ہندوستانی تہذیب و ثقافت"مرتبہ: خواجہ محمد اکرام الدین (نئی دہلی (بھارت): قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، ۲۰۱۳ء) ، ص ۷۔

[5] سید عبداللہ، پیش لفظ،حافظ و خیام مصنف: مقبول بیگ بدخشانی(لاہور: غالب پبلشرز،۱۹۷۹ء)، ص ۸۔

[6] مشفق خواجہ، دیباچہ،موسموں کا عکس مصنف: جمیل زبیری (کراچی: بختیار اکیڈمی، ۱۹۸۴ء)، ص ۱۰۔

[7] محمد کاظم،مجیب احمد سے مکالمہ مرتبہ: عطاالحق قاسمی،ادبی ایڈیشن(لاہور: نوائے وقت،۱۳مارچ ۱۹۷۷ء)۔

[8] یوسف کمبل پوش، عجائبات ِفرنگ مرتب: تحسین فراقی (لاہور: مکہ بکس، ۱۹۸۳ء)، ص ۹۔

[9]انور سدید،اردو ادب کی مختصر تاریخ(لاہور: عزیز بک ڈپو، ۲۰۰۶ء)، ص ۳۰۸۔

[10]یوسف کمبل پوش، عجائبات ِفرنگ مرتب: تحسین فراقی (لاہور: مکہ بکس، ۱۹۸۳ء)، ص ۲۰۔

[11] عجائبات ِفرنگ اور یوسف خان کمبل پوش،(لاہور: زاہد بشیر پرنٹرز،۲۰۱۶ء)، ص ۱۹۸۔

[12]ڈاکٹر ثروت علی۔ مقدمہ۔سفرنامہ فرنگ، (،نئی دہلی: ترقی اردو بیورو، ۱۹۸۴ء)، ص ۱۸۔

[13] ایضاً، ص ۱۸۔

[14]پنڈت ٹھاکر دت شرما وید،سفر یورپ (لاہور: امرت دھارا، ۱۹۲۵ء)، ص ۱۔

[15]ڈاکٹر معین الدین عقیل،عبدالغفار خان،ایک نادر سفر نامہ،مقدمہ و حواشی :(کراچی: مکتبہ اسلوب ۱۹۸۲ء)، ص ۱۵۔

[16]ڈاکٹر معین الدین عقیل،سفرنامہ منشی امین چند: اردو کا اولین اور کم یاب سفرنامہ(کراچی: مکتبہ اسلوب، ۱۹۸۲ء)ص ۴۸۔

[17]ڈاکٹر معین الدین عقیل،سفرنامہ منشی امین چند: اردو کا اولین اور کم یاب سفرنامہ(کراچی: مکتبہ اسلوب، ۱۹۸۲ء)ص ۴۸۔۴۹۔

18 کوی نود وبند بھوشن۔پنڈت ٹھاکردت سرماویند،سیرِیورپ، (لاہور:امرت دھاراپبلشرز،۱۹۲۵ء)،ص ۱۲۲۔

19 ایضاً،ص ۱۲۳۔

20 پروفیسر محمد سرور۔مرتب، مولانا محمدعلی کے یورپ کے سفر(خود ان کے اپنے قلم سے)،(دہلی: جامعہ ملیہ اسلامیہ،کتاب خانہ پنجاب،۱۹۴۱ء)،ص ۳۵۔

21 قاضی عبدالغفار، نقش ِفرنگ(اقصائے مغرب کی سیر کے دلآویز تاثرات)،(لاہور:دارالاشاعت پنجاب، ۱۹۲۴ء)،ص ۳۹۔

22 نواب مہدی حسن خان،مترجم:مولوی محمد عزیز مرزا،گلگشت ِفرنگ،(آگرہ(بھارت): مطبع مفیدِعام،۱۸۸۹ء)ص ۱۵۱۔

23 سرسیّداحمد خان،مسافرانِ لندن(لاہور: مجلسِ ترقی ادب،س ن)،ص ۱۸۵۔۱۸۶۔

24 ڈاکٹر ثروت علی۔مقدمہ۔سفرنامہ فرنگ، (،نئی دہلی: ترقی اردو بیورو،۱۹۸۴ء)،ص ۱۷۔

25 ڈاکٹر سید عبداللہ،پیش لفظ،حافظ و خیام،مصنف:مقبول بیگ بدخشانی(لاہور: غالب پبلشرز،۱۹۷۹ء)،ص ۸۔

26 انور سدید،اردو ادب میں سفرنامہ،(لاہور: مغربی پاکستان اردو اکیڈمی،۱۹۸۷ء)ص ۷۰۔۷۱۔

27 ظہیر احمد صدیقی،سخنے چند: دیکھ لیا ایران مصنف،افضل علوی(لاہور:الحروف،۱۹۸۲ء)ص۔د۔

28 قطب اسناد ہاشمی،تین مسافر (حیدرآباد: نیشنل فائن پریس،۱۹۶۶ء)ص ۹۔

29 ڈاکٹر ایم ایس ناز۔مرتب،اردو میں فنی تدوین،(اسلام آباد:ادارہ تحقیقاتِ اسلامی،۱۹۹۱ء)،ص ۲۵۔۲۶۔

30 بدر شکیب۔مرتب،دیباچہ، یورپ کے تاثرات،(حیدرآباد دکن :اعظم اسٹیم پریس،۱۳۴۹ف بمطابق ۱۹۴۰ء)ص ۱۱۔

31 ایضاً۔

32 ایضاً۔

33 بدر شکیب،مرتب، یورپ کے تاثرات،(حیدرآباد دکن :اعظم اسٹیم پریس،۱۳۴۹ف بمطابق ۱۹۴۰ء)ص ۱۲۔

34 شان الحق حقی؟

35 پروفیسر سیّد عابد علی عابد،اصولِ انتقادِ ادبیات ،(لاہور:سنگ میل،۲۰۰۶ء)،ص ۷۔

36 عطش درانی،مرتب،پاکستانی اردو کے خدوخال،(اسلام آباد: مقتدرہ قومی زبان،۱۹۹۷ء)ص ۶۳۔

37 ڈاکٹر ایم ایس ناز،اردو میں فنِ تدوین،(اسلام آباد:ادارہ تحقیق،۱۹۹۱ء)ص ۱۴۳۔

38 اعجاز راہی۔مرتب،اردو سیمینار،املا و رموز اوقاف کے مسائل،(اسلام آباد: مقتدرہ قومی زبان، ۱۹۸۵ء)،ص ۱۹۔

39 ڈاکٹر طارق عزیز،اردو رسم الخط اور ٹائپ،(اسلام آباد: مقتدرہ قومی زبان،۱۹۸۷ء)،ص ۲۳۔

40 رشید حسن خان،ابتدائیہ،اردو املا(لاہور: فکشن ہاؤس، 373ء)،ص ۹۔

41رشید حسن خان۔ڈاکٹر عبدالستار صدیقی،"اردو املا"، مشمولہ رسالہ ہندوستانی (لاہور: فکشن ہاؤس، جنوری ۱۹۳۱ء،
۲۰۱۰ء)، ص ۸۲۔۸۳۔

42ان کے صاحب زادے مظہر شکیب نے ان کی تاریخ پیدائش بتاتے ہوئے کہا،
"والد صاحب مجھ سے کہا کرتے تھے کہ مظہر تمھاری پیدائش ۹ جون کو ہوئی، یہ تاریخ میں اس لیے نہیں بھول سکتا کہ میں خود بھی جون
کے مہینے میں پیدا ہوا تھا۔" (ٹیلی فون پر بات: ۱۷ جنوری ۲۰۱۹ء)

43احمد حسین صدیقی،دبستانوں کا دبستان(جلد سوم)،(کراچی: محمد حسین اکیڈمی، ۲۰۱۰ء)، ص ۶۱۔

44مظہر شکیب ۱۷ جنوری۔

45احمد حسین صدیقی،دبستانوں کا دبستان(جلد سوم)،(کراچی: محمد حسین اکیڈمی، ۲۰۱۰ء) ص ۶۱۔

46شاہ بلیغ الدین،تذکرہ عثمانین،(کراچی: اردو اکیڈمی سندھ، ۲۰۰۱ء) ص ۲۵۰۔

47"جامعہ عثمانیہ کی ابتدائی ادبی مجالس" بدر شکیب، مشمولہ "مجلہ عثمانیہ—جامعہ عثمانیہ نمبر، س ن، ص ۸۱۔

48"حیدر آباد کے شاعر (جلد دوم)"، مرتب سلیمان اریب، آندھرا پردیش ساہتیہ اکیڈمی، حیدر آباد دکن (بھارت)، ۱۹۶۲ء۔
ص ۱۹۳۔

49 شاہ بلیغ الدین،تذکرہ عثمانین،(کراچی: اردو اکیڈمی سندھ، ۲۰۰۱ء) ص ۲۵۰۔

50بدر شکیب "جامعہ عثمانیہ کی ابتدائی ادبی مجالس"، مشمولہ مجلہ عثمانیہ – جامعہ عثمانیہ نمبر،(حیدر آباد دکن: س ن)
ص ۸۱۔۸۸۔

51 شاہ بلیغ الدین،تذکرہ عثمانین،(کراچی: اردو اکیڈمی سندھ، ۲۰۰۱ء) ص ۲۵۱۔

52احمد حسین صدیقی،دبستانوں کا دبستان(جلد سوم)،(کراچی: محمد حسین اکیڈمی، ۲۰۱۰ء) ص ۶۱۔

53بدر شکیب، نظر کے دھوکے (حیدر آباد دکن: اعظم اسٹیم پریس، ۱۹۳۷ء) ص ب۔

54 ایضاً، ص سرورق۔

55بدر شکیب، مرتب، یورپ کے تاثرات،(حیدر آباد دکن: اعظم اسٹیم پریس، ۱۳۴۹ف بمطابق ۱۹۴۰ء)۔

56سلیمان اریب، مرتب،حیدر آباد کے شاعر (جلد دوم)،(حیدر آباد دکن (بھارت): آندھرا پردیش ساہتیہ اکیڈمی،
۱۹۶۲ء) ص ۱۹۳۔

57 ایضاً، ص ۱۹۴۔۱۹۷۔

58 ایضاً، ص ۱۹۳۔

59شاہ بلیغ الدین،تذکرہ عثمانین،(کراچی: اردو اکیڈمی سندھ، ۲۰۰۱ء) ص ۲۵۰۔

60سلیمان اریب، مرتب،حیدر آباد کے شاعر (جلد دوم)،(حیدر آباد دکن (بھارت): آندھرا پردیش ساہتیہ
اکیڈمی، ۱۹۶۲ء) ص ۱۹۳۔

61 بدر شکیب "جامعہ عثمانیہ کی ابتدائی ادبی مجالس"، مشمولہ مجلہ عثمانیہ – جامعہ عثمانیہ نمبر،(حیدر آباد دکن: س ن)ص ۸۱۔

62 احمد حسین صدیقی،دبستانوں کا دبستان(جلد سوم)،(کراچی: محمد حسین اکیڈمی،۲۰۱۰ء)ص ۶۱۔

63 بدر شکیب،بیمہء زندگی(کراچی: عثمانیہ اکیڈمی، ۱۹۶۴ء)۔

64 سلیمان اریب، مرتب،حیدرآباد کے شاعر(جلد دوم)،(حیدر آباد دکن(بھارت): آندھرا پردیش ساہتیہ اکیڈمی،۱۹۶۲ء)ص ۱۹۳۔

65 بدر شکیب، اسلام اور جنسیات(کراچی: پاک لٹریچر کمپنی،۱۹۵۳ء)۔

66 بدر شکیب،سرگزشت جامعہ عثمانیہ(مدراس: بزم طلبا قدیم،نظام کالج مدراس یونی ورسٹی،۱۹۷۱ء)۔

67 عبدالرشید عابداور عارف عزیز،"سر گزشتِ جامعہ عثمانیہ"پر تبصرہ،مشمولہ،روزنامہ ایکسپریس،(۲دسمبر،۲۰۱۸ء)

68 ایضاً۔

69 احمد حسین صدیقی،دبستانوں کا دبستان(جلد سوم)،(کراچی: محمد حسین اکیڈمی،۲۰۱۰ء)ص ۶۲۔

70 "Tragedy Of Haiderabad"، میر لائق علی،(کراچی: پاکستان کوآپریٹو سوسائٹی،۱۹۶۲ء)۔

71 مظہر شکیب ۱۷ جنوری ۲۰۱۹ء۔کال۔

72 مظہر شکیب "

73 بدر شکیب "جامعہ عثمانیہ کی ابتدائی ادبی مجالس"، مشمولہ مجلہ عثمانیہ – جامعہ عثمانیہ نمبر،(حیدر آباد دکن: س ن)ص ۸۱۔

74 احمد حسین صدیقی،دبستانوں کا دبستان(جلد سوم)،(کراچی: محمد حسین اکیڈمی،۲۰۱۰ء)ص ۶۲۔

75 حسن الدین احمد،"مردِ مومن"مشمولہ انجمن(حیدر آباد دکن : والا اکیڈمی،۱۹۷۴ء)، ص ۸۳۔

76 ایضاً، ص ۸۴۔

77 ایضاً، ص ۸۹۔

78 ایضاً، ص ۸۴۔۸۵۔

79 ایضاً، ص ۸۳۔۹۵۔

80 سید محی الدین قادری زور،داستان ِادب ِ حیدر آباد، شمارہ ۱۶۳،(حیدر آباد دکن :ادارہ ادبیاتِ اردو،سب رس کتاب گھر، ۱۹۵۱ء)، ص ۱۹۰۔

81 حسن الدین احمد،"مردِ مومن"مشمولہ انجمن(حیدر آباد دکن : والا اکیڈمی،۱۹۷۴ء)، ص ۸۵۔

82 ایضاً، ص ۸۶۔

83 محی الدین قادری زور،داستان ِادب ِ حیدر آباد، ص ۱۹۰

[84] حسن الدین احمد، "مرد مومن" مشمولہ انجمن (حیدرآباد دکن : والا اکیڈمی، ۱۹۷۴ء)، ص ۸۷۔

[85] ایضاً، ص ۸۸۔

[86] ایضاً، ص ۹۴۔۹۵۔

[87] شاہ بلیغ الدین، تذکرہ عثمانین (کراچی: اردو اکیڈمی سندھ، ۲۰۰۱ء)، ص ۱۰۳۱۔۱۰۳۲۔

[88] ایضاً، ص ۱۰۳۳۔

[89] ایضاً، ص ۱۰۳۴۔

[90] محمد حسام الدین خان غوری، تحریک ِعلی گڑھ اور حیدر آباد دکن (کراچی: دارالادب پاکستان، ۱۹۷۹ء)، ص ۹۷۔

[91] ایضاً، ص ۹۷۔

[92] مانک راؤ اور ٹھل راؤ (مؤلف)، بستان ِآصفیہ، حصہ ہفتم (حیدرآباد دکن: چشتی القادری پریس، ۱۹۳۱ء)

[93] اے، ایف، ایم خالد حسین (انگریزی سے اردو ترجمہ: ابو عمار سلیم)، "علامہ عبداللہ یوسف علی" الواقعۃ، شمارہ : ۶۴۔۶۵ (رمضان المبارک و شوال المکرم ۱۴۳۸ھ المطابق جون ۲۰۱۷ء)

[94] ایضاً۔

[95] ای۔جے برل، مرتب، انسائیکلو پیڈیا آف اسلام، جلد اول (لندن، انگلستان :لوزک اینڈ کمپنی، ۱۹۶۰ء)، ص ۵۴۔

[96] اے، ایف، ایم خالد حسین (انگریزی سے اردو ترجمہ: ابو عمار سلیم)، "علامہ عبداللہ یوسف علی" الواقعۃ، شمارہ : ۶۴۔۶۵ (رمضان المبارک و شوال المکرم ۱۴۳۸ھ المطابق جون ۲۰۱۷ء)

[97] آصف جیلانی، سکونِ قلب کے متلاشی - مترجم و مفسر ِقران :عبداللہ یوسف علی (ہم سب بلاگ، ۲ دسمبر، ۲۰۱۸ء)

[98] محمد حسام الدین خان غوری، تحریک ِعلی گڑھ اور حیدر آباد دکن، ص ۹۷۔

[99] *M.A. Sherif searching for Solace* (Kuala Lumpur, Malaysia :Islamic Book Trust , 1994)

[100] ایضاً۔

[101] اے، ایف، ایم خالد حسین (انگریزی سے اردو ترجمہ: ابو عمار سلیم)، "علامہ عبداللہ یوسف علی" الواقعۃ، شمارہ : ۶۴۔۶۵ (رمضان المبارک و شوال المکرم ۱۴۳۸ھ المطابق جون ۲۰۱۷ء)

[102] آصف جیلانی، سکونِ قلب کے متلاشی - مترجم و مفسر ِقران :عبداللہ یوسف علی (ہم سب بلاگ، ۲ دسمبر، ۲۰۱۸ء)

[103] ای۔جے برل، مرتب، انسائیکلو پیڈیا آف اسلام، جلد اول (لندن، انگلستان :لوزک اینڈ کمپنی، ۱۹۶۰ء)، ص ۵۴۔

[104] *M.A. Sherif searching for Solace* (Kuala Lumpur, Malaysia :Islamic Book Trust , 1994)

[105] آصف جیلانی،سکونِ قلب کے متلاشی - مترجم و مفسر ِقران :عبداللہ یوسف علی (ہم سب بلاگ، ۲دسمبر،۲۰۱۸ء)۔

[106] سی، سری کشن میری رخصت- حیدر آباد سے(عکسی کاپی،ڈاکٹر معین الدین عقیل کے ذاتی کتب خانہ کراچی سے، ۱۳۵۴ف)۔

[107] سی، سری کشن میرا استعفا از مالیاتی مشاورتی کمیٹی و کمیٹی تخفیف ِ مصرف(جام باغ،حیدر آباد دکن:دکن لاریورٹ مشین پریس،۱۳۵۳ف(صفحات ۱۴۴)۔

[108] حسن الدین احمد "مردِ بے باک"محفل(حیدر آباد دکن :ولا اکیڈمی،۱۹۸۲ء)،ص ۶۱۔

[109] ایضاً،ص ۵۴۔۶۵۔

[110] اسٹار ڈائرکٹری (الہ آباد،اترپردیش:اسٹارپریس،س۔ن۔)،ص ۵۵۵۔

[111] یورپ کے تاثرات

[112] اسٹار ڈائرکٹری (الہ آباد،اترپردیش:اسٹارپریس،س۔ن۔)،ص ۵۵۵۔

[113] یورپ کے تاثرات

[114] اسٹار ڈائرکٹری (الہ آباد،اترپردیش:اسٹارپریس،س۔ن۔)،ص ۵۵۶۔

[115] یورپ کے تاثرات

[116] حفیظ قتیل۔ مرتبہ،راہ رو اور کارواں (حیدر آباد دکن:ادارہ ادبیاتِ اردو،۱۹۵۵ء)،ص ۷۰۔۷۲۔

[117] زینت ساجدہ۔ مرتبہ،حیدر آباد کے ادیب-انتخاب ِنثر :حصّہ دوم(حیدر آباد دکن:آندھرا پردیش ساہتیہ اکیڈمی، ۱۹۶۲ء)،ص ۳۴۶۔

[118] مولوی سید منظر علی صاحب اشہر،منظر الکرام-حیدر آباد دکن کے مشاہیر کا تذکرہ (حیدر آباد دکن:عماد پریس چھتہ بازار،۱۳۴۵ء)،ص ۲۰۸۔

[119] حفیظ قتیل۔ مرتبہ،راہ رو اور کارواں (حیدر آباد دکن:ادارہ ادبیاتِ اردو،۱۹۵۵ء)،ص ۷۰۔۷۲۔

[120] تمکین کاظمی "حیدر آباد کی چند شخصیتیں"مشمولہ"نقوش- شخصیات نمبر"(لاہور:فرید بک ڈپو،س۔ن۔) ص ۱۳۰۶۔

[121] مولوی سید منظر علی صاحب اشہر،منظر الکرام-حیدر آباد دکن کے مشاہیر کا تذکرہ (حیدر آباد دکن:عماد پریس چھتہ بازار،۱۳۴۵ء)،ص ۲۰۸۔

122مولوی سید منظر علی صاحب۔ مؤلفہ، حیدرآباد کی علمی فیاضیاں-۱۳۱۹ء تا ۱۳۴۹ء(چارمینار، حیدرآباد دکن: مطبوعہ احمدیہ پریس، ۱۳۵۵ف)، ص ۶۲۔

123حفیظ قتیل۔ مرتبہ، راہ رو اور کارواں (حیدرآباد دکن: ادارہ ادبیاتِ اردو، ۱۹۵۵ء)، ص ۷۰۔۷۲۔

124ایضاً، ص ۷۰۔۷۲۔

125مولوی سید منظر علی صاحب اشہر، منظر الکرام-حیدرآباد دکن کے مشاہیر کا تذکرہ (حیدرآباد دکن: عماد پریس چھتہ بازار، ۱۳۴۵ھ)، ص ۲۰۸۔

126زینت ساجدہ۔ مرتبہ، حیدرآباد کے ادیب-انتخابِ نثر :حصّہ دوم(حیدرآباد دکن: آندھرا پردیش ساہتیہ اکیڈمی، ۱۹۶۲ء)، ص ۳۴۶۔

127مولوی سید منظر علی صاحب اشہر، منظر الکرام-حیدرآباد دکن کے مشاہیر کا تذکرہ (حیدرآباد دکن :عماد پریس چھتہ بازار، ۱۳۴۵ھ)، ص ۲۰۸۔

128مولوی محمد عبدالرحمٰن خان "مولوی محمد عبدالرحمٰن خان صاحب"، ماہنامہ سب رس 'اقبال نمبر (خیریت آباد: مکتبہ ابراہیمیہ، س ن)، ص ۱۱۔

129مولوی سید منظر علی صاحب اشہر، منظر الکرام-حیدرآباد دکن کے مشاہیر کا تذکرہ (حیدرآباد دکن: عماد پریس چھتہ بازار، ۱۳۴۵ھ)، ص ۲۰۹۔

130سید محی الدین قادری زور، داستانِ ادبِ حیدرآباد (حیدرآباد دکن: ادارہ ادبیاتِ اردو)، ص ۱۸۹۔

131زینت ساجدہ۔ مرتبہ، حیدرآباد کے ادیب-انتخابِ نثر :حصّہ دوم(حیدرآباد دکن: آندھرا پردیش ساہتیہ اکیڈمی، ۱۹۶۲ء)، ص ۳۴۶۔

132سید محی الدین قادری زور، داستانِ ادبِ حیدرآباد (حیدرآباد دکن: ادارہ ادبیاتِ اردو، سن ندارد)، ص ۱۸۹۔

133ایضاً، ص ۱۸۰۔

134زینت ساجدہ۔ مرتبہ، حیدرآباد کے ادیب-انتخابِ نثر :حصّہ دوم(حیدرآباد دکن: آندھرا پردیش ساہتیہ اکیڈمی، ۱۹۶۲ء)، ص ۳۴۶۔

135مولوی سید منظر علی صاحب اشہر، منظر الکرام-حیدرآباد دکن کے مشاہیر کا تذکرہ (حیدرآباد دکن: عماد پریس چھتہ بازار، ۱۳۴۵ھ)، ص ۲۰۹۔

136سید محی الدین قادری زور، داستانِ ادبِ حیدرآباد (حیدرآباد دکن: ادارہ ادبیاتِ اردو، سن ندارد)، ص ۱۸۰۔

137مولوی سید منظر علی صاحب اشہر، منظر الکرام-حیدرآباد دکن کے مشاہیر کا تذکرہ (حیدرآباد دکن: عماد پریس چھتہ بازار، ۱۳۴۵ھ)، ص ۲۰۹۔

138 تمکین کاظمی "حیدر آباد کی چند شخصیتیں" مشمولہ "نقوش- شخصیات نمبر" (لاہور: فرید بک ڈپو، س-ن)، ص ۱۳۰۷۔

139 "یورپ کے تاثرات" مرتبہ بدر شکیب۔

140 صمصام شیرازی، مؤلف، مشیر عالم ڈائرکٹری - کون کیا ہیں؟، (حیدر آباد دکن: سید الاخبار پریس، س ن)، ص ۲۳۱-۲۳۲۔

141 تمکین کاظمی "حیدر آباد کی چند شخصیتیں" مشمولہ "نقوش- شخصیات نمبر" (لاہور: فرید بک ڈپو، س-ن)، ص ۱۳۰۷۔

142 "یورپ کے تاثرات" مرتبہ بدر شکیب۔

143 صمصام شیرازی، مؤلف، مشیر عالم ڈائرکٹری - کون کیا ہیں؟، (حیدر آباد دکن: سید الاخبار پریس، س ن)، ص ۲۳۱-۲۳۲۔

144 تمکین کاظمی "حیدر آباد کی چند شخصیتیں" مشمولہ "نقوش- شخصیات نمبر" (لاہور: فرید بک ڈپو، س-ن)، ص ۱۳۰۷۔

145 تمکین کاظمی "حیدر آباد کی چند شخصیتیں" مشمولہ "نقوش- شخصیات نمبر" (لاہور: فرید بک ڈپو، س-ن)، ص ۱۳۰۷۔

146 صمصام شیرازی، مؤلف، مشیر عالم ڈائرکٹری - کون کیا ہیں؟، (حیدر آباد دکن: سید الاخبار پریس، س ن)، ص ۴۱۹۔

147 "یورپ کے تاثرات" مرتبہ بدر شکیب۔

148 اسٹار ڈائرکٹری (الہ آباد، اترپردیش: اسٹار پریس، س-ن-)، ص ۵۳۸۔

149 ایضاً، ص ۵۳۸۔

150 صمصام شیرازی، مؤلف، مشیر عالم ڈائرکٹری - کون کیا ہیں؟، (حیدر آباد دکن: سید الاخبار پریس، س ن)، ص ۴۱۹۔

151 www.sports-reference.com/olympics/athletes/ha/s-m-hadi-1.html

152 پردیپ ڈل، سید محمد رین بو ہادی: رنجی ٹرافی میں سنچری بنانے والا پہلا آدمی (اخبار، کرکٹ کنٹری، بتاریخ ۱۴ جون ۲۰۱۶ء)

153 ایضاً۔

154 مولوی سید منظر علی صاحب، حیدر آباد کی علمی فیاضیاں- ۱۹۱۰ء سے ۱۹۳۰ء (حیدر آباد دکن: احمد پریس س ن-)، ص ۷۸۔

155 پردیپ ڈل،سید محمد رین بو ہادی: رنجی ٹرافی میں سنچری بنانے والا پہلا آدمی(اخبار،کرکٹ کنٹری،بتاریخ ۱۴جون۲۰۱۶ء)

156 یورپ کے تاثرات

157 www.sports-reference.com/olympics/athletes/ha/s-m-hadi-1.html

158 ڈاکٹر محمد سلیم، اقبال اورڈاکٹر خلیفہ عبدالحکیم("روزنامہ پاکستان"،۲۵اپریل،۲۰۱۴ء)

159 ڈاکٹر وحید عشرت، ڈاکٹر خلیفہ عبدالحکیم کا عمرانی فلسفہ(پنجاب یونی ورسٹی سینٹرل لائبریری،لاہور، ۱۰۷۶ء، کال نمبر ۹۵۴۷. ۱۸۱ع۲۹۵ع)

160 حمیرہاشمی، محمد اسلم انصاری، ممتاز حسین نعیم، ۱۰۰ عہد ساز شخصیات (لاہور: علم وعرفان پبلشرز،۲۰۰۱ء)، ص۲۲۸۔

161 ایضاً،ص۲۲۸۔

162 ایضاً،ص۲۲۸۔

163 ڈاکٹر محمد سلیم، اقبال اورڈاکٹر خلیفہ عبدالحکیم("روزنامہ پاکستان"،۲۵اپریل،۲۰۱۴ء)

164 ڈاکٹر وحید عشرت، ڈاکٹر خلیفہ عبدالحکیم کا عمرانی فلسفہ(پنجاب یونی ورسٹی سینٹرل لائبریری،لاہور، ۱۰۷۶ء، کال نمبر ۹۵۴۷. ۱۸۱ع۲۹۵ع)

165 ڈاکٹر محمد سلیم، اقبال اورڈاکٹر خلیفہ عبدالحکیم("روزنامہ پاکستان"،۲۵اپریل،۲۰۱۴ء)

166 ایضاً۔

167 ڈاکٹر وحید عشرت، ڈاکٹر خلیفہ عبدالحکیم کا عمرانی فلسفہ(پنجاب یونی ورسٹی سینٹرل لائبریری،لاہور، ۱۰۷۶ء، کال نمبر ۹۵۴۷. ۱۸۱ع۲۹۵ع)

168 ڈاکٹر محمد سلیم، اقبال اورڈاکٹر خلیفہ عبدالحکیم("روزنامہ پاکستان"،۲۵اپریل،۲۰۱۴ء)

169 صمصام شیرازی،مؤلف،مشیر عالم ڈائرکٹری - کون کیا ہیں؟ ،(حیدرآباددکن: سیدالاخبارپریس،س ن)، ص۲۸۰۔۲۸۲۔

170 جاوید شاہ آبادی، **حیدرآباد کی چند اہم خواتین ناول نگار** (قومی کونسل برائے فروغِ اُردو زبان: ۳۰ اکتوبر، ۲۰۱۷ء)

171 مولوی نصیرالدین ہاشمی۔مقدمہ،میرے موسومہ خطاز بیگم صغریٰ ہمایوں مرزا(چھتہ بازار،حیدرآباددکن: تاج پریس،۱۹۵۱ء)ص۱۴۔۱۵۔

172 سلطانہ بخش،قیام پاکستان سے قبل، خواتین کے سفرنامے(روزنامہ "دنیا"،۱۴جون،۲۰۱۷ء)

173 نجم النساء،آزادی کے بعد حیدر آباد کی نثر نگار خواتین (بزم اردو بلاگ)

[174]۔https://ur.wikipedia.org/wiki/اکبر علی خان(سیاستدان)

[175]۔شاہ بلیغ الدین،تذکرہ عثمانین (کراچی:اردو اکیڈمی سندھ،۲۰۰۱ء)۔

[176]حسن الدین احمد، انجمن،(حیدرآباد دکن :ولا اکیڈمی،۱۹۷۴ء)،ص۱۳۷۔

[177]شاہ بلیغ الدین،تذکرہ عثمانین (کراچی:اردو اکیڈمی سندھ،۲۰۰۱ء)۔

[178]حسن الدین احمد، انجمن،(حیدرآباد دکن :ولا اکیڈمی،۱۹۷۴ء)،ص۱۳۷۔

[179]ایضاً،ص۱۳۷۔

[180]طیّب انصاری، یاران۔ شہر- ادبی خاکوں کا دوسرا مجموعہ،(خیریت آباد،حیدرآباد دکن :ادارہ ادبیاتِ اردو،۱۹۷۷ء)،ص۲۷۔

[181]حسن الدین احمد، انجمن،(حیدرآباد دکن :ولا اکیڈمی،۱۹۷۴ء)،ص۱۳۷۔

[182]ایضاً،ص۱۳۶۔

[183]طیّب انصاری، یاران۔ شہر- ادبی خاکوں کا دوسرا مجموعہ،(خیریت آباد،حیدرآباد دکن :ادارہ ادبیاتِ اردو،۱۹۷۷ء)،ص۲۶۔

[184]شاہ بلیغ الدین،تذکرہ عثمانین (کراچی:اردو اکیڈمی سندھ،۲۰۰۱ء)۔

[185]طیّب انصاری، یاران۔ شہر- ادبی خاکوں کا دوسرا مجموعہ،(خیریت آباد،حیدرآباد دکن :ادارہ ادبیاتِ اردو،۱۹۷۷ء)،ص۲۹۔

[186]ایضاً،ص۲۸۔

[187]حسن الدین احمد، انجمن،(حیدرآباد دکن :ولا اکیڈمی،۱۹۷۴ء)،ص۱۳۵۔

[188]طیّب انصاری، یاران۔ شہر- ادبی خاکوں کا دوسرا مجموعہ،(خیریت آباد،حیدرآباد دکن :ادارہ ادبیاتِ اردو،۱۹۷۷ء)،ص۲۸۔

[189]ایضاً،ص ۲۶۔

[190] https://ur.wikipedia.org/wiki/اکبر علی خان(سیاستدان)

[191]طیّب انصاری، یاران۔ شہر- ادبی خاکوں کا دوسرا مجموعہ،(خیریت آباد،حیدرآباد دکن :ادارہ ادبیاتِ اردو،۱۹۷۷ء)،ص۲۵-۲۶۔

[192]حسن الدین احمد، انجمن،(حیدرآباد دکن :ولا اکیڈمی،۱۹۷۴ء)،ص۱۳۹۔

[193]ایضاً،ص۱۳۹۔

[194]طیّب انصاری، یاران۔ شہر- ادبی خاکوں کا دوسرا مجموعہ،(خیریت آباد،حیدرآباد دکن :ادارہ ادبیاتِ اردو،۱۹۷۷ء)،ص۲۸۔

195 شاہ بلیغ الدین، تذکرہ عثمانین (کراچی: اردو اکیڈمی سندھ، ۲۰۰۱ء)، ص ۷۰۶۔

196 ایضاً، ص ۷۰۷۔

197 ایضاً، ص ۷۰۹۔

198 ایضاً، ص ۷۰۸۔

199 تمکین کاظمی "حیدر آباد کی چند شخصیتیں" مشمولہ "نقوش- شخصیات نمبر" (لاہور: فرید بک ڈپو، س-ن-) ص ۱۳۰۹۔

200 شاہ بلیغ الدین، تذکرہ عثمانین (کراچی: اردو اکیڈمی سندھ، ۲۰۰۱ء)، ص ۹۲۲۔

201 تمکین کاظمی "حیدر آباد کی چند شخصیتیں" مشمولہ "نقوش- شخصیات نمبر" (لاہور: فرید بک ڈپو، س-ن-)، ص ۱۳۰۹۔

202 شاہ بلیغ الدین، تذکرہ عثمانین (کراچی: اردو اکیڈمی سندھ، ۲۰۰۱ء)، ص ۹۲۱۔

203 ایضاً، ص ۹۲۰۔

204 ایضاً، ص ۹۲۱۔

205 ایضاً، ص ۹۲۲۔

206 ایضاً، ص ۹۲۲۔

207 ایضاً، ص ۹۲۲۔

208 The Encyclopaedia Of Indian Literature, Volume Five - Mohan Lal - sahitya academy-(Sasay To Zorgot) صفحہ 4642۔

209 زینت ساجدہ، مرتبہ حیدر آباد کے ادیب-انتخاب نثر، (آندھرا پردیش: ساہتیہ اکیڈمی، ۱۹۵۸ء)، ص ۴۷۔

210 محمد حسام الدین غوری، تحریک علی گڑھ اور حیدر آباد دکن (کراچی: دارالادب پاکستان، ۱۹۷۹ء)، ص ۱۱۳۔

211 "وفیاتِ معارف" ص ۳۹۲۔

212 زینت ساجدہ، مرتبہ حیدر آباد کے ادیب-انتخاب نثر، (آندھرا پردیش: ساہتیہ اکیڈمی، ۱۹۵۸ء)، ص ۴۷۔

213 محمد حسام الدین غوری، تحریک علی گڑھ اور حیدر آباد دکن (کراچی: دارالادب پاکستان، ۱۹۷۹ء)، ص ۱۱۳۔

214 ڈاکٹر یوسف حسین خان، یادوں کی دُنیا (اعظم گڑھ: دارالمصنفین، ۱۹۶۷ء)، ص ۴۰۳-۴۰۴۔

215 محمد حسام الدین غوری، تحریک علی گڑھ اور حیدر آباد دکن (کراچی: دارالادب پاکستان، ۱۹۷۹ء)، ص ۱۱۴۔

216 از شاہدہ نواز، آزادی کے بعد اردو خود نوشت (تعارفی جائزہ)، مشمولہ، آن لائن بلاگ قومی کونسل برائے فروغِ اردو زبان۔ ۱۴ اکتوبر ۲۰۱۷ء۔

[217] سید صباح الدین عبدالرحمان "نام ورانِ علی گڑھ - ڈاکٹر یوسف حسین خان" مشمولہ سہ ماہی فکر و نظر۔ جنوری ۱۹۸۷ء تا جولائی ۱۹۸۸ء۔ ص ۴۵۱۔۴۵۴۔

[218] تمکین کاظمی "حیدر آباد کی چند شخصیتیں" مشمولہ "نقوش- شخصیات نمبر "(لاہور: فرید بک ڈپو، س۔ن۔) ص ۱۳۱۰ء- ۱۳۱۱ء۔

[219] ایضاً، ص ۱۳۱۱ء۔

[220] ڈاکٹر محمد سہیل شفیق، وفیاتِ معارف (کراچی : قرطاس، ۲۰۱۳ء) ص ۳۹۲۔۳۹۷۔

[221] شاہ بلیغ الدین، تذکرہ عثمانین (کراچی: اردو اکیڈمی سندھ، ۲۰۰۱ء)، ص ۱۵۔

[222] صمصام شیرازی، مؤلف، مشیرِ عالم ڈائرکٹری - کون کیا ہیں؟، (حیدر آباد دکن: سیدالاخبار پریس، س ن)، ص ۲۰۷

[223] شاہ بلیغ الدین، تذکرہ عثمانین (کراچی: اردو اکیڈمی سندھ، ۲۰۰۱ء)، ص ۱۵۔

[224] شاہ بلیغ الدین، تذکرہ عثمانین (کراچی: اردو اکیڈمی سندھ، ۲۰۰۱ء)، ص ۱۵۔

[225] ایضاً، ص ۱۵۔۱۶۔

[226] حفیظ قتیل۔ مرتبہ، راہ رو اور کارواں (حیدر آباد دکن: ادارہ ادبیاتِ اردو، ۱۹۵۵ء)، ص ۳۶۔

[227] زینت ساجدہ، مرتبہ حیدر آباد کے ادیب- انتخابِ نثر، (آندھرا پردیش: ساہتیہ اکیڈمی، ۱۹۵۸ء)، ص ۱۷۔

[228] شاہ بلیغ الدین، تذکرہ عثمانین (کراچی: اردو اکیڈمی سندھ، ۲۰۰۱ء)، ص ۱۹۔

[229] ایضاً، ص ۱۶۔۱۷۔

[230] ایضاً، ص ۱۶۔

[231] صمصام شیرازی، مؤلف، مشیرِ عالم ڈائرکٹری - کون کیا ہیں؟، (حیدر آباد دکن: سیدالاخبار پریس، س ن)، ص ۲۰۸۔

[232] شاہ بلیغ الدین، تذکرہ عثمانین (کراچی: اردو اکیڈمی سندھ، ۲۰۰۱ء)، ص ۱۴۔

[233] ایضاً، ص ۲۰۔

[234] ایضاً، ص ۲۰۔

[235] سیّد محی الدین قادری زورؔ، داستانِ ادبِ حیدر آباد (حیدر آباد دکن: ادارہ ادبیاتِ اردو، سب رس کتاب گھر، ۱۹۵۱ء) ص ۱۹۶۔

[236] ڈاکٹر صفی الدین صدیقی، "ڈاکٹر رضی الدین صدیقی مرحوم" مشمولہ مجلہ عثمانیہ، سہ ماہی "(کراچی : جنوری تا مارچ، جلد ۴، شمارہ ۱) ص ۵۱۔۵۲۔

[237] بہادر یار جنگ اکیڈمی، سراج الدولہ روڈ، بہادر آباد، کراچی Bahaduryarjangacademy.com/dr-raziuddin-siddiqui/

[238] شاہ بلیغ الدین، تذکرہ عثمانین (کراچی: اردو اکیڈمی سندھ، ۲۰۰۱ء)، ص ۲۲۔

[239] ایضاً، ص ۲۳۔

[240] ایضاً، ص ۲۲۔

[241] ایضاً، ص ۱۷۔

[242] ضرار صلاح الدین، "ڈاکٹر رضی الدین صدیقی کی میراث کو ہم نے بھلا دیا"، نسٹ سائنس بلاگ، ۰۶ مئی ۲۰۱۵ء

[243] محی الدین قادری زور، محمد ناظم علی۔ روزنامہ "سیاست" (حیدر آباد دکن: ۳۱ اکتوبر ۲۰۱۴ء)

[244] ایضاً۔

[245] ایضاً۔

[246] خواجہ حسن نظامی، "محی الدین قادری زور"، روزنامہ تعمیر (حیدر آباد دکن: ۲۶ فروری، ۲۰۱۳ء۔

[247] ایضاً

[248] "دکنی ادب اور ڈاکٹر زور" از ڈاکٹر محمد ابرار الباقی، جہان اردو (حیدر آباد دکن: ۱۵ اپریل۔ ۲۰۱۵ء)

[249] ایضاً۔

[250] ڈاکٹر ضیا الدین انصاری، "زورؔ صاحب کی تصانیف کا تعارف" مشمولہ محی الدین قادری زور ؔ، مرتب خلیق انجم ۱۹۸۹ء، ص ۱۷۴۔

[251] ڈاکٹر خلیق انجم "زورؔ ایک ماہر لسانیات" مشمولہ سب رس کراچی، زورؔ نمبر جنوری ۱۹۷۹ء، ص ۸۹۔

[252] ڈاکٹر عبادت بریلوی "اردو تنقید کا ارتقا (علی گڑھ: ایجوکیشنل بک ہاؤس، ۱۹۸۶ء) ص ۳۲۰۔

[253] ڈاکٹر زورؔ "روح تنقید (حیدر آباد دکن: شمس الاسلام پریس، ۱۹۲۵ء، طبع اول) ص ۷۔

[254] پروفیسر سیدہ جعفر ڈاکٹر زور ؔ (نئی دہلی: ساہتیہ اکادمی، ۱۹۹۰ء) ص ۱۵۵۔

[255] ڈاکٹر موہن سنگھ دیوانہ "محقق اعظم"، مشمولہ سب رس، زورؔ نمبر، مدیر: خواجہ حمید الدین شاہد (کراچی: جلد 6، دسمبر جنوری ۱۹۷۸ء-۱۹۷۹ء) ص ۹۲-۹۳۔

[256] سید حرمت الاکرام "ڈاکٹر زورؔ زورؔ شخصی اور ادبی زندگی" مشمولہ سب رس، زورؔ نمبر، مدیر: خواجہ حمید الدین شاہد (کراچی: جلد ۶، دسمبر جنوری ۱۹۷۸ء-۱۹۷۹ء) ص ۱۰۴۔

[257] پروفیسر انور الدین "ڈاکٹر زورؔ کی تواریخ ادب و تذکرے" مشمولہ سب رس زورؔ نمبر (نومبر، دسمبر ۱۹۹۲ء) ص ۳۵۔

[258] مولوی عبد الحق اردو سہ ماہی اورنگ آباد (سنہ اشاعت جولائی ۱۹۳۷ء)۔

[259] پروفیسر سیدہ جعفر، ڈاکٹر زورؔ (نئی دہلی: ساہتیہ اکادمی سنہ اشاعت ۱۹۹۰ء) ص ۱۵۶۔

260 ایضاً، ص ۱۵۷۔

261 ڈاکٹر محمد ابرار الباقی، "دکنی ادب اور ڈاکٹر زور" جہان اردو (حیدر آباد دکن: ۱۵ اپریل۔ ۲۰۱۵ء)

262 صمصام شیرازی، مؤلف، مشیر عالم ڈائرکٹری ۔ کون کیا ہیں؟ ،(حیدر آباد دکن: سید الاخبار پریس، س ن) ،ص ۱۱۷

263 عزیز رضوی، چند یاداشتیں، "تعارف"،(کراچی: بہادر یار جنگ اکیڈمی، ۱۹۸۶ء)، ص ۱۲۔

264 حبیب الرحمان، چند یاداشتیں، (کراچی: بہادر یار جنگ اکیڈمی، ۱۹۸۶ء)، ص فلیپ۔

265 عزیز رضوی، چند یاداشتیں، "تعارف"،(کراچی: بہادر یار جنگ اکیڈمی، ۱۹۸۶ء)، ص ۱۲۔

266 حبیب الرحمان، چند یاداشتیں، (کراچی: بہادر یار جنگ اکیڈمی، ۱۹۸۶ء)، ص فلیپ۔

267 عزیز رضوی، چند یاداشتیں، "تعارف"،(کراچی: بہادر یار جنگ اکیڈمی، ۱۹۸۶ء)، ص ۱۲۔

268 حبیب الرحمان، چند یاداشتیں، (کراچی: بہادر یار جنگ اکیڈمی، ۱۹۸۶ء)، ص فلیپ۔

269 صمصام شیرازی، مؤلف، مشیر عالم ڈائرکٹری ۔ کون کیا ہیں؟ ،(حیدر آباد دکن: سید الاخبار پریس، س ن)، ص ۱۱۷۔

270 حبیب الرحمان، چند یاداشتیں، (کراچی: بہادر یار جنگ اکیڈمی، ۱۹۸۶ء)، ص فلیپ

271 ایضاً۔

272 صمصام شیرازی، مؤلف، مشیر عالم ڈائرکٹری ۔ کون کیا ہیں؟ ،(حیدر آباد دکن: سید الاخبار پریس، س ن)، ص ۱۱۸۔

273 حبیب الرحمان، چند یاداشتیں، (کراچی: بہادر یار جنگ اکیڈمی، ۱۹۸۶ء)، ص فلیپ۔

274 عزیز رضوی، چند یاداشتیں، "تعارف"،(کراچی: بہادر یار جنگ اکیڈمی، ۱۹۸۶ء)، ص ۱۳۔

275 حبیب الرحمان، چند یاداشتیں، (کراچی: بہادر یار جنگ اکیڈمی، ۱۹۸۶ء)، ص فلیپ۔

276 عزیز رضوی، چند یاداشتیں، "تعارف"،(کراچی: بہادر یار جنگ اکیڈمی، ۱۹۸۶ء)، ص ۱۳۔

277 ڈاکٹر زینت ساجدہ، چند یاداشتیں، مضمون "بابا- مولوی حبیب الرحمٰن صاحب"،(کراچی: بہادر یار جنگ اکیڈمی، ۱۹۸۶ء) ، ص ۱۵۔

278 طیب انصاری، یاران شہر، مضمون "پروفیسر حبیب الرحمٰن -ایک نام، ایک علامت "(حیدر آباد دکن، ادارہ ادبیات اردو، ۱۹۷۷ء)، ص ۲۱۔

279 عزیز رضوی، چند یاداشتیں، "تعارف"،(کراچی: بہادر یار جنگ اکیڈمی، ۱۹۸۶ء)، ص ۱۴۔

280 حمیرہاشمی، محمد اسلم انصاری، ممتاز حسین نعیم، ۱۰۰ عہد ساز شخصیات (لاہور: علم و عرفان پبلشرز، ۲۰۰۱ء) ص ۲۲۸۔

281 "ڈاکٹر محمد حمیداللہ (اک طائرانہ نظر میں)" از ادارہ، مشمولہ "مجلہ عثمانیہ' سہ ماہی، (کراچی :اکتوبر تا دسمبر ۲۰۰۳ء) ص ۱۶۔

282 ایضاً، ص ۱۶۔

283 پروفیسر خورشید احمد، "ڈاکٹر محمد حمیداللہ (ترکش مارا خدنگ آخریں)"، مشمولہ مجلہ عثمانیہ' سہ ماہی، (کراچی: اکتوبر تا دسمبر ۲۰۰۳ء) ص ۱۹۔

284 ایضاً، ص ۱۹۔

285 عظیم ترمذي (رکن مجلس التحقیق الاسلامی) محدث فورم، **"ڈاکٹر محمد حمیداللہ مرحوم۔ایک عہدآفرین شخصیت"**، ۱۶ اگست ۲۰۱۲ء۔

286 زینت ساجدہ "ڈاکٹر حمیداللہ"، مشمولہ "حیدر آباد کے ادیب (انتخابِ نثر ،حصہ دوم)، (حیدر آباد دکن: آندھرا پردیش، ساہتیہ اکیڈمی) ص ۴۰۶۔

287 ڈاکٹر رؤف پاریکھ "ڈاکٹر حمیداللہ: خاموش سپاہی اور نابغہ روزگار" روزنامہ ڈان، ۱۴ دسمبر ۲۰۰۹ء۔

288 شاہ بلیغ الدین، تذکرہ عثمانین (کراچی: اردو اکیڈمی سندھ، ۲۰۰۱ء)، ص ۲۲۷۔

289 ایضاً، ص ۲۲۴۔

290 ایضاً، ص ۲۳۱۔

291 ایضاً، ص ۲۳۱۔

292 ایضاً، ص ۲۳۲۔

293 حسن الدین احمد، انجمن: حصہ دوم، (دہلی (بھارت): ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، ۲۰۱۲ء)، ص ۱۱۴۔

294 ایضاً، ص ۱۳۴۔

295 پروفیسر خورشید احمد، "ڈاکٹر محمد حمیداللہ (ترکش مارا خدنگ آخریں)"، مشمولہ مجلہ عثمانیہ' سہ ماہی، (کراچی: اکتوبر تا دسمبر ۲۰۰۳ء) ص ۲۰۔

296 عبدالرشید "ڈاکٹر محمد حمیداللہ مرحوم۔۔۔ایک عہد آفرین شخصیت" محدث فورم، ۲ مارچ ۲۰۱۱ء۔

297 شاہ بلیغ الدین، تذکرہ عثمانین (کراچی: اردو اکیڈمی سندھ، ۲۰۰۱ء)، ص ۲۲۸۔

298 ایضاً، ص ۲۲۹۔

299 پروفیسر خورشید احمد، "ڈاکٹر محمد حمیداللہ (ترکش مارا خدنگ آخریں)"، مشمولہ مجلہ عثمانیہ' سہ ماہی، (کراچی: اکتوبر تا دسمبر ۲۰۰۳ء) ص ۲۰۔

300 عبدالرشید "ڈاکٹر محمد حمیداللہ مرحوم۔۔۔ایک عہدآفرین شخصیت" محدث فورم، ۲ مارچ ۲۰۱۱ء۔

301 https://www.iiu.edu.pk/?page_id=195

302شاہ بلیغ الدین،تذکرہ عثمانین (کراچی: اردو اکیڈمی سندھ،۲۰۰۱ء)، ص ۲۳۵۔

303ایضاً، ص ۲۳۰۔

304عبدالرشید "ڈاکٹر محمد حمید اللہ مرحوم۔۔۔ایک عہد آفرین شخصیت" محدث فورم، ۲ مارچ ۲۰۱۱ء۔

305پروفیسر خورشید احمد، "ڈاکٹر محمد حمید اللہ (ترکش ماراخدنگ آخریں)"، مشمولہ مجلہ عثمانیہ سہ ماہی، (کراچی: اکتوبر تا دسمبر ۲۰۰۳ء) ص ۲۰۔

306ڈاکٹر محمد سہیل شفیق "حمید اللہ، محمد، ڈاکٹر" ص، مارچ 2003ء، مشمولہ "وفیاتِ معارف" (کراچی: قرطاس پبلشرز، ۲۰۱۳ء) ص ۶۵۹

حواشی برائے متن

307 تقسیمِ برِصغیر سے قبل، برطانوی راج میں۔

308 سیاست دان کے لیے استعمال ہونے والا یہ لفظ "سیّاس" اب رائج نہیں۔

309ایسٹ انڈیا کمپنی (East India Company) دسمبر ۱۶۰۰ء میں جزائر شرق الہند میں کاروباری مواقع کی تلاش کے لیے قائم ہوئی لیکن بعد میں اس کمپنی نے ہندوستان میں برطانوی راج کی راہ ہموار کی۔

310 ۱۸۸۷ء میں برطانیہ کی ملکہ وکٹوریا (Alexandrina Victoria) (۲۴ مئی ۱۸۱۹ء-۲۲ جنوری ۱۹۰۱ء) کی تاج پوشی (۲۰ جون ۱۸۳۷ء) کے پچاس سال پورے ہونے کی خوشی میں خصوصی تقریبات کا اہتمام ہوا اور اس سلسلے میں ہندوستان میں بھی "گولڈن جوبلی" منائی گئی۔

311۔ *School of Oriental and African Studies*, University of London۔ اس کا قیام ۱۹۱۶ء میں عمل میں آیا، یہ یونی ورسٹی دنیا میں اپنی نوعیت کی چوتھی بڑی یونی ورسٹی ہے۔

https://www.soas.ac.uk

312۔مالیات کے محکمے کا سربراہ

313۔اسلامیہ کالج لاہور (Islamia College Lahore) کی تین شاخیں ہیں، یہ جامعہ پنجاب سے منسلک ہیں۔ یہ کالج "انجمن حمایت الاسلام" کے تحت ۱۸۹۲ء میں قائم ہوا۔

314۔ سرسید احمد خان نے ۲۷ دسمبر، ۱۸۸۶ء کو محمڈن ایجوکیشنل کانفرنس کی بنیاد رکھی اس کانفرنس کا بنیادی مقصد مسلمانوں کی تعلیمی ترقی کے لیے اقدامات کرنا تھا۔ اس کا پہلا اجلاس علی گڑھ میں ہوا۔ کانفرنس نے تعلیم کی اشاعت کے لیے مختلف مقامات پر جلسے

کیے۔ محمڈن ایجوکیشنل کانفرنس کا سالانہ جلسہ مختلف شہروں میں ہوتا تھا جہاں مقامی مسلمانوں سے مل کر تعلیمی ترقی کے اقدامات پر غور کیا جاتا تھا اور مسلمانوں کے تجارتی، تعلیمی، صنعتی اور زراعتی مسائل پر غور کیا جاتا تھا۔

315۔ تحریکِ خلافت ۱۹۱۹ء میں شروع ہو کر ۱۹۲۲ء میں ختم ہو گئی تھی اور اس کی ناکامی کے بعد ۱۹۲۵ء میں یہ کانفرنس کی گئی۔

316۔ قرآن مجید کا عربی متن اس کا انگریزی ترجمہ اور انگریزی تفسیر ("The Holy Qur'an: Text, translation and Commentary") ۱۹۳۴ء سے ۱۹۳۸ء کے دوران چھپ کر مکمل ہوا۔ ۱۹۳۹ء میں اس کا نظرِ ثانی شدہ انڈیشن چھپا۔ اس کو محققانہ انداز کی وجہ سے بہت مقبولیت حاصل ہوئی۔

317 انتالیس لاکھ تیس ہزار (۳،۹۳۰،۰۰۰) مربع میل۔

318 ۵۰ ممالک، جن میں سے ۵ محدود طور پر تسلیم شدہ ہیں۔

319 مصنف نے "سوئیت" ہی لکھا ہے لیکن اس کے بارے میں کوئی حتمی معلومات نہیں ملی۔ ممکن ہے کہ اُس زمانے میں "سوویت" کے لیے یہ لفظ مستعمل ہو۔

320 (Standard English) انگریزی زبان جو انگریزی بولنے والے ملکوں میں عوامی سطح پر اور رسمی طور پر بولی جاتی ہے۔ مختلف علاقوں میں اس زبان کا الگ الگ لہجہ، قواعد، ذخیرۂ الفاظ، تلفظ اور املا کے اصول ہیں۔

321 اسکاٹ لینڈ (Scotland) یو۔کے۔ کا ایک رکن ملک ہے اور برطانوی جزیرے کے شمالی ایک تہائی حصّے پر اور یورپ کے شمال مغرب میں واقع ہے۔ "ایڈنبرا" اس کا دارالحکومت ہے۔

322 (Northern Ireland) یو۔کے۔ کے شمال مشرقی جزائر پر مشتمل وہ علاقہ ہے جو ابھی تک برطانیہ کے قبضے میں ہے۔ طویل عرصے سے یہاں آزادی کی تحریک جاری ہے۔ اس کا رقبہ ۵،۳۴۵ مربع میل ہے۔

323 ہندومت میں چار بنیادی ذاتیں برہمن، کھشتری، ویش اور شودر ہیں جن کی مزید تیس ہزار سے زائد اقسام یا طبقات ہیں۔

324 Trade Associations

325 National Councils

326 (House of Lords) انگلستان کی پارلیمنٹ کا ایوانِ اعلیٰ جس کے اراکین خطاب یافتہ شرفا ہوتے ہیں۔

327 انگلستان میں طویل عرصے سے قائم ایسے نجی تعلیمی ادارے ہیں جو عوام کے بچوں میں سے قابل بچوں کو منتخب کر کے داخلہ دیتے ہیں، یہ خود مختار تعلیمی ادارے ہیں جو طالب علموں سے فیس بھی لیتے ہیں۔

328 (Eton College) لڑکوں کی تعلیم کے لیے خود مختار رہائشی اسکول ہے جو انگلستان کے شہر برک شائر میں واقع ہے جسے ۱۴۴۰ء میں بادشاہ ہنری ششم نے قائم کیا تھا۔

329 (Harrow School) ہارو، لندن، انگلینڈ میں لڑکوں کے لیے ایک خود مختار رہائشی اسکول ہے۔ یہ اسکول ۱۵۷۲ء میں جیل لیون (John Lyon) نے ایلزبیتھ اوّل (Elizabeth I) کے ایک رائل چارٹر کے تحت قائم کیا تھا۔ ہیرو "ہیڈ ماسٹرز اور ہیڈ مسٹریس کانفرنس" میں چوتھا سب سے مہنگا بورڈنگ اسکول

330 (Winchester College) ونچسٹر، ہیمپ شائر میں واقع برٹش پبلک اسکول کی روایت میں لڑکوں کے لیے ایک خود مختار رہائشی اسکول ہے۔ یہ آج سے چھے سو سال پہلے وجود میں آیا اور یہ بلا شبہ سب سے پرانا اسکول ہے۔

331 (University of Oxford) یہ یونی ورسٹی بارہویں صدی عیسوی میں قائم ہوئی۔

332 (University of Cambridge) یہ یونی ورسٹی ۱۲۰۹ء میں قائم ہوئی۔ ۱۲۳۱ء میں کنگ ہنری سوم (King HenryIII) کی طرف سے اسے ایک رائل چارٹر عطا ہوا۔ کیمبرج 'انگریزی بولنے والی دنیا کی دوسری سب سے قدیم یونی ورسٹی ہے اور دنیا کی چوتھی قدیم ترین یونی ورسٹی ہے۔

333 (Ruskin Hall College, Oxford) مصنف، نقاد اور فن کار جان رسکن (۱۸۱۹ء- ۱۹۰۰ء) کے نام پر اس کالج کا نام رکھا گیا ہے، یہ ۱۸۹۹ء میں مزدور طبقے کی تعلیم کے لیے قائم کیا گیا تھا۔

334 (Tory) برطانیہ کی قدامت پسند سیاسی جماعت جو ملک میں شاہی نظامِ حکومت کی حامی تھی۔ یہ "انگلیکن چرچ" کے معاون تھے اور جائیداد کے معاملات میں دلچسپی رکھتے تھے۔

335 (Whig) برطانیہ کی آزاد خیال (لبرل) سیاسی جماعت تھی۔ ان کی دلچسپی تجارتی معاملات میں تھی اور یہ "پروٹسٹنٹ" نظریات کے حامل تھے۔

۱۷۰۷ء سے دونوں جماعتیں کسی نہ کسی صورت میں برسرِ اقتدار رہیں۔ ٹوری کا اثر ۱۸۳۴ء میں ختم ہوا جب کی وِگ ۱۸۵۷ء تک چناؤ جیتی۔

336 (Parliment) پارلیمان یا قانون ساز ایوان، ایک ایوان ہوتا ہے جہاں قانون سازی کی جاتی ہے، پارلیمان جمہوری ممالک میں ہوتے ہیں۔ اس کا لفظی مطلب ہے بحث و مباحثے کی جگہ۔ پارلیمان میں ملکی مسائل پہ بحث ہوتی ہے اور پھر یہاں سے مسائل کے حل کے لیے اقدامات اٹھائے جاتے ہیں اور قوانین بنائے جاتے ہیں۔

337 ہری جن یعنی بھگوان کی اولاد، اچھوتوں کو یہ نام گاندھی جی نے دیا تھا۔ انیسویں صدی میں ایک سماجی کارکن نے اچھوتوں کے لیے "دلت" لفظ کو بطور اصطلاح متعارف کروایا تھا۔ یہ لوگ ہندوؤں کے ذات پات نظام میں مذکور چار ذاتوں برہمن، چھتری، ویش اور شودر کے بعد آتے ہیں، اس لیے عملًا یہ ذات پات کے نظام سے باہر ہیں۔ بھارت میں ان لوگوں کو سماجی تحفظ دینے کے لیے قانون سازی بھی کی گئی ہے اور دلّت ذات میں سے اب تک ایک صدر بھی بن چکا ہے جن کا نام کے۔ آر۔ نارائن تھا۔

338 (Barrister) بیرسٹر' قانون، اخلاقیات، اور عدالت کے عمل اور طریقہ کار میں اضافی تربیت (یعنی بار۔ ایٹ لاء، وکالت کی تعلیم کے بعد ایک سال کی مدّت کا عملی تجربہ) حاصل کرتا ہے۔

339 چوکھا

340 (Butler) بڑے گھر میں گھریلو کارکن یا ملازم، خاص طور پر باورچی کو کہتے ہیں۔

341 چکی، مشین، کارخانہ

342 ایک چھوٹی پتیوں، زرد پھولوں اور لمبے لمبے سخت کانٹوں والا شاخ دار درخت، جس کی چھال سے چمڑے کی دباغت (چمڑا پکانے، صاف کرنے اور رنگنے کا کام) ہوتی ہے اور کتھا بھی بناتے ہیں نیز اس کا گوند مختلف امراض کے علاج میں استعمال کیا جاتا ہے۔ کیکر۔

343 حَدَّثَنَا عَبْدُاللّٰہِ بْنُ مَسْلَمَۃَ، قَالَ: أَخْبَرَنَا مَالِکٌ عَنْ یَحْیَی بْنِ سَعِیدٍ، عَنْ مُحَمَّدِ بْنِ إِبْرَاھِیمَ، عَنْ عَلْقَمَۃَ بْنِ وَقَّاصٍ، عَنْ عُمَرَ، أَنَّ رَسُولَ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ قَالَ: "الأَعْمَالُ بِالنِّیَّۃِ۔"

حدیث کا اردو ترجمہ:

ہم سے عبداللہ بن مسلمہ نے بیان کیا، کہا ہم کو امام مالک رحمہ اللہ نے خبر دی، انھوں نے یحییٰ بن سعید سے، انھوں نے محمد بن ابراہیم سے، انھوں نے علقمہ بن وقاص سے، انھوں نے عمر رضی اللہ عنہ سے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: عمل نیت ہی سے صحیح ہوتے ہیں (یا نیت ہی کے مطابق ان کا بدلا ملتا ہے)۔(" صحیح بخاری" جلد اول: کتاب الإیمان (ایمان کا بیان): حدیث ۵۴)

344 ایک جوڑا یعنی ایک شادی کرنا۔ ایک بیوی اور ایک میاں کا گھر بسانا اور دوسری شادی نہ کرنا۔

345 فقہ ہنود۔ ہندوؤں کے قانون کی کتاب۔

346 ریت، رسم، قاعدہ، قانون، ضابطہ

347 بیوی

348 شوہر

349 تمام، کل، پورا، میزان کل

350 (ism-) یہ لاحقہ ہے جو مختلف لفظوں کے ساتھ استعمال کیا جاتا ہے اور اکثر کسی فلسفہ، نظریات، مذاہب، سماجی تحریکوں اور طرزِ عمل کی وضاحت کرنے کے لیے بولا جاتا ہے۔

351 Private Practice

352 (Materialistic) مادہ پرستی ایک ذاتی رویّہ ہے جس میں مادی سامان اور روپیہ پیسہ حاصل کرنے کو اہمیت دی جاتی ہے۔ یہ اصطلاح کسی فرد کی شخصیت یا کسی معاشرے کی وضاحت کرنے کے لیے منفی معنوں میں استعمال کی جاتی ہے۔

353 محافظِ شہر۔ پولیس کا افسر جس کے تحت شہر کا بڑا تھانہ ہو۔

354 (HydePark) ہائیڈ پارک، مرکزی لندن میں واقع اوّل درجہ کا حامل ایک اہم پارک ہے جو وہاں کے چار شاہی پارکوں میں سب سے بڑا ہے۔

355 Cantt Council

356 Permanent Secretary

357 زنان خانہ۔ امرا کی بیگمات کے رہنے کی جگہ۔ لونڈیوں کے رہنے کا مکان۔

358 فائدہ، نفع۔ کسی عورت سے معیّن مدّت کے لیے نکاح کرنا (مذہبِ امامیہ میں جائز ہے)۔

359 (Vienna) ویانہ، آسٹریا کا سب سے بڑا شہر اور دارالحکومت ہے۔

360 (Pamphlets) غیر مجلّد کتابچہ۔ کبھی کبھی ایک بڑے صفحے کے دونوں طرف لکھ کر اسے کتابی صورت میں تہہ کر دیا جاتا ہے یا یوں ہی کسی صفحے پر بھی چھاپ دیا جاتا ہے۔اس میں موضوع کی قید نہیں۔

361 تثلیث

362 Administrator

363 (Secretary) سیکریٹری

364 (Chairman) چیئرمین

365 (Geographically) جغرافیائی

366 (Opium) کچے خشخاش (پوست) کے ڈوڈوں سے بیرونی چھلکا کاٹنے کے بعد شیرہ نچوڑ کر خشک کر لیا جاتا ہے۔ الکلیوں کا آمیزہ ہوتا ہے جن میں مارفین، کوڈین اور نارکوٹین ہیں۔معیاری ادویات میں شامل کرنے کے علاوہ زیادہ تر نشہ کے لیے استعمال کیا جاتا ہے۔

367 (SpongeBath) کسی گیلے کپڑے سے پورے جسم کو پونچھ لینا۔نہانے کا یہ طریقہ عموماً مریضوں کو نہلانے کے لیے استعمال کیا جاتا ہے تاہم پانی کی کمی والے یا زیادہ سرد علاقوں کے لوگ بھی اس طریقے سے نہا لیتے ہیں۔

368 (FirstWorldWar,1914-1918) جنگِ عظیم اوّل جو ۱۹۱۴ء سے ۱۹۱۸ء کے دوران ہوئی۔اس میں ایک طرف برطانیہ(British) ، روس(Russia) اور فرانس(France) کی سلطنتیں تھیں جب کہ دوسری طرف جرمنی(Germany)، آسٹریا - مجارستان(austro-hungarian empire) اور دولتِ عثمانیہ Ottoman Turkish کے ممالک تھے۔

369 "Independent Newspaper India"

370 "New Orient Magazine New York"۔ ۱۹۲۴ء سے ۱۹۲۷ء۔

371 (Washington Naval Conference)۔ واشنگٹن بحریہ کانفرنس جو کہ امریکی صدر وارن جی۔ہارڈنگ کی ایما پر ۱۲ نومبر ۱۹۲۱ء سے ۶ فروری ۱۹۲۲ء تک واشنگٹن، ڈی سی میں منعقد ہوئی۔اس میں نو ملکوں کے نمائندے شریک ہوئے۔اس کا مقصد مغربی بحرالکاہل اور شمالی ایشیا کے پانیوں میں جاپانی بحریہ کی توسیع کو روکنا تھا۔

372 (United States of America, U.S.A.)

373 برِصغیر کئی قدیم ترین تہذیبوں کا گھر ہے، زمانہ قبل از تاریخ سے ہی یہاں انسانی آبادی کے سُراغ ملتے ہیں جس میں "پتھر کے دور" میں وادیٔ نرمادا (دو لاکھ سے پانچ لاکھ سال قبل)، دریائے سُون کی وادی، بھیرانا، ہریانہ، مہر گڑھ اور مالوا کے آثار (۱۸۰۰ قبل از مسیح) اسی دور میں شمار ہوتے ہیں، اس دور کے بعد پہلا شہر وادیٔ سندھ کی تہذیب (۱۳۰۰ سے ۳۳۱۰ قبل از مسیح) میں ملتا ہے جس کو "کانسی کا دور" بھی کہتے ہیں، عراق میں "میسوپوٹیما" اور "مصر کی قدیم تہذیب" اس کی ہم عصر ہے۔اس کے بعد سے آج تک ہر دور میں یہاں آبادی رہی اور اب یہ خطہ دنیا بھر میں سب سے زیادہ آبادی کا شمار ہوتا ہے۔

---

[374] آج سے صرف پانچ سو سال پہلے تک ساری مشرقی دنیا یعنی براعظم یورپ، افریقا اور ایشیا 'مغربی نصف کرہ کے ممالک امریکا، کینیڈا اور دیگر ممالک کے وجود سے بالکل بے خبر تھی۔ پندرہویں صدی کے اواخر میں یورپی مہم جوئی کا آغاز ہوا تو یکے بعد دیگرے مختلف ممالک اور خطے دریافت ہوتے چلے گئے۔ ۱۲ اکتوبر ۱۴۹۲ء کو کولمبس امریکا کے مشرقی ساحل کے قریب بہاماز پہنچا۔ ۱۷۷۶ء میں رچرڈ ہنری لی نے ان متحدہ نوآبادیات کی آزادی اور خود مختاری کے لیے قرارداد پیش کی، اس سال جولائی میں یہ قرارداد منظور ہوئی اور ۴ جولائی کو اعلان خود مختاری (DeclarationOfIndependence) پر دستخط ہو گئے، مارچ ۱۷۸۲ء میں برطانوی کابینہ نے امریکا کی خود مختاری کو تسلیم کر لیا۔ ۱۷۸۹ء میں جارج واشنگٹن امریکا کے پہلے صدر منتخب ہو گئے۔

[375] اس کا لفظی مطلب ہے "میرا باپ بادشاہ تھا"۔ ایسے موقع پر بولتے ہیں جب کوئی شخص خود تو کسی خاص حیثیّت کا مالک نہ ہو اور اپنے باپ دادا کی بڑائی بیان کرے۔

[376] برِصغیر میں مرکزی حکومت نہ ہونے کی وجہ سے ایک پرچم بھی نہ بن سکا۔ تاریخ میں پہلا جھنڈا مغلیہ سلطنت کا ملتا ہے اس کے بعد برطانوی ہند کا بھی جھنڈا تھا۔ اس کے بعد ۱۹۰۴ء، ۱۹۰۶ء، ۱۹۰۷ء اور ۱۹۱۷ء میں یکے بعد دیگرے کئی جھنڈے بنائے گئے، ۱۹۲۱ء میں گاندھی نے ایک جھنڈے کا ڈیزائن پیش کیا جو مسلمانوں نے رد کر دیا۔ ۱۹۳۱ء میں انڈین کانگریس نے ایک جھنڈا بنایا جو بھارت کے قومی پرچم کا پیش خیمہ ثابت ہوا اور پاکستان کا قومی پرچم آل انڈیا مسلم لیگ کے جھنڈے کے ڈیزائن میں معمولی تبدیلی کے بعد منظور کر لیا گیا۔

[377] ہسپانیہ کے رہنے والے (Spanish)

[378] بیسویں صدی کے شروع میں برِصغیر کے بڑے بڑے شہروں میں رسمی تعلیم یافتہ مردوں کی تعداد ۱۲ فی صد سے زیادہ نہیں تھی جب کی اسی دور میں ایک فی صد سے بھی کم عورتیں پڑھی لکھی تھیں۔

[379] اٹھارہویں صدی کے اواخر میں امریکہ آزاد ہوا تو وہاں نسل پرستی عروج پر تھی، غلاموں کی تجارت باقاعدہ کاروبار تھا۔ ۱۸۶۵ء کی خانہ جنگی میں جب وفاق نے ملک کا نظم و نسق سنبھال لیا تو ملک سے غلاموں کی تجارت ختم ہوئی۔ بیسویں صدی میں تعلیم اور معاشی ترقی کے ساتھ ہی ساتھ عوام میں شعور بیدار ہوا اور نسلی تعصبات کے لیے افریقی امریکیوں نے کوششیں تیز کر دیں اس حوالے سے مارٹن لوتھر کنگ جونیئر نمایاں ہیں۔ اس کے نتیجے میں ۱۹۵۰ء کی دہائی میں حقوق کی تحریک کے بعد کالوں کو ووٹ کا حق بھی مل گیا۔ ۲۰۰۸ء میں ایک کالا امریکی صدر، باراک حسین اوباما، یکے بعد دیگرے دو بار منتخب ہوا اور آٹھ سال تک صدارت کی مدّت مکمل کی۔

[380] (Greek Civilization) یونان کی تہذیب تقریباً نو سو سال قبل از مسیح کے دور کی ہے۔

[381] (Egyption Civilization) قدیم مصر کی تہذیب تقریباً اکتیس سو سال قبل از مسیح کے دور کی ہے۔

[382] (Iranian Civilization) ایران کی تہذیب تقریباً چھے سو پچیس سال قبل از مسیح کے دور کی ہے۔

[383] (Roman Empire) سلطنتِ روما سو سال قبل از مسیح سے چار سو عیسوی کے عرصے پر محیط ہے۔

[384] (Modern Era of Western Sosiety) سترہویں صدی عیسوی کے اواخر سے اس دور کا آغاز ہوتا ہے۔

385 ۶۶۱ء میں خلافتِ راشدہ کے بعد اموی دَور کا آغاز ہوا جو عباسی دَور کے آغاز کے ساتھ ہی ۷۵۰ء میں ختم ہوا۔ ۹۴۵ء میں منگولوں کی یورش سے یہ دور بھی ختم ہوا۔ ۱۲۵۰ء سے ۱۵۱۷ء تک مملوکوں کی باری آئی اس دَور میں مغرب میں نشاۃ ثانیہ کا آغاز ہوا۔ مملوکوں کے بعد عثمانیوں نے اسلامی سلطنت کو صحیح معنوں میں عروج بخشا، یہ دَور ۱۵۱۷ء سے ۱۹۲۳ء تک پھیلا ہوا ہے۔ اس کو اسلامی حکومت کا دورِ عروج بھی کہا جاتا ہے۔

(European Renaissance-1300-1600)

386 ماہرین ہندوستان میں تہذیب کی عمر پانچ لاکھ سال قبل تک شمار کرتے ہیں جو کہ زمانہ قبل از تاریخ ہے۔ اس لحاظ سے ہندوستان تمام قدیم تہذیبوں (یونان، مصر، عراق وغیرہ) سے پرانا ہے۔ یہاں شہری تمدّن (وادیٔ سندھ کی تہذیب) کی تاریخ کو ۱۳۰۰ سال قبل از مسیح سے دیکھا جاسکتا ہے۔

387 مصری تہذیب اکتیس سو پچاس قبل از مسیح سے شروع ہوئی۔

388 (Byzantine Empire- ۱۳۲۴ء۔ ۱۴۵۳ء) بیزنطانی مشرقی روم کی سلطنت جو چوتھی صدی عیسوی میں قائم ہوئی جب سلطنتِ روم دو حصوں میں تقسیم ہوگئی تھی۔

389 یونانی تہذیب تقریباً نو سو سال قبل از مسیح سے شروع ہوئی۔

390 رومی تہذیب ۲۷ قبل از مسیح سے ۳۹۵ء سے شروع ہوئی۔

391 (Ancient Carthage) کارتھیج ۸۱۴ قبل از مسیح سے ۱۴۶ ق م۔ موجودہ تیونس شہر کے قریب اس کے آثار ملے ہیں۔

392 (Penny) پینی ایک سکّہ ہوتا ہے، یہ بہت سے ملکوں میں استعمال ہونے والی کرنسی کی اکائی ہے۔ برطانوی پینی پونڈ اسٹرلنگ (Pound Sterling) کا سوّاں حصّہ ہے یعنی ایک پونڈ میں سَو پینیاں ہوتی ہیں۔

393 (Driver) ڈرائیور

394 (Tubercuiosis{TB}) ٹی بی یا تپ دق ایک خاص قسم کے بیکٹیریا سے پھیلنے والی چھوت کی بیماری ہے۔ اس میں عموماً پھیپھڑے متاثر ہوتے ہیں ساتھ کھانسی، بخار اور وزن کا گرنا اہم علامات ہیں، مناسب علاج نہ ہونے کی صورت میں جان بھی جاسکتی ہے۔

395 تپ دق کو "سِل" بھی کہا جاتا ہے۔

396 Information Department

397 Economics

398 Public Affairs

399 International Law

400 Law History

401 اٹھارہویں اور انیسویں صدی میں جرمنی ساڑھے تین سو کے قریب ریاستوں میں بٹا ہوا تھا۔ ۱۸۰۶ء میں نپولین (NepolianBonaparte) کی فوج نے جرمنی پر قبضہ کر لیا تو پہلی بار یہاں ایک حکومت قائم ہوئی۔ ۱۸۴۸ء میں جرمنی میں انقلابی تبدیلیاں آئیں، وفاق کی بنیاد پڑی اور صنعتی ترقی ہونے لگی۔ اوتو فون بسمارک (OttoVonBismarck) نے جدید جرمنی کی بنیاد رکھی تو معاشرتی ارتقا بھی ہونے لگا، ۱۸۷۱ء میں اس نے پہلی منتخب پارلیمنٹ بنائی اور معاشرتی قانون سازی کی راہ ہموار ہوئی۔

402 (London School of Economics-LSE) معاشیات اسکول لندن جو کہ ۱۸۹۵ء میں قائم ہوا۔

403 (Graduate) سند یافتہ، گریجویٹ

404 (AcademicChair) دنیا کی سب یونی ورسٹیوں میں تعلیمی پروگراموں کی تدریس کے علاوہ کسی خاص خدمت یا مہارت کے فروغ کے لیے یہ ایک خاص عہدہ ہے جس پر اُس میدان کے ماہرین کو تعینات کیا جاتا ہے جس میں وہ "کرسی" قائم کی جاتی ہے۔

405 ۱۹۲۰ء سے ۱۹۲۴ء کے درمیان برطانیہ میں درج ذیل وزرائے اعظم رہے:

ڈیوڈ لائڈ جارج (David Lloyd George)، آزاد خیال جماعت (Liberal Party)۔ دسمبر ۱۹۱۸ء سے اکتوبر ۱۹۲۲ء تک۔

اینڈریو بونر لا (Andrew Bonar Law)، قدامت پسند جماعت (Conservative Party)۔ اکتوبر ۱۹۲۲ء سے مئی ۱۹۲۳ء تک۔

سٹینلے بالڈون (Stanley Baldwin)، قدامت پسند جماعت۔ مئی ۱۹۲۳ء سے جنوری ۱۹۲۴ء تک۔

رمسای میک ڈونلڈ (Ramsay MacDonald)، مزدور جماعت (Labour (minority) Party)۔ جنوری ۱۹۲۴ء سے نومبر ۱۹۲۴ء تک۔

سٹینلے بالڈون، قدامت پسند جماعت (دوسری بار)۔ نومبر ۱۹۲۴ء سے جون ۱۹۲۹ء تک۔

406 موٹر کار (Car) ۱۶۷۲ء میں چین میں بھاپ سے چلنے والی گاڑی ایجاد ہوئی پھر ۱۷۶۹ء میں خود کار میکانکی گاڑی پیرس میں تیار ہوئی۔ بھاپ سے چلنے والے انجن کے لیے بہت تجربات ہوئے لیکن ۱۸۹۲ء میں جرمن انجینئر روڈولف ڈیزل (RudolfDiesel) نے پہلا ڈیزل انجن تیار کر کے نئی تاریخ رقم کی۔ ۱۹۰۳ء میں ہنری فورڈ نے کار بنانے کی فیکٹری لگائی جس سے بڑے پیمانے پر کم قیمت میں کاریں بننا شروع ہوئیں۔

407۔ ہوائی جہاز (AirCraft) ۱۹۰۲ء میں رائٹ برادران (WrightBrothers) نے جدید طیارہ ایجاد کیا۔ ان بھائیوں سے پہلے ہوابازی، غبارے کے ذریعے اڑنا، بلند مینار یا پہاڑ سے چھلانگ لگانا، ہوا پر تیرنا یا گلائیڈ کرنا اور طیارہ سازی کی طویل روایت نے ان کو اس کامیابی کا اہل بنایا۔ پہلا مسافر طیارہ ۱۹۰۸ء میں لیون ڈیلگ رینج (Ferdinand Léon Delagrange) نے اڑایا۔ فرانسیسی ایوی ایٹر، رابرٹ ایسنولٹ۔پیلیٹری (Robert Albert Charles Esnault-Pelterie) نے ۱۹۰۸ء میں جہازوں کا "فلائٹ کنٹرول" نظام بنایا۔ پہلی تجارتی پرواز یکم جنوری ۱۹۱۴ء کو ہوئی،

جسے سینٹ پیٹرز برگ سے ٹامپا پہنچنے میں ۲۳ منٹ لگے۔ یہ پرواز دن میں دو بار، ہفتہ میں چھ دن تقریباً پانچ ماہ تک جاری رہی۔۱۹۲۸ء کے بعد سے براعظموں کے درمیان سمندر پار پروازیں جاری ہو چکی تھیں۔اب تو یہ سفر خلا میں پروازوں کی صورت میں نئی دنیا میں داخل ہو چکا ہے۔

408۔ مشین گن (MachineGun) نہایت مہلک، خودکار ہتھیار ہے جو ایک منٹ میں مسلسل تین سو گولیاں چلا سکتا ہے۔ مشین گن اٹھارہویں صدی کے وسط میں امریکہ میں بنائی گئی تھی اور تب سے اب تک اس میں بہت سی تبدیلیاں لائی جا چکی ہیں اور اس کی کارکردگی کو مزید بہتر بنایا گیا ہے۔اس کو گاڑیوں اور ٹینکوں پر بھی نصب کیا جاسکتا ہے جس سے اس کی افادیت میں مزید اضافہ ہو جاتا ہے۔اس کی گولی بعض اوقات ۲ کلومیٹر سے بھی زیادہ دُور کا نشانہ لے سکتی ہے۔

409۔ وائر لیس (Wireless) یا وائر لیس کمیونی کیشن کوئی سے دو دُور دراز کے مقامات کے درمیان معلومات کے تبادلے کو کہتے ہیں۔یہ مقامات آپس میں تار کے ذریعے جڑے ہوئے نہیں ہوتے۔ان کا درمیانی فاصلہ چند میٹر سے لاکھوں کلومیٹر دُور بھی ہو سکتا ہے۔عام طور پر اس رابطے میں ریڈیو کی لہریں (Radio Waves) استعمال کی جاتی ہیں۔"وائر لیس" کی اصطلاح سب سے پہلے ۱۸۸۰ء میں ملتی ہے۔موبائل فون، کمپیوٹر کی بورڈ، ہیڈ فون اور سٹیلائیٹ ٹی وی وغیرہ میں یہی ٹیکنالوجی استعمال کی گئی ہے۔

410۔ ریڈیو (Radio) ایک ایسا آلہ ہے جو ریڈیائی لہروں کے ذریعے آواز کو نشر کرتا ہے۔یہ الیکٹرانک میڈیا کی ایک قسم ہے،اس کو تفریح کے ساتھ ساتھ اشتہار بازی، حالاتِ حاضرہ، پروپیگنڈے اور جنگی مقاصد کے لیے بھی استعمال کیا جاتا ہے۔گاڑیوں میں بھی اس کو سنا جاتا ہے۔اس کی نشریات کے لیے ریڈیو اسٹیشن میں مائیکروفون پر حاصل کیے گئے صوتی اشاروں کو ٹرانسمیٹر کے ذریعے ہوا میں چھوڑا جاتا ہے جہاں سے یہ اشارے ریڈیو سیٹ کے ایریل کی مدد سے اس کے اسپیکر پر سنائی دیتے ہیں۔اس سارے مرحلے میں وقت کا عنصر حائل نہیں ہوتا اور نشریات براہِ راست بھی سُنی جاسکتی ہیں۔

411 ۔ بیسویں صدی کی ابتدا میں ہندوستان میں بچوں کے لیے مٹی، تانبا اور لکڑی کے گھگو گھوڑے، بیل، اونٹ، ہاتھی اور دیگر جانوروں کے علاوہ کپڑے اور روئی کی گڑیاں اور مورتیاں ملتی ہیں۔ سرکنڈوں اور پتوں سے بھی کھلونے بنائے جاتے تھے۔کپڑے سے بنی ہوئی گیندیں، لکڑی کے بنے ہوئے گلی ڈنڈے، کاغذ کی پتنگ وغیرہ لڑکوں میں پسند کیے جانے والے کھلونے تھے۔

412۔ ڈیوس کپ کا خیال ہاورڈ یونی ورسٹی کے چار ٹینس کھلاڑیوں کو ۱۸۹۹ء میں آیا۔ان چاروں میں سے ایک کھلاڑی کا نام "ڈیوس" تھا جس کی امریکہ کے ساتھ برطانوی ٹیم کے میچ کی خواہش نے اس کو اپنی جیب سے خریدے گئے اس کپ کے لیے ایک ٹورنامنٹ ترتیب دینے پر مائل کیا۔ اس ٹورنامنٹ کے لیے ابتدا میں "انٹرنیشنل لان ٹینس چیلنج (International Lawn Tennis Challenge)" کا نام تجویز کیا گیا تھا جو بعد میں "ڈیوس کپ" کے نام سے مشہور ہوا۔اس کا پہلا ٹورنامنٹ ۱۹۰۰ء میں ہوا جس میں امریکہ کی ٹیم نے برطانیہ کی ٹیم کو ۳۔۰ سے شکست دی۔ ۱۹۲۱ء میں ہندوستان نے پہلی بار ڈیوس کپ میں شرکت کی۔ ایس۔ایم ہادی نے اس کپ کے لیے ۱۹۲۴ء/۱۹۲۵ء میں اپنے ملک کی نمائندگی کی۔ ایس۔ایم۔ہادی نے ٹینس کے علاوہ کرکٹ میں بھی اپنے ملک کی نمائندگی کی۔اس کے علاوہ آپ ہاکی، فٹ بال، ٹیبل ٹینس، شطرنج اور پولو کے بھی بہترین کھلاڑی تھے۔ان سات کھیلوں میں ان کی صلاحیتوں کو دیکھتے ہوئے ان کو "رین بو ہادی (RainBow Hadi)" کا بھی خطاب ملا۔

413- Honorary Accountant

414- سر مہاراج کمار وجینگرم(Maharaj Kumar of Vizianagram)آپ ۱۹۰۵ء میں اتر پردیش میں پیدا ہوئے۔ کرکٹ اور ٹینس کھلنے کا شوق تھا، ہندوستان کی ٹیم نے ۱۹۳۶ء میں برطانیہ کا دورہ کیا تو آپ اس کے کپتان تھے۔ ۱۹۶۵ء میں اتر پردیش میں وفات پائی۔

415- ومبلڈن(Wimbledon) لندن میں ایک جگہ کا نام ہے۔ ومبلڈن کی چیمپئن شپ (The Wimbledon Championships) جس کو مختصراً "وِمبلڈن" بھی کہتے ہیں ٹینس کا سب سے پرانا اور مشہور ٹورنامنٹ ہے جس کا آغاز ۱۸۷۷ء میں ہوا۔ چاروں "گرینڈ سلام(GrandSlam)" ٹورنامنٹوں میں سے یہ واحد ٹورنامنٹ ہے جو ابھی تک "گراس کورٹ(Grass Court)" پر کھیلا جاتا ہے۔

416 ۔ "حسین ساگر" حیدر آباد دکن میں دل کی شکل کی ایک جھیل ہے جس کو شاہ ابراہیم قلی قطب شاہ (۱۵۱۸ء-۱۵۸۰ء۔ دکن کی ریاست گولکنڈہ کا بادشاہ) نے ایک صوفی بزرگ حسین شاہ ولی کے نام پر تعمیر کیا۔ دریائے موصی اس میں گرتا ہے۔ یہ حیدر آباد دکن کو اسکندر آباد سے جدا کرتی ہے۔

417- 'برار' کا مطلب ہے نبھاؤ، صلح صفائی، موافقت، سازگاری۔

418- راما سوامی نے ۱۸۹۶ء سے ۱۹۹۰ء ٹینس کھلاڑی ۱۹۳۲ء۔

419- خلیفہ عبدالحکیم (۱۸۹۶ء- ۱۹۵۹ء) نے مولانا روم کے فلسفہ پر اپنا مقالہ تحریر کیا تھا جو بعد میں "حکمتِ رومی" کے نام سے ادارہ ثقافتِ اسلامیہ، لاہور نے کتابی صورت میں شائع کیا۔

420 نشاۃ جدیدہ یعنی دوسری جنگِ عظیم کے بعد یورپ اور اس کے اتحادی ملکوں نے فتح کے بعد دیگر ملکوں پر تسلط جمایا اور اس کے نتیجے میں اپنے ملکوں میں ترقی اور خوش حالی کا نیا دور دیکھا۔

421 ۔خذ ما صفا ودع ما کدر" عربی کی ضرب المثل ہے جس کا اردو ترجمہ ہے:

"جو اچھا لگے وہ قبول کرلو اور جو برا لگے وہ چھوڑ دو"

422- رسالہ زیب النسا

423 ۔ ویمبلی نمائش (Exhibition Wimbles) یہ سلطنت برطانیہ کی نمائش (Empire British Exhibition) بھی کہلاتی ہے۔ یہ ۲۳ اپریل ۱۹۲۴ء سے ۳۱ اکتوبر ۱۹۲۵ء تک برطانیہ کے شہر ویمبلی میں جاری رہی۔ اس میں ۵۸ برطانوی مقبوضات میں سے ۵۶ نے حصّہ لیا (گیمبیا اور جبرالٹر نے شرکت نہیں کی)۔ اس نمائش کا مقصد برطانیہ کا اپنے مقبوضہ ممالک کے ساتھ تجارتی اور سیاسی تعلقات کو بہتر بنانا شامل تھا۔ ہر کالونی نے اس نمائش میں اپنی علاقائی ثقافت اور معاشرت کی جھلکیاں دکھائیں۔ اس کا افتتاح جارج پنجم (۱۸۶۵ء- ۱۹۳۶ء) نے کیا۔ اس نمائش میں مجموعی طور پر تقریباً دو کروڑ ستر لاکھ افراد نے شرکت کی اس کے باوجود برطانیہ کو اپنے اخراجات کی نسبت بہت کم آمدن ہونے کی وجہ سے بھاری نقصان اٹھانا پڑا۔

424- عثمانیہ یونی ورسٹی کے گریجویٹ طالب علموں کی انجمن

(Association of Graduates of Ottoman University)

425۔ مجلسِ بلدیہ (Municipal Corporation)

426۔ انگار کمیٹی (Initiative committee)

427۔ برائٹن (Brighton) برطانیہ کا ایک ساحلی شہر ہے جو لندن سے 75 کلو میٹر کے فاصلے پر واقع ہے۔ تاریخی لحاظ سے یہ بہت قدیم شہر ہے، بعض ماہرین نے اس کو کانسی کے دَور کا شہر بھی مانا ہے۔ یہ برطانیہ کا سب سے مشہور ثقافتی اور ساحلی سیاحتی مقام ہے جہاں ہر سال دنیا بھر سے لاکھوں سیاح آتے ہیں۔ اسے "برطانیہ کا سب سے خوش گوار رہائشی مقام (The Happiest Place to Live in U.K.)" کا خطاب بھی مل چکا ہے۔

428۔ شہنشاہی نمائش

429۔ عیسائی عقیدے کے مطابق حضرت عیسیٰؑ کے دوبارہ جی اٹھنے کے دن کو "ایسٹر" کا نام دیا جاتا ہے اور اس دن عید منائی جاتی ہے۔

430۔ اسٹرا فورڈ آن ایون

431۔ دریائے چرول

432۔ پینل سسٹم

433۔ برار کے مطالبہ اور لارڈ ریڈنگ

434۔ "Damn Indian" ڈام کے کوئی متعین معانی تو نہیں لیکن یہ لفظ کسی ناپسندیدہ صورتِ حال میں بے ساختہ بولا جاتا ہے۔ ڈام انڈین سے یہاں ہندوستانیوں کے لیے اظہارِ ناپسندیدگی کیا گیا ہے۔

435۔ کرایڈن (Croydon) برطانیہ کے دار لحکومت لندن کے جنوب میں ایک بڑا سا قصبہ ہے۔ لندن کے مرکزی حصے کے بعد بڑے کمرشل علاقے میں اس کا شمار ہوتا ہے۔

436۔ شرعِ شریف سے مراد اسلامی قوانین ہیں۔

437۔ "اُصولِ فقہ" کا اصطلاحی مطلب ہے کہ اُن احکام شرعیہ جن کا ذریعہ اجتہاد ہے یعنی فقہ، اس کے قاعدوں کا علم۔ یہ ایسا علم ہے جو فقہ کی اجمالی دلیلوں کے حالات، ان دلیلوں سے فائدہ حاصل کرنے کے طریقوں اور فائدہ حاصل کرنے والے کے حالات کے بارے میں بحث کرتا ہے۔

438۔ شلنگ (Shilling) ایک سکہ ہے جو دنیا کے کئی ممالک میں برتا جاتا ہے اور برطانیہ میں ۱۵۵۰ء سے استعمال کیا جا رہا ہے۔

439۔ لارڈ برکن ہیڈ (F.E.Smith, 1st Earl of Birkenhead) برطانوی قدامت پسند جماعت سے تعلق رکھنے والے سیاست دان اور وکیل بھی تھے۔ ۱۸۷۲ء میں پیدا ہوئے اور ۱۹۳۰ء میں وفات پائی۔ آپ کئی عہدوں پر فائز رہے مثلاً لارڈ چانسلر (Lord Chancellor)، اٹارنی جنرل (Attorney-General)، وکیل جنرل (Solicitor-General) اس کے علاوہ آپ نومبر ۱۹۲۴ء سے اکتوبر ۱۹۲۸ء تک ہندوستان کے سیکرٹری (Secretary of State of India) بھی رہے۔

440۔ دیوانی معائدہ (CivilAgreement) گھریلو معاملات، شادی بیاہ، طلاق، لین دین، ملازمت، جائداد، کرایہ، خرید و فروخت وغیرہ کے ضمن میں ہونے والے معائدے ہیں۔

441۔ سنسکرت (Sanskrit) قدیم ہندوستان کی زبان ہے جس کا سراغ قریباً تین ہزار سال پہلے کے زمانے میں بھی ملتا ہے۔ پندرہ سو سے چھے سو قبل از مسیح میں یہ "وِدک سنسکرت" اور اس کے بعد زمانہ حال تک "کلاسیکی سنسکرت" کے نام سے جانی جاتی ہے۔ یہ "ہند یورپی" زبانوں کی "ہندایرانی" شاخ کا "ہند آریائی" خاندان ہے۔ ہندوؤں کی مذہبی کتاب "رگ وید" اسی زبان میں ہے لہٰذا ہندو اس کو مقدّس خیال کرتے ہیں (بدھ اور جین بھی سنسکرت کو احترام کی نگاہ سے دیکھتے ہیں)۔

442 ۔ اوتو وان بوہ تلنگ (OttoVonBohtlingk:1815-1904) جرمنی سے تعلق رکھنے والا ماہرِ ہند (Indologist) اور سنسکرت کا محقق تھا۔ اس کا سب سے بڑا کام سنسکرت کی لغت کی تدوین ہے جو سات جلدوں میں' تیئیس سال کے عرصے میں مکمل ہوئی اور جرمنی کے شہر سینٹ پیٹرز برگ (Saint Petersburg) سے ۱۸۵۳ء-۱۸۷۵ء پھر بعد ازاں اضافے کے ساتھ ۱۸۷۹ء- ۱۸۸۹ء کے دوران شائع ہوئی۔ اس کام میں آپ کے دو دوستوں نے بھی مدد کی، جن میں سے ایک جرمنی کے ماہرِ ہند اور ویدک فلسفے کے ماہر روڈلف وان روت (Rudolf Von Roth: 1821- 1895) اور دوسرے، تاریخ دان' البرٹ فریڈرِک وے بر (Albrecht Weber:1825-1901) تھے۔

443 شوفر (Chauffer) ڈرائیور کو کہتے ہیں۔

444 ٹرام (Tram) پٹڑی پر چلنے والی بڑی سی بس کو کہتے ہیں۔

445 رابندر ناتھ ٹیگور (۱۸٦۱ء-۱۹۴۱ء) بنگالی زبان کے نوبل انعام یافتہ شاعر، فلسفی، افسانہ نگار اور ناول نگار ہیں۔ ٹیگور کو بنگالی کا شیکسپیئر بھی کہا جاتا ہے۔

446 گاندھی کی قومی تحریک جو "سودیشی تحریک" بھی کہلاتی ہے، ہندوستان کی انگریزوں سے آزادی حاصل کرنے کی تحریک کا ہی ایک حصّہ تھی۔ یہ سودیشی تحریک ۱۹۱۸ء سے شروع ہوئی اور آزادی (۱۹۴۷ء) تک کسی نہ کسی شکل میں جاری رہی۔ اس کا مقصد ایک طرف تو انگریز حکومت کو معاشی طور پر نقصان پہنچانا تھا، دوسری طرف مقامی صنعتوں کو فروغ دے کر لوگوں کی معاشی حالت کو بہتر بنانا تھا۔ سودیشی تحریک کی حکمتِ عملی یہ تھی کہ انگریزی مصنوعات کا مقاطعہ کیا جائے اور کوئی باہر کی چیز نہ خریدی جائے، گاندھی جو خود باہر سے پڑھ کر آئے تھے اور انگریزی طرز کا لباس پہنتے تھے، آپ نے بھی وہ لباس ترک کیا اور خود کھڈی لگائی، کپڑا بُنا اور اُسی کپڑے کی تہبند باندھتے تھے۔ اس تحریک کو کامیابی بھی ملی اور مقامی صنعتوں کی حالت بہتر ہوئی۔

447۔ محی الدین قادری زورؔ (۱۹۰۵ء-۱۹٦۲ء) نے اپنی پوری زندگی میں اردو ادب کے مختلف موضوعات پر اکسٹھ (٦۱) کتابیں یادگار چھوڑی ہیں۔ کئی مضامین بھی لکھے۔ ان کے شعری کمالات 'حبِ ترنگ'، 'جواہرِ سخن' اور 'گلزارِ ابراہیم' کی صورت میں نظر آتے ہیں۔

"روحِ تنقید" (۱۹۲۵ء)

"تین شاعر" (۱۹۲٦ء)

"ہندوستانی لسانیات" (۱۹۳۲ء)

"نواب عزیز یار جنگ بہادر عزیز"(۱۹۳۵ء)

"مرقعِ سخن"(۱۹۳۵ء)

"مرقعِ سخن، حیدر آباد کے پچیس ممتاز شعرائے اردو"(۱۹۳۵ء)

"سیرِ گولکنڈہ"(۱۹۳۶ء)

"گولکنڈہ کے ہیرے"(۱۹۳۷ء)

"طلسمی تقدیر، ایک نیم تاریخی افسانہ"

"فنِ انشاپردازی"

"گارساں دتاسی"

"دکنی ادب کی تاریخ"

"تاریخِ ادبِ اردو"(۱۹۴۰ء)

"کلیاتِ محمد قلی قطب شاہ"(۱۹۴۰ء)

"سلطان محمد قلی قطب شاہ"(۱۹۴۰ء)

"نذرِ محمد قلی قطب شاہ"

"حیاتِ میر محمد مومن"(۱۹۴۱ء)

"شادِ اقبال"(۱۹۴۲ء)

"سرگزشتِ حاتم"(۱۹۴۴ء)

"خطباتِ صدارت، شعبہ تصنیف و تالیف"(۱۹۴۴ء)

"سرگزشتِ غالب"(۱۹۵۰ء)

"داستانِ ادب، حیدر آباد دکن"(۱۹۵۱ء)

"تذکرہ مخطوطاتِ اردو"، جلد دوم اور سوم (۱۹۵۱ء اور ۱۹۵۷ء)

"طالب و موہنی " (۱۹۵۷ء)

"خطباتِ صدارت"(۱۹۵۷ء)

"معنئ سخن"(۱۹۵۸ء)

"گارساں دتاسی اور اُس کے ہم عصر بہی خواہان"(۱۹۶۱ء)

"ادبی تحریریں"(۱۹۶۳ء)

"جامعہ عثمانیہ کے فرزندوں کی اردو خدمات"

"ادبیاتِ اردو اور تنقید نگاری"

448۔ General Secretary

449۔ ترکی خاندانِ شاہی کے افراد

450۔ امان اللہ خان کے بھتیجے

451۔ سلطان احمد شاہ*، سابق شہنشاہِ ایران کے متعلقین

452۔ مصر والجزائر وغیرہ کے جملہ امراء کی نئی پود

453۔ جاپان اور حیدر آباد نے ایک ساتھ مغربی تعلیم شروع کی

454۔ شیوہ کی جمع، طور طریقے

455۔ فارسی کہاوت کا ترجمہ "ہر کہ دَر کانِ نمک رَفت، نمک شُد"

456۔ عثمان ساگر

457۔ حمایت ساگر

458۔ کلیۂ اناث (Girls Department)

459۔ Headmistress

460۔ Time Table

461۔ Diploma

462۔ Loud Speaker

463۔ Roll Number

464۔ Co-Education

465۔ Primary Level

466۔ Leihe System

467 M unich۔ جرمنی کا شہر۔

468۔ Bavaria جرمنی

469۔ دُخترِ رز کا لفظی معنی ہے انگور کی بیٹی۔ انگور سے کشید کی گئی شراب کو کہا جاتا ہے۔

470۔ کولون اسٹیشن جرمنی

471۔ آپ نے قلی کو تین ڈاک اُٹھانے کی اجرت ایک مارک (=یک صد فنش) دی

472۔ "اشتمالیت" ایک ایسے نظریے کو کہا جاتا ہے جس میں کسی معاشرے سے شخصی ملکیت کو ختم کر کے املاک کو قوم کی مشترکہ ملکیت بنایا جائے۔ قوم کے ہر فرد کو اپنی لیاقت کے مطابق کام کرنے اور ضرورت کے مطابق حصّہ پانے کے استحقاق کا مسلک۔ اس کے عموماً "کمیونزم (communism)" کی اصطلاح استعمال کی جاتی ہے۔

473۔ یہاں قرآن مجید کی اس آیت کا حوالہ دیا گیا ہے:

وَاَعِدُّوْا لَهُمْ مَّا اسْتَطَعْتُمْ مِّنْ قُوَّةٍ وَّمِنْ رِّبَاطِ الْخَيْلِ تُرْهِبُوْنَ بِهٖ عَدُوَّ اللّٰهِ وَعَدُوَّكُمْ وَاٰخَرِيْنَ مِنْ دُوْنِهِمْ لَا تَعْلَمُوْنَهُمْ ، اَللّٰهُ يَعْلَمُهُمْ ، وَمَا تُنْفِقُوْا مِنْ شَيْءٍ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ يُوَفَّ اِلَيْكُمْ وَاَنْتُمْ لَا تُظْلَمُوْنَ ۔(الانفال۸: ۶۰)

ترجمہ: "اور ان کافروں کے لیے، جس حد تک ممکن ہو، حربی قوت اور بندھے ہوئے گھوڑے تیار رکھو جس سے اللہ کے اور تمھارے ان دشمنوں پر تمھاری ہیبت رہے اور ان کے علاوہ اُن دوسروں پر بھی جنھیں تم نہیں جانتے، (لیکن) اللہ انھیں جانتا ہے اور (جان رکھو کہ) اللہ کی اِس راہ میں تم جو کچھ بھی خرچ کروگے، وہ تمھیں پورا مل جائے گا اور تمھارے ساتھ کوئی کمی نہ ہوگی۔"

474۔ "گنجفہ" ایک کھیل ہے جو تاش کے پتّوں کی طرح کھیلا جاتا ہے، اس کا پتّا تاش کے بر خلاف گول گتّے کی شکل کا ہوتا ہے۔ گنجفے کی آٹھ بازیاں (رنگ) اور چھیانوے (۹۶) پتّے ہوتے ہیں ۔ یہ تین کھلاڑیوں میں کھیلا جاتا ہے۔ آٹھ بازیوں میں چار بڑی اور چار چھوٹی بازیاں کہلاتی ہیں ۔ بڑی بازیوں کے نام تاج، سفید، شمشیر اور غلام ہیں جب کہ چھوٹی بازیوں کے نام چنگ، سرخ، قماش اور برات ہیں ۔تاج کا میر ماہتاب اور سرخ کا میر آفتاب کہلاتا ہے جو اصطلاحاً رات اور دن کے کھیل کے میر کہلاتے ہیں۔

475۔ ہیبت

476۔ نراجیت کا لغوی معنی ہے، انتشار، انارکی، خفگی۔

477۔ بادشاہ کے چاروں ہندوستانی اے ڈی سی

کچھ ممالک میں، ساتھی کیمپ کو اعزاز کا لقب تصور کیا جاتا ہے، جو نامزد خطوں کے بعد ایڈیسی یا اے ڈی سی کو تسلیم کرتی ہے۔ ان کی ذمہ داریاں مختلف ہیں: صدر / گورنر / جنرل کے لیے سیکورٹی فراہم کرنا، صدر / گورنر / جنرل وقت کو بچانے کے لیے راستے کا تعین، کیلنڈر اور شیڈول تیار کرنا، پروٹوکول، ایگزیکٹو اسسٹنٹ کے طور پر خدمت کرنا، ملاقاتیوں اور مہمانوں کی میزبانی کرنا، اضافی عملے کے ارکان کی نگرانی کرنا اور صدر / گورنر / جنرل افسر کی خواہش کے مطابق مختلف فرائض انجام دینا۔

478۔ ارنڈیل کیزل

479۔ حال معتمد امور خارجہ برطانیہ عظمیٰ

480۔ (Indian Contingent) ہندوستان کے جنگی دستے

481 "حیدر آباد کی نسوانی دنیا" از نصیر الدین ہاشمی۔ (حیدر آباد دکن: ادارہ ادبِ جدید، ۱۹۴۴ء)، ص ۴۳۔۴۶۔

482 احمد عقیل روبی کی کتاب "علم و دانش کے معمار" سے مقتبس)

کتابیات

کتابیات

ابرارالباقی، محمد ڈاکٹر، "دکنی ادب اور ڈاکٹر زور" جہانِ اردو ،حیدرآباد دکن: ۱۵ اپریل۔۲۰۱۵ء۔

ابرارالباقی، محمد،ڈاکٹر ،دکنی ادب اورڈاکٹر زور، مشمولہ،جہانِ اردو ،حیدرآباد دکن: ۱۵اپریل۔۲۰۱۵ء۔

احمد، حسن الدین، انجمن:حصہ دوم،،دہلی، بھارت،:ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس،۲۰۱۲ء۔

احمد، حسن الدین، انجمن،،حیدرآباد دکن :والا اکیڈمی،۱۹۷۴ء۔

احمد،خورشید ،"ڈاکٹر محمد حمیداللہ، ترکش ماراخدنگِ آخریں،"، مشمولہ مجلہ عثمانیہ'سہ ماہی،، کراچی:اکتوبر تادسمبر ۲۰۰۳ء۔

احمد، حسن الدین "مردِ بے باک" محفل، حیدرآباد دکن: ولا اکیڈمی، ۱۹۸۲ء۔

اریب، سلیمان، مرتب،حیدر آباد کے شاعر ،جلد دوم،،،حیدرآباد دکن، بھارت،:آندھراپردیش ساہتیہ اکیڈمی، ۱۹۶۲ء ۔

اریب، سلیمان (مرتب)،حیدر آباد کے شاعر ،جلد دوم،،آندھراپردیش ساہتیہ اکیڈمی، حیدرآباد دکن، بھارت،،۱۹۶۲ء۔

اسٹار ڈائرکٹری ،الہ آباد، اترپردیش:اسٹار پریس، س۔ن۔

اشہر، منظر علی ،سید،حیدر آباد کی علمی فیاضیاں- ۱۹۱۰ءسے ۱۹۴۰ء، حیدرآباد دکن :احمد پریس س ن۔
اشہر، منظر علی،سید،منظر الکرام-حیدرآباد دکن کے مشاہیر کا تذکرہ ،حیدرآباد دکن: عماد پریس چھتہ بازار، ۱۳۴۵ء۔
اکرام الدین، محمد، خواجہ،اردو سفرناموں میں ہندوستانی تہذیب و ثقافت، نئی دہلی، بھارت،: قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، ۲۰۱۳ء۔
انجم، خلیق، ڈاکٹر، ''زورؔ ایک ماہر لسانیات'' مشمولہ سب رس کراچی، زورؔ نمبر جنوری ۱۹۷۹ء۔
انصاری، ضیاالدین، ڈاکٹر، ''زورؔ صاحب کی تصانیف کا تعارف'' مشمولہ محی الدین قادری زورؔ ،مرتب خلیق انجم ۱۹۸۹ء۔
انصاری، طیّب، یارانِ شہر- ادبی خاکوں کا دوسرا مجموعہ،، خیریت آباد، حیدرآباد دکن :ادارہ ادبیاتِ اردو، ۱۹۷۷ء۔
انورالدین، پروفیسر ''ڈاکٹر زورؔ کی تواریخ ادب وتذکرے'' مشمولہ سب رس زورؔ نمبر، نومبر، دسمبر ۱۹۹۲ء۔
برلؔ، ای جے، مرتب، انسائیکلو پیڈیا آف اسلام، جلد اول، لندن، انگلستان :لوزک اینڈ کمپنی، ۱۹۶۰ء۔
بریلوی ،عبادت، ڈاکٹر ''اردو تنقید کا ارتقا، علی گڑھ :ایجوکیشنل بک ہاؤس، ۱۹۸۶ء۔
بلیغ الدین، شاہ ،تذکرہ عثمانین ،کراچی :اردو اکیڈمی سندھ، ۲۰۰۱ء۔
بھوشن، کوی نود وبند- پنڈت ٹھاکردت سرماوبند، سیر یورپ، ،لاہور: امرت دھارا پبلشرز، ۱۹۲۵ء ۔
پاریکھ، رؤف، ڈاکٹر "ڈاکٹر حمید اللہ: خاموش سپاہی اور نابغہ روزگار" روزنامہ ڈان، ۱۴ دسمبر ۲۰۰۹ء۔
ترمذی، عظیم، رکن مجلس التحقیق الاسلامی، محدث فورم، "ڈاکٹر محمد حمیداللہ مرحوم-ایک عہدآفرین شخصیت"، ۱۶ اگست ۲۰۱۲ء۔
جعفر، سیدہ، ڈاکٹر زورؔ، نئی دہلی: ساہتیہ اکادمی سنہ اشاعت ۱۹۹۰ء۔
جیلانی، آصف، سکونِ قلب کے متلاشی - مترجم و مفسرِ قران :عبداللہ یوسف علی ،ہم سب بلاگ، ۲ دسمبر، ۲۰۱۸ء
حبیب الرحمان، چند یاداشتیں، کراچی : بہادر یار جنگ اکیڈمی، ۱۹۸۶ء۔
حرمت الاکرام، سید، ''ڈاکٹر زورؔ زورؔ شخصی اور ادبی زندگی'' مشمولہ سب رس، زورؔ نمبر، مدیر: خواجہ حمید الدین شاہد، کراچی: جلد ۶ ،دسمبر جنوری ۱۹۷۸ء-۱۹۷۹ء۔
حسن خان، مہدی، نواب ،مترجم: مولوی محمد عزیز مرزا، گلگشتِ فرنگ،، آگرہ، بھارت،: مطبع مفید عام، ۱۸۸۹ء۔
خان ،یوسف حسین، ڈاکٹر، یادوں کی دُنیا، اعظم گڑھ :دارالمصنفین، ۱۹۶۷ء۔
خان، سرسیّد احمد، مسافرانِ لندن، لاہور: مجلسِ ترقی ادب،

خان،رشید حسن ،ابتدائیہ،اردو املا،لاہور:فکشن ہاؤس،۲۰۱۰ء۔
خان،رشید حسن۔ڈاکٹر عبدالستار صدیقی،"اردواملا"،مشمولہ رسالہ ہندوستانی،لاہور:فکشن ہاؤس،جنوری ۱۹۳۱ء،۲۰۱۰ء۔
خان،عبدالرحمٰن ،محمد"مولوی محمد عبدالرحمٰن خان صاحب "،ماہنامہ سب رس'اقبال نمبر،خیریت آباد:مکتبہ ابراہیمیہ،س ن۔
خواجہ، مشفق،دیباچہ،موسموں کا عکس مصنف:جمیل زبیری،کراچی:بختیار اکیڈمی،۱۹۸۴ء۔
درانی، عطش،مرتب،پاکستانی اردو کے خدوخال،،اسلام آباد:مقتدرہ قومی زبان،۱۹۹۷ء۔
دیوانہ،موہن سنگھ، ڈاکٹر"محقق اعظم"مشمولہ سب رس، زورؔ نمبر،مدیر:خواجہ حمیدالدین شاہد،کراچی: جلد6 ،دسمبر جنوری۱۹۷۸ء-۱۹۷۹ء۔
ڈل،پردیپ،سید محمد رین بوہادی:رنجی ٹرافی میں سنچری بنانے والا پہلا آدمی،اخبار،کرکٹ کنٹری،بتاریخ ۱۴جون ۲۰۱۶ء۔
راہی،اعجاز۔مرتب،اردو سیمینار،املا و رموز اوقاف کے مسائل،،اسلام آباد:مقتدرہ قومی زبان،۱۹۸۵ء۔
راؤ،مانک ، ٹھل راؤ،مؤلفہ، ،بستان آصفیہ، حصہ ہفتم،حیدرآباد دکن،:چشتی القادری پریس،۱۹۳۱ء۔
رضوی ،عزیز،چند یاداشتیں،"تعارف"،،کراچی:بہادر یار جنگ اکیڈمی،۱۹۸۶ء۔
زورؔ، محی الدین قادری،ڈاکٹر"روح تنقید ،حیدرآباد دکن:شمس الاسلام پریس،۱۹۲۵ء،طبع اول۔
زورؔ، محی الدین قادری،ڈاکٹر، محمد ناظم علی۔روزنامہ"سیاست"،حیدرآباد دکن:۱۳۱اکتوبر ۲۰۱۴ء۔
زورؔ، محی الدین قادری،ڈاکٹر،داستان ادب حیدر آباد،شمارہ۱۶۳،،حیدرآباد دکن :ادارہ ادبیات اردو،سب رس کتاب گھر، ۱۹۵۱ء۔
ساجدہ،زینت ڈاکٹر"ڈاکٹر حمیداللہ"،مشمولہ"حیدر آباد کے ادیب ،انتخاب نثر ،حصہ دوم،،،حیدرآباد دکن: آندھراپردیش،ساہتیہ اکیڈمی۔
ساجدہ،زینت ڈاکٹر،چند یاداشتیں،مضمون"بابا-مولوی حبیب الرحمٰن صاحب"،،کراچی:بہادر یار جنگ اکیڈمی،۱۹۸۶ء۔
ساجدہ،زینت ڈاکٹر۔مرتبہ،حیدرآباد کے ادیب-انتخاب نثر :حصّہ دوم،حیدرآباد دکن:آندھراپردیش ساہتیہ اکیڈمی ،۱۹۶۲ء۔
سدید،انور ،اردو ادب کی مختصر تاریخ،لاہور:عزیز بک ڈپو،۲۰۰۶ء۔
سدید، انور،اردو ادب میں سفرنامہ،،لاہور:مغربی پاکستان اردو اکیڈمی،۱۹۸۷ء۔
سرور، محمد۔مرتب، مولانا محمدعلی کے یورپ کے سفر،خود ان کے اپنے قلم سے،،دہلی:جامعہ ملیہ اسلامیہ،کتاب خانہ پنجاب،۱۹۴۱ء۔
بخش، سلطانہ،قیام پاکستان سے قبل، خواتین کے سفرنامے،روزنامہ"دنیا"،۱۴جون،۲۰۱۷ء۔

سلیم، ابو عمار، مترجم، "علامہ عبداللہ یوسف علی" ازاے، الیف، ایم خالد حسین الواقعۃ ،شمارہ : ۶۴-۶۵، رمضان المبارک و شوال المکرم ۱۴۳۸ھ المطابق جون ۲۰۱۷ء۔

سلیم ، محمد، ڈاکٹر، اقبال اور ڈاکٹر خلیفہ عبدالحکیم، "روزنامہ پاکستان"، ۲۵ اپریل، ۲۰۱۴ء۔

سی، سری کشن میرا استعفا از مالیاتی مشاورتی کمیٹی و کمیٹی تخفیف ِ مصرف، جام باغ، حیدر آباد دکن :دکن لا رپورٹ مشین پریس، ۱۳۵۳ف۔

سی، سری کشن میری رخصت- حیدر آباد سے، عکسی کاپی، ڈاکٹر معین الدین عقیل کے ذاتی کتب خانہ کراچی سے، ۱۳۵۴ف۔

شاہ آبادی، جاوید، حیدر آباد کی چند اہم خواتین ناول نگار ، قومی کونسل برائے فروغ اُردو زبان: ۳۰ اکتوبر، ۲۰۱۷ء۔

شرما وبند، ٹھاکر دت، سفر یورپ ، لاہور: امرت دھارا، ۱۹۲۵ء۔

شفیق، محمد سہیل، ڈاکٹر "حمید اللہ، محمد، ڈاکٹر" ض، مارچ 2003ء، مشمولہ "وفیات ِمعارف"، کراچی: قرطاس پبلشرز، ۲۰۱۳ء

شفیق، محمد سہیل، ڈاکٹر، وفیات ِ معارف، کراچی :قرطاس، ۲۰۱۳ء۔

شکیب، بدر "جامعہ عثمانیہ کی ابتدائی ادبی مجالس"، مشمولہ مجلہ عثمانیہ – جامعہ عثمانیہ نمبر،، حیدر آباد دکن: س ن۔

شکیب، بدر، اسلام اور جنسیات، کراچی: پاک لٹریچر کمپنی، ۱۹۵۳ء۔

شکیب، بدر، نظر کے دھوکے، حیدر آباد دکن: اعظم اسٹیم پریس، ۱۹۳۷ء، ص ب۔

شکیب، بدر، بیمہء زندگی، کراچی: عثمانیہ اکیڈمی، ۱۹۶۴ء۔

شکیب، بدر، سرگزشت جامعہ عثمانیہ، مدراس: بزم طلبا قدیم، نظام کالج مدراس یونی ورسٹی، ۱۹۷۱ء۔

شکیب، بدر، مرتب، یورپ کے تاثرات،، حیدر آباد دکن: اعظم اسٹیم پریس، ۱۳۴۹ف بمطابق ۱۹۴۰ء۔

شیرازی، صمصام، مؤلف، مشیر ِعالم ڈائرکٹری - کون کیا ہیں؟ ،، حیدر آباد دکن: سید الاخبار پریس، س ن۔

صباح الدین عبدالرحمان، سید، "نام وران علی گڑھ-ڈاکٹر یوسف حسین خان" مشمولہ سہ ماہی فکر و نظر۔ جنوری ۱۹۸۷ء تا جولائی ۱۹۸۸ء۔

صدیقی ، احمد حسین، دبستانوں کا دبستان، جلد سوم،، کراچی: محمد حسین اکیڈمی، ۲۰۱۰ء ۔

صدیقی ، صفی الدین، ڈاکٹر، "ڈاکٹر رضی الدین صدیقی مرحوم" مشمولہ مجلہ عثمانیہ، سہ ماہی"، کراچی: جنوری تا مارچ، جلد ۴، شمارہ ۱۔

صدیقی، ظہیر احمد، سخنے چند: دیکھ لیا ایران مصنف، افضل علوی، لاہور: الحروف، ۱۹۸۲ء۔

صلاح الدین، ضرار، "ڈاکٹر رضی الدین صدیقی کی میراث کو ہم نے بھلا دیا"، نسٹ سائنس بلاگ، ۰۶ مئی ۲۰۱۵ء۔

عابد علی عابد، سید، اصول ِانتقاد ِادبیات ،، لاہور: سنگ میل، ۲۰۰۶ء۔

عبدالحق، مولوی،اردو سہ ماہی اورنگ آباد،سنہ اشاعت جولائی ۱۹۳۷ء۔

عبدالرشید "ڈاکٹر محمد حمیداللہ مرحوم۔۔۔ایک عہد آفرین شخصیت" محدث فورم،۲مارچ ۲۰۱۱ء۔

عبدالرشید عابد اور عارف عزیز،"سرگزشتِ جامعہ عثمانیہ" پر تبصرہ، مشمولہ، روزنامہ ایکسپریس،، ۲ دسمبر،۲۰۱۸ء۔

عبدالغفار، قاضی، نقشِ فرنگ،اقصائے مغرب کی سیر کے دلآویز تاثرات،،لاہور: دارالاشاعت پنجاب، ۱۹۲۴ء۔

عبداللہ، سید، پیش لفظ،حافظ و خیام مصنف: مقبول بیگ بدخشانی،لاہور: غالب پبلشرز،۱۹۷۹ء۔

عبداللہ، سید، ڈاکٹر، پیش لفظ،حافظ و خیام، مصنف: مقبول بیگ بدخشانی،لاہور: غالب پبلشرز،۱۹۷۹ء۔

عجائباتِ فرنگ اور یوسف خان کمبل پوش،لاہور: زاہد بشیر پرنٹرز،۲۰۱۶ء۔

عزیز، طارق، ڈاکٹر ،اردو رسم الخط اور ٹائپ،،اسلام آباد: مقتدرہ قومی زبان،۱۹۸۷ء۔

عشرت، وحید، ڈاکٹر، ڈاکٹر خلیفہ عبدالحکیم کا عمرانی فلسفہ،پنجاب یونی ورسٹی سینٹرل لائبریری،لاہور، ۱۰۷۶ء، کال نمبر ۹۵۴۷. ۱۸۱ع ۲۹۵ع،

عقیل، معین الدین،سفرنامہ منشی امین چند: اردو کا اولین اور کم یاب سفرنامہ، کراچی: مکتبہ اسلوب، ۱۹۸۲ء۔

عقیل، معین الدین،عبدالغفار خان،ایک نادر سفر نامہ،مقدمہ و حواشی : ،کراچی: مکتبہ اسلوب ۱۹۸۲ء۔

عقیل، معین الدین،سفرنامہ منشی امین چند: اردو کا اولین اور کم یاب سفرنامہ، کراچی: مکتبہ اسلوب، ۱۹۸۲ء۔

علی، ثروت، ڈاکٹر ،مقدمہ۔سفرنامہ فرنگ، ،،نئی دہلی: ترقی اردو بیورو، ۱۹۸۴ء۔

غوری، حسام الدین، محمد،تحریکِ علی گڑھ اور حیدرآباد دکن، کراچی: دارالادب پاکستان،۱۹۷۹ء۔

فاطمی، علی احمد ،"سفرنامہ کی ادبی اہمیت"،مشمولہ "اردو سفرناموں میں ہندوستانی تہذیب

اکرام الدین، محمد، خواجہ ،ثقافت ،نئی دہلی، بھارت،: قومی کونسل برائے فروغِ اردو زبان، ۲۰۱۳ء۔

قتیل، حفیظ۔ مرتبہ،راہ رو اور کارواں ،حیدرآباد دکن: ادارہ ادبیاتِ اردو،۱۹۵۵ء۔

کاظم، محمد،مجیب احمد سے مکالمہ مرتبہ: عطاالحق قاسمی،ادبی ایڈیشن،لاہور: نوائے وقت،۱۳مارچ ۱۹۷۷ء۔

کاظمی، تمکین "حیدرآباد کی چند شخصیتیں" مشمولہ "نقوش۔ شخصیات نمبر"،لاہور: فرید بک ڈپو، س۔ن۔

کمبل پوش، یوسف ،عجائباتِ فرنگ مرتب: تحسین فراقی،لاہور: مکہ بکس،۱۹۸۳ء۔

محمد حسین، مولوی،سفر نامہ ابن بطوطہ، ترجمہ مع حواشی و تعلیقات ،دہلی، بھارت،: عاکف بک ڈپو، ۲۰۰۰ء۔

ناز، ایم ایس، ڈاکٹر۔ مرتب،اردو میں فنی تدوین،،اسلام آباد: ادارہ تحقیقاتِ اسلامی،۱۹۹۱ء۔

ناز،ایم ایس، ڈاکٹر،اردو میں فنِ تدوین،،اسلام آباد: ادارہ تحقیق،۱۹۹۱ء۔

نجم النساء ،آزادی کے بعد حیدر آباد کی نثر نگار خواتین ،بزمِ اردو بلاگ

نظامی، حسن، خواجہ، "محی الدین قادری زور"، روزنامہ تعمیر، حیدر آباد دکن: ۲۶فروری،۲۰۱۳ء۔

نواز،شاہدہ،آزادی کے بعد اردو خود نوشت،تعارفی جائزہ،، مشمولہ،آن لائن بلاگ قومی کونسل برائے فروغِ اردو زبان۔ ۱۴اکتوبر ۲۰۱۷ء۔

ہاشمی، حمیر، محمد اسلم انصاری، ممتاز حسین نعیم، ۱۰۰ عہد ساز شخصیات ،لاہور: علم و عرفان پبلشرز، ۲۰۰۱ء۔

ہاشمی، قطب اسناد،تین مسافر ،حیدرآباد: نیشنل فائن پریس،۱۹۶۶ء۔

ہاشمی، نصیر الدین۔ مقدمہ،میرے موسومہ خطاز بیگم صغریٰ ہمایوں مرزا، چھتہ بازار، حیدر آباد دکن: تاج پریس، ۱۹۵۱ء۔

Tragedy Of Haiderabad، میر لائق علی،، کراچی: پاکستان کوآپریٹو سوسائٹی، ۱۹۶۲ء،۔

East India Company returns after 135-years absence,BBC NEWS،۱۳اگست ۲۰۱۰ء۔

"ڈاکٹر محمد حمید اللہ،اک طائرانہ نظر میں،"از ادارہ، مشمولہ "مجلہ عثمانیہ'سہ ماہی،، کراچی: اکتوبر تا دسمبر ۲۰۰۳ء۔

Sherif, M.A. searching for Solace ، Kuala Lumpur: Malaysia :Islamic Book Trust , 1994.